دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2015
معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

جلد 45 • شمارہ 04 • اپریل 2015 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول
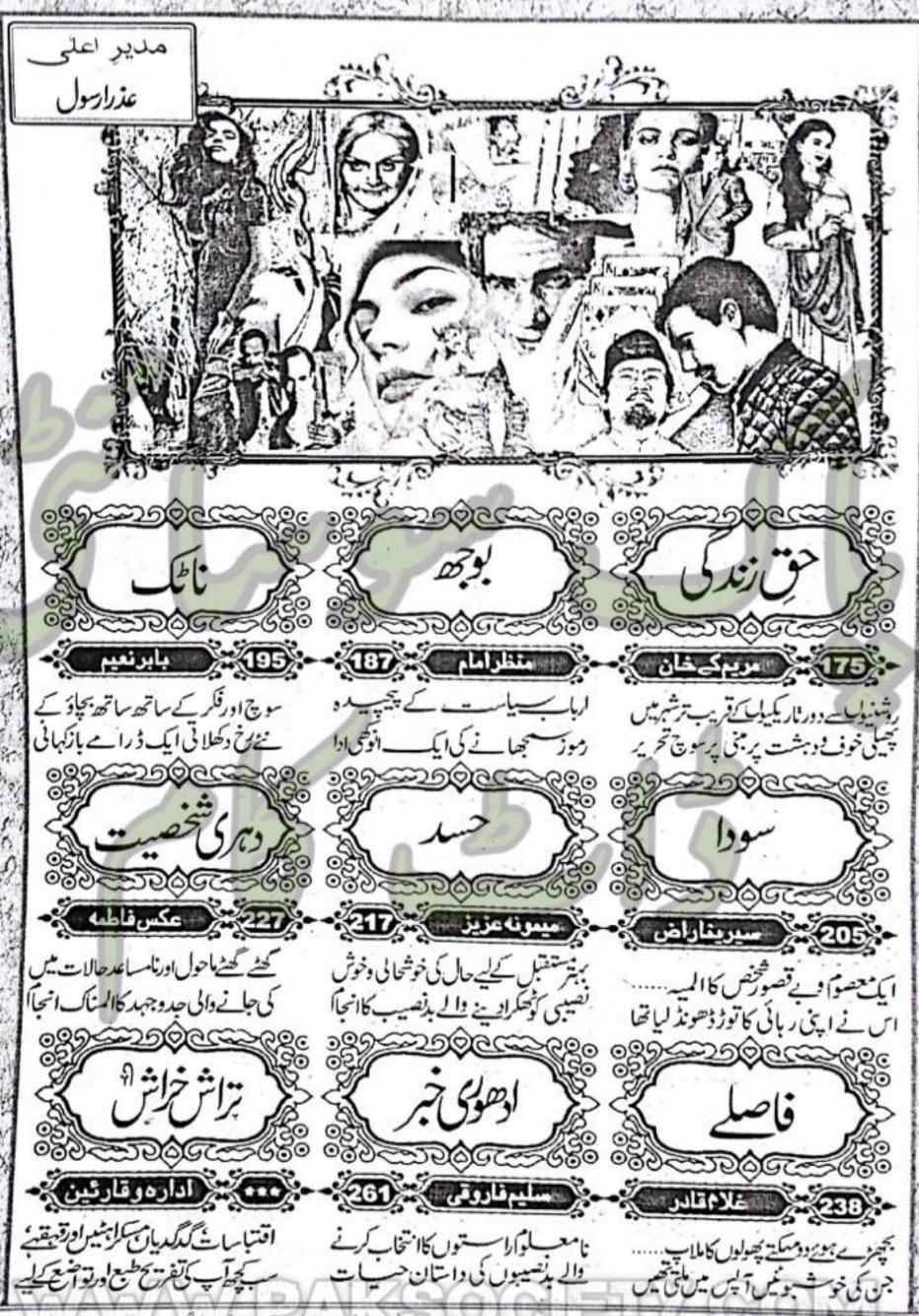
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

چلیے قصہ تمام ہوا۔ ہم آسٹریلیا سے کوارٹر فائنل میں ہارے، بلند بانگ دعوے کرنے والوں نے اسی ملک سے سیمی فائنل میں منہ کی کھائی اور آخری راؤنڈ میں اسی آسٹریلیا نے عجز و انکسار کے ساتھ فتح کا تاج اپنے سروں پر سجالیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ گھمنڈ کھیل کا ہو یا طاقت اور اقتدار کا...... کبھی خیر یا سربلندی پر منتج نہیں ہوتا۔ قدرت ایسوں کی رسی دراز کر دیتی ہے۔ وہ سینہ نکال کر، دھرتی کو کوٹ کوٹ کر اپنی بڑائی پر ناز کرتے ہیں پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب مکافاتِ عمل کے نتیجے میں وہ دھول چاٹتے نظر آتے ہیں۔ یہی کچھ ہمارے پڑوسیوں کے ساتھ بھی ہوا۔ اپنے گھر میں دیکھ لیں جو لوگ کل تک دندناتے اور خاک و خون کی ہولیاں کھیلتے پھرتے تھے، آج پناہ اور امان کی تلاش میں در بدر ہیں۔ عالمی قوتیں اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے جائز اور ناجائز مفادات کے لیے سب کچھ داؤ پر لگاتی جارہی ہیں۔ انہوں نے امتِ مسلمہ کو خاص طور پر تاک لیا ہے۔ ہمارے فروعی اختلافات کو ہوا دے کر پورے مشرقِ وسطیٰ اور خلیجی علاقے کو ایک آتش فشاں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کبھی ایک کو شہ دیتے ہیں کبھی دوسرے کو بھڑکاتے ہیں۔ کسی کی اخلاقی حمایت کر رہے ہیں تو اس کے حریف کو ہتھیار اور سرمایہ فراہم کر رہے ہیں تاکہ ان کے دیوہیکل اسلحہ ساز کارخانے دن رات چلتے رہیں۔ ان کی بھی رسی دراز ہے مگر وہ دن قریب آتا نظر آرہا ہے جب یہ مغرور اور سفاک قوتیں اپنے انجام کو پہنچیں گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ امتِ مسلمہ کے مقتدر طبقے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس حقیقت کا ادراک کرلیں کہ نائن الیون کے بعد دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ بین المذاہب رواداری کے ڈھنڈورے پیٹنے والوں کی بغلوں میں مہلک چھریاں دبی ہوئی ہیں۔ ایک منظم انتشار اور افتراق کا ڈول ڈال کر مسلمانوں کو فرقوں، گروہوں اور آخرکار چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس کا ازالہ نہ کیا گیا تو دشمنوں کا یومِ حساب دور سے دور تر ہوتا چلا جائے گا۔ اب دیکھتے ہیں کہ ہمارے پیارے نیارے قارئین نے اس منظرنامے میں کن اختلافات و اتفاقات کی بنیاد رکھی ہے۔

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی عرق ریزی ”بکھرے بال، گھورتی آنکھیں، طوطے جیسی ناک، کریہہ چہرہ لیے پسٹل کی ناب بس اب دبائے کہ دبائے سنہری ٹائٹل میں بھیانک سین لیے ہوئے تھا۔ شکر ہے باقی آدھا سرورق سوچوں کے حسین رنگوں میں بکھرا ہوا' خوبرو حسین لڑکی اپنے سامنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر یوں اداس لگ رہی تھی جیسے اس کا پیار اسے چھوڑ کے دوسرے کے ساتھ جارہا ہو۔ دیکھتے ہیں کہ اپنے دوست بزمِ نکتہ داں کیا عرض کررہے ہیں۔ زویا اعجاز! آپ کی گفتگو اور رموز کا دائرہ کار تو بہت وسیع ہے، اس چٹکل کی دنیا سے کوئی کہانی ہی لے آؤ پھر۔ عبادت کاظمی صاحب! برستی بارش میں تبصرہ بھی مختصر کردیا۔ زیادہ سردی تو نہیں لگ گئی۔ ماریہ جہانگیر کہانی اور حقیقت کا فرق تو سمجھ آتا ہے اور لطف بھی خوب آتا ہے اصل بات یہ کہ ہم ان کرداروں سے حاصل کیا کرتے ہیں؟ ارے پری زے خان ہم کب حیران ہو رہے ہیں یہ تو آپ کی پروازِ تخیل ہے جناب۔ یادیں تو دل گرفتہ ہی کرتی ہیں، جناح پیرزادہ! آپ بھی یادوں کے بھنور سے نکل آئیں۔ کاشف عبید یہ سوسو کیا بلا ہے۔ بشریٰ افضل! اللہ آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ واہ جی واہ، طاہرہ گلزار تو اس دفعہ سب کے صدقے واری جارہی ہیں، آپ کے خلوص کے تو بھی معترف ہیں جی۔ شکیل کاظمی آپ کا تبصرہ بھی بھرپور ہے پر آپ کون سی داستان کے لیے سرگرداں ہیں جناب۔ ماریہ خان لگتا تو نہیں کہ آپ تاریک راہوں میں گم ہوں، تبصرہ تو خوب روشن ہوتا ہے آپ کا۔ صنوبر گل ویلکم! آپ کے الفاظ بھی بہترین تبصرہ نگار کو عیاں کر رہے تھے۔ ہارٹ کیچر نے تو لگتا ہے بڑی مشکل سے ٹائم نکالا ہے (نہیں جی ان کے پاس بہت وقت ہوتا ہے مگر ان لکھی باتوں کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے) نادر سیال! آپ بھی تو اس پارلیمنٹ کا حصہ ہیں۔ سجاد خان ویلکم، نادر سیال آپ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ جس طرح دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اس طرح بے اختیار جذبوں کو بھی راہ ملتی ہے اور اسی جذبے کے تحت زہرہ بانو تیش شاہ پر مرمٹی، مگر اس نے پہلو تہی کی۔ دوسری طرف ستارہ بیگم کو بھیرو نے زہر دے کر مار دیا اور زہرہ بیگم سازشی ٹولے کے ہاتھوں تنہا ہو کے رہ گئی۔ آوارہ گرد میں آنے والے نئے نئے موڑ کو عبدالرب بھٹی نے سنسنی خیز و سسپنس انگیز بنا دیا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ”تم ندی کے پانی میں دوبارہ پیر نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ دوبارہ وہ پانی نہیں ہوگا۔ واہ تم تو فلسفی ہو گئے۔ کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا۔ سلیم اور روبی کی اندرونی تڑپ نے آخر انہیں بھی ایک کر ہی دیا اور جواری زندگی ہارتے ہارتے بھی سب کچھ جیت گیا تھا۔ فلسفیانہ باتوں سے معمور احمد اقبال کی جواری بھی آخری قسط لیے زبردست رہی۔ دامِ تزویر، کاشف زبیر کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ قدرت نے ہماری زمین میں اتنے خزانے چھپا دیے ہیں کہ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا اور جو اندازہ کرلیں تو وطن کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ غدار اس میں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اسا وارم اور ساتھی مل کر اس نقصان کا ازالہ کر کے وطن کے لیے عظیم کام بھی کر جاتے ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ کھوکھلی ذہنیت کو بے نقاب کرتا نیلی موت کی صورت میں منظر امام کی زبردست کاوش تھی۔ جوش کی خاموشی میں ہی اس کے خاندان کی بھلائی تھی سو وہ ہیرو ٹھہرا۔ تنویر ریاض کی تحریر نارمل رہی۔“

جامپور سے عثمان راشد کا نوازش نامہ ”7 مارچ کو رسالے کی دید نصیب ہوئی۔ سب سے پہلے سرورق کی روگردانی کی۔ سرورق کی کہانیاں اس دفعہ کچھ خاص نہیں رہیں۔ کہانیوں میں گھماؤ پھراؤ زیادہ اور کہانی کم تھی۔ البتہ عمران کا کردار بھایا۔ سرورق کی تصویر کی داد دیتا ہوں۔ اس کے بعد پرشور ثبوت پڑھی۔ کہانی خوب تھی۔ انکشاف بھی اچھی تھی۔ دیرینہ خواہش نے چھکے چھڑا دیے۔ نفسیاتِ زن بھی اچھی تھی۔ اوباش میں چالبازی خوب تھی۔ کیا بات ہے سراغ رساں کی۔ محفل خطوط میں آئے تو سب سے پہلے زویا اعجاز کو پایا۔ محترمہ آپ کو مبارک باد ہو۔ لگتا ہے آپ کرکٹ سے بڑی متاثر ہیں۔ اس کے علاوہ باقی سب بھی اچھے تھے اور ان کی باتیں بھی۔ سب کو میرا اسلام! پاکستان فائنل میں پہنچا ہے۔ اس کے لیے دعاگو ہوں کہ ہماری ساکھ بنائے رکھے۔ خوشی سے پھولے نہ سمانے کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں اس کے علاوہ اس دفعہ کچھ کترنیں علیحدہ صفحے پر ساتھ ہی ہیں۔“

سید اکبر شاہ اوگی، مانسہرہ کی مصروفیات ”فروری کے مہینے جہاں میری صحت کی بحالی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے وہی قریب ہوتے بورڈ کے امتحان برائے نہم سے دل و دماغ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جلتی پر تیل کا کام بھائی نے خط نہ پوسٹ کر کے کیا۔ جاسوسی کیسے ملا، یہ الگ داستانِ محبت و جنگ ہے۔ سرورق جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ سازشی حسینہ، سازندے کے مانند کسی سازش کے تار چھیڑ رہی تھی۔ بزمِ یاراں کی طرف قلابازی لگائی۔ کرکٹ میچز کا جنون زویا خالہ کی تبصرہ نگاری میں سر چڑھ کر بول... بلکہ چیخ رہا تھا۔ مردِ میدان قرار پانے پر ڈھیر ساری مبارک باد۔ پری زے خان، ناواقفیت والی بات سے اتفاق ہے۔ صوفیہ شکیل کو پڑھتے ہوئے آپ کی رحستی عقل پر قلمی دکھ ہوا۔ طاہرہ گلزار، مظہر سلیم کے حوالے سے دو سو چالیس اسپیڈی الزام بے دھڑک سے متفق نہیں ہیں ہم۔ شکیل بھائی اور ماریہ خان کے علاوہ بھی کافی دوستوں نے دل دہا کے لکھا۔ عبدالجبار رومی، بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے؟ یا... تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے۔ غیر حاضر... کبیر عباسی اور تصویر العین کے لیے ڈھیروں ڈھیر پیار۔ یہ پیار ہماری گزشتہ استانیوں جیسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اپنے دس فٹ لمبے ناخن ہمارے کان کی لو میں گھونپ دیا کرتی تھیں۔ ہماری چیخ و پکار کا جواب کچھ یوں ہوتا ”بچے رویا نہیں کرتے شاباش۔“ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ کہانیوں کی ابتدا آوارہ گرد سے کی۔ بیگم صاحبہ اور ان کی والدہ کو جاگیردارانہ طبقے نے خوب رگیدا۔ بس وہی انا کا مسئلہ۔ لئیق شاہ کے کردار میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ جواری کے مطالعے سے بوریت غالب آجاتی تھی، بالآخر اختتام ہو چکا۔ جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ انگارے نئی سلسلہ وار کہانی... آپ کے سوال کا جواب ہے طاہر جاوید مغل۔ منظر امام کو وارنش بدست پہلا رنگ رنگتے دیکھا۔ اقتدار کے ایوانوں میں پلتے پھولتے سیاست دانوں اور ملک کی جڑیں ادھیڑنے والے میکار تے جیسے لوگ اپنے ناپاک اور خطرناک منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ باہمی اتحاد و اتفاق کو تقویت دے کر بہترین حکمتِ عملی اپنائی جائے تو ان بدترین جانور سے نجات مل سکتی ہے۔ دوسرا رنگ یقیناً بالکل پسند نہ آیا۔ حصولِ آزادی جس میں ذہنیت ہی مغربی طرز کی ہو، میں سرگرداں، پل پل رنگ بدلتی سیننا جیسی دوشیزاؤں کا انجام بدترین ہوا کرتا ہے۔ چند ایک مختصر فن پاروں کے علاوہ باقی رسالہ ابھی باقی ہے۔ کترنیں کھٹی میٹھی رہیں۔“

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی ناراضی ”اس بار جاسوسی کا ٹائٹل خوب صورت، خوش رنگ اور جاذبِ نظر ہے۔ اس کی کشش نے کھینچ لیا۔ ناراضی کے ساتھ آپ کی محفل میں حاضری دی جا رہی ہے۔ آپ نے کافی وقت گزرنے کے بعد بھی ہماری کہانیوں منصوبہ، انتقام کی آگ اور رقابت کو نہیں دیکھا۔ (انشاء اللہ اس دفعہ دیکھ لیں گے پھر آپ کی ناراضی بھی دور ہو جائے گی) کرائم کہانیاں اس بار بھی اچھی تھیں مگر مختصر کہانیوں میں الٹی تدبیر زیادہ پسند آئی۔ اس انداز کی میاں بیوی کی کرائم کہانیاں مغرب سے پہلے بھی آتی رہی ہیں۔ دامِ تزویر اچھی کاوش تھی اور اقبال کاظمی صاحب کی آخری مات ہنگاموں سے بھرپور کافی معیاری تحریر تھی، اقبال کاظمی بہت اچھے ادیب تھے۔ آوارہ گرد حسبِ معمول ہنگامہ خیزی سے جاری ہے۔ نیلی موت بھی بہت اچھی منفرد کاوش ہے۔ انگارے میرے خیال میں طاہر جاوید مغل صاحب نے ہی تحریر کی ہے۔“

تھرپارکر، عمرکوٹ سے وفا آکاش عبداللہ سیمجو کی پہلی تحریر ”میرا جاسوسی ڈائجسٹ کے لیے یہ پہلا خط ہے۔ میں بہت ہی پرانا جاسوسی کا قاری ہوں، لیکن خط اس لیے نہیں لکھ پاتا کہ میرا گاؤں تھرپارکر میں ہے اور وہاں ڈاک کا آنا جانا تھوڑا پرابلم ہے۔ اس لیے بالآخر میں نے آج آپ کو لکھنا شروع کیا۔ ہمیں ہر ماہ رسالہ تقریباً 10 تاریخ کو ملتا ہے، اس بار جواری کا آخر بالکل بھی اچھا نہیں رہا۔ آوارہ گرد کچھ مزیدار بن گئی ہے۔ میرے خیال میں کہانی انگارے کے مصنف طاہر جاوید مغل ہی ہوں گے۔ باقی کہانیوں کو ابھی تک پڑھا بھی نہیں ہے۔ ویسے تو کاشف زبیر، مریم کے خان، آصف ملک، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی وغیرہ میرے پسندیدہ مصنفین میں شامل ہیں۔“

اوکاڑہ سے شوکت شہریار کا تبصرہ ”زندگی کی مصروفیات نے کافی ماہ تک چٹکی نکتہ چینی میں حاضری کا موقع نہیں دیا لیکن اس بار آخر کار ہمت کر ہی لی۔ مارچ کا شمارہ اس دفعہ 8 تاریخ کو ہی میرے ہاتھوں میں موجود تھا۔ سرورق کی حسینہ غمناک آنکھوں کے ساتھ آنٹی طاہرہ گلزار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک خونخوار شخص بہت غصے میں ان پر فائرنگ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ محفل میں داخل ہوئے تو زویا اعجاز بڑی شان کے ساتھ موجود تھیں اور بلقیس خان اور مس الیلی کی کلاس لے رہی تھیں۔ بس کریں زویا کیا بچیوں کی جان لیں گی آپ؟ کراچی سے پری زے خان کو محفل میں دیکھ کر حیرت کا خوشگوار جھٹکا لگا۔ ویلڈن پری آپ کو چٹکی نکتہ چینی میں ویلکم۔ صفدر معاویہ بھائی آپ کے تبصرے کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پشاور سے آنٹی طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی اچھا تھا اور یاد آیا آج کل آنٹی طاہرہ گلزار فیس بک پر بھی موجود ہیں اور ماد ھوری ڈکشٹ کی تصویر لگا کر جلوے دکھا رہی ہیں۔ مظہر بھائی کیا ہو گیا آپ کو؟ اس مرتبہ آپ کے تبصرے میں وہ جان نہیں ہے جو آپ کو ایک بہترین تبصرہ نگار ثابت کرتی ہے۔ مرتضیٰ بھائی آپ کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔ جاوید بلوچ خیر تو ہے آپ نے اپنا نام ہارٹ کیچر رکھ لیا ہے؟ شفقت مرالی، بشیر بھٹی، محسن علی، ماریہ خان، صنوبر گل، عبدالجبار، نادر سیال کے تبصرے اچھے تھے۔ سید شکیل کاظمی عرف وڈے شاہ جی JDP میں حیران تھے کہ یہ بلقیس خان کون ہیں جو ان کی بہت تعریفیں کر رہی ہیں۔ محفل میں کبیر عباسی بھائی کو نہ دیکھ کر دل ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا کیونکہ آئی لو کبیر بھائی۔ اس مرتبہ بڑے بڑے تبصرہ نگار محفل میں موجود نہیں تھے، ان کی کمی محسوس ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دامِ تزویر پڑھی جو کہ ایک نئے موضوع پر لکھی گئی بہترین کہانی تھی، جولی نے ثابت کر دیا کہ انسانی دماغ کمپیوٹر سے زیادہ پاورفل ہے لیکن اس کو نفسیاتی مریضہ کا خطاب دینا درست نہیں تھا۔ پُرشور ثبوت میں ایڈورڈ کا اپنی بیوی کو مارا گیا مکا مزہ دے گیا۔ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے دونوں میاں بیوی پولیس کے چنگل میں پھنس گئے۔ فسادِ خون پڑھ کر بہت دکھ ہوا، کیا انسان دولت کے لیے اتنا بھی گر سکتا ہے کہ اپنے سگے بیٹے کا خون کر دے؟ آوارہ گرد کی یہ قسط بہت بہترین تھی اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔ ترکہ میں میکس نے اپنی بہن کو بہت خوب صورت تحفہ دیا۔ جواری کی آخری قسط پڑھ کے بالکل بھی مزہ نہیں آیا، ابھی یہ اسٹوری بہت آگے بڑھ سکتی تھی لیکن اس کو جلدی میں ختم کر دیا گیا۔ آخری مات میں جون اوسکر کی جتنی ٹھکائی ہوئی آج تک کسی سراغ رساں کا ایسا حال ہوتا نہ دیکھا تھا۔ ویون مکافاتِ عمل کا شکار ہو گئی اور حاصل بھی کچھ نہ ہوا۔ نیلی موت سرورق کا پہلا رنگ، اسٹوری بہت اچھی تھی۔ ارسلان کو آخر میں اپنی محبت مل گئی لیکن کہانی کا

اختتام بہت جلدی میں کیا گیا جس کا افسوس ہوا۔ لذتِ آزار میں عمران کی ثابت قدمی اور روبی کی محبت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور آخر میں رخسانہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا کر دی۔ جاسوسی کی تمام ٹیم کو ایک بہترین شمارہ شائع کرنے پر مبارک باد۔"

پشاور سے طاہرہ گلزار کی کارگزاری" آج یعنی 9 مارچ کو چار بار چکر لگانے کے بعد اپنا سویٹ سویٹ جاسوسی ملا تو دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں تو سامنے سے ایک بندے کو خوش فہمی ہونے لگی کہ شاید ہم اس کی محبت میں گرفتار ہو کے خوش ہو رہے ہیں۔ ہائے اس کو کیا معلوم کہ ہم جاسوسی سے کتنی محبت کرتے ہیں لیکن ادارے والے ہر دفعہ ہمارا دل توڑتے رہتے ہیں۔ رحم بھی ہمارے کمزور دل پر نہیں کرتے، انکل ہمارے جیسی پیار کرنے والی نہیں ملے گی۔ سرورق دیکھا تو لڑکی انڈین ڈراما قم قم بھاگیا کی بلبل لگی اور بندوق ہاتھ میں لے کر ہمایوں سعید باقیوں کو ڈرا رہے ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں عبدالرب بھٹی، احمد اقبال بابا جانی کے ساتھ کاشف زبیر، مریم کے خان، آصف ملک اور منظر امام کے نام دیکھ کے دل خوشی سے جھوم اٹھا اور دل پکار اٹھا، جیو جاسوسی۔ اب چلتے ہیں چھیڑ چھاڑ، نکتہ چینی کی محفلِ غوغا میں جہاں اب محبت و دوستی کی چینی کم اور اعتراض کے نکتے زیادہ رہ گئے ہیں۔ پہلا خط حسبِ معمول زویا اعجاز کا رہا، مبارکاں! بہت طویل اور دلچسپ تبصرہ تھا۔ ماریہ جہانگیر اور پری زے خان بھی اپنے جاندار تبصرے کے ساتھ موجود تھیں، مجھے یاد رکھنے کا شکریہ پری۔ سرگودھا کے اسد عباس نے بھی ہمیں یاد رکھا، شکریہ بھائی۔ صفدر معاویہ بھائی مجھے جھوٹ اور منافقت سے سخت نفرت ہے اور یہ جو اچھا اچھا لکھتے ہیں، ان میں سے بہت سے اندر سے بہت کالے ہیں۔ بشریٰ افضل سسٹر اتنی ناامیدی اچھی بات نہیں۔ وڈے شاہ جی تبصرہ تو حسبِ معمول بہت اچھا تھا لیکن زیادہ نخرے نہ کرو۔ عبدالجبار رومی کا بھی بہت طویل، دلچسپ اور شاعرانہ تبصرہ بہت خوب تھا۔ ہمایوں سعید، آغا فرید، قدرت اللہ، رضوان تنولی، قمرتی اور جاوید بلوچ کو بہت مس کر رہی ہوں۔ اب تھوڑا تبصرہ کہانیوں پر۔ حسبِ عادت پہلے عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی جس میں میڈم کی کہانی ان کی زبانی جاری ہے۔ ہائے عورت سوکن کو زہر دے اور اس کو لانے والے شوہر کو چھوڑ دیا جو اصل فساد کی جڑ ہے۔ کمیل دادا اور لئیق شاہ وہی ازلی رقیب، دونوں میڈم سے محبت کرنے والے۔ بھٹی صاحب کی اچھی تحریر، ویلڈن بھٹی صاحب۔ آخر کار احمد اقبال صاحب کی تحریر جواری اختتام پذیر ہوئی۔ نادر شاہ ختم۔ ریشم اور انور، روبی اور سلیم آخر ایک ہو گئے۔ اللہ، اللہ خیر سلا۔ سلیم انور کی تحریر اوباش، مغربی پولیس کا مجرم کو پکڑنے کا نیا انداز۔ سکندر عظیم کی مختصر مغربی تحریر، پتا نہیں یہ مرد، عورت کو بے وقوف سمجھنا کب چھوڑیں گے۔ شیپرڈ اپنی چال میں ناکام اور اس کی بیوی شالی کامیاب ہاہاہا؟ میمونہ عزیز کی نفسیات زن مغربی تحریر، واقعی نفسیاتی عمل کے ذریعے قاتل پکڑنا واہ! کاش ہماری پولیس بھی ایسی ہو جائے۔ بابر نعیم کی دیرینہ خواہش مغربی مجرمانہ ذہنیت کی کہانی۔ خود کو بہت چالاک سمجھنے والا اپنے اسٹیٹ منیجر کے ہاتھوں لٹ گیا۔ شازلی سعید مغل کی تحریر انکشاف بہت حساس تحریر تھی۔ آج کل ہمارے معاشرے میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ سرورق کی دوسری کہانی لذتِ آزار میری فیورٹ رائٹر مریم کے خان کی بہت شاندار تحریر... معاشرے کے کچھ ناسور زدہ رشتوں کے جذبات کی عکاسی کرنے والی کہانی جو ہمارے اس معاشرے میں بہت حد تک ہو رہا ہے۔ اللہ ہم سب کو عمران کی طرح گناہوں سے بچائے، آمین۔ سرورق کی پہلی کہانی میرے فیورٹ رائٹر منظر امام صاحب کی تحریر نیلی موت جس سے میری روح تک کانپ گئی۔ یہ تو میرے ملک پاکستان کی ہی کہانی ہے۔ کاشف زبیر کی ایک اچھوتی تحریر دامِ تزویر ایک مکمل شاہکار تحریر جسم میں ہر کردار، ہر منظر مکمل، ویلڈن کاشف زبیر زورِ قلم زیادہ ہو۔"

میانوالی سے احسان سحر کی بھگوتی باتیں" بارشوں کے دن ہیں، برس رہی ہیں...... برس رہی ہیں... اور نہ جانے کب تک برستی رہیں گی۔ برسنا ہے ان کا کام۔ یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں، تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں، اور کبھی ہر پل ہمارے من کو جل تھل کیے رکھتی ہیں لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ پہلی دفعہ ہمیں جاسوسی اتنا لیٹ ملا ہے پھر بھی دل ہے کہ مانتا نہیں ہے۔ کہتا ہے شکر کرو مل تو گیا ہے نا، اب شکوے چھوڑو اور برسنا شروع ہو جاؤ۔ خوشبو بن کر اس کے وجود میں سما جاؤ اور واقعی ہم ایسے ہی بن گئے۔ ٹائٹل سے برسنا شروع کیا۔ صنفِ نازک کا کومل وجود دلکشی میں اپنی مثال آپ تھا۔ ساتھ میں پریمی جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ لیے نئی منزل کی طرف گامزن تھا۔ دعا ہے کہ یہ ہماری طرح بھٹکتے نہ پھریں۔ پستول نما صنفِ کرخت فل ایکشن میں نظر آئے۔ اپنی محفل کی طرف جانا ہمیں بھی اچھا ہی لگتا ہے۔ اچھی چیزیں ہی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ بہت خوب صورت بنا دیتی ہیں۔ زویا اعجاز کو بھرے پرے گراؤنڈ میں کنٹری کرتے پایا۔ وہ بھی سب سے اوپر کے کنٹری بکس میں۔ آپ کی کنٹری اچھی لگی۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے جب دل پر اداسی کے بادل ہوں تو چیزیں اور ماحول اچھا لگتا ہے۔ اس ماہ 3 لائن کے تبصرے زیادہ تھے مایوسی ہوئی، اس دفعہ کوئی بھی تبصرہ خاص نہ لگا۔ اسی مایوسی کو دور کرنے کے لیے ہم حاضر ہوئے ہیں آپ کے در پر... اور در پر آنے والوں کو خالی ہاتھ نہیں بھیجتے پیارو۔ تنویر ریاض نے اس دفعہ ہیرو کے ساتھ حاضری دی۔ جوش نے اپنے باپ کو بچانے کی خاطر بہت اچھا اقدام کیا۔ کیونکہ جب باپ زندہ رہے تو گھر آباد رہتا ہے۔ ایسی ہی قربانیاں ہمیں دوسروں کی نظروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور کاموں میں بہت زیادہ خوشیاں موجود ہیں فرق صرف انہیں کرنے، برتنے اور محسوس کرنے کا ہے۔ گم شور ثبوت، جس طرح اچھائی کے ساتھ برائی ہوتی ہے، منفی کے ساتھ مثبت ہوتا ہے اسی طرح انسان کی عقل مندی کے ساتھ بے وقوفی بھی پائی جاتی ہے۔ مسز اور مسٹر ایڈورڈ نے اپنی عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ مگر بے وقوفی کو وہ بھول ہی گئے تھے جو بظاہر تو چھپی ہوتی ہے۔ پر اینڈ ٹائم اور خاص ٹائم پر ظاہر ہو کر مجرم کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ بعض دفعہ انسان اپنی ہی کمزوری اور عادت کی وجہ سے مار کھا جاتا ہے۔ انکشاف کہانی بھی انسان کی ایسی ہی ایک عادت اور کمزوری کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ سارنگ کا تکیہ کلام ہی اسے لے ڈوبا اور انکشاف بھی ہوا، اس حقیقت کا کہ بھتا خوری کا رجحان کافی پرورش پا چکا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ دیرینہ خواہش، اکثر ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم کرنا چاہتے ہیں اور اکثر وہ نہیں نکلتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ یہاں بھی ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ چھوٹی سی غلطی... وہ چنگاری کا کام کرتی ہے جو آگے چل کر الاؤ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کی حاضری ہوئی۔ جولی جو کچھ جان کو دکھا رہی ہے اور جو واقعات پیش آ رہے ہیں وہ ویسے ہیں جیسا دکھائی جا رہی ہے اور ساتھ دماغ کی کرشمہ سازیوں نے بھی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ایسی حیرت انگیز سوچ کی حامل تحریر پہلی مرتبہ پڑھنے کو ملی جہاں اینڈ تک محظوظ ہوتے رہے۔ اینڈ کافی اچھا اور خوب صورت رہا۔ جولی اپنی دولت بٹور کر یہ جا وہ جا

ہوگئی۔ اقبال کاظمی کا شاہکار پڑھا۔ نفرتیں بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں محبتیں بھی دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ لالچ بھی دل میں پیدا ہوتا ہے اور یہ لالچ دولت کا ہو تو پھر آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی چھا جاتا ہے اور اندھیرے میں اپنے پرائے کی پہچان نہیں رہتی۔ فورڈ نے بھی دولت کی خاطر گھناؤنا کھیل کھیلا، پر حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسے کھیلوں کا انجام ایسا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ آصف ملک فسادِ خون کے ساتھ حاضر تھے۔ تالاب میں ایک گندی مچھلی کی وجہ سے پورا تالاب گندا ہوتا ہے۔ نفسیات زن میں عورت کی نفسیات کی عکاسی کی گئی تھی۔ کافی عمدہ طریقے سے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ نفسیات جاننے والا بھی سب پر بھاری ہوتا ہے۔ آوارہ گرد پر پہنچے جہاں ستارہ بیگم سازش کا شکار ہو کر راہی عدم ہو چکی ہے۔ چودھری ممتاز کی خباثتیں جاری ہیں۔ کہانی میں ٹھہراؤ کے ساتھ واضح تبدیلی کافی اچھی لگی۔ دن بدن بہتری کی جانب گامزن سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ رنگوں میں نیلی موت وطن پرستوں کے لیے اچھی کاوش تھی۔ اپنی قیمتی چیزوں کی حفاظت نہ کرنا ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے اور اپنے وطن کی ایسی نادر قیمتی چیزیں لوٹنے میں ہمارے بڑے بھی شامل ہیں کیونکہ جس کا بھی ضمیر مردہ ہوتا ہے وہ سیاست میں آ جاتا ہے۔ سبز دروازہ، سراغ رسی سے بھرپور بہترین اسٹوری تھی۔ دوسرا رنگ پڑھا۔ دولت کی فراوانی سے ہمیشہ انسان کے اندر اچھائی بھی پیدا ہوتی ہے اور برائی بھی۔ کچھ انسان بھٹک کر اس سے غلط راستے کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں اور کچھ اچھے راستوں کی طرف۔ سیما کا کردار بھی ایسا ہی تھا۔ محبت بھلا کہاں پیسوں سے خریدی جا سکی ہے یہ تو مقدر سے حاصل ہوتی ہے اور مقدر انسان خود بناتا ہے اپنے عمل سے۔ مجموعی طور پر مارچ کے جاسوسی نے کافی متاثر کیا۔"

واہ کینٹ سے **بلقیس خان کے دل کی باتیں** "ذاکر جی! عبادت کاظمی، احسان سحر، محسن علی طالب یا عبدالجبار رومی جیسا سوہنا منڈا کوئی نہیں ملا تھا آپ کو جو حسنِ سوگوار کے ساتھ پستول بدست معراج محبوب سنیاسی کو لا کھڑا کیا اور محترم کا انداز تو دیکھیں، گولی چلانے کے لیے دوسروں کا کندھا وہ بھی زنانہ۔۔۔۔ دوسری جانب پڑوسن سے بیزار اور جہانوں کے طلب گار نئی داستانوں سے سرشار شاہ صاحب اس بار جل دینے میں کامیاب رہے۔ پکڑائی نہیں دی۔ یعنی ہاتھ کر گئے۔ مگر ہمارے ذاکر صاحب بھی پکے چھاپا مار ہیں آخر کار حسینہ بدست ہاتھ چھاپ ہی لیا۔ گوری کلائی بتا رہی ہے نئی داستاں لاجواب ہوگی۔ محفل میں داخلے سے پہلے جان کاری ہوگئی کہ ہر بار کی طرح زویا اعجاز قطعی غیر جمہوری انداز اپنائے، عزیز ہم وطنو! والا اسٹائل، ایوانِ صدر پر قبضہ کر چکی ہیں اور غرور کے بخار میں جتلا ورلڈ کپ سے پہلے فائنل کھلانے کے چکر میں ہیں۔ طاہرہ گلزار! میری چھوٹی بہن، آپ سمیت تمام مخلص بہن بھائیوں کی دعائیں باریاب ہوگئیں، میری بہن کو صحت ملی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ سجاد خان! اپنے تمام قیدی بھائیوں کے نثار، بھاری ہاتھ صرف ان کے لیے ہے جن کو شرافت راس نہیں آتی۔ سید شکیل کاظمی! آپ نے ایک بار خطوط یا کہانیوں کی یکسانیت کے متعلق لکھا کہ ایسی تحریریں عدم دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ میں آپ ہی کے فرمان پر عمل کر رہی ہوں۔ قلم پر تو گرفت آپ کی ہے۔ ہم کہاں اور آپ کہاں۔ عبدالجبار رومی! آپ نے تمام ساتھیوں کو خوش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بشریٰ افضل! یہ خط میں نے تمہارے لیے لکھا ہے، تم سمجھتی ہو کہ صرف تم غم زدہ ہو باقی لوگ خوش ہیں تو ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں اپنے غم کی صرف اللہ ہی سے شکایت کرتی ہوں۔ صرف تمہاری وجہ سے سب سے شیئر کر رہی ہوں۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق فاٹا سے ہے اور ہمارے مطلق جاہل قبیلے کی معلوم پشتوں میں کوئی قتل نہیں۔ لیکن میرے پڑھے لکھے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا۔ یہ اکتوبر 2010ء کی بات ہے، ان دنوں اسما قادری کی تحریر گرداب چل رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے 17 اکتوبر کو میں نے رسالہ خریدا اور سب سے پہلے گرداب کو پڑھا، اس میں مرکزی کردار آفتاب کے دوست افضل خان کا قتل ہوتا ہے۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ میرے بھائی افضل خان کے قتل کی پیش گوئی ہے۔ 29 اکتوبر کو افضل خان کا ہم نام میرا پیارا بھائی ڈاکٹر افضل خان مریم اسپتال (راولپنڈی) سے گھر جاتے راستے میں قتل کر دیا گیا۔ وہ اتنے مشکل دن تھے، میرا رابطہ اپنے پروردگار سے بھی ٹوٹ گیا۔ مجھے ہر شخص پر اپنے بھائی کے قاتل کا گمان ہوتا، افضل خان سب سے چھوٹا تھا۔ لاڈلا ہونے کے ناتے طبیعت میں بچگانہ پن تھا۔ فرضی کالر جھاڑ کر کہتا پاکستان کی 16 کروڑ آبادی میں صرف 10 لڑکے ہیں (امتیازی نمبر لینے پر) جن میں ایک تمہارا بھائی ہے۔ میرے دوسرے بھائی جو ایک معروف اشاعتی ادارے میں کلیدی عہدے پر تھے انہوں نے آئی ایس آئی کی خدمات لیں لیکن یہ ایک اندھا قتل تھا بعد میں پتا چلا کہ مارنے والے طاقت ور لوگ تھے۔ میرے بھائی اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ اسی غم میں ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے دو جوان بیٹوں کی موت نے میری والدہ کا ذہنی توازن الٹ دیا اور ہم بہنیں فشارِ خون اور شوگر کے امراض سے دوچار ہوگئیں۔ میرے مزدور باپ کے یہی دو قابل بیٹے تھے جو پورے کنبے کی کفالت کرتے تھے۔ تو بشریٰ افضل! ہم سب اپنے اپنے دکھوں کی صلیب اٹھائے رشتوں کے ہجوم میں تنہا کھڑے ہیں۔ موت اٹل سچائی ہے، ہم ہی انجان ہیں جو عارضی ٹھکانے سے دل لگا بیٹھے پھر کیوں نہ خوش رہا جائے اور دوسروں کو بھی خوش رکھا جائے۔ کہانیوں میں صرف نیلی موت کے دائٹر پر بات کروں گی جو ڈاکٹر شیر شاہ سید کی طرح اپنے حصے کا چراغ جلا رہے ہیں۔ منظر امام جیسے چند سچے موتیوں جیسے لوگ اس دنیا کے قائم رکھنے کا سبب ہیں ورنہ یہاں عوام و خواص ایک جیسی فطرت رکھتے ہیں۔"

کراچی سے **ادریس احمد خان کی تعریفیں** "جاسوسی قدرے تاخیر سے ملا۔ حسبِ سابق رنگوں میں سجا سرورق خوب سے خوب تر تھا۔ اندرادارے سے مستفیض ہوئے، چیں بہ جبیں نکتہ چینی میں سرِ فہرست زویا اعجاز تھیں۔ حسبِ روایت مبارک باد قبول کریں۔ خطوط میں نئے شامل ہونے والے زیادہ تھے۔ اپنی حاضری کا نامہ نظر نہیں آیا وہ شاید پوسٹ آفس والوں کی کوتاہی کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ آگے بڑھے اور سب سے پہلے سرورق کی کہانی دامِ تزویر پڑھی جو کاشف زبیر کی تحریر تھی، پسند آئی۔ دوسری تحریر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد تھی جو دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے اور پڑھنے میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ اور کسی چیز کا خیال نہیں رہتا جب تک تحریر ختم نہ ہو جائے۔ بہت خوب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب! تیسری تحریر جواری تھی جو آخر کار ختم شد ہوگئی۔ بہرحال اتنی مقبولِ عام نہ ہو سکی اس سے پہلے کی تحریروں کے مقابلے میں۔ تنویر ریاض کی ہیرو بھی اچھی تحریر تھی۔ پُرشور ثبوت میں مارٹی بوائل نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے کریگ ہومر کی قاتل ایڈورڈ براؤن کی بیوی کو پکڑ لیا اور مہارت کی وجہ سے قاتل کا پتا چل گیا۔ فسادِ خون نے بھی متاثر کیا۔ جہانزیب نے انتہائی سوچ اور تدبر سے کام لے کر خاندانی دشمنی کا سدِ باب کر دیا اور آئندہ کے لیے دشمنیوں کا تدارک کر دیا۔ انکشاف بھی بہت اچھی ثابت ہوئی جو آج کل کے حالات پر مبنی اچھی کہانی تھی جس میں عبرت کا بھی عنصر بدرجہ اتم تھا۔ دیرینہ خواہش بھی بہتر تحریر تھی۔ سبز دروازہ اور خاص کر نفسیات زن بہت دلچسپ تھیں۔ ترکہ اوباش بھی

قابلِ توجہ رہیں۔ اوسکر نے صحیح سوچا کہ آئندہ کے لیے محتاط ہو گیا۔ آخری مات بھی خوب تر تھی۔ الٹی تدبیر میں بیوی کے لیے گڑھا کھودنے والا شوہر خود ہی بیوی کے ہاتھ موت کا شکار ہو گیا۔ کٹر نیم بھی بہت پسند آئیں۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں حسبِ روایت بہت خوب صورت اور اثر انگیز رہیں۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی ریاضت ''یکم مارچ سے انتظار شروع کر دیا تھا لیکن جاسوسی بھی کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح پورے دس دن لیٹ ملا۔ 10 کو ہمارے ہاتھوں میں جاسوسی آیا اور 11 کو کزن کی مہندی تھی تو پورے دن جاسوسی میں غرق رہے۔ سرورق کافی دلکش تھا۔ ایک خوب صورت نازک اندام حسینہ سائڈ پوز میں کسی کو شوٹ کرنے کا آرڈر دے رہی تھی اور اوپر سے ہاتھوں میں ہاتھ، ہائے کیا کچھ یاد آ گیا۔ زویا اعجاز درست فرمایا، پہلی دفعہ آپ کی بات پر داد دینے کو دل چاہا۔ واقعی انسان تو ایک کھلونا بن کے رہ گیا ہے۔ بشریٰ افضل بہنا آپ کی بہن کی ڈیتھ کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے۔ وڈے شاہ جی شکیل جہانوں کو چھانتے چھانتے آپ کی عمر نہ بیت جائے۔ سجاد خان آف موچھ ویلکم بھائی۔ عرصے کے بعد بلقیس کی آمد اچھی لگی۔ طاہرہ گلزار اور نادر سیال کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے موسٹ فیورٹ آوارہ گرد پڑھی۔ میڈم زہرہ اور لئیق شاہ غالباً مل نہیں پائیں گے۔ کہانی میں ٹوئسٹ آیا ہے۔ جواری کی آخری قسط دیکھ کر جھٹکا لگا لیکن کہانی پڑھنے کے بعد اور بڑا جھٹکا لگا، نورین کہاں گئی، کچھ سمجھ نہیں آیا۔ سلونی اور رنگیلا کہاں گئے۔ احمد صاحب نے کہانی کو جلدی میں سمیٹ لیا لیکن کرداروں کو واضح نہیں کیا۔ لگتا ہی نہیں یہ احمد اقبال صاحب کی کہانی تھی، اینڈ بالکل اچھا نہیں ہوا۔ خیر مریم کے خان آئی تے چھا کر کے چھا گئی بہت اعلیٰ۔ لذتِ آزار گھر سے نکلنے والی لڑکی کی عزت دو کوڑی کی ہو جاتی ہے، سبق آموز تھی۔ نیلی موت اچھی تھی سیکار تے کے کردار کی سمجھ نہیں آئی۔ اقبال کاظمی کی کہانی نے مزہ دوبالا کر دیا۔ باقی تحریروں میں انکشاف اور ہیرو اچھی لگی۔''

میانوالی، کندیاں سے نادر سیال کے اقوال ''جاسوسی نے 10 مارچ کو ہماری دہلیز پہ قدم رکھا۔ اس بار آپ نے بڑا انتظار کروایا یار۔ ٹائٹل گرل اس بار پھر بازی لے گئی اور ساتھ میں بیٹھے شخص نے پتا نہیں کس کا نشانہ لیا ہے یہ تو ڈاکر انکل ہی جانیں۔ زویا اعجاز جی مبارکاں، مبارکاں۔ رہی بات ورلڈ کپ کی تو آپ کی بات میں کافی وزن تھا زویا جی، آپ بھی آج کل مصباح جیسے اسٹروک کھیل رہی ہو۔ پری زے خان کراچی ہم کو بھلا آپ کے نام کا کیا پتا، آپ کیا بے نظیر کی سیکریٹری تھیں یا دھرنوں میں خطاب کیا کرتی تھیں۔ عثمان ارشد ہم کو بھی اسی قسم کی شکایت ہے، ہم کو تو 8 یا 10 تاریخ سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ بشریٰ افضل اللہ پاک آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ سب صبر دے آمین۔ عبدالجبار روی انصاری اس بار آپ پورے خط میں عاشق مزاج میں تھے۔ حاجی حسین کاظمی صاحب ادارے والوں نے تو آپ کو نظر انداز نہیں کیا لیکن آپ نے جاسوسی کو لفظوں میں نظر انداز کر دیا۔ محمد مرتضیٰ احتشام چلو جاسوسی کی وجہ سے آپ کی آپ کے گھر والوں کے سامنے تھوڑی عزت میں اضافہ تو ہوا۔ ہارٹ کیجر جناب تھوڑا ہتھ ہولا رکھ یار، کہیں ایسا نہ ہو کہ منہ کی کھانی پڑ جائے۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان اس بار آپ اپنی ہی تعریف کرتی نظر آئیں، آپ لڑکیاں کیوں اپنی آپ تعریفیں کرتی ہو؟ (آپ لڑکی بن جاؤ، معلوم ہو جائے گا) صنوبر گل خان ایڈووکیٹ صاحب آپ کے قلم سے بہت اچھے لفظ نکلتے ہیں۔ ساہیوال محسن علی طاب، ارے او بھائی آپ کون سی دنیا میں رہتے ہو اس دنیا میں اچھے انسان بھی ہیں اور برے بھی۔ سید عبادت کاظمی اس بار میری طرح آپ بھی جلدی میں تھے؟ ماریہ خان ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی کوشش کرنا اچھی بات ہے۔ شکیل کاظمی آپ نے صحیح فرمایا ہم سب کو دکھ ہوا پڑھ کر۔ مثال اور نوال کی کوششیں بھی اچھی تھیں۔ باقی طاہرہ گلزار، جناح پیرزادہ ان سب کے تبصرے اچھے تھے اور اس بار نئے نام بھی کافی پڑھنے کو ملے جس کی وجہ سے ہمارے خط کو کاٹ کر شائع کیا گیا جو اچھی بات نہیں ہے۔ (کیوں اچھی بات نہیں، نئے دوستوں سے نئی ملاقات اچھی نہیں لگی؟) کہانیوں میں آوارہ گرد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی بہت زبردست جا رہی ہے، ہمیں تو لئیق شاہ کا ماضی جاننے کی بے قراری تھی لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ کمیل دادا کا بھی کردار وہیں سے شروع ہوتا ہے، بہت زبردست۔''

کبیر والا سے ماریہ جہانگیر مرالی کا عذر ''اس ماہ جاسوسی ڈائجسٹ خلافِ توقع اور خلافِ معمول خاصی تاخیر سے یعنی آٹھ مارچ بروز اتوار کو موصول ہوا۔ بارش اور دھوپ کے امتزاجی موسم نے جاسوسی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ بزمِ یاراں میں زویا اعجاز کرسیٔ صدارت پر براجمان تھیں۔ میرا اور میرے چاچو، مہر محمد شفقت کا احوال نامہ اوپر تلے ہی درج تھا۔ جن ساتھیوں نے مجھے ویلکم کہا ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس مرتبہ محفل میں نئے تبصرہ نگاروں کی شرکت زیادہ تھی۔ یہ پرانے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ بشریٰ افضل آپ کی بہن کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ ماریہ خان، آپ کی طرح ہمیں بھی یہی خدشات لاحق رہتے ہیں۔ صنوبر گل خان ایڈووکیٹ، آپ کی طرح ہم بھی ادبی ذوق رکھنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر تبصرہ نگار، اپنی عمر بھی رقم ..... کریں تو تنقید و توصیف کرتے ہوئے کسی کی شان میں گستاخی نہ ہونے پائے۔ آوارہ گرد اس بار بھی بیگم صاحب کے پُر پیچ ماضی کے گرد محوِ سفر رہی۔ جواری بالکل غیر متوقع طور پر بہت جلد انجام پذیر ہو گئی۔ سرورق کا پہلا رنگ نیلی موت ایک دلچسپ کہانی تھی، لیکن انجام سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر وہاں سے نکلنا اتنا ہی آسان تھا تو یہ کام پہلے کسی نے کیوں نہیں کیا۔ سرورق کا دوسرا رنگ لذتِ آزار کافی شناسا سی لگی۔ شاید اسی قسم کی کوئی کہانی پہلے بھی آ چکی ہے۔ مختصر کہانیوں میں اوباش، الٹی تدبیر اور نفسیات زیرِ پڑھی۔ وقت کی قلت کے باعث باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔''

گوجرانوالہ کینٹ سے آصف محمود کے خیالات ''مارچ 2015ء کا جاسوسی 6 تاریخ کو میرے ہاتھوں میں جلوہ افروز ہوا۔ سرورق اچھا تھا مگر کلر ڈم تھے۔ سب سے پہلے آوارہ گرد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی سلسلہ وار پڑھی۔ نہایت اچھا اندازِ تحریر ہے۔ شہزادشہزی کے بجائے لئیق شاہ، کمیل دادا، زہرہ بانو نے کرداروں میں جان ڈال رکھی ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ دامِ تزویر کاشف زبیر اور نیلی موت منظر امام بلذتِ آزار مریم کے خان،

اعتذار

چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس ماہ "انگارے" کا سلسلہ شروع نہیں کیا جا سکا۔ اس کی اشاعت سے قارئین کو ان شاء اللہ پیشگی آگاہ کر دیا جائے گا۔

پُرشور ثبوت. جمال دستی اچھی تحریریں ہیں۔ باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔ میں عرصہ 35 سال سے جاسوسی، سسپنس ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں۔ اب تو نگاہ بھی کام نہیں کر رہی ہے۔ مگر بار بار ایک ہی مصنف کی لکھی گئی کہانیاں سلسلہ وار پڑھ کر بے حد غصہ آتا ہے۔ اب جواری کو ہی لے لیجیے، کیا آپ نے اس کا آخری حصہ پڑھا ہے، نا ئیں نا ئیں فش؟ یہ معلوم ہوا ہے کہ چینی نکتہ چینی میں کہانیوں پر تبصرہ کم اور آپس کی چونچیں لڑنا زیادہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب! جاسوسی کا معیار گرتا جارہا ہے۔ بدیسی کہانیاں کم کی جائیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ سلسلے وار کہانیوں کا انتخاب مار دھاڑ، تجسس، سسپنس، تھرل اور تیز تر واقعات پر مبنی ہوں۔ سلسلے وار جواری، کشکول، واپسی وغیرہ جیسی کہانیاں جاسوسی ڈائجسٹ کے شایانِ شان نہیں ہیں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی تفصیلی باتیں "مارچ کا جاسوسی 4 مارچ کو پاکستان کی دوسری جیت پر موصول ہوا۔ مزہ دوبالا ہو گیا اور اب جنوبی افریقہ جیسی ٹیم کو زیر کر کے ہمیں خوشی دی۔ جیو پاکستان کرکٹ ٹیم، اسی طرح لگن اور محنت سے کھیلو اور جیتو ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سرورق کو خوب صورت ماڈل پسٹل پکڑے مرد اور اوپر سے ایک صنفِ وجاہت اور صنفِ نازک کا ہاتھ آپس میں ملا کر بتایا گیا کہ دنیا کی رونقیں آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن کوئی کچھ نہیں اکیلا۔ مل کر ہی زندگی ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ رشوت ہی تمام تر فساد کی جڑ ہے اگر یہ رشوت ختم ہو جائے اور ہمارا پولیس کا محکمہ ٹھیک ہو جائے تو ملک میں امن ہی امن ہو جائے۔ اپنی محفل میں آئے تو محترمہ زویا اعجاز صاحبہ کو بہترین کنٹری کرتے پایا گیا، مبارک ہو جی۔ سید عبادت کاظمی جنرل سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے موجود۔ کبیر والہ سے ماریہ جہانگیر مرالی اینڈ مہر شفقت مرالی کی اچھی کاوش۔ پری زے خان کا تبصرہ بھی عمدہ ہے، آتے ہی چھا گئی لڑکی۔ جی طاہرہ گلزار یہاں ہم کراچی چلے گئے ہیں۔ بشریٰ افضل ایسی کیا مایوسی، دکھ اور سکھ تو زندگی کا حصہ ہیں۔ باقی آپ تو ادارے کی بہت پرانی تبصرہ نگار ہیں، آپ اور تفسیر عباس بابر کا تبصرہ 2001ء کے سرگزشت میں پڑھا ہے پچھلے دنوں، آپ تو ادارے کے لیے فخر کا باعث ہیں۔ سید شکیل کاظمی صاحب اور ماریہ خان کے اسلام آباد سے اچھے تبصرے۔ لیہ سے صنوبر گل خان بھی درست فرما رہی ہیں۔ مظہر سلیم بھائی مختصر تبصرے کے ساتھ موجود۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی قابلِ تحسین ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ جہاں بیگم صاحبہ اپنے ہونے والے ظلم کی داستان بیان کر رہی ہیں۔ احمد اقبال کی جواری پر پہنچے، پہلے تو پتا نہیں چلا کہ آخری قسط ہے یہ تو درمیان میں جا کر پتا چلا کہ کہانی کی آخری قسط ہے، بہت سے نشیب و فراز سے گزرتی فرید کی زندگی جیت گئی، نادر ہار گیا۔ سکندر شاہ بھی بے آسرا ہوا، اتنی دولت کے باوجود کہانی کا اینڈ بہترین طریقے سے کیا گیا۔ کاشف زبیر مغرب کی دنیا سے دامِ تزویر لائے، کس چالاکی سے جولی نے سب کو مات دی اور اپنے باپ کی وراثت تک پہنچی اور اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ انسانی دماغ سب سے تیز ہے۔ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تنویر ریاض کی ہیرو بھی گزارہ کر گئی۔ جمال دستی کی پرشور ثبوت مارٹی کی ذہانت نے جلد ہی قصہ نمٹا دیا۔ فسادِ خون لے کر آئے آصف ملک جس میں جہانزیب نے احسن طریقے سے دشمنی ختم کی لیکن باپ اور بہنوئی نے برا کیا۔ شازلی سعید مغل کی انکشاف یعنی کہ بھتا نہیں دیا تھا اور اسے بھولا ہوا بھی تھا۔ شجاعت کی ذہانت کہ وہ آواز پہچان گیا اور سارنگ کو اس کا تکیہ کلام مروا گیا۔ بابر نعیم کی دیرینہ خواہش میں لگتا تھا کہ لیئی کو اس کا فیجر ہی چونا لگا گیا۔ سبز دروازہ بھی گزارہ کر گئی۔ میمونہ عزیز کی نفسیاتِ زن جونسن کی نصیحت پر عمل کر کے ملزم تک پہنچا۔ عکس فاطمہ کی ترکہ میں بھائی اپنی بہن پر بہت بڑا احسان کر گیا مرتے مرتے بھی لیکن پولیس والوں نے دو نمبری کی۔ سلیم انور کی او باش ڈیوڈسن بہت اعلیٰ طریقے کے ساتھ قاتل تک پہنچا اور جاتے جاتے لڑکی کا بھی بھلا کر گیا۔ اقبال کاظمی کی آخری مات میں جون اوسکر مار کھاتا گرتا گراتا آخر کار مجرم تک جا پہنچا اور فورڈ نے منصوبہ تو لاجواب بنایا تھا پر اوسکر بازی لے گیا۔ منظر امام نیلی موت لے کر آئے۔ کیسے کیسے غدار اور ناسور لوگ پڑے ہیں۔ مریم کے خان کی لذتِ آزار بھی بیسٹ رہی۔ عمران نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ سینا کو بھی سیدھی راہ دکھا دی۔ کترنیں بھی مزہ کر گئیں۔"

ساہیوال سے محسن علی طاب کی رائے "جاسوسی مارچ 2015ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل کہانیوں کی مناسبت سے موزوں تھا۔ میرا خط شامل کرنے پر شکر گزار ہوں اگر آپ میرا خط شائع کریں گی تو ہر ماہ تبصرہ ارسالِ خدمت کر دیا کروں گا۔ خطوط میں زویا اعجاز، جناح پیرزادہ، سید شکیل، بلقیس خان اور عبدالجبار صاحب چھائے ہوئے تھے۔ دامِ تزویر ایک ایسی تحریر تھی جو ثابت کر رہی تھی کہ انسان اپنی ایجادوں کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ صلاحیت خاص ترین لوگوں میں ہی موجود ہوتی ہے۔ فسادِ خون، زن زر کے لیے اپنا خون بھی سفید ہو جاتا ہے۔ غیر تو دور کی بات ہے۔ انکشاف میں مخدوم حسین کا کردار پسند آیا، بے شک مختصر تھا۔ آوارہ گرد اچھی جا رہی ہے۔ جواری کا اینڈ ٹھیک نہیں یہاں تک کہ یہ کہانی اور آگے بڑھ سکتی تھی پھر اچھا اینڈ ہوتا۔ منظر امام بے شک اچھی تحریر لائے مبارک باد۔ ہمارے ملک میں ہر چیز ممکن ہے ہم تو غیر ملکوں کے افراد کو ویزا اور ہر چیز فراہم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہودی، عیسائی دونوں مسلمانوں کے خلاف دو ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ لڑکیاں اور ڈالر۔"

لاہور سے زویا اعجاز کی حاضری "ماہِ مارچ میں جاسوسی کے انتظار کا تناسب ہمیشہ ہی زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اس سال بھی یہ روایت قائم رہی اور قبر جاسوسی 6 مارچ کو طلوع ہوا۔ ٹائٹل جاسوسیت اور رومانویت کا بہت ڈیسنٹ کمبی نیشن لیے ہوئے تھا۔ اداریہ رشوت زنی کی لعنت سے نبرد آزما نظر آیا۔ یہ مرض تو گویا ہمارا قومی روگ بن چکا ہے۔ محفل میں شرکا کی حاضری معمول سے زیادہ تھی جو کہ ایک اچھی علامت ہے۔ پری زے خان کی پروازِ تخیل شاندار تھی۔ اسد عباس کے چشمے کا نمبر شاید بڑھ گیا ہے ورنہ انہیں علم ہو جاتا کہ ہم نے تبصروں اور تحریروں کا یکساں پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ طاہرہ گلزار! آپ پر کچھ لکھنے کی تاب ہم خود میں نہیں پاتے۔ وڈے شاہ جی آج کل بڑوں اور شیکسپیئر کے بغیر ہی انٹری دے رہے ہیں۔ مظہر سلیم اس بار شاید بہت عجلت میں تھے۔ کاشف عبید، ماریہ خان، مشال اور نوال کے حسنِ نظر کا شکریہ۔ بلقیس خان کے بقول ان کی سمجھ کا خانہ خالی ہوتا ہے۔ تو اس خالی ظن کے لیے ہم اپنے الفاظ کا ضیاع کیونکر کریں؟ نادر سیال! آپ کی نادر سمجھ داری کے بارے میں یہی کہیں گے کہ دیر آید درست آید۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر حسبِ روایت ایک شاہکار لے کر آئے۔ ان کی ہر تحریر ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں ہم۔ تجسس، منظر نگاری، مسٹری سے بھرپور یہ تحریر اسٹوری آف دی منتھ کے تاج سے مزین ہونے کے قابل ہے۔ سرورق کے دونوں رنگ اس بار عمدہ تھے۔ نیلی موت پاک سرزمین کو پیرا سائٹس کی طرح چمٹے عناصر کی عکاسی اور اربابِ اقتدار کی بے حسی کا نوحہ

تھی۔ جدید سائنسی علوم سے دوری نے ہمیں پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔ اختتام بہرحال مزید بہتر ہوسکتا تھا۔ لذتِ آزار نفس کی کارستانیوں کا شاخسانہ رہی۔ نفس کو اگر ایک بار آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ بے لگام گھوڑے کی طرح تباہی و بربادی کی داستانیں رقم کرتا ہے۔ عمران کے کردار کی مضبوطی اور رخسانہ کا راہِ راست پر آنا بہت متاثر کن تھا۔ جواری کا اختتام بہت بے ربط لگا۔ کہانی میں کئی پہلو تشنہ رہے۔ نادر شاہ کو پہلی قسط سے ایک ہوا بنا کر پیش کیا گیا تھا مگر اس کی گمنام اور غیر واضح موت بالکل بھی پسند نہ آئی۔ آوارہ گرد میں ماضی کی بھول بھلیاں بے حد دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ جاپانی ادب سے برآمد شدہ سبز دروازہ ایک پُرتجسس کاوش ثابت ہوئی۔ فسادِ خون میں باپ کے ہاتھوں اولاد کا قتل حرام اور قربِ قیامت کی نشانیاں ہی قرار دی جاسکتی ہیں۔ پُرشور ثبوت، دیرینہ خواہش اور ہیرو کے اختتام بہت حیران کن تھے۔ نفسیاتِ زن میں خواتین کی نفسیاتی منظر کشی تو عالمگیر سچائی تھی۔ انکشاف میں ایک اچھے موضوع کے ساتھ بالکل انصاف نہیں ہوسکا۔ ترکہ اور اوباش مغربی قانون ساز اداروں کے مثبت پہلو سامنے لائیں۔ ہمارا قانونی نظام تو مجرموں کو تائب ہونے کے بعد عزت دار واپسی کا کوئی رستہ نہیں دیتا اور مجرموں کے رشتے داروں کو رگیدنا بھی فرضِ عین سمجھا جاتا ہے۔ الٹی تدبیر نئی پیکنگ میں پرانا سامان ثابت ہوئی۔

کوئٹہ سے **سیف اللہ خان** کی ہمت و شجاعت ”تمام تر معروفیات، مصلحات اور... چشم پوشیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بار ہم نے تبصرہ لکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا، اس لیے 8 مارچ کے گرجتے برستے موسم کو خاطر میں لائے بغیر جاسوسی کو حاصل کرنے چل پڑے۔ موسلا دھار بارش اور تیز ہواؤں کے ایڈونچر کے اختتام پر جاسوسی ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ ذاکر انکل کے بنائے ہوئے ملے جلے تاثرات اور خوب صورت حسینہ نے ٹائٹل کو خواب ناک سا بنا دیا تھا۔ انٹری نمبرون پر زویا اعجاز کی کنٹری چل رہی تھی۔ زویا جی آپ کے انکل کی وفات کا پتا چلا، اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ پرویز خان کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ صفدر معاویہ محفل میں آپ کی مسلسل موجودگی نے ہمیں بھی شہ دی ہے۔ بشریٰ افضل اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ طاہرہ گلزار ادارے والوں کو آپ نے کون سی دعا دی، اس کا ذکر نہیں کیا آپ نے! اشکیل صاحب اک نئے جہاں کی تلاش میں نظر آئے۔ مظہر سلیم، بلقیس خان اور اسد عباس نے بھی خوب لکھا تھا۔ انکل سیانے اور تنفیر صاحب کی کمی بہرحال محسوس ہوئی۔ کاشف زبیر کی تحریرِ دام تزویر اچھوتے موضوع پر لکھی گئی ایک لاجواب تحریر ثابت ہوئی جس نے دوسرے پیراگراف سے ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جولی نے جان جیسے ماہر نفسیات کو اس کے جدید آلات اور سافٹ ویئر سمیت ٹریپ کر کے قدرت کی وہ بالادستی دکھا دی جسے تسلیم کرنے سے انسانیت ہمیشہ گریزاں نظر آتی ہے۔ جواری کا جوا اختتام پذیر ہوا، نورین جس کے طمن کی آس میں ہم جیسے تیسے کر کے کہانی پڑھ رہے تھے لیکن احمد اقبال صاحب نے اسے صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ آوارہ گرد میں ڈاکٹر صاحب مزید دلچسپی پیدا کر رہے ہیں۔ سبز دروازہ میں ہیر بنارامن نے اس تاثر کی بالکل نفی کر دی کہ ایک اچھا رائٹر کبھی بھی اچھا سراغ رساں نہیں بن سکتا۔ نیلی موت میں منظر امام نے اس بار کافی مایوس کیا۔ تاہم مریم کے خان کی لذتِ آزار اور اقبال کاظمی کی آخری مات دل موہ لینے والی تحریریں تھیں۔

بنوں سے **محمد ہمایوں سعید** کی جلد بازی ”جاسوسی گاؤں جانے سے پہلے ملا تو خوشی دوبالا ہوئی کہ اب سفر میں بور نہیں ہوں گا مگر یہ خوشی اس وقت کافور ہوئی جب عین ہیر ودھائی موڑ پہنچ کر یہ جان لیوا انکشاف ہوا کہ جاسوسی تو روم میں ہی رہ گیا ہے۔ ٹیکسی والے کو ڈھائی سو پہ راضی کیا اور گھنٹے بعد جب واپس پہنچ کر اترا تو انکشاف ہوا کہ گاڑی نکل چکی ہے، اگلی رات گیارہ بجے جائے گی۔ اس صدمے سے سنبھلے نہیں تھے کہ سامنے ہی ایک رسالوں سے بھری سائیکل کی ٹوکری پہ پہلے جاسوسی کو دیکھ کہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ پٹھانوں پہ اتنے سارے جوکس بلاوجہ نہیں بنے۔ پاکستانی کرکٹ کے بخار سے ابتدائی دو میچز کے بعد بھلے چنگے ہو چکے تھے مگر پی کے کی پیش گوئی کی لاج رکھنے والے سرفراز نے دھوکا نہ دے کر مینجمنٹ کا منہ کڑوا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں دوبارہ بخار چڑھا دیا ہے۔ محفل میں گھستے ہی سنجے منجریکر کی سی آواز اور ولولے میں پُرجوش کنٹری کانوں میں پڑی۔ جس کے بعد کان پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہوئی۔ عبادت صاحب آپ کے شمارے میں کوئی مینوفیکچرنگ خرابی آئی ہوگی ورنہ باقی شماروں میں میرا تبصرہ نہ کہیں سے جلا ہوا ہے نہ کٹا ہوا۔ محسن علی لاعلمی نعمت ہے اور میری دعا ہے کہ آپ اس حقیقت سے لاعلم رہیں کہ فیس بک پہ سب قاری رابطے میں ہیں۔ بشریٰ افضل آپ نے میرے سادہ سے کمنٹ پر کچھ زیادہ ہی اوور ایکٹنگ کی۔ طاہرہ جی، مظہر خود کو بچہ سمجھے، دوسروں کے الفاظ سے یا بال بنا کے جیسے مرضی لوگوں کو متاثر کرے، یہ ان کا آئینی حق ہے۔ احتشام صاحب کا خود سے سرِعام اظہارِ عقیدت کے بعد خود کو مرشد مرشد سا محسوس کر رہا ہوں۔ بلقیس خان پٹھانوں کے جو کارنامے آپ نے بتائے، وہ تسلیم مگر ایک بات بھول گئیں آپ کہ پٹھان اپنی شناخت اور نام کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں۔ ماریہ خان پرانے لوگ اسے خوش فہمی کہتے ہیں جبکہ اصل میں یہ خود شناسی ہے۔ مثال کے طور پہ نالائق بچہ کبھی بھی میچر کے سوال پہ ہاتھ کھڑا نہیں کر سکتا۔ جو ہاتھ کھڑے کرتے ہیں، ان میں کچھ تو خاص بات ہوتی ہے۔ ابتدائی صفحات پہ کاشف زبیر نے صحیح معنوں میں دھوم مچا دی۔ اتنی مکمل جاسوسانہ اور تھرلنگ شاہکار ان سب کے نام جو شکوہ کناں ہیں کہ جاسوسی کا معیار کم ہوا ہے۔ مریم کے خان کی لذتِ آزار ایک دلکش اور سبق آموز تحریر تھی۔ رخسانہ کے اعمال دراصل اس معاشرے کے دیے گئے تحائف کا ردِعمل تھا۔ عمران کا کردار متاثر کن تھا۔ نیلی موت ایک بہت بڑے موضوع پہ لکھی گئی کمزور تحریر تھی۔ ہیرو صاحب ایک صفحے پہ فرماتے ہیں کہ اس کی آنکھ مبارک بہت دیر سے کھلی جبکہ اگلے ہی صفحے پہ انکشاف کہ چاہے گرمی ہو سردی ہو آندھی ہو یا طوفان، وہ صبح صادق کو جاگتا ہے۔ دوسری بات کہ اتنا بڑا منصوبہ چلانے والوں کو ہرگز بھی ماہرین کے نام پہ نئے فارغ التحصیل پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اغوا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے پاس اپنے ماہرین کی کمی نہیں۔ جمال دستی کی کہانی پُرشور ثبوت میں بیوی نامی نعمت کی ازلی اوور ایکٹنگ نے شوہر کو پھنسا دیا۔ ہیر و مختصر کہانیوں میں خوب صورت ترین تحریر تھی۔

24 مارچ کو ادارے کے بہت پرانے رفیقِ کار اور ٹائٹل ڈیزائنر، ذاکر حسین کے صاحب زادے محمد زاہد لاہور میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ذاکر حسین اور ان کے اہلِ خانہ کے دکھ کی اس گھڑی میں ان کا شریک ہے۔

محی الدین نواب

مسیحا

انسان کی حیثیت محض پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے سمندر کے جھاگ کی طرح ہے... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں... بالکل اسی طرح ہماری زندگیاں، موت کے ہاتھوں بکھر جاتی ہیں... گزرنے والے ماہ و سال جاودانی زندگی کے سامنے ایک لمحے سے زیادہ کچھ نہیں... مادّے کی یہ دنیا اور جو کچھ اُس دنیا میں ہے... اس بیداری کے مقابلے میں ایک خواب کی طرح ہے... ہمارے قہقہے کی صدائیں... اور ہر آہ جو ہمارے دلوں کی گہرائی سے نکلتی ہے... ان کی صدائے بازگشت کہیں اور محفوظ ہو رہی ہوتی ہے... فرشتے غم کے بہائے ہوئے ہر آنسو کا حساب رکھتے ہیں... آج جس عمل کو ہم احساسِ جرم کی وجہ سے کمزوری سمجھتے ہیں، وہ کل کو انسانی زندگی کی مکمل زنجیر میں ایک اہم کڑی بن کر ظاہر ہوتا ہے... ایسے ہی چہروں سے نقاب اٹھاتی کہانی کے نشیب و فراز... جو اپنے مفادات کی خاطر دین کو محض ایک ڈھونگ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں... ان کے اندر ہوس اور تکبر دونوں اس طرح یکجا ہیں جیسے انہوں نے اسی خمیر سے جنم لیا ہو... ناکارہ... ناپسندیدہ اور فرسودہ نظامِ سیاست اور ان کے منتخب کردہ بے ایمان اور بے ضمیر چہروں کے گھناؤنے کارناموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ...

طلسمی طاقت رکھنے والے دو فرشتوں کی بلند سرفرازی... ایمان... اقتدار اور محبت کی دردمسیحائی

زمین پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان بھی چاند کے نور سے محروم تھا۔ کہیں کہیں ستارے ٹمٹمارہے تھے۔ زمین پر خاموشی اور نیند کا خمار تھا۔ ملک بوستان کے باشندے خمارزدہ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انسان نیند کی حالت میں تقریباً مرجاتا ہے۔ اپنے ہی وجود سے بے خبر رہتا ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ لوگ نیند کے نام پر اپنے آپ کو گم شدہ کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات انسان جو نہیں سوچتا، وہ ہو جاتا ہے۔ اس رات بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

سرمد بستی کے دو چار لوگ نائٹ ڈیوٹی کے باعث جاگ رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ آسمان کی بلندیوں پر روشنی کا ایک جھما کا سا دکھائی دیا۔ پتا نہیں وہ چونکا دینے والی روشنی آسمان سے آئی تھی یا خلا میں از خود روشن ہو گئی تھی۔ وہ ایک لمحاتی نظارے کے بعد خلا میں پھر تاریکی چھا گئی تھی۔

چند لمحوں بعد پھر وہی روشنی کا جھما کا طلوع ہو کر غروب ہو گیا۔ اس بار تجسس بڑھ گیا۔ آسمان کی طرف دیکھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔

یہ اندازہ ہوا کہ وہ غروب ہو کر طلوع ہونے اور پھر غروب ہونے والی روشنی کا رخ زمین کی طرف تھا۔ ایک شخص نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟ کیا تم لوگوں نے دیکھا، یہ اوپر سے سیدھا ہماری بستی کی طرف آرہا تھا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے میرے ہی اوپر آرہا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں ہماری طرف آرہا ہے مگر گیا

کہاں؟ پھر غائب ہوگیا ہے۔''

تاریک بلندیوں پر ایک بار پھر وہی چکا چوند کر دینے والی روشنی جھلک دکھا کر بجھ گئی۔ یہ امید دلا گئی کہ شاید پھر جھلکے گی۔ خوابیدہ بستی میں ذرا ہلچل سی پیدا ہوگئی۔

کچھ اور لوگ بیدار ہوگئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے حرارت محسوس کی تھی۔ نائٹ ڈیوٹی کرنے والوں نے کہا۔ ''ہاں ہم نے بھی گرمی محسوس کی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسی روشنی تھی۔ نیچے آتے آتے غائب ہوگئی۔''

ایک نے کہا۔ ''وہ روشنی کے دو گولے تھے۔ ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔''

''لیکن وہ کہاں گئے؟''

سب ہی تاریک خلا میں تکنے لگے۔ نہ چاند تھا نہ ستارے' اماوس کی گہری کالی رات تھی۔ وہ جلتے بجھتے والا نظارہ پھر لمحہ بھر کے لیے جھلکا لیکن اس بار ہلکی سی روشنی تھی جیسے زمین پر آکر بجھ رہی ہو۔ سب ہی عورتیں اور مرد چونک گئے۔ سب ہی کہنے لگے۔ ''یہ تو روشنی ہماری بستی میں کہیں آکر بجھ گئی ہے۔''

جیسا کبھی نہ ہو ویسا ہو جائے تو تجسس پیدا ہوتا ہے۔ کوئی غیر معمولی قدرتی نظارہ دکھائی دے تو دل کہتا ہے یہ کوئی آسمانی اشارہ ہے۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے... کیا ہونے والا ہے؟ یہ علوم فلکیات کے ماہرین سمجھیں گے جو لوگ نماز فجر سے پہلے جاگ رہے تھے انہوں نے گھر کے آنگن سے وہ نظارہ دیکھا تھا۔ وہاں کے دوسرے افراد بھی گہری نیند سے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

ایک نے لحاف سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ اچانک گرمی کیوں لگ رہی ہے؟''

پیش امام نے گھر سے نکل کر کہا۔ ''میں آنگن میں وضو کر رہا تھا۔ ایسے وقت ایک روشنی دیکھی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں گم ہوگئی؟''

عورتیں بھی گھروں سے نکل آئی تھیں۔ ایک نے کہا۔ ''امام صاحب! میں نے بھی دیکھا ہے' وہ جیسے کوئی آسمانی نور تھا۔''

مؤذن نے کہا۔ ''میں اذان دینے جارہا ہوں۔ ویسے آپ لوگوں کو جا کر دیکھنا چاہیے' وہ نور ہماری بستی کے پاس آکر کہیں بجھ گیا ہے۔''

جاگنے والی عورتیں اور مرد پیش امام کے ساتھ جانے لگے۔ منہ اندھیرے سب ہی گہری نیند سوتے ہیں۔ اس وقت چھوٹی سی بستی میں کچھ عجیب سی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ روشنی اسی بستی میں آئی تھی لیکن اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

مسجد کی ایک چھوٹی سی چار دیواری تھی... لیکن صحن بہت وسیع و عریض تھا۔ وہ سب صحن کی سیڑھیوں پر جوتے اتار کر اندر آئے تو دو نمازیوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ صحن میں شانہ بہ شانہ قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی اذان نہیں ہوئی تھی۔ وہ شاید تہجد کی عبادت میں مصروف تھے۔

وہ لوگ دبے قدموں چلتے ہوئے ان کے قریب آئے۔ وہ اجلے سفید لباس میں تھے۔ بیٹھنے کے باوجود اندازہ ہورہا تھا کہ وہ صحت مند اور قد آور ہیں۔ ان کے قریب دو سفری بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے بھرپور مردانگی عیاں تھی۔ ایک نامعلوم سی کشش تھی ان میں۔ انہیں دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

مؤذن نے صحن میں آکر اذان دی تو وہ دونوں محویت سے چونک گئے۔ لوگوں کو اپنے آس پاس دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہوگئے پھر کہا۔ ''السلام علیکم...''

سب نے سلام کا جواب دیا، پیش امام نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟''

انہوں نے اوپر دیکھا جیسے آسمان کو دیکھ رہے ہوں پھر ایک نے کہا۔ ''بہت دور سے آئے ہیں' میرا نام آدم ربانی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میرا نام آدم رحمانی ہے۔''

''ہم پوری دنیا گھومنا چاہتے ہیں۔ اپنا سفر اس بستی سے شروع کر رہے ہیں۔''

ایک بوڑھے نے پوچھا۔ ''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

انہوں نے کسی جگہ کا نام بتایا پھر کہا۔ ''ویسے ہم سب جہاں سے آئے ہیں' وہاں لوٹ کے جانا پڑتا ہے۔ لیکن ہمارا دل نہیں مانتا کہ ہم اگلے پل ہی اچانک لوٹ جائیں۔''

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''جب جانا ہی ہے تو آؤ۔ آگے سفر کا سامان کرو۔ نماز کا وقت ہوچکا ہے۔ اپنے رب کو راضی کرو۔''

سب نے پیش امام کے پیچھے قیام کیا۔ آدم ربانی اور آدم رحمانی بھی اگلی صف میں کھڑے ہوگئے۔ اس بستی کے لوگ باقاعدہ پانچوں وقت کے نمازی نہیں تھے اور صبح کی گہری نیند سے کبھی جاگتے نہیں تھے۔ اس روز جیسے پوری بستی کے لوگ بستر چھوڑ کر گھر سے نکل آئے تھے۔

جو پاک صاف تھے' وہ مسجد میں آکر اجنبی مسافروں

کو دیکھ رہے تھے اور جب مسجد میں آ ہی گئے تھے تو نماز بھی پڑھ رہے تھے۔ اس طرح نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا کچھ لوگ اپنی عورتوں' ماؤں اور بہنوں کے ساتھ باہر منتظر تھے کہ وہ اجنبی مسجد سے نکلیں تو انہیں دیکھیں گے۔

نماز ہو چکی تھی۔ نمازیوں کو باہر آنا چاہیے تھا لیکن مسجد کے اندر شور سنائی دے رہا تھا۔ کچھ لوگ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر کئی نمازی باہر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''یہاں جو اجنبی نماز پڑھنے آئے ہیں' ان کے دو بیگ کوئی چرا کر لے گیا ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''کتنے شرم کی بات ہے۔ ہماری مسجد کی سیڑھیوں سے جوتے چرائے جاتے ہیں۔ آج ہماری بستی میں آنے والے مسافروں کا مال چرایا گیا ہے۔ آؤ بھائیو! چور کو تلاش کرو۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔''

عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی نے کہا کہ کیا صمدانی کو پکڑنے کی ہمت ہے۔ وہ تو دن دیہاڑے واردات کرتا ہے۔ کیا پولیس کبھی اسے پکڑنے آتی ہے؟''

سب ہی کو چپ لگ گئی۔ صمدانی صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کا پالتو غنڈا تھا۔ تھانے والے اس پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ پھر کوئی عام آدمی اسے کیسے پکڑ سکتا تھا؟

آدم ربانی اور آدم رحمانی سیڑھیوں پر آئے۔ اس وقت صبح روشن ہو گئی تھی۔ ان کی خوب روئی دیکھ کر عورتوں کے کلیجے سے ہائے نکلی۔ دل بے اختیار کہہ رہا تھا کہ وہ انسان تو ہیں لیکن ان کی شخصیت زمینی نہیں ہے۔ وہ شاید کسی اور ہی دنیا سے آئے ہوں گے۔

آدم رحمانی نے کہا۔ ''میری ماؤں! بہنو! اور بھائیو! ہمارا سامان چوری ہو گیا، کوئی بات نہیں جو چیز جس کے نصیب میں ہوتی ہے' اسے ملتی ہے۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''اگر ہمارا سامان چور کے نصیب میں تھا تو اسے مل گیا' اگر نصیب میں نہیں ہے تو اسے نہیں ملے گا۔ وہ ہمارے دونوں سفری بیگ یہاں واپس لے آئے گا۔''

ان کی آواز اور لہجے کی مٹھاس اور نرمی دلوں کو چھو رہی تھی۔ انہوں نے یہ مضحکہ خیز بات کہی تھی کہ چور ان کے سفری بیگ واپس لے آئے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا لیکن ان کا اعتقاد اور لہجے کی مضبوطی کہہ رہی تھی کہ ایسا ضرور ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی علاقے کا سربراہ تھانیدار کے ساتھ آیا۔ اس نے اپنی آواز کو گرجدار بناتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھیڑ کیوں لگی ہے؟ سنا ہے یہاں دو مسافر آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا سیڑھی کے پاس آ کر ٹھٹک گیا۔ سیڑھی کے تین پائدان کی بلندی پر وہ دونوں قطب مینار کی طرح کھڑے تھے۔ سربراہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو گردن دُکھنے لگی۔ اُجلے لباس میں چہرے کی دمکتی رنگت اور اونچی چٹان جیسی جسامت دیکھتے ہی وہ بولنا بھول گیا۔ تھانیدار نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بڑے رعب سے پوچھا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

آواز پھنس کر نکلی۔ وہ رعب نہ جما سکا۔ اس نے دوسری بار منمناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''جواب دو، میں علاقے کا تھانیدار ہوں، الٹا لٹکا دیتا ہوں۔ کون ہو تم لوگ؟''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''انسان ہیں۔''

''وہ تو نظر آ رہے ہو مگر ہو کون؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟''

آدم ربانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جہاں سے تم آئے ہو جہاں سے تمام انسان آتے ہیں' وہیں سے آئے ہیں۔''

''ارے یہ کیا بکواس ہے؟ سیدھا سا جواب دو۔''

''سیدھا جواب ہے۔ اپنی ماں سے جا کر پوچھو۔ دنیا کی ہر ماں سے ہمارا والا ہی جواب ملے گا۔''

ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''اوئے تھانیدار! یہ سیدھی سی بات کر رہے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے؟''

وہ جھلا کر بولا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں' یہ کس علاقے سے آئے ہیں؟''

آدم رحمانی اور ربانی نے اپنی اپنی جیب سے کارڈ نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو یہ ہمارے شناختی کارڈز ہیں۔''

تھانیدار نے سیڑھی کے ایک پائدان پر چڑھ کر ایک کارڈ لے کر اسے غور سے پڑھا۔ آدم رحمانی نے کہا۔ ''کارڈ الٹا ہے، سیدھا تو کر لو۔''

اس نے جھینپ کر عورتوں اور مردوں کے ہجوم کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

جواب ملا۔ ''کارڈ میں لکھا ہے۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''اور ہم بستی والوں کے سامنے تم سے پوچھتے ہیں۔ تم پڑھنا جانتے ہو یا نہیں۔ اگر جانتے ہو تو سب کے سامنے ہمارا نام پڑھو۔''

سربراہ نے فوراً ہی تھانیدار سے کارڈ لے کر پڑھا پھر کہا۔ ''تمہارا نام آدم رحمانی ہے۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، تھانیدار لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہے۔''

وہ گرج کر بولا۔ ''بکواس مت کرو۔ میں بی اے پاس ہوں۔ میرے پاس سرٹیفکیٹ ہے۔''

آدم ربانی نے کہا ''یہاں انگوٹھا چھاپ بھی بڑی بڑی ڈگریاں لیے پھرتے ہیں۔ تم اپنی ہسٹری ہم سے سنو، تمہارا نام بھی جبار دادا تھا۔ آج تمہارا نام عبدالجبار خان ہے، پہلے تم قاتل اور ڈکیت تھے۔ کئی بار جیل جاچکے ہو۔''

تھانیدار نے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اے بکواس مت کرو۔ منہ توڑ دوں گا۔''

وہ بولتا جارہا تھا۔ ''آج تمہارا بہنوئی ایک صوبے کا منسٹر ہے۔ اس نے تمہارے نام سے بی اے کا سرٹیفکیٹ بنوا کر اس چھوٹے سے علاقے میں تھانیدار لگوایا ہے۔ آج تم قانون کے رکھوالے بن کر وہی واردات کرتے ہو جو پہلے کرتے تھے۔''

تھانیدار غصے سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''سراسر بکواس کررہے ہو۔ تو... تم میرے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

اس نے پریشان ہوکر ہجوم کو دیکھا۔ سچ سامنے آرہا تھا۔ اس کی بے عزتی ہورہی تھی۔ اس نے آدم رحمانی سے کہا۔ ''تم۔ میرا مطلب ہے۔ تم غلط جانتے ہو۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تم دونوں کو یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔ تم یہاں مرنے کے لیے آئے ہو۔''

وہ غصے سے تنتناتا ہوا اس کے قریب آیا لیکن آتے ہی ایک دماغی جھٹکا لگا۔ آدم رحمانی نے اپنی ہتھیلی ہولے سے اس کی پیشانی پر ماری۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے سیڑھیوں پر سے اچھل کر گرتا ہوا لوگوں کے قدموں میں پہنچ گیا۔

لوگ پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ فوراً ہی اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں دُکھ رہی تھیں۔ سربراہ اسے سہارا دے کر زمین سے اٹھانے آیا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ ''جاؤ تھانے سے تمام سپاہیوں کو بندوق کے ساتھ آنے کے لیے کہو، یہ دونوں یہاں سے زندہ نہیں جائیں گے۔''

ایسے وقت صمدانی اپنے حواریوں کے ساتھ وہاں آیا۔ وہ سب لمبے تڑنگے جوان تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سفری بیگ تھے۔ جنہیں وہ چرا کر لے گئے تھے۔ تھانیدار نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''صمدانی! ان بدمعاشوں کے ہاتھ پاؤں توڑ دے۔ انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔''

صمدانی نے اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ انہیں تم پر ہاتھ اٹھانا مہنگا پڑے گا۔ ویسے بھی ہم انہیں چھوڑنے والے نہیں ہیں۔''

تھانیدار نے اس کے قریب جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ''تم ان کے بیگ واپس کیوں لائے ہو۔ کیا اس میں نقدی اور قیمتی سامان نہیں ہے؟''

صمدانی نے جھنجلا کر کہا۔ ''دونوں بیگوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں۔ پہلے انہیں پکڑ کر تھانے لے چلتے ہیں۔ وہاں ان کی پٹائی کریں گے۔ پھر پوچھیں گے کہ یہ اپنے بیگ میں پتھر لے کر دنیا گھومنے کیوں نکلے ہیں؟''

حواریوں نے وہ بیگ ان دونوں کے قدموں کے پاس پھینک دیے۔ تھانیدار نے کہا۔ ''انہیں اٹھاؤ اور سیدھی طرح ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ ورنہ صمدانی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہے ہو، یہ تم دونوں کا کچومر نکال دیں گے۔''

آدم رحمانی نے بیگ اٹھا کر سامنے ہجوم پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ''میری ماں! بہنو اور بھائیو! ابھی ہم نے کہا تھا، جو چیز جس کے نصیب میں ہوتی ہے اسے ملتی ہے۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''اور ہم نے کہا تھا، ہمارا سامان چور کے نصیب میں نہیں ہے تو اسے نہیں ملے گا۔ وہ ہمارے دونوں سفری بیگ واپس لے آئے گا اور آپ دیکھ رہے ہیں یہ نامراد چور خود انہیں واپس لے آئے ہیں۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''اس میں پتھر نہیں ہیں، کیا ہم پاگل ہیں کہ پتھر اٹھا کر سفر کریں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے جھک کر بیگ کی زپ ہٹائی۔ پھر اس میں سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر کہا۔ ''یہ بوستانی کرنسی ہے، اس بیگ میں لاکھوں روپے ہیں۔''

''لاکھوں روپے...؟''

سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ صمدانی اور اس کے ساتھی بے یقینی سے ان نوٹوں کو دیکھنے لگے پھر صمدانی نے چیخ کر کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم نے اپنے ہاتھوں سے پتھروں کو چھو کر دیکھا تھا۔''

آدم ربانی نے بھی اپنے بیگ کی زپ کو کھولا پھر اس میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے نصیب میں پتھر اور ہمارے نصیب

میں گھی شکر۔ میرے اس بیگ میں بھی لاکھوں روپے ہیں۔''
یعنی کہ ان مسافروں کے پاس لاکھوں روپے تھے۔
چور انہیں چرا نہ سکے۔ ان کے پاس خود ہی واپس لے آئے۔ لوگوں نے یہ عجیب تماشا دیکھا تھا۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ مال ان کے پاس واپس آئے گا۔
وہ اتنی بڑی رقم سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ یک بہ یک چیختے چنگھاڑتے ہوئے لاکھوں کی گنتی کی طرف لپکے۔ صمدانی اپنے چاروں حواریوں کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا لیکن قریب پہنچتے ہی انہیں دن میں تارے نظر آنے لگے۔
وہ دونوں اپنی جگہ روبوٹ کی طرح جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے صرف دو ہاتھ چل رہے تھے۔ وہ ہاتھ جس پر پڑ رہے تھے۔ اس کی کوئی نہ کوئی ہڈی کڑکڑانے اور فریاد کرنے لگتی تھی۔ صمدانی کو اپنی باڈی بلڈنگ پر ناز تھا۔ جب اس کے منہ پر ہاتھ پڑا تو جیسے عارضی طور پر اندھا ہوگیا۔ صاف محسوس ہوا کہ کئی دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا علاقے کے سربراہ اور تھانیدار کے قدموں میں آگیا۔
دوسرے بھی مار کھا کر گرتے پڑتے آرہے تھے، کسی کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اور کسی کی پسلیاں تڑخ گئی تھیں۔ حملہ کرنے والے زخمی ہو کر لہولہان ہو کر سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گئے تھے اور جہاں پہنچ گئے تھے وہاں سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔
صرف چند منٹوں میں خاموشی چھا گئی۔ تھانیدار اور سربراہ کی غنڈا فورس زمین پر پڑی کراہ رہی تھی۔ بستی کے لوگ خوش ہو رہے تھے لیکن تھانیدار کے خوف سے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے تالیاں نہیں بجا رہے تھے۔
مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب ہی ان دو اجنبی مسافروں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں اپنی غیر معمولی جسمانی قوتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ تمام غنڈوں اور سپاہیوں کو زمین بوس کر دیا تھا۔ یہ سن کر سب ہی حیران ہو رہے تھے کہ چوروں کو ان کے بیگ سے پتھر ملے تھے۔ جبکہ ان دو بیگ میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔
یہ واقعی حیرانی کی بات تھی کہ چوروں کے ہاتھ نوٹ نہیں پتھر آئے تھے۔ یہ ان مسافروں کی کرامات تھیں۔ اچانک ہی وہ سب ان کے عقیدت مند ہو گئے۔ انہیں بڑی اپنائیت سے دیکھنے لگے۔
وہ تین پائدان والی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ تھانیدار سے کہہ رہے تھے۔ ''ہم برائیوں سے لڑنے آئے ہیں اور یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ ہماری جنگ اسی بستی سے شروع ہوگی۔ فی الحال ہم یہاں قیام کریں گے۔''
ایسے وقت چھ سپاہی بندوقیں لیے للکارتے ہوئے آگئے۔ تھانیدار کو پھر سے طاقت حاصل ہوگئی۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''انہیں گولیوں سے بھون ڈالو لیکن نہیں۔ انہیں جان سے نہ مارو ان کے پیروں پر گولیاں چلا کر اپاہج بنا دو۔ جب یہ اپاہج بن جائیں گے۔ پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہیں گے۔ تب میں ان سے بات کروں گا۔''
مرد عورتیں بچے ہاتھ جوڑ کر التجائیں کرنے لگے۔
''انہیں نہ مارو۔ ان کے لاکھوں روپے لے لو اور انہیں زندہ جانے دو۔ ہمارا دل کہتا ہے۔ یہ خدا کے نیک بندے ہیں۔ خدا سے ڈرو۔''
بندوق ہاتھ میں ہو تو بندہ شیر ہو جاتا ہے۔ تڑا تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ گولیاں ان دونوں کے قدموں کے آس پاس فرش کو ادھیڑتے ہوئے گزر رہی تھیں۔
انہوں نے اطمینان سے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک ٹی ٹی نکالی۔ وہ سیاہ رنگ کی ٹی ٹی سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سپاہیوں کے پاس برسوں پرانی زنگ خوردہ بندوقیں تھیں۔ وہ انہیں پھر سے لوڈ کر رہے تھے۔
دونوں نے گولیاں چلائیں۔ فائرنگ کے شور میں سپاہی چیخیں مارتے ہوئے بھاگنے اور گرنے لگے۔ موت تو پلک جھپکتے ہی آتی ہے اور اپنا سامان لے جاتی ہے۔ چار سپاہی حرام موت مرے دو اپاہج ہو کر زمین پر گر پڑے۔
آدم رحمانی نے تیسرے پائدان کی بلندی سے کہا ''کسی بھی مغرور طاقت ور کو سمجھاؤ۔ وہ محبت کی زبان سے نہیں سمجھے گا۔ سمجھانے کے لیے اس سے زیادہ طاقت ور بننا پڑتا ہے۔ یہاں سربراہ، تھانیدار اور ایک بہنوئی منسٹر کی شیطانی طاقت کا آخری وقت آچکا ہے۔''
آدم ربانی نے کہا۔ ''اس زمین کے لوگ زبان سے نہیں سمجھتے۔ ڈنڈے پڑتے ہی مان جاتے ہیں لہٰذا ہم یہاں ڈنڈے سے سمجھانے اور منوانے آئے ہیں۔
''یہ خدا کے گھر کا دروازہ ہے یہاں ایمان دار سجدے کرنے آتا ہے اور بے ایمان ٹھوکریں کھانے کے لیے باہر رہتا ہے۔''
آدم رحمانی نے کہا۔ ''ہم خدائی منصف ہیں۔ جہاں جائیں گے عدالتیں قائم کریں گے۔ اس ملک بوستان کی زمین سے تمام غیر اخلاقی غلاظتیں اور منفی سیاستیں ختم کر کے

ہی جائیں گے۔ لہٰذا ہم پہلی عدالت اسی مسجد کے دروازے پر قائم کررہے ہیں۔

"یہاں جو چار سپاہی مارے گئے ہیں، انہوں نے ماضی میں تھانیدار کے حکم سے چھ بے گناہوں کو ہلاک کیا تھا۔ باقی دو سپاہی قاتل نہیں ہیں' یہ مردود زانی ہیں۔ تھو ہے ان پر... ہم نے انہیں اپاہج بنادیا ہے۔ یہ کبھی پیروں پر کھڑے نہیں ہوسکیں گے۔ باقی زندگی بھیک مانگتے اور توبہ توبہ کرتے گزاریں گے۔

"ہم جہاں جائیں گے' ہمیں وہاں کے لوگوں کا اعمال نامہ معلوم ہوتا رہے گا۔ سربراہ! تمہارا اعمال نامہ یہ ہے کہ تم اپنے سیاسی رہنماؤں کے رنگ محل میں لڑکیاں پہنچاتے ہو۔ پھر ان کا جھوٹا کھاتے ہو اور خوب مال کماتے ہو۔ لعنت ہے تم پر... کتنی معصوم لڑکیوں کی چیخیں عرش تک پہنچتی رہی ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے تم بھی عرش پر جاؤ۔"

ایک گولی چلی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ عرش تک پہنچنے کی دو ہی سیڑھیاں ہیں ایک دعا اور دوسری بددعا۔

تھانیدار نے سربراہ کا انجام دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں قانون کو ہاتھ میں لے رہے ہو۔ قاتل بن رہے ہو۔ کوئی تمہیں پھانسی کے پھندے سے نہیں بچائے گا۔ میری ہلاکت سے باز آؤ۔ میں تمہیں قانون کے شکنجے سے بچالوں گا۔"

آدم ربانی نے نفرت سے کہا "تمہارے گناہ اور جرائم اتنے ہیں کہ ہم ان کا ذکر کرکے وقت ضائع نہیں کریں گے۔"

اس نے یہ کہتے ہی اسے گولی ماردی۔ اس کے بعد انہوں نے صمدانی اور اس کے ساتھیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ انہیں بھی جہنم میں پہنچادیا۔ سب ہی کو ان کے اعمال کی سزائیں مل گئیں۔

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر یکبارگی سب ہی تالیاں بجانے لگے۔ آدم رحمانی، آدم ربانی زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے لاشوں کو روندتے ہوئے سیڑھیوں کے قریب آنے لگے۔

آدم ربانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "رک جاؤ۔ جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ ہمارے قریب نہ آؤ۔"

وہ سب رک گئے۔ ان دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ آدم رحمانی نے کہا۔ "تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ کیا ہم تمہارے اعمال نامے نہیں جانتے ہیں؟ کیا تم غلطیوں اور گناہوں سے پاک ہو؟"

انہیں چپ لگ گئی۔ وہ نظریں چرانے لگے۔ آدم ثانی نے کہا۔ "انسان خطا کا پتلا ہے لیکن وہ سنبھلتا بھی رہتا ہے۔ پچھلی غلطیوں سے توبہ کرتا ہے اور آئندہ راہِ راست پر چلنے کی کوششیں کرتا ہے۔ تم سب یہی کرتے ہو۔ تم سب حالات سے مجبور ہو۔ آٹا مہنگا ہوتا ہے تو پاپی پیٹ کی خاطر چوری کرتے ہو۔ چینی نہیں ملتی تو کڑوا بولنے پر مجبور ہو جاتے ہو۔ نوکری نہیں ملتی تو ہتھیار اٹھالیتے ہو۔ بے روزگاری کے باعث شادی نہیں کرسکتے تو کسی کے ساتھ منہ کالا کرتے ہو۔ حکمرانوں نے تمہیں ایسے مقام پر پہنچادیا ہے جہاں تم اخلاق' تہذیب اور شرافت کو بھول گئے ہو۔ ہم تمہیں سنبھلنے اور راہِ راست پر آنے کا موقع دیں گے۔ تمہارے لیے ایسی سہولتیں فراہم کریں گے کہ تم سب مل کر مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کرسکو گے۔

"تمہاری اس بستی میں ہر قوم اور ہر زبان کے لوگ آباد ہیں۔ لیکن تم سب کے دکھ درد اور سنگین مسائل ایک ہیں۔ اگر تم سب کو مہنگائی اور بے روزگاری کی لعنت سے دور رکھا جائے تو کیا تم کوئی جرم یا گناہ کروگے؟"

سب نے بیک زبان کہا۔ "کبھی نہیں، کبھی نہیں..."

پھر ایک نے پوچھا۔ "آپ ہمیں ان لعنتوں سے کیسے بچائیں گے؟"

آدم رحمانی نے کہا۔ "اللہ تمہیں بچائے گا۔ ہم کوشش کریں گے۔ قوم کی فلاح و بہبود میں ہر سال بجٹ میں کروڑوں روپے مختص کیے جاتے ہیں۔ ہم اس سرمد بستی کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت سے کروڑوں روپے حاصل کریں گے۔"

وہ سب آدم ربانی اور آدم رحمانی کے لیے زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ دونوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خاموش ہوجاؤ، آئندہ کبھی زندہ باد کے نعرے نہ لگانا۔ ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا صرف خدا ہے۔ تم لوگ زندہ باد کے نعرے لگا کر سیاست دانوں کو اپنا خدا بنالیتے ہو۔ پھر ان زمینی خداؤں کی طرف سے عذاب سہتے رہتے ہو۔"

سب نے گردنیں جھکالیں۔ وہ ان دونوں سے عقیدت مندی کی حد تک متاثر ہوگئے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ دونوں غیر معمولی صلاحیتیں اور فولادی قوتیں رکھتے ہیں۔ دل کہتا تھا، وہ ان کے نجات دہندہ بن کر آئے ہیں۔

آدم رحمانی نے کہا۔ ''آج سے اس بستی کو ایسے سنوارو جیسے اپنے گھر کو اور اپنی گھر والیوں کو سنوارتے ہو۔ تم سب مل کر سوچو کہ کس طرح اپنی سرمد بستی سے شرمناک گناہوں اور بدترین جرائم کا خاتمہ کر سکو گے۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''جرائم کے خاتمے کے لیے پولیس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے لیکن پولیس الٹا کام کر رہی ہے۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ آج کے بعد سرمد بستی میں کوئی پولیس تھانہ نہیں ہوگا۔ یہاں ہر شخص خود اپنا محاسبہ کرے گا۔ نہیں کرے گا تو ہم سے چھپا نہیں رہے گا۔ کسی کی معمولی سی غلطی کی سزا بھی بھیانک اور عبرتناک ہوگی۔ اس بستی کے کسی گھر میں کوئی اسلحہ نہیں ہوگا۔ تعصبات اور فرقہ واریت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

''تمہیں اپنے ملک بوستان کو صحیح معنوں میں خوشبو کا گھر بنانا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے ایک چھوٹی سی سرمد بستی کو جرائم اور گناہوں سے پاک کر کے اسے مثالی بستی بنادو پھر رفتہ رفتہ پورا بوستان ایک مثالی ملک بن جائے گا۔

''ہم مسجد کے صحن میں ابھی پچاس لاکھ روپے رکھ کر جائیں گے۔ اس رقم سے ایک نئی بستی بسانے کی اور نئی زندگی شروع کرنے کی پلاننگ کرو اور ہم جو کہہ رہے ہیں' اسے توجہ سے سنو...

''یہاں مختلف ادارے بناؤ پھر سرمد بستی کی انتظامیہ کے لیے ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کا انتخاب کرو اور تعمیری منصوبے بنا کر ان پر تندہی سے عمل کرتے رہو۔ تمہیں آئندہ بھی بڑی بڑی رقمیں ملتی رہیں گی۔''

وہ دونوں صحن کے وسط میں آئے۔ اپنے اپنے بیگ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر فرش پر رکھنے لگے۔ اس بستی کے غریب اور پسماندہ لوگوں نے کبھی ایک ساتھ اتنے نوٹ نہیں دیکھے تھے۔ اب دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

پیش امام نے کہا۔ ''تم دونوں پر خدا کی رحمت ہو۔ مسجد کے باہر کئی لاشیں پڑی ہیں۔ وہ حرام موت مرنے والا منسٹر کا سالا تھا۔ یہاں سخت انکوائری ہوگی۔ کیا وہ تمہیں گرفتار کر سکیں گے؟''

''آپ ہماری فکر نہ کریں۔ لوگوں کو سچ بولنے اور ایک دوسرے کی عزت کرنے کی ہدایت کریں۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''یہاں طاقتور افسران آئیں گے۔ وہ آپ کے عطا کیے ہوئے روپے چھین کر لے جائیں گے۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''منفی قوت عوام کو کچلتی ہے اور مثبت قوت عوام کو طاقت ور بناتی ہے۔ تمہارے ساتھ مثبت قوتیں ہیں۔ کسی طاقت سے نہ ڈرو۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر جا کر نظروں سے گم ہو گئے۔ کتنے ہی لوگوں کو متجسس نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے۔ وہ دونوں گم ہو کر پھر ان کے درمیان آ گئے۔ اب کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ مسجد کے صحن میں تمام لوگ پچاس لاکھ روپے کے اطراف کھڑے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''کسی نیک اور دیانت دار شخص کے پاس یہ رقم رکھوائی جا سکتی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''پیش امام صاحب کے پاس رقم محفوظ رہے گی۔''

تمام لوگ تائید کرنے لگے۔ پیش امام نے کہا۔ ''میں اتنی بڑی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ ویسے آپ تمام لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ آج سے آپ سب ہی نیک اور دیانت دار ہیں۔ جس کی نیکی مشکوک ہوگی، وہ ان دونوں سے ضرور سزا پائے گا۔''

ایک نے کہا۔ ''خدا ہمیں غلطیوں سے بچنے کی توفیق دے اور اپنی اصلاح کرنے کا عادی بنائے۔''

سب نے آمین کہا۔ پیش امام نے کہا۔ ''ہمارا فرض ہے کہ بستی میں جو بھی غلط دھندا کر رہا ہے، اسے روکیں ٹوکیں۔ فتو لنگڑا ہیروئن اور چرس کا دھندا کرتا ہے۔ اس دھندے کو ابھی اسی وقت بند ہونا چاہیے۔''

فتو لنگڑے نے کہا۔ ''بھئی واہ! پہلا پتھر مجھ ہی کو مارا جا رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کریں گے تو کھائیں گے کیا؟''

پیش امام نے کہا۔ ''ہمیں جو رقم ملی ہے اس رقم سے ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اتنے دنوں تک تم کوئی کام پکڑو، محنت مزدوری کرو۔''

''ابھی مجھے دس ہزار دو۔ میں بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' فتو نے کہا۔

آدم ربانی نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہاتھ رسید کیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے جا گرا۔ پھر فرش پر تڑپنے لگا۔ اس کی ناک .... اور باچھوں سے لہو رسنے لگا تھا۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اچانک چیخ مار کر کیوں گر پڑا ہے۔ پھر پیش امام نے کہا۔ ''اللہ اکبر... فتو کو اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔''

وہ فرش پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ توبہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں یہ دھندا چھوڑ دوں گا۔ کوئی دوسرا اچھا کام کروں گا۔''
پیش امام نے کہا۔ ''شاباش یہ تمہارا اچھا فیصلہ ہے۔ ہیروئن اور چرس کو زمین میں دفن کردو۔''
وہ بولا۔ ''میرے گھر میں ہیروئن کی دو پڑیاں اور چھٹانک بھر چرس ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کے سامنے لے آؤں گا۔''
بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ پر ایک زور کی ٹھوکر لگی۔ وہ چیخ مار کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں تڑخ گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ ڈوبتی آواز میں بولا۔ ''میرے گھر میں دس ہزار کی ہیروئن اور آٹھ ہزار کی چرس رکھی ہے۔ میں انہیں شہر جا کر فروخت کروں گا' اپنے دھندے سے باز نہیں آؤں گا۔''
آدم رحمانی نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اپنے سر سے بلند کیا۔ سب حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ وہ آپ ہی آپ فرش سے بلند ہوگیا تھا پھر ہوا میں جیسے بہتا ہوا مسجد کے باہر پڑی ہوئی لاشوں کے پاس پہنچ گیا۔
سب حیران تھے' توبہ توبہ کررہے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مسیحا اسے سزا دے رہے ہیں۔ ایک شخص نے قریب آکر اسے دیکھا۔ پھر پیش امام سے کہا۔ ''یہ مرچکا ہے۔''
آدم ربانی نے ہجوم سے دور جا کر ایک ہاتھ اپنے کان پر یوں رکھا جیسے فون کو پکڑا ہو پھر اس نے کہا۔ ''ہیلو... میں سرمد بستی سے بول رہا ہوں۔ ابھی یہ نہ پوچھنا کہ میں کون ہوں۔ بس اتنا جان لو کہ مسیحا کہلا رہا ہوں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہاں کئی لاشیں پڑی ہیں۔''
دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''تم کون ہو؟''
جواب ملا۔ ''خدائی فوجدار۔''
فون بند ہوگیا۔ ڈی آئی جی نے اپنے فون کو دیکھا پھر انسپکٹر سے بولا۔ ''سرمد بستی کے تھانے دار سے بات کراؤ۔''
تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوا۔ دوسری طرف بڑی دیر تک بیل بجتی رہی پھر آدم ربانی نے اسی طرح اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہیلو۔ یہ تھانیدار کا فون ہے۔ وہ بولنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اپنے غنڈوں کے ساتھ جہنم میں پہنچ گیا ہے۔ ان کی لاشیں تمہارا انتظار کررہی ہیں۔''
فون بند ہوگیا۔ ڈی آئی جی نے انسپکٹر سے کہا۔ ''معاملہ سنگین ہے۔'' پھر مطلوبہ ایس ایچ او سے بات کی۔ ''فوراً مسلح سپاہیوں کو لے کر سرمد بستی جاؤ۔ وہاں تھانیدار کئی لوگوں کے ساتھ مارا گیا ہے۔ مجھے جلد از جلد رپورٹ دو۔''
اس نے وہاں پہنچ کر رپورٹ دی کہ تھانیدار اور علاقے کا سربراہ مارے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نو لاشیں مسجد کے سامنے پڑی ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی بستی میں دو مسیحا آئے تھے۔ انہوں نے بے جا طاقت دکھانے والوں کو ہلاک کیا ہے۔''
ڈی آئی جی نے کہا۔ ''کون ہیں وہ دو مسیحا؟''
''بستی کے لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ رات کے اندھیرے میں وہاں آئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آج کے بعد وہاں کوئی چور بدمعاش اور پولیس تھانہ نہیں ہوگا اور قمار خانے اور شراب خانے کا اڈا ابھی نہیں ہوگا۔''
''واٹ نان سینس! تم نے ان دو قاتلوں کو گرفتار کیا ہے یا نہیں؟''
''وہ دونوں غائب ہوگئے ہیں۔''
''یہ کیا بکواس ہے، کون یقین کرے گا وہ واردات کرنے والے غائب ہوجاتے ہیں؟''
''تمام لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔ وہ دونوں سرمد بستی کو بے مثال بنانے کے لیے پچاس لاکھ روپے دے کر کہیں چلے گئے ہیں۔''
''پچاس لاکھ...!''
ڈی آئی جی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''تم نے پچاس لاکھ کہا ہے ناں؟''
''یس سر! یہ پچاس لاکھ روپے میرے سامنے ہیں۔''
''خبردار...! میرے آنے تک انہیں ہاتھ نہ لگانا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ تم نے اچھی طرح گن لیے ہیں ناں؟ پورے پچاس لاکھ ہیں؟''
''کیسے گن سکتا ہوں؟ آپ ہاتھ لگانے سے منع کررہے ہیں۔''
''اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں آکر گنوں گا۔ ابھی کسی فوٹو گرافر اور انویسٹی گیٹر کو نہ بلانا۔ کسی کو پچاس لاکھ کی ہوا نہ لگنے دینا۔ میں بس آرہا ہوں۔''
رابطہ ختم ہوگیا۔ ایس ایچ او نے فون بند کرتے ہوئے نوٹوں کے پہاڑ کو دیکھا۔ وہ دولت ابھی تک مسجد کے صحن میں رکھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس کے حصے میں کتنے نوٹ آنے والے تھے۔ انہیں چھونے کو جی کررہا تھا لیکن اعلیٰ افسر نے رقم کو ہاتھ لگانے سے منع کیا تھا۔
باہر لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی قانونی کارروائی

نہیں ہو رہی تھی۔ پچاس لاکھ بہت اہم تھے۔ اوپر سے نیچے تک بندر بانٹ ہونے والی تھی۔

ڈی آئی جی جیسے ہوا میں اڑتا ہوا آ گیا۔ وہ مال کی ہوس میں جوتوں سمیت مسجد کے صحن میں جانا چاہتا تھا۔ اسی لمحے میں جیسے کسی نے دھکا دیا۔ وہ سیڑھی کے ایک پائدان پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ پھر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پیش امام نے کہا۔ ”آپ جوتے اتار کر یہاں آئیں۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیا تم نے مجھے روکنے کے لیے دھکا دیا ہے؟“

”جناب عالی! میں تو آپ سے دور ہوں۔ سرمد بستی کی ہوا بدل گئی ہے۔ یہاں جو بھی غلطی کرتا ہے، اسے دھکے لگتے ہیں۔“

اس نے حیرانی سے اس جگہ کو دیکھا جہاں اسے دھکا لگا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ آپ ہی آپ گر پڑا۔ زیادہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ دور صحن میں رکھا ہوا نوٹوں کا پہاڑ اسے بلا رہا تھا۔

وہ جوتے اتار کر تیزی سے چلتا ہوا ایس ایچ او کے پاس آیا پھر اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”تم نے گنے ہیں؟“

”نو سر! آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

”ٹھیک ہے... میرے سامنے گن سکتے ہو۔ اور یہاں اتنی بھیڑ کیوں لگی ہے؟ انہیں یہاں سے بھگاؤ۔“

”سر! انہیں بھگانا مناسب نہیں ہے۔ یہ سب قتل کی واردات کے چشم دید گواہ ہیں۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ تم نے گنتی شروع نہیں کی؟“

”سر! ابھی کر رہا ہوں۔“

ایس ایچ او نوٹوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر اس نے سب سے اوپر والی گڈی اٹھائی۔ دوسرے ہی لمحے عجب تماشا دکھائی دیا۔ وہ گڈی اس کے ہاتھ میں آتے ہی پتھر بن گئی۔

ڈی آئی جی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جو ملائم کاغذ تھا وہ ٹھوس پتھر بن گیا تھا۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود فریب لگ رہا تھا۔ ایس ایچ او پر اچانک ہی خوف طاری ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے چھوڑ دیا۔ وہ پتھر اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر آتے ہی پھر نوٹوں کی گڈی بن گیا۔

تمام لوگوں نے حیرانی سے اور بڑی خوشی سے یہ تماشا دیکھا۔ ڈی آئی جی آنکھیں پھاڑ کر فرش پر پڑی ہوئی گڈی کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایسا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اس نے فرش پر جھک کر اسے اٹھایا تو وہ پتھر نہیں بنی نوٹوں کی گڈی ہی رہی۔ وہ خوش ہو کر قہقہہ لگانے لگا۔ اس نے ایس ایچ او سے کہا ”نظروں کا دھوکا تھا۔ بھلا کاغذ پتھر کیسے بن سکتے ہیں؟“

”سر! یہ ابھی پتھر بن گئے تھے۔“

وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڈی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ پتھر ہے؟ بیوقوف...! پتھر سے چوٹ لگتی ہے، کاغذوں سے نہیں لگتی۔ یہ دیکھو...“

اس نے نوٹوں کی گڈی کھینچ کر ماری۔ ایس ایچ او کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اسے پتھر لگا، اس کی پیشانی سے لہو بہنے لگا۔ ڈی آئی جی حیرانی سے بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ گڈی پتھر کیسے بن گئی؟“

تماشا دیکھنے والے زیرلب مسکرا رہے تھے۔ بڑے افسران کی حالت پر ہنس نہیں سکتے تھے۔ آدم رحمانی اور ربانی پر اعتقاد مستحکم ہو رہا تھا کہ ہتھیاروں کی طاقت رکھنے والے پولیس افسران بھی ان کی دولت نہیں لوٹ سکیں گے اور نہ ہی کسی کو خواہ مخواہ ہتھکڑی پہنا سکیں گے۔ ان کے حوصلے بلند ہو رہے تھے۔

ڈی آئی جی نے نوٹوں کے پہاڑ کو دیکھا جو پتھر بن گئی تھی، وہ پھر سے للچانے والی گڈی بن کر اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس اعلیٰ افسر نے پہاڑ کی بلندی سے دوسری گڈی اٹھائی تو وہ پتھر بن گئی۔ ایک بچہ بے اختیار ہنسنے لگا، اعلیٰ افسر نے غصے سے وہ پتھر کھینچ کر اسے مارا... واہ...! واہ واہ پھر وہی کرشمہ ہوا۔ وہ پتھر بچے تک پہنچتے ہی پھر نوٹوں کی گڈی بن گیا۔

وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا جادو ہے؟“

پیش امام نے کہا۔ ”آپ توبہ کریں مسجد میں جادو نہیں ہوتا۔ یہ قدرتی کرامات ہیں۔ اس دولت پر صرف سرمد بستی کے باشندوں کا حق ہے۔ یہ رقم نہ ہی سرکاری خزانے میں جائے گی اور نہ ہی لٹیروں کے ہاتھ لگے گی۔“

وہ غصے سے گرجتے ہوئے بولا۔ ”تم ہمیں لٹیرا کہہ رہے ہو۔ ابھی ایک ہاتھ پڑے گا تو تمہاری ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

وہ پیش امام کی توہین کر رہا تھا۔ نماز پڑھانے والے بزرگ پر ہاتھ اٹھانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے منہ پر ایک ہاتھ پڑا۔ بڑا زبردست ہاتھ تھا۔ حلق سے

کراہ نکل گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں تو نظر آنے لگا۔

ایس ایچ او نے فوراً ہی قریب آکر پوچھا۔ ''سر! یہ... یہ کیا ہوا؟ آپ کی ناک اور باچھوں سے لہو رس رہا ہے۔''

اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا لہو کی گرمی محسوس ہوئی۔ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی کسی نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ وہ حملہ کرنے والا نظر نہیں آرہا ہے۔ یہ کیا جادو...''

وہ لفظ 'جادو' زبان پر لا کر ٹھٹک گیا۔ پیش امام نے ابھی سمجھایا تھا کہ مسجد میں جادو نہیں ہو سکتا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟ یہاں مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ یہاں کاغذ پتھر بن رہے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ عقل نہیں مانتی لیکن ہمارے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔''

''یس سر! بستی کے سب ہی لوگ کہہ رہے ہیں کہ دو فرشتے آئے تھے۔ انہوں نے تھانیدار اور سربراہ کو ان کے غنڈوں اور سپاہیوں کو موت کی سزا دی ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا، وہ دونوں ہم انسانوں میں سے نہیں تھے۔ اسی لیے یہ بستی آج سے ستارہ نگر کہلائے گی۔''

ڈی آئی جی نے حکم دیا کہ تمام لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا جائے۔ پھر اس نے فون کے ذریعے آئی جی اور ایک منسٹر سے کہا کہ یہ بات نہ عقل مانے گی، نہ قانون تسلیم کرے گا کہ آسمان سے آئے ہوئے دو ستاروں نے گیارہ بدکاروں کو موت کی سزا دی ہے۔''

منسٹر نے ڈی آئی جی اور ایس ایچ او کو طلب کیا۔ انہوں نے حاضر ہو کر وہی بیان دیا جو فون پر کہہ چکے تھے۔

منسٹر ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا یہ سن رہا تھا کہ نوٹوں کی گڈیاں صرف سرمد بستی کے لوگوں کے لیے ہیں۔ کوئی دوسرا وہ رقم لینا چاہے تو وہ گڈیاں پتھر بن جاتی ہیں۔

منسٹر نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کتنے ہی لوگ امانت میں خیانت کرتے ہیں لیکن خیانت کرنے والے کو کبھی پتھر نہیں ملتے۔''

انہیں اپنے قریب ہی آدم ربانی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر ساتھ والے خالی صوفے کو تکنے لگے۔ وہاں جیسے کوئی بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''تمہارے افسران دیکھ چکے ہیں، سرمد بستی کے باشندوں سے زبردستی کوئی ایک تنکا بھی نہیں لے سکے گا۔''

منسٹر نے خالی صوفے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ ہمیں نظر کیوں نہیں آرہے ہو؟''

جواب ملا۔ ''کبھی ضرورت پیش آئی تو ہم نظر آئیں گے۔ فی الحال تمہیں بستی کے باشندوں کی نمائندگی کرنی ہے۔ تم اعلیٰ حکمرانوں سے کہو گے کہ ترقیاتی کاموں کے لیے فی الحال ایک کروڑ روپے ادا کریں۔''

''کیا زبردستی ہے؟ کیا اس طرح حکم دے کر ایک تنکا بھی حاصل کر سکو گے؟''

''طاقت سے سونے کا پہاڑ ٹل جاتا ہے۔ تمہارے پاس فون، پولیس اور ہتھیاروں کی طاقت ہے۔ تم عوام کو کچلتے ہوئے حکومت کر رہے ہو۔ ہم نے فی الحال سرمد بستی کے ایک چھوٹے سے علاقے کو ناقابلِ تسخیر قوتوں کا مرکز بنایا ہے۔ تم اس قوت سے ٹکراؤ گے تو پاش پاش ہو جاؤ گے۔''

''اس کا مطلب ہے تم ہمارے وطن بوستان سے ایک چھوٹا سا علاقہ چھین لینے کا احمقانہ منصوبہ بنا چکے ہو۔''

''سرمد بستی بوستان میں ہے اور رہے گی۔ ہم اس علاقے کو جرائم سے پاک کر کے صحیح معنوں میں اسے پاک مقام بنائیں گے۔ فتنہ و فساد پھیلانے والے انگارے صفت لوگوں کو ہمیشہ کے لیے بھسم کر دیں گے۔''

منسٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں خواب دیکھنے سے نہیں روکیں گے۔ جادوئی ہتھکنڈوں سے غائب ہو کر بچوں کو ڈراؤ۔ ہم تمہاری دھونس میں نہیں آئیں گے۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''ہم جا رہے ہیں۔ جب تک سرمد بستی کے بیت المال میں ایک کروڑ روپے جمع نہیں کراؤ گے، تب تک تم ایک پیر میں جوتا پہنو گے، دوسرے میں پہن نہیں سکو گے۔''

منسٹر نے چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ اچانک اس نے بائیں پاؤں کے تلوے میں جلن محسوس کی۔ فوراً ہی چپل اتار کر اسے ہاتھوں میں لے کر دیکھا، اس چپل میں آگ تھی، نہ انگارے۔ اسے چھونے سے ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

ڈی آئی جی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا سر؟''

''کچھ نہیں، یونہی جلن محسوس ہوئی تھی۔''

اس نے پھر اسے پہنا اور پہنتے ہی گھبرا کر اتار دیا۔ اس پاؤں کے تلوے میں پھر ناقابلِ برداشت جلن ہوئی جیسے جلتے ہوئے انگارے... چپل اتارتے ہی ٹھنڈک پڑ گئی۔

اس نے پریشان ہو کر خالی صوفے کی طرف دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ ڈی آئی جی اور ایس ایچ او سمجھ گئے کہ اب اس کا دوسرا پاؤں ننگا رہا کرے گا۔

منسٹر نے جھنجلا کر خالی صوفے سے کہا۔ ''تم خطرناک جادوگر ہو۔ میں تمہارے زیرِ اثر آنے والا نہیں ہوں۔ ابھی اس جادو کا توڑ کراؤں گا۔''

پھر اس نے دونوں افسروں سے کہا۔ ''وہ یہاں صوفے پر بیٹھا ہے، اسے پکڑو۔ جانے نہ دو۔''

انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر خالی صوفے کو لاتیں ماریں پھر اس صوفے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈی آئی جی نے پوچھا۔ ''کیا تم موجود ہو؟''

جواب نہیں ملا۔ انہوں نے ایک طرف دیکھا ادھر ڈرائنگ روم کا دروازہ خودبخود کھل کر بند ہو گیا تھا۔ سمجھ میں آ گیا۔ وہ جا چکا تھا۔

منسٹر نے افسران سے کہا۔ ''یہ سراسر جادو ہے۔ کالے جادو کا توڑ کرنے والے جتنے عامل ہیں' انہیں کال کرو۔ وہ اپنے عمل سے جوابی حملے کریں گے تو ہم پر کیا ہوا جادو خاک ہو جائے گا۔''

وہ دونوں افسران وہاں سے چلے گئے۔ منسٹر نے فون کے ذریعے اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا۔ انہیں سرمد بستی میں آنے والے دو قاتلوں کے متعلق بتایا۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ وہ ان کی قدرتی صلاحیتوں کو جادو کہہ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جب تک اس بستی کے بیت المال میں ایک کروڑ روپے جمع نہیں کیے جائیں گے۔ تب تک وہ ایک ہی پاؤں میں جوتا یا چپل پہن سکے گا۔

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔ ''سر! میں نے آزمایا ہے جب بھی بائیں پیر میں چپل پہنتا ہوں ' پاؤں کے تلوے اَن دیکھی آگ سے جلنے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی میرا پاؤں بنا چپل کے ہے۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''ہم حیران ہیں' ایسا کیسے ہو رہا ہے؟ ہم دیکھنا چاہتے ہیں' یہ کیا جادو ہے؟ آپ یہاں تشریف لے آئیں۔''

''میں ایک ہی پاؤں میں جوتا پہن کر نہیں آسکوں گا۔ یہاں سے وہاں تک سیکیورٹی گارڈز اور ملازموں کے سامنے تماشا بن جاؤں گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ آپ آرام کریں۔ ہمارے آدمی سرمد بستی جا کر وہاں کے لوگوں کا جینا حرام کر دیں گے۔ ان مسیحا کہلانے والے قاتلوں کو سامنے آنے پر مجبور کر دیں گے۔ جب وہ ظاہر ہوں گے تو اسی دم انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔''

وہ حاکمِ اعلیٰ اپنی محل نما کوٹھی کی ایک بالکونی میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا پھر اچانک ہی حیرانی و پریشانی سے بولا۔ ''ارے یہ... یہ کیا ہو گیا...؟ میری پتلون...؟''

اس کی پتلون کمر سے ڈھلک کر اس کے قدموں میں آ گئی تھی۔ بدن پر صرف ایک شرٹ رہ گئی تھی۔ اس نے فون کو ایک طرف رکھ کر اسے دوبارہ پہننا چاہا تو پتا چلا' وہ سائز میں چھوٹی ہو گئی ہے۔

وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ جو پتلون چند لمحے پہلے سائز کے مطابق تھی وہ اچانک ہی چھوٹی ہو گئی تھی۔

یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ فی الحال فوراً ہی دوسرا کوئی لباس پہننا تھا۔ وہ دوسری پتلون یا شلوار لانے کے لیے ملازم کو آواز نہیں دے سکتا تھا۔ ملازم اس حالت میں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا۔ وہ کسی خدمت گار کے سامنے مذاق نہیں بننا چاہتا تھا۔

وہ فون بند کر کے خود ہی الماری کے پاس آیا۔ اس وقت یاد آیا' ہوم منسٹر کا بھی ایک پاؤں ننگا رہنے والا تھا۔ کیا اب اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا ہے؟ کچھ نہیں... کچھ سے زیادہ ہو رہا تھا۔ وہ نصف برہنہ ہو گیا تھا۔

اس نے الماری کھولی تو ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہاں جتنی پتلونیں اور شلواریں تھیں وہ سب چھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ صرف اوپر پہننے والی قمیصیں اس کے سائز کے مطابق تھیں۔

وہ کھلی الماری کے سامنے دیدے پھیلائے سوچ رہا تھا۔ ''اچانک یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ انہی دونوں کی شرارت ہے۔ میں سرمد بستی میں تخریبی کارروائی کرنے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی مجھ پر حملہ کر دیا گیا۔ میں صرف قمیص پہن کر باہر نہیں جا سکوں گا۔ کسی ملازم کا بھی سامنا نہیں کر سکوں گا۔''

اس نے شرٹ اتار کر ایک لمبی سی قمیص نکال کر پہنی۔ اس طرح ستر پوشی ہو گئی۔ لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ نیچے سے بے لباس ہے۔

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون کے پاس آ کر اسے اٹھایا۔ پھر دوسرا تماشا دکھائی دیا۔ ننھی سی اسکرین سادہ تھی۔ فون کرنے والے کا نمبر نہیں تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا مگر ہو رہا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آدم ربانی نے کہا۔ ''قوم اور ملک کو ننگا کرنے والے ذرا آئینہ دیکھو! ابھی تم آدھے ننگے ہو۔ کل پورے ہو جاؤ گے۔''

''کیا تم وہی سرمد بستی میں آنے والے قاتل ہو؟''

"ہم قاتل نہیں، منصف ہیں۔ ہم نے انصاف کے لیے بدترین مجرموں کو سزائے موت دی ہے۔ تم اپنی بہتری چاہتے ہو تو سرمد بستی میں تخریبی کارروائیوں سے باز آ جاؤ۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ وہاں کے بیت المال میں ایک کروڑ روپے جمع کیے جائیں۔ اب مطالبہ بڑھ گیا ہے۔ جب تک سرمد بستی کی انتظامیہ کو پانچ کروڑ ادا نہیں کرو گے تب تک اسی طرح بیرونی ممالک کا دورہ کرنے آدھے ننگے جاؤ گے۔"

فون بند ہو گیا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ مگر کوئی سننے والا نہیں تھا۔ وہ پانچ کروڑ کی حتمی ادائیگی کا فیصلہ سنا کر جا چکا تھا۔

پھر فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ ننھی سی اسکرین پر دوسرے حاکمِ اعلیٰ کا نمبر دکھائی دیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "جی اعظم صاحب! میں بول رہا ہوں۔ فرمایئے!"

دوسری طرف سے حاکمِ اعلیٰ اعظم نے کہا۔ "کیا فرماؤں معظم صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر کہوں گا تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ نیچے سے... یعنی کہ لباس اوپر ہے، نیچے نہیں ہے؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"اس طرح جانتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب...؟ کیا آپ بھی آدھے برہنہ ہیں؟"

معظم نے کہا۔ "ہاں، وہ پکے بدمعاش ہیں۔ مکار ہیں۔ ہمیں اس طرح بے بس کیا ہے کہ ہم کسی کا سامنا نہیں کر سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، کیا کروں؟ کوئی مدد کرنے آئے گا تو ہمیں شلوار نہیں پہنا سکے گا۔ ان بدمعاشوں کو پکڑ کر نہیں لا سکے گا۔"

اعظم نے کہا۔ "میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔ اگر وہ باہر سے للکاریں گے تو ہم ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ایسی حالت میں نہیں نکل سکیں گے۔ اپنے اپنے بیڈروم میں بیٹھے رہ جائیں گے۔"

"کیا ہم یہ یقین کر لیں کہ ان کا مطالبہ پورا کرتے ہی ہم پورا لباس پہن سکیں گے؟"

"اگر وہ واقعی نیک ہوں گے اور زبان کے سچے ہوں گے تو ہم پورا لباس پہن سکیں گے۔"

فون ایک پل کے لیے بند ہوا پھر ایک کو آدم رحمانی کی اور دوسرے کو آدم ربانی کی آوازیں سنائی دیں۔ "اپنی بے بسی اور مجبوریوں کو سمجھو۔ موجودہ حالات میں دولت، طاقت اور حکمرانی کام نہیں آئے گی۔ ہم چاہیں تو تمہیں اونچی کرسیوں سے ابھی نیچے گرا دیں لیکن یہ الزام آئے گا کہ ہم نے حقائق کی بنیاد پر نہیں، جادو کے زور سے تمہاری حکومت گرائی ہے جبکہ یہ جادو نہیں ہے۔ بے شک قدرت کی طرف سے سزائیں ہیں۔

"ہم پوری قوم کو رفتہ رفتہ تمہارے خلاف بیدار کریں گے اور اس دوران میں چاہیں گے کہ تم دونوں خود ہی راہِ راست پر آ جاؤ۔"

"ہم حکمرانوں کی اصلاح ضرورت کے وقت کرتے رہیں گے۔ قوم کی اصلاح مسلسل ہوتی رہے گی۔ یہ قوم جھوٹ اور جرائم سے توبہ کرے گی، ذہین اور سچے لوگوں کی طرح آئندہ حکمرانوں کا انتخاب کرے گی۔ تب یہ ملک واقعی بوستان بن جائے گا۔ یہ جن نادیدہ قوتوں کے باعث تم معمولی لباس بھی نہیں پہن رہے ہو، وہ یہ اپنا مشن پورا کر کے واپس چلی جائیں گی۔"

"آخری بات یہ ہے کہ جرمانے کے طور پر پانچ کروڑ ادا کرو۔ ادائیگی ہوتے ہی تمہیں پورا لباس مل جائے گا۔"

فون پھر آن ہوا۔ معظم نے اعظم سے پوچھا۔ "کیا تم سن رہے ہو؟ وہ جو بول رہے ہیں؟"

"ہاں، سن رہا ہوں۔ جتنی جلدی ادائیگی ہوگی، اتنی ہی جلدی ہمیں پورا لباس ملے گا۔"

"لیکن یہ تو کمزور پڑنے اور جھکنے والی بات ہوگی۔ حکمران کبھی کمزور نہیں ہوتے۔ اگر ہو جائیں تو کرسی سے گر جاتے ہیں۔"

"ہمارے ہر بُرے وقت میں سُپر طاقت کام آتی ہے۔ اس نے ہمیں دولت اور طاقت دی۔ پہننے کے لیے تھری پیس سوٹ دیے۔ کیا آج شلوار یا پتلون دے سکے گی؟"

"ضرور دے گی لیکن وہاں سے ایکسپورٹ ہونے والی پتلونیں امپورٹ ہو کر چھوٹی ہو جائیں گی۔"

"دو روز بعد مجھے 'وہائٹ اسکائی' کے دورے پر جانا ہے۔"

"اور مجھے 'بلیو اسکائی' جانا ہے۔ ہم اس حالت میں

کیسے جائیں گے؟"

دنیا کے نقشے پر وہائٹ اسکائی ایک وسیع وعریض طاقت ور ملک تھا۔ سب اسے سپر پاور کہتے تھے۔ ناقابلِ تسخیر طاقت کے حوالے سے بلیو اسکائی کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ وہائٹ اسکائی کا دوست اور دستِ راست بن کر رہتا تھا۔ ایک کو سپر پاور اوّل اور دوسرے کو سپر پاور ثانی کہا جاتا تھا۔

حاکمِ اعلیٰ اعظم نے دوسرے فون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پرسنل فون پر بڑا بیٹا کال کررہا ہے۔"

دوسرے حاکمِ اعلیٰ معظم نے کہا۔ "اور میری لاڈلی بیٹی مجھے کال کررہی ہے۔ آپ یہ فون آن رکھیں۔ ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ ہم ابھی بات کریں گے۔"

اس نے پرسنل فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ بیٹی کی آواز سنائی دی۔ "ہائے ڈیڈ! میں آرہی ہوں۔ سیکیورٹی افسر سے کہہ دیں' ہمیں نہ روکے۔"

وہ پریشان ہوگیا۔ ایسی حالت میں بیٹی کا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "ابھی نہ آؤ۔ میں میٹنگ میں ہوں۔"

"نو پرابلم۔ آپ میٹنگ میں رہیں۔ میں مام کے ساتھ بیڈروم میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"فون اپنی مام کو دو۔"

تھوڑی دیر بعد اسے بیوی کی آواز سنائی دی۔ وہ گھر والی کے انداز میں بولی۔ "کیا آپ کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہے کہ بیوی بچوں سے مل سکیں؟"

"ابھی ملوں گا لیکن پہلے تاباں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر تنہا بیڈروم میں آؤ۔ ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ آؤ گی تو معلوم ہوجائے گا۔"

اس نے فون بند کردیا۔ دوسرے فون پر اعظم نے کہا۔ "میرا بیٹا بھی اپنی ماں کے ساتھ آیا ہے۔ میں ابھی فون بند کررہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔"

ان کا سیاسی رابطہ ختم ہوگیا۔ گھریلو رابطہ شروع ہوگیا۔ بیگم بیٹے کے ساتھ بیڈروم کے دروازے پر آگئی۔ دستک دیتے ہوئے بولی۔ "اندر سے بند کیوں کیا ہے؟ وہاں کیا ہورہا ہے؟ فوراً کھولو۔"

وہ دروازے سے لگ کر بولا۔ "ابھی کھولتا ہوں۔ اگر بیٹا تمہارے ساتھ ہے تو اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کو کہو۔ اکیلی آؤ گی تو دروازہ کھولوں گا۔"

"ایسی کیا بات ہے کہ بیٹے کے سامنے نہیں آؤ گے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ کچھ ایسی بے شرمی کی بات ہے کہ بول نہیں سکتا۔ اندر آ کر دیکھ لو۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "پہلے ہی شرم آجاتی تو یوں منہ نہ چھپاتے۔ جوان بیٹا ہے، بہو ہے، پوتے پوتیاں ہیں اور اس عمر میں یہ چھن ہیں۔"

بیٹے نے سنا تو کہا۔ "مام! میں ادھر بالکونی میں رہوں گا۔ آپ جائیں۔"

وہ بالکونی کی طرف چلا گیا۔

بیگم نے دستک دے کر کہا۔ "کوئی نہیں ہے۔ دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھل گیا۔ میاں کو دیکھتے ہی بیگم کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ وہ غصے سے بولی۔ "کہاں ہے وہ کلموہی...؟"

اس نے بیگم کا ہاتھ کھینچ کر اندر کیا اور دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "کسی کلموہی نے ایسا نہیں کیا ہے' پہلے میری بات سن لو۔"

"جب دیکھ رہی ہوں تو سننے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ اسی لیے سرکاری محل میں رہتے ہو تاکہ بچے تمہارے کرتوت نہ دیکھ سکیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڈ کے نیچے الماری کے پیچھے جارہی تھی۔ پردے ہٹا کر بھی دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "اعظم! اپنی اوقات نہ بھولو۔ تم دو ٹکے کے آدمی تھے۔ میرے باپ نے تمہیں سیاسی لیڈر بنایا' تم پر کروڑوں روپے خرچ کیے۔ تم وہائٹ اسکائی کے صدر بھی بن جاؤ' تب بھی میرے پیروں کی جوتی ہی رہوگے۔"

وہ اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ ہے تمہاری اوقات۔ میرے ڈر سے اوپر پہنا' جلدی میں نیچے نہ پہن سکے۔"

بیگم نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا پھر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ؟"

وہ عاجزی سے بولا۔ "تمہاری قسم یہاں کوئی نہیں ہے۔ پہلے میری بات سن لو۔ فار گاڈ سیک، تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوجاؤ، مجھے بولنے دو۔"

وہ ایک صوفے پر دھنستے ہوئے بولی۔ "میں خوب سمجھتی ہوں' تم نے اسے کھڑکی کے راستے بھگا دیا ہے۔"

"تم چپ نہ ہوئیں تو میں بھاگ جاؤں گا۔ اگر یہاں کوئی آتی تو سیکیورٹی والے پہلے اسے چھپاتے یہاں سے بھگاتے پھر تمہیں آنے کی اجازت دیتے۔"

وہ بولی۔ "یہی ہوا ہے۔ پہلے اسے بھگایا گیا ہے۔"

پھر مجھے یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے۔''
''اگر اب تم چپ نہ ہوئیں تو میری ایک کال پر سیکیورٹی والے آکر تمہیں یہاں سے رخصت کردیں گے۔''
وہ چپ ہوگئی۔ اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''الماری کھول کر دیکھو! میری تمام پتلون اور شلواریں چھوٹی ہوگئی ہیں۔ لعنت ہے ان دونوں پر۔ پتا نہیں کہاں سے مرنے آگئے ہیں۔ ان کا عذاب مجھ پر نازل ہورہا ہے۔ جب تک ہم تمام اعلیٰ حکمران پانچ کروڑ روپے ادا نہیں کریں گے' اسی طرح آدھے ننگے رہیں گے۔''
بیگم نے اٹھ کر الماری کھول کر دیکھا تو غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''یہ کیسے ہوگیا؟ جو پانچ کروڑ کا مطالبہ کررہے ہیں' وہ شریف اور ایمان دار ہو ہی نہیں سکتے۔ یقیناً کالا جادو کررہے ہیں۔''
''وہ اپنے لیے نہیں' ایک چھوٹے سے علاقے کو جھوٹ' فریب اور ہر طرح کے جرم سے باز رکھ کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ملک واقعی خوشبو کی آماج گاہ ہے۔''
''یعنی وہ ہمارے خلاف عوام کو بھڑکا رہے ہیں۔ کیا پانچ کروڑ میں ایک چھوٹا سا علاقہ سچا' ایماندار اور خوشحال ہوجائے گا؟''
''وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے آئندہ بھی اچھی خاصی رقمیں طلب کرتے رہیں گے۔''
''آپ انہیں پھوٹی کوڑی بھی نہ دیں۔''
''نہیں دوں گا تو ایسا ہی رہوں گا۔ انسانی تاریخ میں کوئی ننگا حکمران نہیں آیا۔ میں وہائٹ اسکائی کے دورے پر کیسے جاؤں گا؟''
''آپ دھوتی پہن کر دیکھیں، شاید وہ چھوٹی نہیں پڑے گی۔''
''یہ سرکاری محل ہے۔ یہاں دھوتی نہیں ہے۔''
وہ شاپر سے ایک ساڑی نکالتے ہوئے بولی۔ ''ابھی خرید کر لائی ہوں۔ پورے دو لاکھ کی ہے۔ اصلی سونے چاندی کے تاروں سے کڑھائی کی گئی ہے۔''
''کیا یہ پہن کر باہر جاؤں گا؟''
''باہر نہیں جائیں گے مگر ہمارے بچوں کے سامنے ننگے تو نہیں رہیں گے۔ آزما کر دیکھیں۔ شاید یہ ساڑی نہ اُترے۔''
مرد اور ساڑی پہنے...؟ یہ گوارا نہ تھا پھر بھی اس نے آزمائش کے طور پر اسے دھوتی کی طرح پہنا۔ پھر سر جھکا کر غور سے دیکھا۔ وہ نہ چھوٹی ہورہی تھی' نہ نیچے گر رہی تھی۔ بیگم نے جیسے اسی کے لیے شاپنگ کی تھی۔
اس نے یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی کہ رشتے داروں اور ملازموں کے سامنے ننگا نہیں رہے گا۔ پھر وہاں سے گھوم کر قدِآدم آئینے میں دیکھا تو شرم آئی۔ وہ اوپر سے مرد اور نیچے سے عورت لگ رہا تھا۔
اس نے فوراً ہی اسے اتارتے ہوئے کہا۔ ''اسے پہن کر اور تماشا بن جاؤں گا۔ اس سے تو بہتر ہے' اپنی قمیص کے دامن کا پردہ رکھوں اور ننگا رہوں۔''
اس نے الماری کے نچلے حصے سے بستر کی چادر نکالی۔ پھر اسے دھوتی کی طرح باندھا۔ وہ بالکل سادہ سی چادر تھی۔ باندھ کر ہاتھ ہٹاتے ہی وہ کھل گئی۔ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ ''کیا کروں؟ کس سے مدد مانگوں؟ کون ایسا ہے جو مجھے پورا لباس پہنا سکے؟''
بیگم اسے ہمدردی سے دیکھ رہی تھی۔ سنجیدگی سے سمجھا رہی تھی۔ ''فی الحال میری ساڑی پہن لو۔ میں بیٹے کو بلاتی ہوں۔ وہ کسی عامل کے پاس جا کر اس جادو کا توڑ کرائے گا۔''
فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اسے کان سے لگاتے ہی دوسری طرف سے معظم خان نے پوچھا۔ ''کیا جادو سے نجات مل رہی ہے؟ یہاں میری بیگم بھی پریشان ہے۔ ہم نے بیٹے کو اپنے بیڈروم سے دور رکھا ہوا ہے۔ یہ کیا عذاب ہے کہ اپنی اولاد کا بھی سامنا نہیں کرسکتے۔''
پھر اس نے کہا۔ ''کوئی عامل ہی ہمیں اس مصیبت سے نکالے گا۔ فی الحال میں نے بیگم کی چمک دمک والی ساڑی باندھی ہے۔ دوسری چادر باندھتا ہوں تو وہ کھل جاتی ہے۔ آپ بھی اپنی بیگم کی کوئی رنگین اور چمک دمک والی ساڑی باندھ لیں عارضی طور پر نجات مل جائے گی۔''
''ٹھیک ہے، میں یہی کرتا ہوں۔''
حاکمِ اعلیٰ اعظم نے فون بند کرکے بیگم سے کہا۔ ''ساڑی اتارو۔''
بیگم نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''کیا دماغ چل گیا ہے۔ جوان بیٹی ڈرائنگ روم میں آپ سے ملنے کی منتظر ہے اور آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''
''مجھے تمہاری ساڑی پہننی ہے۔ ابھی اعظم صاحب نے بھی کیا ہے۔ اپنی بیگم کی ساڑی پہن کر پوری طرح ملبوس ہوگئے ہیں۔''
وہ بے دلی سے بولی۔ ''آپ کے لیے تو جان بھی

دے سکتی ہوں لیکن ابھی تقریب میں جانا ہے۔ ایسی مہنگی ساڑی وہاں کسی نے پہنی نہ ہوگی۔ میں اعظم صاحب کی بیگم کو جلانا چاہتی ہوں۔ ایسا کریں، میں دوسری ساڑی گھر سے منگوائی ہوں۔"

"نہیں بیگم! مجبوری ہے۔ معظم صاحب کہتے ہیں چمک دمک والی مہنگی ساڑی سے نجات ملے گی۔ دیر نہ کرو فوراً اتارو۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اتارنے لگی۔" آگ لگے ان قاتل بدمعاشوں کو میری ساڑھے تین لاکھ کی ساڑی برباد ہورہی ہے۔"

اس نے ساڑی لے کر پہنی۔ آئینے میں دیکھا، اطمینان ہوا کہ برہنگی نہیں رہی لیکن شرم آرہی تھی۔ اس نے کہا۔" اپنے بچوں کے سامنے کیسے جاؤں گا؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔" یہ بعد میں سوچیں ،ابھی بیٹی سے ملیں۔ وہ بور ہورہی ہے۔"

بیگم نے دروازہ کھول کر آواز دی۔" تاباں! آجاؤ تمہارے ڈیڈی بلارہے ہیں۔"

تاباں خوش ہوکر آئی، پھر باپ کو دیکھ کر حیرانی سے بولی" اوہ ڈیڈ! یہ کیا؟ آپ نے موم کی ساڑی اتروا کر پہنی ہے؟"

بیگم نے کہا۔" ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ یہاں بیٹھو، تم عبادت کرتی ہو، تمام فرائض ادا کرتی ہو، شاید اس مسئلے کا حل بتاسکوگی۔"

وہ باپ کو حیرانی و پریشانی سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ماں اسے بتانے لگی کہ اس کے باپ اور دوسرے حاکمِ اعلیٰ اعظم صاحب کو کس طرح دو بندے سزا دے رہے ہیں۔

تاباں نے تمام واقعات سُن کر کہا۔" اگر وہ ہمارے ملک کے ایک چھوٹے سے علاقے سرمد بستی سے جھوٹ فریب اور جرائم ختم کرنے آئے ہیں تو وہ واقعی نیک ہوں گے۔ میں ان سے ضرور ملوں گی۔"

باپ نے سخت لہجے میں کہا۔" ہماری یہ حالت دیکھ کر بھی دشمنوں سے ملنا چاہتی ہو؟"

"ڈیڈ! جرائم کا خاتمہ کرنے والے دشمن نہیں ہوسکتے۔ میں نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے دوران آپ کو سمجھایا تھا کہ ایک بہترین سیاستداں بن کر نیک نامی حاصل کریں لیکن اقتدار ملتے ہی آپ فرعون بن گئے۔"

"بکواس مت کرو، تمہیں تو دینی تعلیم دلاکر پچھتا رہا ہوں۔ جب دیکھو باپ پر تنقید کرتی رہتی ہو۔

"صرف میں ہی نہیں، پوری قوم آپ کی حکومت کے خلاف بول رہی ہے۔ اب دو فرشتے نما انسان آگئے ہیں تو خدا کے لیے سنبھل جائیں، ان کی بات مان لیں۔ ایک مثالی بستی بنانے کے لیے پانچ کروڑ ادا کردیں۔"

باپ نے اسے سوچتی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا تم سرمد بستی جاؤ گی؟"

"میری پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ میں ان نیک بندوں سے ملاقات کروں اور ان کی ہدایات کے مطابق کام کروں۔"

"ہم دو دن کے اندر سرمد بستی کے تعمیری کام کے لیے پانچ کروڑ کا بجٹ پاس کرائیں گے۔ تم اس کے عوض ان دونوں سے ہماری دوستی کراؤ۔"

"آپ موجودہ اعمال سے توبہ کریں، خود ہی دوستی ہوجائے گی۔"

"بکواس مت کرو، اس دنیا میں افضل و برتر رہنے کے لیے جو کیا جاتا ہے، وہی ہم کررہے ہیں۔"

ماں نے سمجھایا۔" پانچ کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم ان سے اتنی سی بات منوالو کہ وہ تمہارے ڈیڈی کو حکومت کے پانچ سال پورے کرنے دیں اور انہیں کسی طور کمزور نہ بنائیں اور اس طرح مجبور نہ کریں، جیسا اب کررہے ہیں۔"

تاباں نے کہا۔" آپ میرے لیے دعا کریں کہ مجھے ان فرشتوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ پھر آپ مدعا ان سے بیان کروں گی۔"

معظم نے کہا۔" پتا نہیں ان سے کب تمہاری ملاقات ہوگی کیا ہم اس وقت تک ساڑی پہن کر رہیں گے؟"

وہ باپ کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔" آپ عوام کو دکھانے کے لیے کبھی کبھی عبادت کرتے ہیں، آج دل سے عبادت کریں، توبہ کریں۔ انشاء اللہ موجودہ پریشانی ختم ہوجائے گی۔ میں دوسرے کمرے میں جاکر نماز پڑھوں گی۔ آپ کے لیے دعا مانگوں گی۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ ایسے وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے فون کے پاس آکر ننھی سی اسکرین کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کسی کال کرنے والے کا فون نمبر نہیں تھا اور کالنگ ٹون اُبھر رہی تھی۔

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دو افراد کی آواز بیک وقت سنائی دی۔" السلام علیکم..."

اس نے کہا۔" وعلیکم السلام..."

پھر ایک نے کہا۔ ”تم پر خدا کی رحمت ہو، میرا نام آدم ثانی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”میرا نام آدم ربانی ہے۔ سرمد بستی میں آؤ۔ ہم سے ملاقات ہوگی۔“

تاباں کا دل مسرتوں سے بھر گیا۔ آدم ثانی نے کہا۔ ”تمہارے نیک ارادوں اور نیک اعمال کے طفیل ہم اس شرط پر ان کی سزائیں معاف کرتے ہیں کہ وہ دو دن کے اندر سرمد بستی کے بیت المال میں پانچ کروڑ پہنچا دیں گے۔“

آدمی ربانی نے کہا۔ ”اپنے والد کو اسلامی تہذیب کے مطابق مخاطب کرو، ڈیڈی نہ کہو۔“

وہ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی، اس سے پہلے ہی فون بند ہوگیا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ماں باپ کے پاس آئی پھر بولی۔ ”ابو! امی! میں آج سے آپ دونوں کو اپنی تہذیبی روایات کے مطابق مخاطب کروں گی اور یہ خوش خبری سناتی ہوں کہ اگر دو دن کے اندر ان کا مطالبہ پورا کردیا جائے گا۔ آپ وعدہ کریں گے تو اسی وقت پورا لباس نصیب ہوگا۔“

معظم نے جلدی سے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں، دو دن میں ان کے بیت المال میں پانچ کروڑ پہنچ جائیں گے۔“

تاباں نے الماری کے پاس جاکر اس کے پٹ کھولے۔ اندر رکھے ہوئے ملبوسات کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا پھر کہا۔ ”میں جارہی ہوں۔ آپ لباس پہن لیں۔“

ماں نے پوچھا۔ ”کہاں جارہی ہو؟“

”میں صبح ہونے کا انتظار نہیں کروں گی۔ ابھی سرمد بستی جارہی ہوں۔“

وہ کوئی جواب سنے بغیر چلی گئی۔ معظم نے الماری کے پاس آکر دیکھا تو حیران ہوا۔ خوش ہوکر بولا۔ ”یہ تو پہلے کی طرح ہوگئے ہیں۔“

اس نے فوراً ہی ساڑی اتار کر پتلون پہنی پھر مارے خوشی کے بیگم سے لپٹ گیا۔ اسے پورا لباس مل گیا تھا۔ بیگم نے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو پورا لباس پہننے دیں۔“

وہ اپنی ساڑی اٹھا کر پہننے لگی۔ ”شکر ہے زیادہ سلوٹیں نہیں آئی ہیں۔“

تاباں ڈرائنگ روم سے گزر رہی تھی۔ کالنگ ٹون سن کر رک گئی۔ اس نے نمبر پڑھے، معظم کا دوسرا بیٹا حماد کال کررہا تھا۔ وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولی۔

”ہاں بولو، کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”بات تو دل کی ہے۔ دل کو سمجھنا چاہیے۔“

اس نے کہا۔ ”میں پہلے بھی جواب دے چکی ہوں، میرے سینے میں دل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔“

”دیکھو فون بند نہ کرنا۔ میں تمہیں ایک ایسی انوکھی بات بتا رہا ہوں جو میرے ڈیڈ کے ساتھ ہورہی ہے۔“

”میں جانتی ہوں، کچھ اور کہنا ہے؟“

”یہ بتادو کہاں ہو؟“

”جہاں بھی ہوں، وہاں سے سرمد بستی جارہی ہوں۔“

”یہ تو ہمارے شہر کا ایک دورافتادہ علاقہ ہے؟“

”دور ہے تو کیا ہوا؟ میں دو فرشتہ صفت انسانوں سے ملنے جارہی ہوں۔“

”اوہ گاڈ! تم رات کو اجنبیوں سے ملنے جارہی ہو؟“

”فرشتوں سے کسی وقت بھی ملاقات کی جاسکتی ہے۔“

حماد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی ان کا ذکر سن رہا ہوں۔ وہ فرشتے کہلا رہے ہیں مگر اب بے چارے فرشتے نہیں رہیں گے۔ تمہیں دیکھتے ہی نیت خراب ہوجائے گی۔“

”یو شٹ اپ!“

اس نے فون بند کیا پھر کوٹھی کے انٹرنس میں آئی۔ وہاں سے اپنی عبا اور نقاب اٹھا کر پہنا۔ اس کے بعد باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگی۔

حماد اپنے عیاش دوستوں کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ ایک دوست نے بھرا ہوا گلاس بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ نہیں پھنسی؟“

وہ ایک گھونٹ حلق سے اتار کر بولا۔ ”آج ضرور پھنسے گی۔ رات کے وقت سرمد بستی جارہی ہے۔ اسے راستے سے ہی اڑایا جاسکتا ہے۔“

”یار! وہ معظم صاحب کی بیٹی ہے۔ اسے ہاتھ لگائیں گے تو زندہ نہیں بچیں گے۔“

حماد نے اپنے فون پر نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”وہ معظم کی بیٹی کو اغوا کرنا ہے۔ حوصلہ کرو گے تو کل صبح پچاس ہزار مل جائیں گے۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہم نے بیس ہزار کے لیے اپنی ایک عورت کو آپ کے پاس پہنچایا تھا۔ پچاس ہزار کے لیے تو جان کی بازی لگادیں گے۔“

’’تو پھر فوراً نکلو۔ وہ ابھی کوٹھی سے نکلی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے اس بستی میں نہیں پہنچے گی۔ اسے راستے سے اٹھالو۔ اس کی کار پہچانتے ہونا؟‘‘

’’ہم پہچان لیں گے۔ ایک گھنٹے بعد خوش خبری سنائیں گے۔‘‘

رابطہ ختم ہوگیا۔ ایک انار ہوتا ہے اور سو بیمار ہوتے ہیں اور بھی شکاری تھے جو تاباں کی تاک میں تھے۔ اپوزیشن کے ایک بہت بڑے لیڈر مبارک چنگیزی کا بیٹا کامل چنگیزی ہزار جان سے تاباں پر عاشق ہوگیا تھا۔ عاشق اس لیے ہوگیا تھا کہ تاباں حاکم اعلیٰ معظم کی اکلوتی بیٹی تھی۔

معظم اپنے حلقے سے ہر الیکشن میں ووٹوں کی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوکر اسمبلی پہنچتا تھا۔ اگر کامل چنگیزی کسی طرح اس کا داماد بن جاتا تو اسے بھی اسمبلی میں گھس کر کسی صوبے کا وزیر بننے کا موقع ضرور مل جاتا۔ کامل اپنے طور پر جال پھینکنے کی بھرپور کوششیں کرتا رہا تھا۔ انتہائی شریف اور پرہیزگار بن کر اس سے دو بار لائبریری میں اور شادی کی تقریب میں ملاقات کرچکا تھا اور یہ معلوم کرچکا تھا کہ وہ عشق و محبت کو چوری چھپے کا ناجائز کھیل سمجھتی ہے۔ وہ فون پر میسج کا جواب نہیں دیتی تھی۔ کہتی تھی، کسی نامحرم سے چھپ کر گفتگو کرنا سراسر بے حیائی ہے۔ یوں سمجھ میں آگیا تھا کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔

اس وقت بھی اس نے تاباں کو اپنے باپ کے سرکاری محل میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اس محل سے اسے تنہا نکلتے دیکھ کر حواریوں سے کہا۔ ’’یہ اچھا موقع ہے۔ جیسی پلاننگ کی تھی، اس پر عمل کرو۔ فوراً اس کا پیچھا کرو۔‘‘

پلاننگ یہ تھی کہ اس کے حواری تاباں کو اغوا کرنا چاہیں گے۔ ایسے وقت وہ فلمی ہیرو کی طرح آکر ان کا مقابلہ کرے گا پھر ان حواریوں کو شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور کردے گا۔ یوں تاباں کی عزت آبرو بچا کر اس کا دل جیت لے گا۔

اس کے باپ نے اسے سمجھایا تھا۔ ’’ایسی پلاننگ کرو کہ تاباں کا دل بھی جیت لو اور پورے الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں دھوم بھی مچ جائے کہ تم نے جان پر کھیل کر اس کی عزت بچائی ہے۔‘‘

بیٹے نے پوچھا۔ ’’ایسی کیا پلاننگ ہوسکتی ہے؟‘‘

اپوزیشن کے گھاگ لیڈر مبارک چنگیزی نے کہا۔ ’’بیٹے! تاباں کی عزت اور جان بچانے کے لیے تمہیں زخمی ہونا پڑے گا۔ ذرا تکلیف سہنی پڑے گی۔ اپنے ہی کسی حواری کی گولی کا نشانہ بننا ہوگا۔‘‘

اس نے ٹھٹک کر باپ کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ’’بیٹے سیاست سیکھو! ایک گولی تمہارے بازو میں یا کمر کے نیچے کہیں لگے گی تو تمہیں اسپتال پہنچایا جائے گا۔‘‘

بیٹے نے پوچھا۔ ’’آپ مرنے کا سبق کیوں پڑھا رہے ہیں؟‘‘

’’میری بات سمجھو۔ تمہیں جانی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپریشن کے بعد تم زندہ رہوگے اور وہ نئی زندگی تمہیں صرف تاباں کی نظروں میں ہی نہیں، پوری دنیا کی نظروں میں بھی ہیرو بنادے گی۔ میں اپوزیشن پارٹی کو چھوڑ کر معظم کی سیاسی پارٹی جوائن کروں گا تو وہ تمہیں داماد بنانے کے لیے گلے سے لگالے گا۔‘‘

کامل نے باپ کے مشورے پر غور کیا۔ وہ جان کی بازی لگا کر تاباں کی محبت اور اس کے باپ کی سیاست کو جیت سکتا تھا۔ پھر وہ ٹی وی اور اخبارات میں دن رات خبروں کا مرکز بن جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک معروف سیاست داں کی بلندیوں پر پہنچ جاتا۔

یہ اس کے سیاست داں باپ مبارک چنگیزی کی زبردست کامیابی حاصل کرنے والی پلاننگ تھی لیکن کامل چنگیزی موت سے ڈرتا تھا۔ وہ تو گولی لگنے کے تصور سے ہی لرز گیا تھا۔ ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ’’میں گولی کھائے بغیر ہی تاباں کا دل جیت لوں گا۔ آپ اپنی سیاست رہنے دیں۔‘‘

اس رات وہ خود کو محفوظ رکھنے والی پلاننگ کے مطابق اپنے حواریوں سے مقابلہ کرنے والا تھا۔ پھر انہیں مار بھگا کر تاباں کی نظروں میں ہیرو بننے والا تھا۔ اس طرح موت کا دھڑکا نہ رہتا۔ یعنی... ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا۔

دوسری طرف حماد خود اپنی کوٹھی سے نکل کر تاباں کے تعاقب میں جارہا تھا۔ اس کے حواری پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔ ایک لڑکی کار ڈرائیو کرتی ہوئی جارہی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ عزت و آبرو کے دشمن کس طرح چاروں طرف سے جھپٹنے والے ہیں۔

کامل نے فون کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔ ’’ہیلو تاباں! تم تنہا کہیں جارہی ہو۔ میں نے تمہیں ابھی راستے سے گزرتے دیکھا ہے۔‘‘

اس نے پوچھا۔ ’’کیا تم میرے پیچھے آرہے ہو؟‘‘

’’میں دل سے مجبور ہوں تمہیں رات کو تنہا کہیں

جانے نہیں دوں گا۔"

"تمہارا دل ہے، تمہاری مجبوریاں ہیں۔ تم جانو۔ مجھے خوامخواہ متاثر کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"تم کچھ بھی کہو، میں تمہارا محافظ بن کر رہوں گا۔"

تاباں نے فون بند کر دیا۔

سرمد بستی تین کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ وہ بڑے آرام سے ڈرائیو کرتی ہوئی آدم رحمانی اور آدم ربانی کے متعلق سوچتی جا رہی تھی۔ دین ایمان اور نیکیوں کے حوالے سے وہ عوام کے لیے فلاحی تعمیری کام کرنا چاہتی تھی اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے اپنے باپ کے گناہوں کی معافی چاہتی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی' پتا نہیں وہ دونوں کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کیسی حیرت انگیز اور عجیب صلاحیتیں رکھتے ہیں؟ کیا واقعی انسان کے روپ میں فرشتے ہیں؟ یا خدا کے ایسے نیک بندے ہیں' جو اپنے بہترین اعمال کے باعث فرشتے کہلا رہے ہیں؟

اس نے اچانک ہی بریک لگا کر گاڑی کو روکا۔ سامنے سے آنے والی گاڑی نے ایک ذرا گھوم کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

اس نے خطرہ محسوس کرتے ہی پیچھے جانے کے لیے ریورس گیئر لگایا۔ پھر رک گئی۔ عقب نما آئینے میں پیچھے بھی ایک گاڑی نے آکر راستہ روک لیا تھا، اس میں سے چار افراد باہر نکل رہے تھے۔

آگے والی گاڑی میں سے بھی چار مسلح افراد نمودار ہو رہے تھے۔ جو آگے اور پیچھے سے آئے تھے ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی رکاوٹ بننے آجائے گا جبکہ چار ادھر تھے تو چار ادھر بھی تھے اور سب ہی مسلح تھے۔

اس ڈرامائی سچویشن میں آٹھ مسلح افراد کافی نہیں تھے لہٰذا تیسری طرف سے اندھیرے میں کامل نے للکارا۔ "خبردار! تاباں کے قریب کوئی جائے گا تو حرام موت مرے گا۔"

چوتھی طرف سے تاریکی میں حماد نے للکارا "کامل! میں نے تیری آواز پہچان لی ہے۔ اپوزیشن کے بدمعاش باپ کے بدمعاش بیٹے! تو میری تاباں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔"

پھر اس نے اپنے حواریوں کو حکم دیا۔ "چلاؤ گولی، مار دو ان کتوں کو۔"

کامل نے بھی اپنے حواریوں کو یہی حکم دیا پھر تو گولیاں پٹاخے کی طرح چلنے لگیں۔ تاباں سہم کر سیٹ کے نیچے دبک گئی۔ دو گولیاں اس کی کار کی باڈی سے لگتی ہوئی گزر گئی تھیں۔

اس وقت اس نے دو قدآور سفید پوش افراد کو دیکھا۔ وہ اس کے آس پاس کار کے باہر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان لمحات میں ان دونوں کے وجود سے ایسی خوشبو آ رہی تھی کہ وہ سحرزدہ سی ہو گئی اور اب گولیاں ادھر نہیں آ رہی تھیں۔ ان کا رخ بدل گیا تھا۔ مرنے والے چیخ رہے تھے اور جہنم میں جا رہے تھے۔ ایسے وقت کامل کے حلق سے چیخ نکلی۔ ایک گولی اس کی گردن کی ہڈی توڑتی ہوئی گزر گئی وہ اوندھے منہ گر کر تڑپ رہا تھا۔

باپ نے سیاسی نسخہ بتایا تھا کہ حوصلہ کر کے ایک گولی کھا لے۔ وہ ایک گولی اسے اسمبلی میں پہنچائے گی لیکن اس بزدل نے انکار کیا تھا۔ اب انکار کے باوجود موت کا مزہ چکھ رہا تھا۔

تاباں ان دو فریقوں کے درمیان محفوظ تھی۔ فون پر باپ سے کہہ رہی تھی۔ "ابو، میں فائرنگ کرنے والوں کے درمیان گھر گئی ہوں اور فائرنگ کرنے والے حماد اور کامل چنگیزی کے آدمی ہیں۔ میں نے ان دونوں کی آوازیں سنی ہیں۔"

معظم نے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں ایک غیر آباد علاقے میں ہوں۔ سرمد بستی یہاں سے دو یا تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہو گی۔"

"بیٹی! حوصلہ رکھو۔ ابھی پولیس فورس وہاں پہنچ جائے گی۔"

اس نے فون بند کیا۔ اسی وقت حماد کی چیخ سنائی دی۔ ایک گولی اس کے کولہے کی ہڈی توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دونوں طرف کے حواری مارے گئے تھے۔ جو بچ گئے تھے' وہ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔

اچانک خوشبو گم ہو گئی۔ تاباں نے دائیں بائیں دیکھا۔ کار کے باہر ڈھال بننے والے غائب ہو گئے تھے۔ آگے میدان صاف تھا۔ راستہ روکنے والے اپنے انجام سے دوچار ہو رہے تھے۔ تاریکی میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ انہیں تو پولیس آ کر دریافت کرنے والی تھی۔

تاباں نے بدمعاش عاشقوں کی ڈرامے بازی پر لعنت بھیج کر کار اسٹارٹ کی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے سوچنے لگی۔ سرمد بستی میں کہاں جائے گی؟ اللہ کے ان نیک

بندوں سے کہاں ملاقات ہوگی؟

وہ سوچ رہی تھی اور بے خیالی میں کار کا اسٹیئرنگ خود بخود گھوم کر راستے بدل رہا تھا پھر وہ کار ایک اسکول کی عمارت کے پاس آکر رک گئی۔

اس عمارت کے اندر اور باہر روشنی تھی۔ بستی کے بہت سے لوگ جیسے اس کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ سب سے آگے آدم ربانی اور آدم رحمانی تھے اور سب سے الگ دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی کار کا دروازہ کھولا۔

اس نے کار سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''السلام علیکم''

پورے ہجوم نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ آدم ربانی اور رحمانی نے دعائیہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم پر خدا کی رحمت ہو۔ آؤ اس بستی کے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔''

وہ اُن دونوں کے درمیان چلتی ہوئی اسکول کے ایک بڑے کمرے میں آئی۔ وہاں بچے فرش پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ میز اور کرسیاں نہیں تھیں۔ اس وقت فرش پر دریاں اور چٹائیاں بچھائی گئی تھیں۔ سب لوگ ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی افراد دیواروں سے لگ کر کھڑے تھے۔ تاباں بھی آدم ربانی اور رحمانی کے ساتھ لوگوں کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔

آدم ربانی نے کہا۔ ''ہم چاہیں تو یہاں ابھی آرام دہ صوفے اور تخت طاؤس آجائے۔ یہ اسکول کئی منزلہ عمارت بن جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی مدد آپ کرنے اور ایک دوسرے کے کام آنے کے لیے بھیجا ہے۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''اس قوم کے اندر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور دنیا میں خود کو نمایاں رکھنے کا جذبہ ہے لیکن فرعونی طاقتیں اس جذبے کو کچل رہی ہیں۔ طاقت کے جواب میں طاقت لازمی ہے' اس لیے ہم آئے ہیں۔ ہم تمہیں بیٹھنے کے لیے آرام دہ صوفہ اور سونے کے لیے پھولوں کی سیج نہیں دیں گے۔ صرف ان طاقتوں کو کمزور کریں گے' جو تمہیں کچل رہی ہیں۔

''یاد رکھو! شیطانی قوتوں سے لڑنے کے دو ہی ہتھیار ہیں۔ ایک ایمان اور دوسرا سچائی... ہم تمہارے ان ہتھیاروں کو تیز اور کارآمد بنانے کے لیے تمہیں جھوٹ اور فریب سے باز رکھیں گے اور باز نہ آنے پر سخت سزائیں دیں گے۔

''موجودہ حکمران تمہاری اہم بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہم تمہارے تمام حقوق ان سے حاصل کرتے رہیں گے۔ تمہیں صرف ایک ہی کام کرنا ہے۔ ہر طرح کی غلطیوں سے باز رہنا ہے۔ سچ بولو گے' ایک دوسرے کی عزت کرو گے تو پھر کسی کو بھی دھوکا نہیں دو گے۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے رہنے سے معاشرے کی بہت سی خرابیاں آپ ہی آپ دور ہوتی چلی جائیں گی۔''

''یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ ہمارے آجانے سے تمہاری مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔ تم ایمان کے راستوں پر چل کر اپنی مشکلیں خود آسان کرو گے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم تم سے مایوس ہو کر چلے جائیں گے۔ کیونکہ جس طرح ہمارے بغیر تم فرعونی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکو گے' اسی طرح ہم تمہاری ایمانی قوتوں کے بغیر جھوٹ' فریب اور جرائم کا خاتمہ نہیں کرسکیں گے۔''

''ہمیں کم سے کم وقت میں بہت سے ابتدائی فرائض انجام دینے ہیں۔ کل صبح انتظامیہ کے ممبران کا انتخاب کرو اور کسی بینک میں سرمد بستی کا بیت المال قائم کرو۔ انشاء اللہ آج سے دو دنوں کے بعد ہمارے بیت المال میں پانچ کروڑ روپے جمع ہوجائیں گے۔''

سب نے بیک زبان کہا۔ ''سبحان اللہ، جزاک اللہ...''

یہ تاکید کی گئی تھی کہ لوگ خوش ہو کر تالیاں نہ بجائیں اور زندہ باد کے نعرے نہ لگائیں۔ کامیابی اور خوشی کے موقع پر خالقِ حقیقی کا شکرادا کیا کریں۔

آدم رحمانی نے کہا۔ ''ہمارے حکمرانوں کے دلوں میں انصاف نہیں ہے لیکن یہ ابھی انسانوں کی سچی خدمت کے جذبات لے کر ہماری بستی میں آئی ہیں۔ آپ ان کی باتیں سنیں۔''

تاباں نے اٹھ کر کہا۔ ''میں زیادہ نہیں بولوں گی۔ جو کرنا ہے' وہ آپ حضرات کے ساتھ عملی طور پر کرتی رہوں گی۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہمارے حکمرانوں کی کتنی دولت وہائٹ اسکائی اور بلیو اسکائی کے بینکوں میں محفوظ ہے۔ ان کی اولاد کے بینک اکاؤنٹس میں کروڑوں روپے صرف جیب خرچ کے لیے ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے ذاتی اکاؤنٹ میں ستر کروڑ روپے ہیں۔''

سب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''آپ کے لیے ستر کروڑ بہت ہیں۔ لیکن ہمارے سامنے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہم صبح بوستان میں ناشتا کرتے ہیں۔ دوپہر کو سمندر پار بلیو اسکائی میں لنچ کرتے ہیں اور رات کا کھانا

سات سمندر پار وہائٹ اسکائی میں کھاتے ہیں۔

''یہ دولت قومی خزانہ لوٹ کر اور عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈال کر حاصل کی جاتی ہے۔ اگر آپ سب اچھے انسانوں کی طرح اپنا محاسبہ کریں گے، خود کو جھوٹ فریب اور جرائم سے پاک رکھیں گے تو میں اپنے اکاؤنٹ کے ستر کروڑ روپے سرمد بستی کے بیت المال میں منتقل کردوں گی۔''

سب ہی نے خوشی سے جھوم کر کہا۔''سبحان اللہ، تم پر اللہ کی رحمت ہو، سلامتی ہو۔''

تاباں نے کہا۔''کل میں پچیس کروڑ روپے سے بیت المال کا آغاز کروں گی اور یہاں اہم فرائض ادا کرنے کے لیے ایک چھوٹے سے مکان میں دن رات رہا کروں گی۔''

سب ہی اس کی تعریف میں بڑی عقیدت سے کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا۔''بیٹی! میں تین کمروں کے ایک مکان میں تنہا رہتا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ تم میری بیٹی بن کر میرے ساتھ رہو گی تو میں آرام اور سکون سے اپنی آخری سانسیں پوری کر کے دنیا سے جاسکوں گا۔''

وہ اپنے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ میرے ابا جان ہیں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں آپ سب کے قریب رہا کروں گی۔''

آدم ربانی اور رحمانی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''اللہ تمہیں سلامتی دے۔ جب تک ہم اس زمین پر ہیں تب تک تم ہر بلا سے محفوظ رہو گی۔ یہاں آکر رہو اور یہاں کی انتظامیہ کی ایک رکن بن کر بہترین منصوبوں کے مطابق اسے ایک ایمان پرور بے مثال بستی بنانے کی جدوجہد کرتی رہو۔''

اس بستی میں ایمان پرور فضا قائم ہوگئی تھی۔ ان مسیحاؤں نے وہاں کے باشندوں کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ تاباں ان کے حوصلوں کو اور مستحکم کر رہی تھی۔ آدم ربانی اور رحمانی نے درست کہا تھا کہ جب تک بستی کے لوگ خود ہی جھوٹ، فریب اور جرائم کا خاتمہ نہیں کریں گے، تب تک وہ فرعونی قوتوں کو ختم نہیں کرسکیں گے۔

یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو اس دنیا میں آج فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے۔ بدی سے لڑنا آسان نہیں ہے۔ ابھی تو آزمائشوں کا پہلا مرحلہ تھا۔ دیکھنا تھا کہ فرعونی قوتوں سے نجات حاصل کر کے اور زندگی کی ضروریات بہ آسانی پوری کر کے لوگ ایمانداری اور دیانت داری قائم رکھتے ہیں یا نہیں؟

☆☆☆

حماد اور کامل چنگیزی کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ سیاسی پہلو سے دونوں بہت اہم تھے۔ حماد، اعظم کا بیٹا تھا اور کامل چنگیزی اپوزیشن کے معروف لیڈر کا بیٹا تھا۔ اس لیے کئی سرکاری شعبے تیزی سے حرکت میں آگئے تھے۔ ٹی وی اور اخبار والے بھی اسپتال پہنچ رہے تھے۔

صبح تک دونوں آپریشن کے مشکل مراحل سے گزر گئے تھے۔ کامل چنگیزی کی گردن کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ اسے جوڑ کر نک کالر پہنا دیا گیا تھا۔ وہ بستر پر ایسے بے ہوش پڑا تھا جیسے مجرم کی گردن میں طوق ڈال دیا گیا ہو۔

حماد اعظم کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اسے بھی بڑی مہارت سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ مہینوں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

تاباں نے اپنے باپ کو اطلاع دی تھی کہ وہ فائرنگ کرنے والوں کے درمیان گھر گئی ہے۔ اس فون کال سے ٹی وی اور اخبار والے بلکہ پولیس والے بھی اندازہ لگا رہے تھے کہ دونوں تاباں کے عاشق تھے۔ دونوں اسے حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑ پڑے تھے۔

معظم نے فون پر بیٹی سے پوچھا۔''تاباں! تم کہاں ہو؟''

''ابو! میں سرمد بستی میں ہوں۔ ایک ضروری اجلاس میں شریک تھی۔ یہاں آدم ثانی اور آدم ربانی سے باتیں کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد گھر آؤں گی۔''

''کیا وہ ابھی تمہارے ساتھ ہیں؟''

''جی ہاں۔ میں ان کے روبرو بیٹھی ہوں۔''

''پھر تو ایک کام کرو۔ صبح انہیں ناشتے پر مدعو کرو۔ ان سے میری دوستی کراؤ۔''

''سوری، یہ نہیں ہو سکے گا۔ پہلے دو دن کے اندر آپ مطلوبہ رقم بیت المال میں جمع کرائیں گے۔ اس کے بعد کوئی بات ہوگی۔''

''اچھا ایسا کرو تم انتظار کرو۔ تنہا نہ آؤ۔ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔''

''یعنی اس بہانے آپ انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو بتادوں کہ یہ صرف مجھے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اہم معاملات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ ان سب کی نظروں سے بھی اوجھل رہتے ہیں۔''

معظم نے پوچھا۔ ''حماد اور کامل چنگیزی فائرنگ کے وقت تم سے کیا کہہ رہے تھے؟''

وہ بولی۔ ''حماد کے ارادے ہمیشہ ناپاک رہے ہیں۔ البتہ کامل کہہ رہا تھا کہ میں اسے پسند کروں یا نہ کروں، وہ اتنی رات کو میری حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ وہ دونوں شاید مارے گئے ہیں۔''

''مرتے مرتے بچ گئے ہیں۔ اسپتال میں پڑے ہیں۔''

معظم نے فون بند کر کے اعظم خان سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت دارالسلطنت شبیر آباد میں تھا۔ اس نے اعظم سے کہا۔ ''میں پہلے بھی آپ سے شکایت کر چکا ہوں۔ تاباں کے لیے تمہارے حماد کا رویہ بدمعاشوں جیسا رہتا ہے۔ آج اس نے بدمعاشی کی ہے۔ تاباں کا بیان ہے کہ کامل چنگیزی اس کے مقابلہ میں محافظ بن کر آیا تھا۔''

اعظم نے کہا۔ ''میں حماد کو سخت سزا دوں گا لیکن یہ بات میڈیا تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ ہم ایک ہی پارٹی کے ٹاپ لیڈرز اور حاکمِ اعلیٰ ہیں۔ ہم دونوں کی بدنامی ہوگی۔ ہماری پارٹی کی شہرت کو دھچکا لگے گا۔ اور وہ اپوزیشن لیڈر مبارک چنگیزی خوشی سے بغلیں بجائے گا۔''

معظم نے کہا۔ ''میں اس معاملے کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں۔ تاباں کامل کو ناپسند کرنے کے باوجود اس محافظ کی قربانی سے متاثر ہوگی۔ میرے منع کرنے کے باوجود کامل کے حق میں اور حماد کی مخالفت میں بیان دے گی۔''

اعظم نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''اگر تاباں ہمارے مخالف مبارک چنگیزی کی بہو بننے پر راضی ہوجائے گی تو کیا ہوگا؟ ہم دونوں کو زبردست سیاسی مات ہوگی۔''

''میں نے فی الحال اپنے خاص آدمیوں کو تاباں کی نگرانی پر مامور کیا ہے۔ وہ ٹی وی اور اخبار والوں کو تاباں کے قریب جانے نہیں دیں گے۔ ابھی وہ کوئی بیان نہیں دے پائے گی۔''

صبح ہوگئی تھی۔ وہ تمام حکام رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ سونا چاہتے تھے لیکن برسوں سے سونا کمانے کے بعد اب سونا نصیب نہیں ہورہا تھا۔ بوستان کی فوج کے اعلیٰ عہدے دار پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہیں جو سرمد بستی کو ایک آزاد ریاست بنانا چاہتے ہیں؟

صبح ہوتے ہی بہت سے مسلح آدمی درجنوں گاڑیوں میں آئے۔ انہوں نے سرمد بستی کا محاصرہ کیا پھر میگا فون کے ذریعے وارننگ دی کہ کوئی وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی اپنے گھر سے نہ نکلے ورنہ اسے گولی ماردی جائے گی۔

وہ سب ہتھیار اٹھائے مسجد میں اور گھروں میں گھسنے لگے۔ وہ تلاشی لینے کے دوران میں کہہ رہے تھے کہ سرمد بستی کو تخریبی کارروائیوں کا مرکز بنانے کے لیے وہاں کچھ نامعلوم لوگ آکر جادوئی ہتھکنڈے دکھا رہے ہیں۔ وہ جو بھی ہیں سامنے آجائیں۔

ایک عہدے دار نے للکارا۔ ''کہاں ہیں وہ ڈھونگی جو یہاں حکومت کرنے آئے ہیں؟''

پیش امام نے کہا۔ ''وہ یہاں موجود ہیں لیکن نظر نہیں آئیں گے۔ آپ کو قانوناً تلاشی لینے کا حق ہے۔ آپ کسی پر ظلم نہیں کررہے ہیں۔ اس لیے وہ آپ کے فرائض میں مداخلت نہیں کررہے۔''

ایک بوڑھے نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے کسی گھر میں اسلحہ، منشیات یا اور کوئی غیر قانونی چیز پائی ہے؟ ہم اپنی بستی کو ہر لعنت سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لیے ہمیں حوصلہ دیں۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں، ہمارا ملک تمام لعنتوں سے پاک رہے لیکن نیک ارادہ رکھنے والوں کو منہ نہیں چھپانا چاہیے۔''

اسی لمحے ان کی آوازیں سنائی دیں۔ ''السلام علیکم...''

ان افسران نے گھوم کر دیکھا۔ قریب ہی گلی کے موڑ سے آدم رحمانی اور ربانی آرہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''ہم ان مسلح اور دلیر جوانوں کو سلام کرتے ہیں۔''

وہ چیتے کی چال چلتے ہوئے آہستہ آہستہ آرہے تھے۔ دونوں نے قریب آکر تمام ساتھیوں سے مصافحہ کیا۔ ایک ساتھی نے پوچھا۔ ''لوگ تمہیں فرشتے سمجھتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''کسی کے سمجھنے سے کوئی فرشتہ نہیں بن جاتا۔ اس کے بہترین اعمال اسے انسان سے فرشتہ بناتے ہیں۔ آپ ہمارے اعمال کو پرکھنے کے بعد ہمیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

ایک اور افسر نے کہا۔ ''ہمیں اعلیٰ حکام سے معلوم ہورہا ہے کہ آپ کی جانب سے انہیں کیسی سزائیں ملتی رہی ہیں؟ پہلے یقین نہیں ہوا تھا۔ اب اطمینان ہورہا ہے، شاید آپ حکمرانوں کو راہِ راست پر لاسکیں گے... یا سیاسی دھاندلیاں کم سے کم کرسکیں گے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''ہم یہاں اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ فی الحال جا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے لوگ وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہیں گے۔ ہمیں رپورٹ ملتی رہے گی۔ اگر یہ بستی تہذیبی اور اخلاقی طور پر تعمیری مراحل سے گزرتی رہے گی تو آئندہ ہم ہر مرحلے پر تمہارا ساتھ دیتے رہیں گے۔ فی الحال ہم اور تمہارے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کریں گے۔''

وہ تمام افسران آدم رحمانی اور ربانی سے مصافحہ کرکے اپنے مسلح جوانوں کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ سرمد بستی کے باشندے بہت خوش تھے۔ انہیں ہر طرف سے حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ بڑے جوش و جذبے سے کام کرنے لگے۔

اب وہاں کوئی بے روزگار اس لیے نہیں تھا کہ تعمیراتی کام شروع ہوگیا تھا۔ علاقے میں ایک مضبوط ادارے کے قیام کے لیے ایک عمارت بنانے' اسکول کی چار دیواری اٹھانے' گلیوں اور سڑکوں کو پختہ کرنے کے سلسلے میں وہاں کے لوگ مصروف ہوگئے تھے۔ ان سب کو ہفتہ وار معقول تنخواہ مل رہی تھی۔

شہر سے ٹھیکیداروں کو بُلایا گیا تھا۔ وہاں کی مسجد میں پہلی بار دو نجات دہندہ آئے تھے۔ لہٰذا اس مسجد کو وسیع و عریض کرنے اور تاقیامت یادگار بنانے کی پلاننگ ہو رہی تھی۔ کسی ماہر آرکیٹکٹ کو یہ خدمات سونپی جانے والی تھیں۔

وہاں کے کچے گھروں کو توڑ کر باقاعدہ ایک شہری منصوبے کے مطابق پختہ مکانات تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہاں کوئی عالی شان بنگلا نہیں بنے گا۔ کوئی کسی سے برتر یا کسی سے کمتر نہیں رہے گا۔

پولیس کے اعلیٰ افسران نے کئی بار تاباں سے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ وہ سرمد بستی کا دورہ کرنے آئیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن تاباں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''جب وہاں گھر' مسجد' اسکول اور اسپتال وغیرہ بن جائیں گے۔ جب باقاعدہ تعلیم شروع ہوگی' مریضوں کا علاج ہونے لگے گا اور جب یہاں کے باشندے صحیح معنوں میں مہذب' نیک اور محب وطن کہلائیں گے تب محض پولیس والوں کو ہی نہیں' ساری دنیا کو سرمد بستی کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے گی۔''

سرمد بستی کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی تھی۔ آئندہ ترقیاتی منصوبے کے مطابق آس پاس کی آبادیوں کو اس میں شریک کیا جاسکتا تھا۔ تمام حکمرانوں کے لیے لمحۂ فکریہ تھا کہ وہ چھوٹا سا علاقہ رفتہ رفتہ بڑھتا پھیلتا اور وسیع و عریض ہوتا جائے گا۔ کیا اس طرح تنکا تنکا کرکے پورا ملک ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا؟

انہوں نے اعلیٰ افسران سے کہا۔ ''وہاں باغی' تخریب کار اور ملک کے دشمن ہیں۔ وہ منفی قوتوں کو مستحکم کر رہے ہیں۔ وہاں پڑوسی ملک کے جاسوس چھپ کر رہتے ہیں۔ وہ عنقریب بوستان کو زبردست نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اس سے پہلے ہی انہیں کچل دیا جائے۔''

انہیں جواب ملا۔ ''ہمارے سراغ رساں وہاں جاتے رہتے ہیں۔ وہاں لوگ خود اپنا محاسبہ کر رہے ہیں۔ کسی پولیس کے بغیر ایک دوسرے کو فریب اور مکاریوں سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ایک اور افسر نے کہا۔ ''وہاں کی مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ سماجی اور معاشرتی پہلوؤں سے ترقیاتی کام دن رات جاری رہتا ہے۔ بوستان کو اسی جوش و جذبے اور ایمان کی ضرورت ہے۔''

ایک اور افسر نے کہا۔ ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ بوستان کے اندر ایک چھوٹا بوستان وجود میں آرہا ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم آپ کی گزارش کے مطابق سرمد بستی کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔''

حکمران کسی قدر کمزور پڑ رہے تھے۔ ایک تو سرمد بستی کو اعلیٰ افسران کی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ دوسرا یہ کہ آدم رحمانی اور ربانی کی غیر معمولی قوتیں انہیں مرعوب کر رہی تھیں۔ ان دونوں کی طرف سے انہیں مختصر سی سزائیں بھی مل چکی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے خیال سے ہی سہم جاتے تھے۔ خوف زدہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سیاسی جرائم سے توبہ کرلیتے اور قومی خزانہ خالی کرکے سمندر پار اپنا اکاؤنٹس بھرنا چھوڑ دیتے۔

وہ حکمران اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ عیسائی اور یہودی ملکوں سے منافع بخش خفیہ معاہدے کرنے' اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے بوستان میں غیر ملکی فوج کے لیے راستے کھولنے اور مجرمانہ منافع خوری سے باز آنے والے نہیں تھے۔

سُپر طاقت ان کی مائی باپ تھی۔ وہی انہیں آدم ربانی اور رحمانی کے عذاب سے بچاسکتی تھی۔ اعظم وہائٹ اسکائی اور معظم بلیو اسکائی پہنچا ہوا تھا۔ دونوں اپنے آقاؤں کے سامنے دکھڑا سنا چکے تھے۔

سپر پاور اوّل کے صدر روڈنی ویلر نے کہا۔ ''آدمی ہر نئی بات سے متاثر ہوتا ہے اور ہر نئی چیز کی طرف لپکتا ہے۔ تمہارے بوستان میں یہ نئی بات ہوئی کہ جادوئی تماشے دکھانے والے دو بہروپیے آگئے ہیں۔ لوگوں کو تو متاثر ہونا تھا اس لیے ہو رہے ہیں۔''

ایک ملک کے سربراہ نے کہا۔ ''ہماری دنیا میں پیغمبروں کے بعد بے شمار ولی، روحانی مسیحا اور بھگوان کے اوتار آتے رہے ہیں۔ جب وہ گئے تو دنیا والے ویسے ہی مجرم اور گناہ گار رہے اور نہ ہی اب آدم ربانی اور رحمانی کے آجانے سے سرمد بستی بے داغ اور پاک وصاف ہوجائے گی۔''

''مسٹر اعظم! تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی بھی تماشا تھوڑی دیر کا ہوتا ہے۔ وہ تماشا مسلسل جاری رہے تو دیکھنے والے اُکتا جاتے ہیں۔''

''انسانی نفسیات کو سمجھو۔ جب آدمی کی مصیبت دور ہوجاتی ہے، وہ خوشحال ہوجاتا ہے تو دوسروں کو اُلّو بنا کر خود کو ذہین ثابت کرتا ہے۔ یہ انسانی فطرت جا ہی نہیں سکتی کہ وہ خود کو دوسروں سے برتر نہ سمجھے۔ ہمارا مذہب تمہارے مذہب سے افضل اور برتر ہے۔ ہمارا شجرہ تمہارے شجرے سے زیادہ قابلِ فخر ہے۔ ہماری ذات تمہاری ذات سے اونچی ہے۔ یہ تفریق ازل سے انسان کے دماغ میں گھسی ہوئی ہے۔ اس خناس کو آج تک دماغ سے نکالا نہ جاسکا۔

''سرمد بستی میں اسی انسانی نفسیات سے کھیلو۔ ابھی ان کے اندر صوبائی تعصب کو دفن کردیا گیا ہے لیکن ازلی بیج دفن ہوکر پھر پھوٹ کر زمین کی تہ سے نکلتا ہے۔ ان سب کے اندر یہ حقیقت چھپی ہوگی کہ ہماری بستی تمام صوبوں سے بڑی اور مستحکم ہے۔ ہماری تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے۔

''آدمی خوشحالی میں اور پھیلتا ہے، دو سو چالیس گز کا مکان چھوٹا لگتا ہے۔ ایک تاج محل چاہتا ہے۔ بائیک یا کار چلانے کا شوق مار نہیں سکتا۔ محفلوں میں ایک دوسرے سے برتر اور دیدہ زیب نظر آنے کی خواہش کو کچل نہیں سکتا۔ اس کے اندر ہزاروں خواہشیں مچلتی ہیں۔

وہ مسٹر معظم! ان خواہشوں کو ہتھیار بناؤ۔ آدمی آدھا انسان اور آدھا شیطان ہے۔ اس آدھے شیطان کو جگاتے رہو۔ پھر تم پانچ برس کی مدت پوری کرنے کے بعد بھی حکومت کرتے رہو گے۔ یہی لوگ پھر تمہیں ووٹ دے کر اقتدار کی کرسی پر بٹھائیں گے۔''

''معظم نے پریشان ہوکر کہا۔ ''آپ بڑے ہی آزمودہ داؤ پیچ بتا رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے، وہ دونوں سن رہے ہوں گے۔''

''سُن رہے ہیں تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ ہمیں ابھی نقصان پہنچا کر اپنی موجودگی کا ثبوت دیں۔''

دونوں خاموش ہوگئے۔ انتظار کرنے لگے کہ اب تب میں شامت آنے والی ہے لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ معظم نے اطمینان کی سانس لی۔

آقا نے کہا۔ ''مانا کہ وہ دونوں روحانی قوتیں رکھتے ہیں۔ لیکن بیک وقت ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتے۔ اگر ابھی سرمد بستی میں ہیں تو اسی لمحے میں یہاں پہنچ نہیں سکیں گے۔ یہ صرف گاڈ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بیک وقت ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ ایسی خدائی قوت اور صلاحیت نہ آج تک کسی کو ملی ہے، نہ ان دونوں کو ملے گی۔''

یہ بات دل کو لگنے والی تھی۔ آدم ربانی اور آدم رحمانی وہاں کے معاملات میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ جب تعمیری کام شروع نہیں ہوا تھا۔ تب انہوں نے منسٹر اور اعلیٰ حکام کی طرف توجہ دی تھی۔ ایک کو ننگے پاؤں اور باقی دو کو نصف برہنہ رہنے کی مختصری سزائیں دی تھیں۔ ان سے پانچ کروڑ وصول ہوگئے تھے پھر بھی ان کی ضرورت ہوتی تو ان کی طرف توجہ دیتے۔ فی الحال وہ سرمد بستی کو اعلیٰ اقدار اور روشن دھرتی کا ایک نمونہ بنانے میں مصروف تھے۔

انہوں نے سوچا تھا کہ جب کبھی تعمیری کاموں کے لیے کثیر رقم کی ضرورت ہوگی تو وہ آئندہ بھی حکمرانوں سے رقمیں وصول کریں گے لیکن ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرمد بستی کا اور آدم ربانی اور رحمانی کا اس قدر چرچا ہو رہا تھا کہ امیر کبیر لاکھوں کروڑوں روپے عطیات کے طور پر بیت المال میں جمع کرا رہے تھے۔

چار ماہ کے بعد ہی کئی اسلامی ممالک نے اربوں روپے کے عطیات ارسال کیے ان حالات میں بوستانی حکمران غیر ضروری ہوگئے تھے اس لیے آدم رحمانی اور ربانی ان سے فی الحال غافل ہوکر تمام توجہ اپنے مختلف پروجیکٹس پر مرکوز کرچکے تھے۔

☆☆☆

قارئین نے اب تک جو پڑھا، وہ موجودہ کہانی کا ابتدائیہ تھا۔ کہانی کا آغاز اب ہو رہا ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی کہانی آدم اور حوا سے شروع ہوئی اور آج تک آدم زاد اور حوا زادی کے بغیر کوئی کہانی نہ

لکھی گئی ہے، نہ لکھی جاسکے گی۔ اگر کسی نے لکھی بھی تو وہ کہانی بے اثر اور بے جان رہی۔ یا پھر اس کہانی میں عورت نظر نہ آنے کے باوجود بین السطور میں چھپی رہی۔ عورت کے بغیر نہ دنیا ہے، نہ داستانِ دنیا ہے۔

عورت جب دل کو متاثر کرتی ہے تو پہلے پتا نہیں چلتا کہ کب دماغ کے کونے میں آکر بیٹھ گئی ہے اور چپکے چپکے اپنی نامعلوم کشش سے اندر ہی اندر جگہ بنارہی ہے۔ اچھا تھا کہ آدم ربانی اور رحمانی کسی اور جہان میں تھے وہاں انہوں نے گندم نہیں کھائی تھی۔

صنفِ نازک اچھی لگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نیت بُری ہوجائے۔ ان دونوں کے دلوں میں بھی دور تک ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں جس طرح کھلا ہوا تازہ گلاب اچھا لگتا تھا۔ اسی طرح تاباں بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ دونوں غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے ذریعے لوگوں کی بُری نیتوں کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ کسی کے اچھے ارادے خودبخود ظاہر ہو جاتے ہیں۔ بُرے مقاصد کو سمجھنے کے لیے کسی کو بھی اندر سے سمجھنا پڑتا ہے۔ وہ دونوں برائیاں دور کرنے آئے تھے۔ اس لیے خداداد صلاحیتوں کے باعث لوگوں کو اندر سے پہچان لیا کرتے تھے۔

انہیں کبھی تاباں کی کسی بری نیت کا، بری خواہش کا علم نہیں ہوا۔ اس لیے وہ اچھی لگتی تھی لیکن عجیب سی بات تھی کہ جب وہ سامنے نہیں ہوتی تھی تب اس کی آواز کا ترنم دھیمے سروں میں سنائی دیتا تھا۔ جب سورج کی پہلی کرن آنکھ کھولتی تو خیال آتا کہ تاباں جھکی ہوئی پلکیں اٹھارہی ہے اور ان دونوں کے دلوں میں صبح ہورہی ہے۔

تاباں وہاں کے مختلف معاملات میں ان دونوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ وہ بھی گندم کی روٹی کھاتی تھی۔ اس کے دل میں بھی دھڑکتے ہوئے جذبات تھے۔ وہ حیا والی محتاط رہنے کے باوجود اب کچھ بے چین ہورہی تھی۔ وہ دونوں اسے متاثر کررہے تھے۔ دل کہتا تھا' یہ جو دھڑکنیں ہیں' یہ دراصل دستک ہیں۔ یہ دل کی زبان ہے۔ دل سے سنو... وہ دونوں خیالات پڑھ لیتے تھے لیکن ایک نامحرم کنواری کے خیالات پڑھنا خلاف تہذیب سمجھتے تھے یا پھر ان میں اچھے خیالات پڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ برائیاں دور کرنے کے لیے صرف برے خیالات پڑھ سکتے تھے۔ اور بھی جوان لڑکیاں تھیں' جو آدم رحمانی اور ربانی کے ساتھ کسی نہ کسی پروجیکٹ میں وقتاً فوقتاً ساتھ رہ کر کام کرتی تھیں۔ وہ بھی ان کے آگے دل ہار چکی تھیں لیکن ان کی مرعوب کرنے والی شخصیت کے سامنے کچھ بولنے کی جرأت نہیں کرتی تھیں اور کئی جوان تھے' جو شہر سے آکر وہاں اہم فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ تاباں کو اپنا بنالینے کے لیے ترس رہے تھے۔ لیکن ایک حاکم اعلیٰ کی بیٹی کے سامنے حالِ دل بیان کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ہماری زمین پر سب سے پہلے انسان کا لہو ایک عورت کے حصول کے لیے بہایا گیا تھا۔ ایک عورت کو حاصل کرنے کے لیے اس زمین پر پہلا فساد ہوا تھا۔ عورت ہی فساد کی جڑ ہے۔ یہی دنیا کی ماں ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی مرد پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت کی موجودگی' محبت' رقابت' عداوت اور سازشوں کے بیج بوتی چلی جاتی ہے۔ سرمد بستی میں یہ بیج پڑ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے فصل پکنے والی تھی۔

وہاں کے ایک مکان میں چودھری احمد نواز رہتا تھا۔ اس کی بیٹی شادو ایک نوجوان دستگیر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ دستگیر اچھا کماتا تھا۔ شادو کو خوش رکھ سکتا تھا لیکن احمد نواز اور اس کے رشتے دار اسے داماد نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ دوسری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ رشتے داری سے انکار کے پیچھے نفرت نہیں تھی بلکہ ایک محلے دار کی حیثیت سے سب ہی قوموں اور خاندانوں کے درمیان دوستی اور محبت تھی۔ وہ اب تک ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے آئے تھے۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ دستگیر بُری طرح ایک حادثے سے دوچار ہوا تھا۔ اسے خون کی ضرورت تھی اور چودھری احمد نواز نے اسے اپنا خون دیا تھا لیکن بیٹی کو بیاہنے کی جہاں تک بات تھی تو وہ ذات پات کو اور قومیت کو اہمیت دے رہا تھا۔

دستگیر کے والدین اور رشتے دار بھی دوسری قوم کی لڑکی کو بہو نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اپنے ہی باپ دادا کی تہذیب اور روایات کے مطابق ایک لڑکی پسند کرچکے تھے۔

شادو اور دستگیر نے سرمد بستی کی عدلیہ میں اپنا مقدمہ پیش کیا۔ اپنی ایک عرضی میں دستگیر نے لکھا۔ ''میں شادو کو شریکِ حیات بناؤں گا تو میرے والد مجھے عاق کردیں گے۔''

شادو نے کہا۔ ''میں دستگیر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ والد نے دھمکی دی ہے کہ وہ خاندان کی ناک کٹنے

سے پہلے مجھے قتل کردیں گے۔''

آدم رحمانی اور ربانی کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ دستگیر کے باپ نے کہا۔ ''ہم شادو اور اس کے والدین کی عزت کرتے ہیں اور انہیں گلے لگاتے ہیں۔ ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں لیکن اپنی نسل کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی تہذیبی روایات کے مطابق شادی خانہ آبادی کریں گے۔''

احمد نواز نے کہا۔ ''ہمارے دلوں میں بھی دستگیر کے خاندان والوں کے لیے بے پناہ محبت ہے۔ ہم انہیں اپنے تن کا لباس اور گھر کی چار دیواری دے سکتے ہیں لیکن بیٹی نہیں دیں گے۔ بیٹیاں ہوں یا بیٹے، وہ ہمارے ہی خون سے اولادیں پیدا کرتے آرہے ہیں۔ ایسا ہمارے پرکھوں سے ہوتا آرہا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''ہم سب ایک ہیں۔ نہ کوئی برتر ہے نہ کمتر ہے۔ ہم صرف انسان ہیں۔ صرف بوستانی ہیں۔ اس کے بعد جو بھی اپنی تہذیبی روایات کو افضل اور برتر کہہ رہا ہے، وہ سرد بستی سے آج ہی نکل جائے۔ اس سلسلے میں مزید کوئی بحث نہیں ہوگی۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''شادو اور دستگیر صوبوں اور قوموں کو متحد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شادی ہمارے قوانین کے عین مطابق ہوگی۔ ایک ہفتے کے اندر انہیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیا جائے۔''

ان دونوں کے سامنے کوئی اپنے اندر کی بات بول نہیں پاتا تھا اور اندر کی بات یہ تھی کہ اکثر لوگ اپنے شجرے اور اپنے خاندان کی واضح پہچان رکھنا چاہتے تھے۔

چند بزرگوں نے ان دونوں سے مسجد میں ملاقات کی اور کہا۔ ''ہمارے یہاں یہ حکم ہے کہ لڑکی بالغ ہوجائے تو جلد از جلد اس کی شادی کردی جائے۔ اگر کوئی بیوہ یا مطلقہ ہے تو اس کی بھی شادی جلدی کردی جائے۔ دیر ہوجائے تو بہکنے اور بے حیائی کی ترغیب مچلتی ہے۔''

دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''مردوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ انہیں بھی شریکِ حیات کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔''

پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ تاباں کے دل میں کیا ہے؟ وہ ایک نامحرم لڑکی کے چور خیالات پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ چور خیالات میں ایسی باتیں بھی ہوتیں، جو حیا کے منافی ہوتیں۔ اس لیے انہوں نے تاباں کی آنکھوں اور اس کی حیا بار اداؤں سے اندازہ کیا تھا کہ وہ انہیں چاہتی ہے۔ اس کی چاہت میں عقیدت بھی ہے اور شاعرانہ انداز بھی ہے۔

بات آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ یہاں آکر اٹک گئی تھی کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے؟ آدم ربانی کو یا آدم رحمانی کو...؟

ایک بزرگ نے کہا۔ ''تاباں آپ دونوں کی ہدایات پر عمل کرتی رہتی ہے۔ آپ اسے نصیحت کریں گے تو وہ یہاں تنہا نہیں رہے گی۔ کسی کو اپنا جیون ساتھی بنالے۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''ہم اس سلسلے میں اس سے بات نہیں کرسکیں گے۔ بہتر ہے، خواتین ہمارا پیغام پہنچائیں کہ اسے جلد از جلد اپنی پسند کے مطابق کسی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا چاہیے۔''

یہ باتیں مسجد میں کئی نمازیوں کے سامنے ہوئی تھیں۔ ذرا سی دیر میں یہ چرچا پوری بستی میں ہونے لگا کہ آدم رحمانی اور ربانی شادی کرنے والے ہیں اور وہ یقیناً اس بستی کی لڑکیوں میں سے کسی دو کو شریکِ حیات بنائیں گے۔ یہ خبر بڑی تہلکہ خیز تھی۔ کنواریوں کے دل اچھل پڑے۔ سب ہی آئینے کے سامنے آکر خود کو مختلف زاویوں سے دیکھنے لگیں۔

پہلے ہی بے شمار لڑکیاں صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوکر اپنے بزرگوں اور سرپرستوں کے ذریعے ان دونوں تک اپنا سیرت نامہ پہنچا رہی تھیں۔ سب ہی جانتی تھیں کہ ان نیک فرشتہ صفت جوانوں کو رجھانے کے لیے دن رات بیوٹی پارلر میں نہیں مصلے پر رہنا ہوگا۔

کئی خواتین نے تاباں کے گھر آکر بزرگوں اور ان دونوں کا پیغام پہنچایا کہ اسے تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ اپنی پسند کے مطابق کسی کے نکاح میں آجانا چاہیے۔

یہ سوچتے ہی تاباں کے دل میں مسرت کی لہر سی دوڑ گئی کہ ان دونوں نے کسی کے نکاح میں آجانے کا مشورہ دیا ہے۔ کسی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اتنی بڑی دنیا میں کسی کا انتخاب کرے۔ جبکہ تاباں کی دنیا ان دونوں تک محدود تھی۔ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا مسئلہ تھا۔ جبکہ دونوں ہی پسند تھے۔

دونوں میں خوبیاں ہی خوبیاں بھری تھیں۔ وہ کسی ایک خوبی کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ اگر ایک آفتاب تھا تو دوسرا آفتاب سے پھوٹنے والی کرن تھا۔ آفتاب اور کرنوں کی طرح دونوں ہی لازم وملزوم تھے۔

ایک خاتون نے پوچھا۔ ''بیٹی! کیا سوچ رہی ہو۔

ماشاء اللہ تم تو خود بہت ذہین ہو۔ کیا تمہیں اتنے بڑے مکان میں تنہا رہنا چاہیے؟"

وہ بولی۔ "آپ درست فرماتی ہیں۔ مجھے ایک جیون ساتھی کے بغیر یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن میں یہاں کی صرف ایک عام لڑکی نہیں ہوں۔ اس ملک کے حاکمِ اعلیٰ کی بیٹی بھی ہوں۔ مجھے یہاں کے کاموں سے فرصت ملے گی تو شبیر آباد جا کر اپنے والدین سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔"

وہ بہانہ بنا کر انہیں ٹال رہی تھی۔ ایک خاتون نے کہا۔ "اگر تم دل سے آدم رحمانی اور ربانی کا مشورہ قبول کرو گی تو شبیر آباد جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ فون پر والدین کو اپنی پسند اور شادی کی تاریخ بتا دو گی۔"

دوسری خاتون نے کہا۔ "میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں۔ کئی بار دیکھا ہے وہ تمہیں بڑی محبت سے دیکھتے ہیں۔ تمہیں چاہتے ہیں۔ مگر منہ سے بولتے نہیں ہیں۔"

ایک خاتون نے پوچھا۔ "کیا دونوں ہی اسے چاہتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ مگر دونوں کی آنکھوں میں اس کے لیے پیار دیکھا ہے۔"

تاباں شرما رہی تھی، بل کھا رہی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتی تھی لیکن عورتیں تو شادی خانہ آبادی کے معاملات میں کمبل ہو جاتی ہیں۔ وہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ یہ جان کر جوان لڑکیوں میں کھلبلی پیدا ہو گئی کہ آدم ربانی اور رحمانی تاباں کو چاہتے ہیں۔ اب کسی دوسری لڑکی کا چانس نہیں ہے۔

ایک لڑکی نے کہا۔ "مجھے چانس ملے گا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ دونوں ہی تاباں سے شادی کریں۔ کوئی ایک کرے گا۔ دوسرا میرے لیے رہے گا۔"

"تم بڑے یقین سے کہہ رہی ہو۔ کیا ان سے ملاقات کرتی ہو؟"

وہ بڑی حسرت سے بولی۔ "روز ہی رات کو آتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں آنکھ نہ کھلے۔ کمبخت کھل جاتی ہے۔"

تمام لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ایک نے کہا۔ "میں نے کئی بار فون پر ان سے دوستی کرنی چاہی لیکن نمبر پنچ ہوتے ہی اسکرین سے مٹ جاتا ہے۔"

دوسری لڑکی نے حسرت سے کہا۔ "تاباں بہت ہی خوش نصیب ہے۔ اسے ان کی قربت حاصل ہوتی رہتی ہے۔"

"اصل چیز قربت ہے۔ اگر ہمیں قریب جانے کا موقع ملے تو وہ ہم پر فدا ہو جائیں گے۔ جلوہ رُوبرو ہے تو مرد بچ کر نہیں جاتا۔"

تاباں رات کو بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ ہر کروٹ پر دونوں چلے آتے تھے۔ پھر ذہن کو جھٹکتے ہی گم ہو جاتے تھے۔ پہلے وہ دل میں چھپے رہتے تھے۔ اب پوری سرمد بستی میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی ایک تاباں سے شادی کرے گا اور دوسرا یہاں کی کسی لڑکی کو دلہن بنائے گا۔

یہ خبریں بڑی خوش کن تھیں۔ سب ہی لڑکیوں کے والدین ان میں سے ایک کو داماد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تاباں کو جاگتی آنکھوں کا خواب پریشان کر رہا تھا۔ ایسے وقت فون پر کالنگ ٹون سنائی دی۔ فون کی ننھی سی اسکرین سادہ تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر دوپٹہ درست کرتے ہوئے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "السلام علیکم! فرمائیے۔"

آدم ربانی نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "ہم نے نیند میں مداخلت کی ہے؟"

"جی نہیں میں جاگ رہی تھی۔ فرمائیے..."

"وہ میں کیا کہوں؟ تم... تم رحمانی سے بات کرو۔"

اسے رحمانی کی آواز سنائی دی۔ "وہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے اور تمہارے بارے میں کچھ ایسی خبریں پھیل رہی ہیں کہ..."

وہ جھجکنے لگا۔ ربانی نے کہا۔ "کہ ہم کسی رشتے کے بغیر تنہائی میں ملیں گے تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔"

"آپ درست فرماتے ہیں لیکن آپ دونوں تو کسی کو نظر آئے بغیر بھی آسکتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں اعتراض نہ ہو تو ابھی آسکتے ہیں؟"

اس کے اندر جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ فوراً ہی بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔ "مجھے خوشی ہوگی آپ آئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں آ رہی ہوں۔"

اس نے آئینے کے سامنے آ کر اپنے لباس کو دیکھا۔ بالوں میں کنگھی کی پھر ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

تمام لوگ ان دونوں کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس وقت وہ کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔

جس تاباں سے روز ملتے تھے اس کے سامنے بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

اس نے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''چائے رہنے دو۔ ہم ضروری بات کر کے چلے جائیں گے۔''

وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ تاباں ان کے روبرو ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یقیناً کوئی اہم بات ہے۔ اسی لیے اتنی رات کو آئے ہیں۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''ہاں یہ تو تم سن ہی رہی ہو۔ ہمارے متعلق کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟''

''کیا لوگ غلط باتیں کر رہے ہیں؟''

آدم ربانی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آں۔ ہاں غلط تو نہیں کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے کہنے آئے ہیں کہ...''

رحمانی نے کہا۔ ''تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔''

تاباں نے سر جھکا کر پوچھا۔ ''اور آپ دونوں کو...؟''

''آں۔ ہاں۔ ہمیں بھی کر لینی چاہیے۔''

ربانی نے کہا۔ ''ہم شادی کے لیے ہی آئے ہیں۔''

تاباں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا ابھی شادی کرنے آئے ہیں۔''

''ہمارا مطلب ہے شادی کی بات کرنے آئے ہیں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہوگا تو بات آگے بڑھائیں گے۔''

وہ سر جھکا کر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت خوش نصیب ہوں۔ آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔''

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر آدم رحمانی نے ربانی سے کہا۔ ''تم بولو۔''

ربانی نے کہا۔ ''تم کیوں نہیں بولتے؟''

تاباں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہ بات یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کس سے نکاح پڑھوانا چاہو گی؟''

ربانی نے پوچھا۔ ''مجھ سے یا رحمانی سے...؟''

اس نے جھکی جھکی نظروں سے دونوں کو دیکھا۔ بہت مشکل سوال تھا۔ ایسا بہت کم سننے میں آیا ہے کہ کسی پیار کرنے والی کے دل میں بیک وقت دو محبوب دھڑکتے ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ قدرتی طور پر ایسا ہو رہا تھا اور جو معاملہ قدرتی ہو اس پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔

دونوں ایک جیسے کیوں ہو؟ اگرچہ ہم شکل نہیں ہو۔ لیکن ہم سیرت ہو۔ ایک جیسی خوبروئی، ایک جیسی خوبیاں دونوں طرف سے کیوں کھینچ رہی ہیں؟ اگر ایک پیار کرنے والی دو عاشقوں سے ایک جیسا پیار کرتی رہے گی تو کیا ہوگا؟

وہ دونوں پیار و محبت کے معاملے میں اناڑی تھے۔ شاعرانہ انداز میں بولنا تو دور کی بات، وہ سادگی سے بھی کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ خود الجھ رہے تھے۔ اس بیچاری کو بھی اُلجھا رہے تھے۔

آدم رحمانی نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟ ہم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو گی تو دوسرا مایوس نہیں ہوگا۔ اسے خوشی ہوگی۔''

آدم ربانی نے کہا۔ ''ہاں۔ تاباں تمہاری زندگی میں آ جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

آدم رحمانی نے کہا۔ ''فضول باتیں نہ کرو۔ تمہیں دکھاوے کی خوشی ہوگی۔ تم میری خاطر اپنے پیار کی قربانی دو گے۔''

''تم بھی تو یہی کرو گے۔ ابھی تاباں کے سامنے بولو۔ کیا اسے دل و جان سے نہیں چاہتے؟''

وہ لڑنے کے انداز میں بولا۔ ''تو پھر تم پہلے بولو۔ کیا اس کے بغیر خوش رہ سکو گے؟ کیا میں تمہیں محروم کر کے خوشیاں منا سکوں گا؟''

تاباں شرما رہی تھی۔ مارے خوشی کے بیٹھے بیٹھے دہری ہو رہی تھی۔ یہ کیا کم خوش نصیبی تھی کہ وہ دونوں ہی اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس کا جی کر رہا تھا کہ دونوں ہاتھ اٹھا کر فضا میں اُڑنا شروع کر دے۔

یہ معاملہ ایسا تھا کہ وہ تینوں آسانی سے کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتے تھے اور اس وقت بھی ان کی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اچانک دستک کی آواز سنائی دی۔ کوئی دروازے پر آیا تھا۔

تاباں نے حیرانی سے کہا۔ ''اتنی رات کو کون آ سکتا ہے؟''

آدم ربانی نے آنکھیں بند کیں۔ پھر باہر کی ایک جھلک دیکھ کر آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''گلی میں کئی عورتیں ہیں، مرد بھی ہیں۔ جاؤ۔ دروازہ کھولو۔''

تاباں نے پریشان ہو کر دونوں کو دیکھا۔ آدم رحمانی نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ ہم نظر نہیں آئیں گے۔ جاؤ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔''

پھر ایک بار پھر دستک سنائی دی۔ تاباں ڈرائنگ روم سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا تو یکے بعد دیگرے کئی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ اندر آ گئیں۔ وہ سب اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ایک خاتون نے کہا۔ ”تمہارے کمرے میں روشنی دیکھی۔ پھر وہی خوشبو محسوس ہوئی جو آدم رحمانی اور آدم ربانی کی قربت سے ہوتی ہے۔ کیا وہ آئے ہیں؟“

تاباں نے پہلی بار سرمد بستی میں جھوٹ کہا۔ ”نہیں تو... وہ بھلا اتنی رات کو کیوں آئیں گے؟“

رحمانی اور ربانی نے پہلی بار موجود ہو کر دھوکا دیا۔ ان سب کی نظروں سے اوجھل رہے۔

تاباں کو بھی جھوٹ بولنے سے نہیں روکا۔

وہ اس دنیا کی چھوٹی سی زمین سے جھوٹ، فریب اور جرائم کا خاتمہ کرنے آئے تھے اور خود ہی ان غلطیوں کے مرتکب ہو رہے تھے۔ مرد عورت سے مجبور۔ عورت مرد سے مجبور... وہ مجبور تھے۔ نظر آتے تو تاباں بدنام ہوتی کہ رات کو اس کی تنہائی میں دو مرد آئے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ بیشتر لوگ مجبور ہو کر ہی جھوٹ بولتے ہیں اور فریب دیتے ہیں۔

انسان مجبور کیوں ہوتا ہے؟ اپنے اعمال سے ہوتا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ وہ رات کو تاباں کے پاس آتے؟ ایک عورت کی چاہت کھینچ لائی تھی۔ آئندہ انہیں اور بہت کچھ معلوم ہونے والا تھا کہ عورت زمین پر کیسے کیسے تماشے کراتی ہے؟

انصاف سے دیکھا جائے تو عورت کا قصور نہیں ہوتا۔ وہ آگے بڑھ کر غلطی نہیں کرتی۔ مرد آگے بڑھتا ہے اور دلوں کے نذرانے لے کر کسی تاباں کی تنہائی میں چلا آتا ہے۔ بعد میں الزام دیا جاتا ہے کہ اس کی تمام غلطیوں کی وجہ عورت تھی۔

تاباں کے صحن میں آنے والے لوگ مکان کے اندر تمام کمروں میں آ گئے تھے۔ ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک نے کہا۔ ”وہ نہیں ہیں... لیکن ان کی خوشبو دھیمی سی محسوس ہو رہی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”وہ ہوتے بھی ہیں تو نظر کب آتے ہیں؟ اپنی مرضی سے ضرورت کے وقت دکھائی دیتے ہیں۔“

تاباں نے کہا۔ ”کیا میری مائیں، بہنیں اور بزرگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ دونوں یہاں موجود ہیں اور آپ لوگوں سے خوامخواہ چھپ رہے ہیں؟“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ ہمارے لیے بہت محترم ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔“

ایک خاتون نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آؤ چلو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ تاباں کی تنہائی میں خلل نہ ڈالو۔ اسے آرام کرنے دو۔“

وہ سب ایک ایک کر کے باہر چلے گئے۔ تاباں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ آدم ربانی اور آدم رحمانی نے باہر آ کر مردوں اور عورتوں کو دیکھا۔ وہ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ لیکن بار بار پلٹ کر تاباں کے گھر کو دیکھ رہے تھے۔

ایک نے گلی کے نکڑ پر آ کر کہا۔ ”دیکھو محسوس کرو۔ یہاں وہ خوشبو نہیں ہے۔“

ایک خاتون نے کہا۔ ”ہاں وہاں تھی، یہاں نہیں ہے۔“

ایک اور نے کہا۔ ”یہ تو صاف سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ وہ دونوں وہاں ہیں۔“

دوسرے نے پوچھا ”پھر ہم سے کیوں چھپ گئے؟“

”بھئی سمجھا کرو۔ ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں بولیں گے۔“

وہ دونوں ان کی باتیں سن رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ غیر معمولی صلاحیتیں اور قوتیں رکھنے کے باوجود انہیں بولنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ اپنی موجودگی ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

پھر یہ کہ وہ ہر جگہ ہر بولنے والے کے پاس پہنچ نہیں سکتے تھے۔ جتنا سن لیا اتنا ہی سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ یہ قدرتی اشارہ تھا کہ سنبھل جاؤ۔ آگے اور بہت کچھ ہونے والا ہے۔

وہ تاباں کے پاس آ گئے۔ وہ ایک صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ ”محلے والے شبہ کر رہے ہیں۔“

وہ دونوں پریشان تھے۔ ربانی نے کہا۔ ”شبہ نہیں، یقین کر رہے ہیں۔ ہم اپنے جسم کی قدرتی خوشبو سے پہچان لیے گئے ہیں۔“

تاباں نے دروازے کو بند کیا پھر کہا۔ ”شاید اب خوشبو باہر نہ جائے۔ ویسے میں بدنام ہو رہی ہوں۔ صبح ہونے تک یہ بات پوری سرمد بستی میں پھیل جائے گی۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو ندامت سے دیکھنے لگے۔

یہی سوچ رہے تھے کہ نہ وہاں چھپ کر ملنے آتے۔ نہ بدنامی کے در کھلتے۔ وہ پریشان تھی کہہ رہی تھی۔ ”لوگ آپ کے خوف سے منہ پر تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہیں گے۔“

رحمانی نے کہا۔ ”ہم شرمندہ ہیں۔ تمہاری نیک نامی کو مجروح کر رہے ہیں۔“

”پلیز شرمندہ نہ ہوں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہے بلکہ عجیب طرح کی آسودگی اور خوشی ہے۔ آپ کے ناموں سے بدنام ہو کر بہت اچھا لگے گا۔ میری فکر نہ کریں۔“

”فکر تو کرنی ہوگی۔ ذاتی مسرتوں سے ہٹ کر سمجھنا ہوگا۔ چھپ کر ملنا گناہ ہے۔ ہماری وجہ سے یہ غلط روش چل پڑے گی۔ یہاں کی جوان لڑکیاں اور لڑکے چھپ کر ملیں گے اور ہماری مثال دیں گے۔ ہم ایسے وقت کیا کہہ سکیں گے؟“

ربانی نے کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجانا چاہیے۔ پھر سب کی زبانیں بند ہوجائیں گی۔“

رحمانی نے کہا۔ ”تاباں...! ابھی فیصلہ سناؤ۔ کس کے ساتھ نکاح پڑھواؤ گی؟“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ ”پلیز مجھ سے نہ پوچھیں۔ اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں، کون مجھ سے محروم ہونا چاہے گا؟“

”ہماری پروا نہ کرو۔ ہم میں سے کوئی بھی محرومی برداشت کرلے گا۔“

”میں برداشت نہیں کروں گی۔ کسی کو صدمہ نہیں پہنچاؤں گی۔“

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کسی کی محرومی برداشت نہ کرنے کا مطلب کیا ہوا؟“

وہ کھل کر نہیں کہہ سکتی تھی کہ دل دونوں کے لیے پاگل ہے۔ وہ دو پاؤں، دو ہاتھ اور دو آنکھوں کی طرح ان دونوں کو اپنے وجود کا حصہ بنانا چاہتی ہے۔ کسی ایک سے محروم ہو کر رہ نہیں سکے گی۔

آدم رحمانی نے کہا۔ ”آج نہیں تو کل کسی ایک کو تو قبول کروگی۔ خدا کے لیے ابھی کرلو۔ کل کوئی ہم پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ کل جو نگاہیں پتھر کی طرح لگنے والی ہیں وہ پھول کی طرح لگیں گی۔“

وہ ان سے دور جاتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی ایک کو قبول نہیں کرسکوں گی۔“

”یہ تو ہم سمجھ گئے ہیں، تم کسی ایک کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی ہو۔ رحمانی! فیصلہ میں کرتا ہوں... کل ہی تمہارا نکاح تاباں سے پڑھایا جائے گا۔“

”نہیں۔ تمہارا نکاح تاباں سے ہوگا۔“

”اس طرح تو ہم اپنی اپنی ضد پر اڑے رہیں گے۔ کچھ تو سوچو، ہماری وجہ سے تاباں بدنام ہوتی رہے گی۔“

وہ ایک دروازے کی آڑ میں آگئی۔ اچانک ہنسنے لگی۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کا لباس جھلک رہا تھا۔ پھر انہیں محسوس ہوا کہ وہ ہنستے ہنستے رو رہی ہے۔

ربانی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تاباں! کیا ہوا؟“

وہ ذرا چپ رہی۔ سسکیاں لیتی رہی پھر بولی۔ ”تقدیر کے مذاق پر ہنسی آگئی تھی۔ اب یہ سوچ کر رو رہی ہوں کہ یہ فیصلہ کبھی نہیں ہوسکے گا کیونکہ میرا دل وہ مانگتا ہے، جو کوئی بھی حیادار لڑکی نہیں مانگتی۔“

وہ دور کھڑے دروازے سے جھلکنے والے لباس کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لباس کی جھلک کہہ رہی تھی آؤ۔ دونوں آؤ اور مجھے چھولو۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”میری ایک سانس آتی ہے، آدم رحمانی کے نام سے۔ دوسری سانس آتی ہے، آدم ربانی کے نام سے۔ کیا کروں؟ میں پاگل ہوگئی ہوں۔ دونوں کو اپنی ضرورت سمجھتی ہوں۔ کسی ایک کو اپناؤں گی تو دل دوسرے کی محرومی سے روتا رہے گا۔ میں کیا کروں؟“

ربانی نے کہا۔ ”حیا کا تقاضا پورا کرو۔ دل نہیں مانتا تو مناؤ۔ اپنے آپ پر جبر کرو۔“

”کیا مرد جبر کرتا ہے؟ جب ایک کے بعد دوسری دل میں سماتی ہے۔ حیا اور جبر مرد کے لیے کیوں نہیں ہے؟ وہ دوسری کو بھی بلا روک ٹوک شریکِ حیات بنالیتا ہے۔“

”یہ اس لیے کہ مرد سے نسل آگے بڑھتی ہے۔ عورت بیک وقت دو شادیاں کرے تو آئندہ نسلیں کھچڑی ہوجاتی ہیں۔“

”اس لیے جبر عورت پر کیا جاتا ہے۔ میں دونوں پر مرمٹوں، جان پر کھیل جاؤں، تب بھی آپ دونوں کو مرتے دم تک نہیں پاسکوں گی اور دیکھ لینا، میں اسی خواہش پر ایک روز جان دے دوں گی، جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔“

وہ آہستہ آہستہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں دونوں کو نہیں پاسکوں گی لیکن دور ہی دور

سے محبت کرتی رہوں گی۔ چونکہ قربت نہیں ہوگی اس لیے بے حیائی نہیں ہوگی۔ میری چاہت حیا کا پاس رکھے گی۔ دور ہی دور سے۔۔۔''

یہ کہتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے دروازے کو تکنے لگے۔ وہ باب محبت بند ہونے کے باوجود دونوں کے دلوں میں کھل گیا تھا۔ پہلے وہ نہیں جانتے تھے کہ تاباں ان میں سے کس کو چاہتی ہے؟ کس کی دلہن بنے گی؟

آج انکشاف ہوا' وہ باؤلی ہے۔ دونوں کو یکساں چاہتی ہے۔ اس کے خوبصورت دل میں دونوں کے لیے گلاب کھلتے ہیں۔ اس لمحے سے دونوں ہی خوش نصیب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دوسری صبح پڑوسن نے تاباں کے گھر کے دروازے کو کھلا پایا۔ اس نے دوسری تیسری پڑوسنوں کو آواز دی۔ پھر کھلے ہوئے دروازے سے اندر جا کر دیکھا۔ اندر بھی تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس کی کار بھی نہیں تھی۔

ایک خاتون نے کہا۔ ''کوئی نیا پروجیکٹ شروع ہوا ہے۔ اس کے لیے صبح ہی چلی گئی ہے۔''

دوسری نے کہا ''پہلے بھی گھر کو اس طرح کھلا چھوڑ کر نہیں گئی۔ کل رات سے اس گھر میں کچھ ایسا ہو رہا ہے جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

ایک نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ''ان دونوں کے ساتھ کہیں گئی ہوگی۔''

دوسری نے بھی مسکراتے ہوئے کان میں کہا۔ ''رات ایک کے ساتھ گزاری۔ دن دوسرے کے ساتھ گزارنے گئی ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''ہائے کیا قسمت ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہی ہے۔''

اس بات پر سب ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ ایک خاتون نے ان سے ہمدردی کی۔ ''بے چارے دن رات کام کرتے ہیں۔ انہیں تفریح کرنے کی چھٹی تو ملنی چاہیے۔''

پتا چلا' وہ یونین آفس میں نہیں آئی ہے جہاں فیلڈ ورک ہو رہا تھا۔ وہاں بھی نہیں ہے۔ آدم رحمانی اور ربانی کو معلوم ہوا کہ صبح سے اس کا گھر کھلا پڑا ہے، وہ نظر نہیں آ رہی ہے۔

ربانی نے کہا۔ ''میں معلوم کرتا ہوں۔''

وہ دوسرے ہی لمحے میں تاباں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ راستے میں تھی۔ اچانک اسے خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ چونک کر بولی۔ ''آپ۔۔۔؟''

وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں ربانی ہوں۔ تم کچھ کہے سنے بغیر کہاں جا رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کل رات میں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس کے بعد صاف نظر آ رہا ہے کہ ہم تینوں یکجا نہیں ہو سکیں گے۔ وہاں ہمارے خلاف کوئی کچھ نہیں بولے گا لیکن میں بڑی خاموشی سے بدنام ہوتی رہوں گی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کی نظریں کیچڑ اچھالتی رہیں گی۔''

''سرمد بستی کے لوگ تمہارے اچانک چلے آنے سے متجسس رہیں گے۔ ہم سے سوال کریں گے۔ وہ چاہیں گے کہ ہم اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے تمہاری خیریت معلوم کریں اور تمہیں واپس لے آئیں۔ ہم انہیں کیا جواب دیں گے؟''

''آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ بڑے لوگوں میں واپس چلی گئی ہوں اور یہ سچ ہے۔ میں اپنے والدین کے پاس شبیر آباد جا رہی ہوں۔''

''تم اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا بھرپور جذبہ لے کر آئی تھیں۔''

''انشاءاللہ یہ جذبہ سلامت رہے گا۔ میں شبیر آباد سے واپس آ کر شہر والے گھر میں رہوں گی۔ روز صبح سرمد بستی آؤں گی اور شام کو چلی جایا کروں گی۔''

''بے شک۔ وہاں رات کو تنہا مکان میں نہیں رہو گی تو لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ فی الحال تو یہی کرو جو سوچا ہے لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ شادی کا فیصلہ جلد سے جلد کرنا ہوگا۔''

''فیصلہ مجھے نہیں آپ دونوں کو کرنا ہے۔''

''تم نے اُلجھا دیا ہے۔''

''آپ دونوں خود ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے قربانی دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح بات کبھی نہیں بنے گی۔''

''ہمیں الزام نہ دو۔ تم خود اُلجھی ہوئی ہو۔ کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں کر رہی ہو۔''

''عورت سے زیادہ مرد کا فیصلہ اہم ہوتا ہے۔ آپ میں سے جو مجھے قبول کرے گا، میں سر جھکا کر قبول کر لوں گی۔''

''کل رات تمہارا دل دونوں کو طلب کر رہا تھا۔ ابھی

تم مجبوراً بات بدل رہی ہو۔"

"بدنامی کے پیشِ نظر عورت کو مجبوراً حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"

"تم مجبور ہوکر ایک کو قبول کروگی پھر ایک کی منکوحہ بننے کے بعد دوسرے کی آرزو ستاتی رہے گی۔ جو شوہر بنے گا، وہ بھی تمہارے ساتھ کانٹوں کے بستر پر رہا کرے گا۔"

"ہم اس موضوع پر جتنا بولیں گے، اتنا ہی اُلجھتے جائیں گے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "میں جارہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔"

"تم آئے ہو، اچھا لگ رہا ہے۔ رحمانی سے کہو کسی وقت آئے۔"

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر خوشبو محسوس ہوئی۔ تاباں نے کہا۔ "رحمانی...؟"

"ہاں! میں ہی ہوں۔ ربانی نے تمہاری روٹین بتائی ہے کہ شہر میں رہ کر کس طرح سرمدبستی آتی جاتی رہوگی؟ یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔"

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی پھر چپ ہوگئی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک شخص آکر بیٹھ رہا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ زیرِلب بھی کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

رحمانی نے کہا۔ "اسے میری آواز سنائی نہیں دے گی لیکن میں بولتا رہوں گا، تم جواباً کچھ بول نہیں پاؤ گی۔ ایسا کرو، سر کے اور ہاتھوں کے اشاروں سے جواب دو۔ ایسا کرسکوگی؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے اسے تعجب سے سر ہلاتے دیکھا۔ پھر اپنے سامنے اخبار پھیلا کر پڑھنے لگا۔ رحمانی نے کہا۔ "چلو یہ معروف ہوگیا ہے۔ تمہیں پتا ہے، میں اور ربانی کل رات سے الجھے ہوئے ہیں۔"

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "الجھن کیا ہے؟"

تمہارے دل کا فیصلہ انوکھا ہے۔ تم مجھے بھی چاہتی ہو اور ربانی کو بھی۔"

وہ سر ہلانے لگی۔ پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے پھر اسے حیرانی سے دیکھا۔ اسے کچھ یاد آیا کہ اس نے تاباں کو کہیں دیکھا ہے۔ اس شخص نے یاد کرنے کے لیے اس پر نظر ڈالی تو وہ شرمارہی تھی۔

رحمانی کہہ رہا تھا۔ "یقین کرو، تمہارے فیصلے نے میرا اور ربانی کا جھگڑا بالکل ہی ختم کردیا ہے۔ اب نہ تو میں اس کے لیے قربانی دوں گا اور نہ وہ تمہاری چاہت سے محروم رہے گا۔ یہ انوکھا پیار ہے۔ تم دونوں کو ہی دل و جان سے چاہتی ہو۔"

"تمہارا پیار اگرچہ عجیب ہے۔ تاہم اس طرح ہماری دوستی اور محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ تم نے ہمیں ایک دوسرے سے کمتر نہیں ہونے دیا۔ تم ہمیشہ ہمارے دل و دماغ پر حکومت کرتی رہو گی۔ ہم تمہاری محبت اور اپنائیت پر فخر کرتے رہیں گے۔"

تاباں کے منہ سے بے اختیار آواز نکل گئی۔ "لیکن ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟"

ہم سفر نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟"

اسے غلطی کا احساس ہوا وہ جلدی سے بولی۔ "جی، وہ میں اپنی امی کو یاد کررہی تھی۔"

"بیٹی! جہاز نے ٹیک آف کیا ہے۔ ایسے وقت اللہ کو یاد کرو۔"

وہ بولی۔ "لیکن آپ تو اخبار پڑھ رہے ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "نصیحتیں اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ رحمانی نے کہا۔ "ہم ابھی بات نہیں کرسکیں گے۔"

تاباں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ہمسفر نے کہا "ایسا لگتا ہے، تمہیں خودکلامی کی عادت ہے۔ خیالوں میں کسی سے باتیں کرتی ہو۔"

تاباں نے اثبات میں سر ہلایا وہ مسکرا کر بولا۔ "اس عمر میں ایسا ہوتا ہے، میرا مشورہ ہے، شادی جلدی کرلینا دیر نہ کرنا۔ یہ کمبخت جوانی آتے ہی چلی جاتی ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہ چلا کہ بڑھاپے نے کب آکر دبوچ لیا؟"

وہ بولی۔ "شادی کے معاملے میں ایک پرابلم ہے۔"

"وہ کیا ہے؟ مجھے بتاؤ، چٹکی بجا کر حل کردوں گا۔"

"وہ دونوں مجھے اچھے لگتے ہیں۔ کسی ایک سے کیسے کروں؟"

"یہ کیا بات ہوئی۔ شریف لڑکیاں ایک وقت میں کسی ایک کے ساتھ ہی زندگی گزارتی ہیں۔"

"پھر شریف آدمی چار کے ساتھ زندگی کیوں گزارتے ہیں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "یہ... یہ کیا سوال ہے؟"

"یہی تو سوال ہے۔"

خوش کن تحریروں سے آراستہ اور گل رنگ
سلسلوں سے مزین اپریل 2015ء کا سالگرہ نمبر
کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ
پاکیزہ
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے خوب صورت ناول
زاهده پروین کے دلکش منی ناول...... جنگل کا پھول اپنے اختتام کی طرف گامزن
زمر نعیم نے اسیرِ وفا میں پھیلائے خوشیوں کے رنگ
میں شانزے ہوں...... رفعت سراج کی ایک اور پرلطف تحریر
ہردلعزیز رائٹر اور پاکیزہ کی
دیرینہ پرستار عنیزہ سید نے
بخشی ہماری بزم کو نئی رونق
اس کے ساتھ ساتھ رضوانہ پرنس' صبیحہ شاہ' شیریں حیدر'
نگہت اعظمی' عظمیٰ افتخار' قرۃ العین خرم و
دیگر کہنہ مشق رائٹرز کی خصوصی تحریریں بطور خاص سالگرہ نمبر کے لیے
حسبِ معمول مختلف دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پرمسرت و دلفریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

''بیٹی! کیا تم اسلامی تہذیب بدلنے نکلی ہو؟''

''خدا نہ کرے کہ کبھی اپنے دین پر ایک حرف بھی آنے دوں۔ ایسا کرنے سے پہلے مرجاؤں گی لیکن ایسی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ میں کیا کروں؟ میرا دل دونوں کی چاہت سے باز نہیں رہا۔''

''فوراً توبہ کرو اور اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ میں بہت معروف نجومی ہوں۔''

اس نے اپنا بایاں ہاتھ پیش کیا۔ وہ بڑی توجہ سے لکیروں کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''تم نے یہ تمام باتیں مذاق میں کی ہیں؟''

''نہیں۔ خدا جانتا ہے میں نے مذاق نہیں کیا ہے۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔''

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر بولا۔ ''تمہارے مقدر میں دو تو کیا ایک بھی شادی نہیں ہے۔''

اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے سامنے خلا میں جیسے رحمانی کو دیکھا پھر بڑے عزم سے کہا۔ ''میں تقدیر بدلنا جانتی ہوں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''بے شک... اللہ تعالیٰ نے یہ لکیریں ہتھیلی پر اس لیے بنائی ہیں کہ تقدیر انسان کی مٹھی میں رہے۔ جو عزمِ مسلسل رکھتے ہیں، وہ اپنی تقدیر ضرور بدلتے ہیں۔''

ہم سفر نے کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ شبیر آباد میں کہاں رہتی ہو؟ کیا کرتی ہو؟''

''میں نئی آبادی سرمد بستی میں رہتی ہوں۔''

وہ چونک کر اس کی طرف گھوم گیا۔ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سرمد بستی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ ٹی وی سے برابر خبریں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اوہ گاڈ! مجھے یاد آرہا ہے۔ کیا تمہارا نام تاباں ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یعنی کہ تم حاکمِ اعلیٰ معظم خان کی صاحبزادی ہو؟''

اس نے پھر سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''اخباروں میں لکھا ہوتا ہے کہ شیش محل کی شہزادی سرمد بستی کی مزدور عورتوں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے اور دن رات وہیں رہتی ہے۔''

پھر وہ ذرا قریب ہو کر بولا۔ ''کیا وہ فرشتوں والی باتیں سچ ہیں؟ بھئی یقین نہیں ہوتا کہ وہ آسمان سے آئے ہیں۔''

''یقین نہیں ہوتا تو نہ کریں۔''

''دیکھو ناں بیٹی! وہ ہوتے تو وہاں والوں کے ساتھ ان کی ایک آدھ تصویر ضرور شائع ہوتی۔ پریس فوٹو گرافرز اور کئی ٹی وی چینلز کے کیمرے ان کی تصویریں اتار کر لے گئے۔ لیکن ان کی صورتیں ٹی وی اسکرین پر نظر نہیں آئیں۔ اخباری تصویروں میں بھی وہ دکھائی نہیں دیتے۔ سنا ہے، تم ان کے ساتھ بہت مصروف رہتی ہو؟''

''اتنا زیادہ کام ہے کہ ہم نے چھ ماہ میں سرمد بستی کو ایک چھوٹا سا خوبصورت ٹاؤن بنا دیا ہے۔ تعمیری کام اب بھی جاری ہے۔''

''یہ عجیب اتفاق ہے کہ تم مل گئیں۔ مجھے تمہارے والد معظم خان نے ایک ماہر نجومی کی حیثیت سے بلایا ہے۔ میں وہیں جارہا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات، آپ شہزادی ہیں۔ میں بیٹی نہیں کہہ سکتا۔ دراصل میں کہنا چاہتا...''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''میں سرمد بستی کی مزدور لڑکی ہوں۔ آپ مجھے بیٹی کہہ سکتے ہیں۔''

''شکریہ، تم بہت اچھی ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا بلکہ دنیا کہہ رہی ہے کہ باپ بیٹی کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ تم اپنے ہی والد محترم کی حکومت کے خلاف سرمد بستی کو ایک مثالی بستی بنا کر پورے ملک کا نقشہ بدلنا چاہتی ہو؟''

''یہ درست ہے۔ اختلافات کے باوجود وہ میرے بہت اچھے ابو ہیں۔ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ویسے آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں معظم خان صاحب کی خدمت میں آدم ربانی اور رحمانی کی صحیح رپورٹ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے ان دونوں کا زائچہ بنانا ہوگا۔ کیا تم ان کی پیدائش کا صحیح وقت، دن اور تاریخ بتا سکتی ہو؟ میرے اندر ہلچل سی مچی ہے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے سرکاری محل میں بلایا گیا ہے۔ میں علمِ نجوم کے ذریعے وہاں مستقل سرکاری نجومی بن کر اپنے بال بچوں کا مستقبل سنوارنا چاہتا ہوں۔ میری کچھ مدد کرو۔ ان دونوں کے بارے میں ایسی باتیں بتاؤ جو دوسرے نہ جانتے ہوں۔''

''ان کے بارے میں صحیح باتیں بتانے کے لیے میرے ابو کو سچ کہنا ہوگا کہ ان کی حکومت کی چھٹی ہونے والی ہے اور ایسا کہنے کے بعد آج ہی آپ کی چھٹی ہوجائے گی۔''

''میں کیا کروں؟ وہ اپنی حکومت بچانے اور ان فرشتہ کہلانے والوں کی بہت سی کمزوریاں معلوم کرنے کے

لیے ہم نجومیوں سے آئندہ ہونے والی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اب تم ہی ہو۔ تم ہی ان کی کمزوریاں بتا سکو گی۔''

''میں نے اب تک کوئی کمزوری نہیں دیکھی ہے۔''

''جب وہ اس دنیا میں آچکے ہیں تو انہیں ہماری کمزوریاں لگ سکتی ہیں۔ خوشبو یا بدبو سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ وہ خود ہی آکر لگتی ہے۔ انسان کے دل کو اور دماغ کو جو چیز سب سے پہلے آکر لگتی ہے' وہ عورت ہے۔ وہ ہماری دنیا میں آکر کسی عورت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور جب متاثر ہوں گے تو ان کے اندر نامعلوم طریقوں سے جھوٹ اور فریب پیدا ہوتا رہے گا۔''

تاباں سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ دونوں محلے والوں کو دھوکا دے کر اس سے چھپ کر اس لیے ملنے آئے تھے کہ ان میں انسانی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ تاباں نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ گھر میں تنہا ہے جبکہ وہ دونوں موجود تھے۔

نجومی سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک دم چونک کر تاباں کو دیکھا۔ اسے یاد آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا۔ ''وہ دونوں مجھے اچھے لگتے ہیں۔ کسی ایک سے شادی کیسے کروں؟''

وہ سمجھ گیا کہ وہ آدم رحمانی اور ربانی ہی ہوں گے۔ ایسے خوبرو اور پُرکشش ہوں گے کہ یہ ان دونوں پر مرمٹی ہے۔ نجومی نے سر جھکایا پھر چور نظروں سے تاباں کو دیکھا اور پورے یقین کے ساتھ دل میں کہا۔ ''میں فرشتوں کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو بیٹھے بیٹھے سراغ مل رہا ہے...''

☆☆☆

بوستان کے دارالسلطنت شبیر آباد میں مداریوں اور بازی گروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہاں کے بڑے بڑے ہوٹلوں اور سرکاری مہمان خانوں میں غیر معمولی کمالات دکھانے والے عامل کامل' کرامات دکھانے والے پیر مرشد' علمِ نجوم کے ماہرین اور سیاسی بساط کو بھی الٹ دینے والے اور بھی پلٹ دینے والے بازی گر موجود تھے۔

حاکمِ اعلیٰ معظم خان اور اعظم خان اور کئی وزیر باتدبیر اپنے اقتدار کو آئندہ بھی مستحکم رکھنے کے لیے ان تمام باکمال افراد سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ان کی سب سے بڑی طاقت وہائٹ اسکائی کی وہائٹ کالر تھی۔ وہائٹ کالر ایک علامت بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔ جو سیاست داں اس سفید کالر کو اپنی گردن میں پہن لیتا تھا' اسے ہر طرح کا سیاسی اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔

جب تک وہ طوق ان کی گردن میں پڑا رہتا تب تک ملک کے عوام اسے بداعمالیوں کی سزا نہیں دے پاتے تھے۔ سب ہی منافع خور سیاست داں اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہائٹ کالر ایک تعویذ ہے جسے گلے میں پہن کر ہر بلا سے دور رہ کر اس دنیا کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے جنت بنایا جا سکتا ہے۔

ایک صدی گزرنے کو ہے اور وہائٹ کالر کی قوت کو کوئی کچلنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ انہیں تو آسمانی قوت ہی کچل سکتی تھی اور اب اچانک ایسا کچھ ظہور پذیر ہو رہا تھا تو وہ سب بوکھلا گئے تھے۔

حکامِ اعلیٰ کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے سنگین معاملات کو جوتوں کی نوک پر رکھتے تھے۔ لیکن پچھلے دنوں انہیں ایسی عجیب و غریب قسم کی سزائیں ملی تھیں' جن سے وہائٹ کالر بھی نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

انہیں زبردست سیاسی مشورے دیے گئے کہ کسی طرح ان کی کمزوریاں معلوم کرو؟ ان سے مقابلہ کرو۔ چپکے چپکے انہیں کمزور بناتے رہو۔ یہ ایک طویل دورانیے کا کھیل ہوگا۔ نتیجہ زمین کے حق میں ہی ہوگا۔ آسمان سے آنے والے خدائی فوجدار بھاگ جائیں گے۔

ایسے طریقۂ کار کے مطابق سازشوں کے جال پھیلا دیے گئے تھے۔ سرد بستی میں سیکڑوں جاسوسوں اور آلۂ کاروں کو اپنے مقاصد کے لیے پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ مزدور' کلرک' مکینک' انجینئر اور بینکر کی حیثیت سے مستقل رہائش اختیار کر چکے تھے۔ بہ ظاہر خود کو سچا اور دیانت دار بنائے رکھتے تھے۔ پھر وقتِ ضرورت تخریبی کام کرتے تھے۔ اس کے بعد پھر پارسا بن جاتے تھے۔

آدم رحمانی اور ربانی کے متعلق یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے بیک وقت سب کے پاس پہنچ کر ان کا محاسبہ کبھی نہیں کر سکیں گے۔

سات ماہ میں سرد بستی ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر بن گیا تھا۔ اب اسے بستی نہیں سرد ٹاؤن کہا جا رہا تھا۔ وہاں کے پرانے باشندے اس کے حسن کو قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن چور دروازوں سے بہت آہستہ آہستہ تباہی لائی جا رہی تھی۔ ایک دن تو کھل کر حملہ ہو گیا۔

تاباں کے وہاں سے جانے کے بعد ہی شام کو پچاس

مسلح افراد گاڑیاں دوڑاتے چوراہے پر آ گئے۔ انہوں نے ہوائی فائرنگ کی تو پہلی بار امن و امان والی بستی میں بھگدڑ مچ گئی۔ دکانیں اور بازار بند ہو گئے۔ لوگ مہینوں بعد فائرنگ کی آوازیں سن کر چار دیواری میں جا کر چھپ گئے۔

ان مسلح افراد کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت ہی تجربہ کار درندے اور دہشت گرد ہیں۔ ان کے لیڈر نے چوراہے کی بلندی پر آ کر للکارا۔ ''کہاں ہیں وہ آسمان سے آنے والے! ابھی ان کے باپ نے بھی حکومت کی ہے کہ وہ آسمان سے ٹپک کر یہاں ایک ریاست قائم کرنے آ گئے ہیں؟''

اس نے ایک ہوائی فائر کیا پھر کہا۔ ''میں دس فائر کروں گا۔ اگر وہ نہ آئے تو پھر شہریوں پر گولیاں برسائی جائیں گی۔''

اس نے پہلا فائر کیا پھر کہا۔ ''تم لوگوں نے کن بے وقوفوں کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ نہ وہ ہتھیار رکھتے ہیں، نہ تمہیں رکھنے دیتے ہیں۔ کیا آج سبق مل رہا ہے کہ انہوں نے آج کے دن ہمارے ہاتھوں مرنے کے لیے تمہیں خالی ہاتھ رکھا ہے؟''

وہ دوسرا فائر کرنے کے بعد بولا۔ ''نہ تھانہ' نہ پولیس... کیا حماقت ہے۔ کسی کو تمہاری حفاظت کے لیے رہنے نہیں دیا ہے۔''

پھر ایک گولی چلی، اس نے پوچھا۔ ''کہاں ہو بزدلو! فرشتے بنتے ہو تو ڈرتے کیوں ہو؟ کیا ہمارے ہتھیاروں سے مرنا نہیں چاہتے ہو؟''

وہ فائر کرتے ہوئے بولا۔ ''میری گولیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ میں دس کی گنتی بھول کر یہاں قتل عام شروع کر رہا ہوں۔ تم دونوں چھپ کر تماشا دیکھو۔''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ وہ دونوں بہت دور سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے ہی فاتحانہ انداز میں شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ دونوں کے قدم ساتھ ساتھ اٹھ رہے تھے۔ خونخوار چیتوں جیسی چال تھی۔ شکاریوں کے جال میں آ رہے تھے اور نہتے تھے۔

ان لمحات میں پچیس کلاشنکوف' پندرہ سیون ایم ایم' اور دس راکٹ لانچرز کے رخ ان کی طرف تھے۔ وہ انہیں آسمان پر واپس بھیجنے کی پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

لیڈر اور اس کے دو خاص ماتحتوں نے چوراہے کی بلندی سے ان پر فائرنگ کی۔ وہ انہیں ابھی مارنا نہیں چاہتے تھے' انہیں زخمی جانور بنا کر گلے میں پھندا ڈال کر پورے شہر میں گھمانا چاہتے تھے۔

وہ فائرنگ کے باوجود بڑی بے باکی سے قریب آ رہے تھے۔ گولیاں ان کے آس پاس سے گزر رہی تھیں اور ان کے قدموں کے پاس مٹی اڑاتی جا رہی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے چوراہے کی بلندی پر ان کے روبرو آ گئے۔

آدم رحمانی نے کہا۔ ''یہاں جو ہونے والا ہے' اس کا ابتدائی تماشا دیکھو۔ یہاں جو سڑکوں کے کنارے بڑے بڑے اشتہاری ہورڈنگز نصب ہیں، یہ اب ٹی وی اسکرین بن گئے ہیں۔''

ان سب نے چونک کر اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا۔ سڑکوں کے کنارے بڑی بڑی اسکرین پر وہ تمام مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا لیڈر للکار رہا تھا۔ ''کہاں ہیں وہ آسمان کے اترے؟ ابھی ان کے باپ نے بھی حکومت کی ہے...''

پھر اسکرین پر دکھائی دیا۔ لیڈر ہوائی فائرنگ کرنے کے بعد کہہ رہا تھا۔ ''میں دس فائر کروں گا۔ اگر وہ نہ آئے تو پھر شہریوں پر گولیاں برسائی جائیں گی۔''

وہ لیڈر اب تک جو کہتا اور کرتا آ رہا تھا اس کی مکمل ویڈیو فلم تیار ہو رہی تھی۔ آدم ربانی نے کہا۔ ''ابھی اور جو کچھ ہونے والا ہے' اس کی پوری ڈاکیومنٹری تیار ہو گی۔ پھر اسے بوستانی فوج اور عدالت عالیہ میں پہنچایا جائے گا۔''

لیڈر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جب یہاں کا ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا تو تم کس کے لیے انصاف مانگنے جاؤ گے؟''

ربانی نے کہا۔ ''یہاں ایک بچے کو بھی ہلکی سی خراش نہیں آئے گی۔ ہم تمہیں آخری بار سمجھاتے ہیں۔ تمام ہتھیار پھینک دو اور بیان دو کہ امن و امان سے رہنے والوں کو برباد کرنے کیوں آئے ہو؟''

آدم رحمانی نے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ جو سچ ہے' وہ کہہ دو۔''

لیڈر نے اچانک ہی ایک الٹا ہاتھ رحمانی کے منہ پر رسید کیا۔ پھر خود ہی چیخ پڑا۔ یوں لگا' ہاتھ کسی لوہے سے ٹکرایا ہے۔ وہ فوراً ہی منہ پھیر کر اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگا۔ اپنی کلاشنکوف ماتحت کو پکڑا دی۔

آدم رحمانی اور ربانی نے اس کے دونوں ماتحتوں کی کلائیوں کو تھام کر ایک جھٹکا دیا۔ ان کے ہتھیار زمین پر گر

گئے۔ مسلح افراد نے اپنے لیڈروں کا یہ حال دیکھا تو ان دونوں پر گولیاں چلائیں۔ وہ اناڑی نہیں تھے، نشانہ باز تھے۔ لیکن گولیاں ان خاص ماتحتوں کو لگیں۔ چوراہے کی بلندی پر لیڈر تنہا رہ گیا۔

ربانی نے ایک گن اٹھا کر اس لیڈر کو ایک بازو میں دبوچ کر دھمکی دی۔ ''اگر ایک گولی بھی ادھر آئے گی تو تمہارا یہ تیس مار خاں مارا جائے گا۔''

لیڈر کا ہاتھ طمانچہ مارنے کے نتیجے میں ناکارہ ہو گیا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''ان سے نہ ڈرو۔ یہ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ تم لوگ جاؤ اور گھروں میں گھس کر فائر کرو۔ میری جان کی پروانہ کرو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی آدم رحمانی نے بلند آواز میں حکم دیا۔ ''فائر...!''

وہ تمام مسلح افراد گھروں اور دکانوں کی طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی بوکھلا گئے۔ اچانک ہی کایا پلٹ گئی تھی۔ تمام گھروں اور دکانوں کی کھڑکیوں اور چھتوں سے گولیاں برسنے لگیں۔ ان دشمنوں کو ایسے حملے کی توقع نہیں تھی۔ نشانے پر آنے والوں کو فوراً ہی سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ کچھ جان سے گئے، کچھ زخمی ہو کر گرے۔ باقی ادھر ادھر مورچا بنانے کے لیے بھاگنے لگے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سرمد ٹاؤن کے خالی گھروں میں جدید ہتھیار ہوں گے۔ سڑک کے کنارے بڑی بڑی اسکرین پر فائرنگ کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ صرف آدم ربانی اور رحمانی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی کمنٹری سنائی دے رہی تھی۔ ''یہ تمام مناظر پوری قوم مختلف چینلز کے ذریعے دیکھے گی اور معلوم کرے گی کہ یہ دہشت گرد کن لوگوں کے پالتو کتے ہیں؟''

ربانی نے کہا۔ ''ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں، سرمد ٹاؤن امن و امان کا گہوارہ ہے۔ یہاں کسی گھر میں، کسی کی جان لینے والا کوئی بھی ہتھیار نہیں ہے اور واقعی اب تک نہیں تھا۔ لیکن ہم نے چشم زدن میں پوری سرمد بستی کو مسلح کر دیا ہے۔''

''جب یہ تخریب کار فنا ہو جائیں گے لاشوں اور زخمیوں کا ملبا ہٹا دیا جائے گا، تب یہاں کا ہر گھر پہلے کی طرح ہتھیاروں سے خالی ہو جائے گا۔

''اے لوگو...! اپنی دنیا کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ایسا رہنے دو، جہاں ایک بھی جان لیوا ہتھیار نہ ہو مگر تم رہنے نہیں دیتے۔ سرمد ٹاؤن کو ہتھیاروں سے خالی اور کمزور سمجھ کر چڑھ دوڑے ہو۔

''اب دشمنوں کو عقل آئے گی کہ جنت میں ہتھیار نہیں ہوتے۔ ہتھیار لانے والے جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔''

آدھے گھنٹے کے اندر مختلف شاہراہوں اور گلیوں میں چالیس دہشت گرد مارے گئے۔ باقی بھاگتے ہوئے چوراہے پر آئے۔ انہوں نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ ربانی نے ان کے لیڈر کو ایک ہاتھ مارا تو وہ چوراہے کی بلندی سے گرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے قدموں میں آ گیا۔

دشمن جن گاڑیوں میں آئے تھے، ان گاڑیوں کو ٹاؤن کے باہر آگ لگا دی گئی۔

لیڈر فون کے ذریعے اپنے آقاؤں سے طبی امداد طلب کر رہا تھا۔ انہیں بتا رہا تھا۔ ''پچاس میں سے ہم سات زندہ اور زخمی ہیں۔ وہ ہمیں ٹاؤن سے باہر پھینک کر چلے گئے ہیں۔ ہمیں فوراً اسپتال پہنچایا جائے۔''

آٹھ مسلح افراد چار موٹر سائیکلوں پر فوراً آئے۔ آتے ہی ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ ان سب کو لیڈر سمیت گولیوں سے چھلنی کیا پھر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ آقاؤں نے ہمیشہ کے لیے ان کی زبانیں بند کر دیں۔ اب ان کے خلاف بیان دینے والا کوئی نہیں تھا۔

سرکاری محلوں میں ماتمی خاموشی چھا گئی تھی۔ انہوں نے سرمد ٹاؤن کو ہتھیاروں سے خالی اور کمزور سمجھا تھا اور بری طرح مات کھا گئے تھے۔ رپورٹ مل رہی تھی کہ وہاں غضبناک کاؤنٹر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہاں کے کسی گھر، کسی عمارت کی دیوار پر ایک بلٹ کا نشان نہیں ہے۔ کسی ایک بچے کو خراش تک نہیں آئی۔

معظم خان نے کہا۔ ''انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اس بستی کو کبھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

اعظم خان نے کہا۔ ''ہمارے لیے وہ بستی اہم نہیں ہے۔ وہاں کے رہنے والے بہت اہم ہیں۔ وہ پستی میں رہیں گے، ان کے ذہن پسماندہ رہیں گے تو وہ ان مسیحا کہلانے والوں کی راہنمائی کے باوجود اپنے وڈیروں اور پیروں کے آگے جھکتے رہیں گے۔''

''ہاں۔ ہمارے ملک کے عوام لکیر کا فقیر بن کر رہنے کے عادی ہیں۔ یہ وڈیروں، عاملوں اور فقیروں کے آگے سجدے کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔''

''وہائٹ کالر نے یہ تاکید کی ہے کہ ہم آدم ربانی اور رحمانی سے نہ الجھیں۔ وہاں کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ لالچی اور کرپٹ بنائیں۔''

ایک مشیر نے کہا۔ ''ہمارے آدمی کئی بہروپ میں وہاں موجود ہیں۔ اپنی عورتوں، بچوں کو خاص طور پر جوان نسل کو اپنے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔ اگر ہمارے اس پروجیکٹ کے لیے بجٹ بڑھا دیا جائے تو انہیں اور کامیابی سے سبز باغ دکھائے جاسکیں گے۔''

ایک پی اے نے انٹرکام پر کہا۔ ''جناب عالی! ایک ماہر نجومی کامران کچھ اہم معلومات کے ساتھ حاضر ہونا چاہتا ہے۔''

اسے حاضر ہونے کی اجازت دی گئی۔ کامران نے دونوں حکام کے سامنے آکر سر جھکا کر سلام کیا پھر کہا۔ ''میں ان فرشتہ کہلانے والے آدم رحمانی اور ربانی کے متعلق چند اہم باتیں عرض کرنے آیا ہوں۔''

اسے بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم نجومی کہلاتے ہیں۔ یعنی ستارہ شناس... ہم آسمان پر مخصوص ستاروں کی جگہ پہچانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ آسمانی حالات کے مطابق انسانوں پر ان کے اثرات کس طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں؟''

اعظم خان نے کہا۔ ''ہمیں ستارہ شناسی نہ سمجھاؤ۔ کام کی بات کرو اور جاؤ۔''

''کام کی بات یہ ہے کہ میرے حساب کے مطابق وہ دونوں اس ارضی دنیا کے باشندے نہیں ہیں۔ کئی چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ آسمان سے آگ کے دو گولے سیدھے اس بستی میں آئے تھے۔ دنیا کا کوئی نجومی آدم ربانی اور آدم رحمانی کا زائچہ نہیں بنا سکتا۔ صرف میں بنا رہا ہوں اور رفتہ رفتہ کچھ معلومات حاصل کرتا جارہا ہوں۔''

''بے شک۔ کئی ماہر نجومی کہہ چکے ہیں کہ ان کا زائچہ نہیں بنایا جاسکے گا۔ تم کیسے بنا رہے ہو؟''

''تفصیل بیان کروں گا تو آپ فرمائیں گے، میں ستارہ شناسی سمجھا رہا ہوں۔ بہتر ہے، آپ صرف اپنے کام کی باتیں معلوم کریں۔''

ایک مشیر نے کہا۔ ''اکثر نجومی باتیں بنا کر وقت ضائع کرتے ہیں۔ ابھی تم اپنی باتوں سے متاثر کرو گے۔ کل معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے متعلق تمہاری باتیں درست نہیں ہیں۔''

کامران نے کہا۔ ''درست نہ ہوئیں تو میری گردن اڑادیں۔ اگر درست ہوئیں تو مجھے منہ مانگا انعام دیں۔''

معظم خان نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ''ہم تمہیں مالا مال کردیں گے۔ بولو ان دونوں کے متعلق کیا معلوم کرچکے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہماری زمین ہمیں اناج کھلاتی ہے، زندگی دیتی ہے۔ لیکن جذبات کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیتی ہے۔ ہمیں جسمانی طور پر توانا اور جذباتی طور پر کمزور بناتی ہے۔ وہ دونوں بھی اس زمین کا اناج کھا رہے ہیں اور لاعلمی میں کمزور ہوتے جارہے ہیں۔''

''یہ محض باتیں ہیں یا ثبوت بھی ہے، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کمزور ہوتے جارہے ہیں؟''

''آپ حضرات کو بھی معلوم ہوگا لیکن تنہائی میں...''

کامران نے تمام مشیروں پر ایک نظر ڈالی۔ اعظم خان نے کہا۔ ''یہ تمام مشیر ہمارے سیاسی ہمراز ہیں۔ ان کے سامنے بولو۔''

''یہ راز صرف سیاسی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے۔ لہٰذا تنہائی لازمی ہے۔''

ایک مشیر نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوجائے گا۔ ہم دوسرے کمرے میں جارہے ہیں۔''

وہ سب وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ کامران نے معظم خان سے کہا۔ ''آپ کا ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس لیے تنہائی میں بول رہا ہوں اور اس کا تعلق ان دونوں مسیحا کہلانے والوں سے ہے۔ وہ آسمان سے آنے والے آپ کی صاحبزادی تاباں کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور صاحبزادی بھی ان دونوں کو دل و جان سے چاہتی ہیں۔''

''کیا یہ تمہارا علم کہتا ہے؟''

''علم بھی کہتا ہے اور صاحبزادی بھی یہی فرماتی ہیں۔ آج صبح کی فلائٹ میں وہ یہاں تک میری ہم سفر رہی تھیں۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ کامران نے معظم خان سے کہا۔ ''اس وقت آپ سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہ ہوگا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے دونوں کی کمزوریاں آپ کے ہاتھوں میں آگئی ہیں۔''

وہ دونوں خوش ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اعظم خان نے کہا۔ ''بھائی معظم! یہ تو واقعی کمال ہوگیا۔ ان کی لگام ہماری تاباں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔''

کامران نے کہا۔ ''جب مرد کی لگام عورت کے ہاتھوں میں آتی ہے تو وہ انجانے میں بے لگام ہوتا چلا جاتا ہے اور اسے خبر تک نہیں ہوتی۔''

معظم خان نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں۔ ہمیں نہ سمجھاؤ۔ مزید کام کی باتیں بتاؤ۔''

''حضور! میں نے عرض کیا تھا کہ میری کوئی بات غلط ہو تو گردن اڑا دیں۔ ورنہ منہ مانگا انعام دیں اور آپ وعدہ کر چکے ہیں۔''

''بے شک جو چاہو گے' وہ ملے گا۔ کام کی باتیں کرو۔''

''ایک کام کی بات یہ ہے کہ آپ فوراً ہی ان کی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔''

دونوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ''فی الحال کچھ رکاوٹیں پیش آئیں گی۔''

''کیسی رکاوٹیں؟''

''وہ دونوں ہی آپ کی صاحبزادی کو اپنی منکوحہ بنانا چاہتے ہیں۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟''

''ایک اور بکواس یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادی بھی ان دونوں کے نکاح میں آنا چاہتی ہیں۔''

باپ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے بولا۔ ''اگر یہ تمہارا علم نجوم کہتا ہے تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

''یہ آپ کی صاحبزادی فرماتی ہیں' ان سے پوچھ لیں۔''

''اگر یہ غلط ہوا تو تمہاری شامت آجائے گی۔ کیا میری بیٹی بے حیا ہے؟ کیا یہ باپ بے غیرت ہے؟ اگر تمہاری بات غلط ہوئی تو یہاں سے تمہاری لاش جائے گی۔''

وہ وہاں سے پلٹ کر محل کے اندرونی حصے میں جانے لگا۔ اعظم خان اس کے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''یہ تو ہمارے حق میں ہے۔ دونوں کی لگام ایک ہی بیٹی کے ہاتھوں میں رہے گی۔ غصہ نہ دکھائیں۔''

وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''کس کمبخت کو غصہ آ رہا ہے؟ مگر غیرت کا مظاہرہ کرنے کے لیے شرم و حیا' اخلاق اور تہذیب کی باتیں کرنی ہی ہوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی تاباں سے بات کلئیر کرتا ہوں۔''

اعظم خان مطمئن ہو کر مسکراتا ہوا کامران کے پاس آ گیا۔

☆☆☆

آدم ربانی اور آدم رحمانی بڑے آرام اور سکون سے تھے۔ انہیں نہ اپنی فکر تھی نہ زمانے کی پروا تھی۔ زمانے کی فکر و پریشانیاں دور کرنے کے لیے ان کے پاس خداداد غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔

انسانی زندگی میں سب سے تشویشناک فکر اپنے دل و جان کی ہوتی ہے اور تاباں کی فکر ان کی جان کو لگ گئی تھی۔ یہ سوچ ہر دم ستاتی رہتی کہ آئندہ اس کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی؟

ان تینوں کے درمیان عجیب و غریب محبت کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ جب وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے متاثر ہونے لگے تو ایک رات انہوں نے چھپ کر تاباں سے ملاقات کی۔ دل سے مجبور ہو کر اس کے گھر آئے اور بدنام ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ بدنامی کو اور پر لگتے' وہ سرمد ٹاؤن چھوڑ کر دارالسلطنت شبیر آباد آ گئی۔ دیکھا جائے تو یہ فرار کا راستہ تھا۔ فرار ہونے کے بعد عشقیہ رسوائی اور شدت اختیار کر رہی تھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے بلکہ باتیں بنا رہے تھے کہ تاباں کچھ سوچ سمجھ کر کہیں گئی ہے۔ اب وہ تینوں کسی دوسری جگہ چھپ کر ملا کریں گے۔

آدم ربانی اور رحمانی اپنے طور پر صفائی پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے وضاحت پیش کی تھی کہ تاباں سرمد ٹاؤن کے فرائض سے منہ موڑ کر نہیں گئی ہے۔ وہ اپنی شادی کے سلسلے میں والدین سے بات کرنے گئی ہے۔ جلد ہی سرمد ٹاؤن واپس آ کر پہلے کی طرح اپنے فرائض اور ذمے داریاں سنبھالے گی۔

وہ دونوں تاباں کے احساسات کو اور پیار کے لطیف جذبات کو خوب سمجھتے تھے۔ لیکن دوسروں کے سامنے ایسے معاملات میں انجان بن رہے تھے۔

وہ سچ بولنے کی ہدایات کرتے تھے اور حالات سمجھا رہے تھے کہ زن، زر اور زمین راہ میں آتے ہیں تو کس طرح مجبور ہو کر جھوٹ بولنا پڑتا ہے یا باتیں بنانی پڑتی ہے۔

ربانی اور رحمانی ایک مکان کے ٹیرس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے دور ایک پروجیکٹ پر کام ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سرمد ٹاؤن کے باشندے ان کے منصوبوں کے مطابق بڑی تندہی سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

رحمانی نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے' ہمارے تمام پروجیکٹس بحسن و خوبی مکمل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان ترقیاتی کاموں کی شہرت ملک سے باہر پہنچ رہی ہے لیکن جو دل کے معاملات ہیں' وہ ہمارے درمیان اٹک گئے ہیں۔''

ربانی نے کہا۔ ''میرا دھیان تاباں کی طرف لگا رہتا ہے۔ ہم دونوں اس سے ملنے کے لیے بیک وقت وہاں جائیں گے تو یہاں کام رک جائے گا۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا بات ہے۔ تم جاؤ، میں یہاں کے معاملات سنبھالوں گا۔''

''تمہارا دل بھی وہاں اٹکا ہے۔ تم جاؤ۔''

''نہیں۔ تم نے بات شروع کی ہے، پہلے تم جاؤ۔''

''پہلے آپ پہلے آپ میں گاڑی رُکی رہے گی۔ ہم یہیں رہ جائیں گے۔ تاباں کے پاس جانا ضروری ہے۔ میری بات مانو ابھی تم جاؤ۔ جب واپس آؤ گے۔ تاباں کے حالات بتاؤ گے تو پھر میں وہاں جاؤں گا۔''

''میں جب بھی اس سے ملنے جاتا ہوں، وہ تمہاری بات ضرور کرتی ہے۔''

''اور میں ملاقات کرتا ہوں تو مجھ سے بھی تمہارے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتی ہے۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو اسے مِس کرتی ہے۔''

''وہ دل سے مجبور ہے۔ ہمیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ لیکن ایسی چاہت کب تک جاری رہ سکے گی؟''

''ہم کب تک اس موضوع پر سر کھپاتے رہیں گے؟ بہتر ہے کہ تاباں کے ساتھ سر کھپائیں۔ اسی لیے کہتا ہوں اب دیر نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔''

وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ بڑی محبت سے ایک دوسرے کی بات مانتے تھے۔ ربانی اسی وقت معظم خان کے سرکاری محل میں پہنچ گیا۔ نجومی کامران ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں حاکم اعلیٰ اعظم خان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اعظم اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا واقعی تاباں ان دونوں کو چاہتی ہے؟ یعنی کہ دونوں کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہے؟''

''جنابِ عالی! صاحبزادی اس معاملے میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کسی کی شریکِ حیات بننے کے سلسلے میں کوئی بات مکمل کرنہیں کی ہے لیکن دونوں سے عشق کرنے کا ایسا ہی کوئی نتیجہ سامنے آسکتا ہے۔''

''تمہارا علم کیا کہتا ہے؟''

''میرے علم میں یہ بات آرہی ہے کہ یہ معاملہ الجھتا جائے گا۔ یہ تکون عشق رنگین بھی ہوگا اور سنگین بھی...... اور یہ آخر تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچے گا۔''

آدم ربانی اس ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک بیڈروم میں آیا۔ وہاں تاباں اپنے والدین کے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اچانک ہی اپنے عاشقوں میں سے ایک کی خوشبو محسوس کی۔ پھر اسے سرگوشی سنائی دی۔ ''میں ہوں ربانی......''

تاباں نے مسکرا کر ایک گہری سانس لی۔ اس کی والدہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تعجب ہے ابھی بہت ہی سنجیدہ تھیں اور یکلخت ہی مسکرا رہی ہو؟''

اس نے فوراً ہی بات بنائی۔ ''وہ۔ کچھ نہیں۔ وہ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا تھا۔''

معظم نے کہا۔ ''وہ لطیفہ ہمیں بھی سناؤ۔''

بیگم نے گھور کر کہا۔ ''بڑھاپے میں جوان بچوں کے لطیفے نہ سنیں۔ کام کی بات کریں۔''

پھر وہ بیٹی سے بولی۔ ''ان دونوں میں سے کوئی ایک ایسا ہوگا جو کچھ زیادہ اچھا لگتا ہوگا۔ کسی ایک کو تو ترجیح دینی ہی ہوگی۔''

وہ بولی۔ ''کوئی کسی سے کمتر یا برتر نہیں ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی میرے حواس پر چھائے ہوئے ہیں۔''

''دل کو بہت سی چیزیں اچھی لگتی ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔''

''اگر کچھ چیزیں اپنے وجود کا حصہ بن جائیں تو کیا کیا جاسکتا ہے؟ میں اپنی دو آنکھوں میں سے کسی ایک کو بند نہیں کرسکتی۔ دونوں سے دیکھنا لازمی ہے۔''

معظم نے کہا۔ ''دونوں آنکھوں سے دیکھنا قدرتی مجبوری ہے۔ تم اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھو۔ سمجھو پھر بولو۔''

وہ بولی۔ ''ہم صرف قدرت سے ہی نہیں، دل سے بھی مجبور ہوتے ہیں۔ کیا آپ لُوٹ مار کی سیاست دل سے اور ضرورت سے مجبور ہوکر نہیں کرتے ہیں؟ جبکہ آپ قدرتی طور پر مجبور نہیں ہوتے۔ قدرت تو آپ کو سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''تم کہاں کی بات کہاں لے جا رہی ہو، اپنی بات کرو۔''

''اپنی بات یہ ہے کہ یہ نئی نئی سی الجھن ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ یہ رفتہ رفتہ سلجھے گی۔''

پھر وہ سر جھکا کر بولی۔ ''حقیقتاً میں الجھی ہوئی ہوں۔ عقل کہتی ہے جو میرا دل چاہتا ہے، وہ کبھی نہیں ہوگا۔''

بلقیس بیگم نے کہا۔ ''ظاہر ہے، یہ کھلی بے حیائی ہوگی۔ دنیا ہنسے گی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

معظم نے کہا۔ ''ہم سیاست داں انہونی کو ہونی بنا دیتے ہیں۔ جو کبھی نہیں ہوتا وہ کر دکھاتے ہیں۔ تب ہی

ہماری سیاست چمکتی ہے اور اقتدار قائم رہتا ہے۔''

بلقیس نے کہا۔''یہ دل کا اور ازدواجی تعلقات کا معاملہ ہے۔ یہاں آپ کی سیاست کام نہیں آئے گی۔''

وہ بولا۔''ایسے ہی موقع پر جو چالیں چلی جاتی ہیں۔ اسے سیاست کہتے ہیں۔ سیاسی خاندانوں میں سیاسی شادیاں اقتدار کی کرسیوں پر پہنچا دیتی ہیں۔''

ماں بیٹی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔''دیکھا جائے تو آدم ربانی اور آدم رحمانی میرے سیاسی حریف ہیں۔ سرمد ٹاؤن کو معاشی، اقتصادی اور سیاسی طور پر ایک بہترین نمونہ بنا کر ہماری حکومت گرانا چاہتے ہیں۔''

وہ ذرا تن کر بولا۔''لیکن نہ میں گروں گا اور نہ ہی آج کے بعد انہیں دشمنی کرنے دوں گا۔ انہیں داماد بنا کر گلے لگاؤں گا۔''

تاباں نے باپ کو چونک کر دیکھا۔ بلقیس بیگم نے حیرانی سے چیخ کر پوچھا۔''دونوں کو داماد کیسے بنائیں گے؟''

''ہم بعد میں دو کی باتیں کریں گے۔ فی الحال ایک سے رشتے داری اور دوستی کی گنجائش نکل آئی ہے۔ اب دوسرے کو بھی رشتے دار بنانے کے سلسلے میں کوئی تدبیر کی جائے گی۔''

بیگم نے کہا۔''آپ ساری عمر تدبیر کرتے رہیں۔ نہ ہماری کوئی دوسری بیٹی ہے نہ ہم دوسرے کو داماد بنا سکیں گے۔''

تاباں نے کہا۔''اچھا ہی ہے کہ میری کوئی اور بہن نہیں ہے۔ ہوتی تو میں کبھی اسے اپنی سوکن نہ بننے دیتی۔''

''وہ تمہاری سوکن کیسے بن جاتی؟ تمہاری شادی ربانی سے ہوتی تو اس کی رحمانی سے ہو جاتی۔''

وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔''دونوں ہی میرے ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ دونوں سے میرا نکاح ہوگا لیکن یہ جانتی ہوں کہ دونوں کی زندگی میں میری سوکن نہیں آئے گی۔''

ماں باپ اسے حیرانی اور پریشانی سے دیکھنے لگے۔ ویسے باپ حیران تو تھا، پریشان نہیں۔ اندر ہی اندر خوش تھا کہ ایک بیٹی دو بیٹوں کا کام دکھانے والی ہے۔ دونوں کی لگام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنے والی ہے۔

معظم نے کہا۔''بیٹی! یہ معاملہ بہت ہی سنگین ہے۔ تم دونوں کو لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہو اور میں بھی کسی طرح دونوں سے پکی رشتے داری چاہتا ہوں۔ ایسی رشتے داری جو ہمیں سیاسی طور پر ہم مزاج بنا دے۔''

وہ اک ذرا توقف سے بولا۔''وہ میرے سیاسی مزاج کے مطابق میرے سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ ہو گئے تو میں دونوں کو داماد بنانے کے لئے کچھ بھی کر گزروں گا۔''

بیٹی نے حیرانی سے پوچھا۔''آپ کیا کر گزریں گے؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ پہلے ان دونوں کے منہ سے رشتے کی بات سنوں گا۔ تمہیں شریک حیات بنانے کے سلسلے میں ان کے خیالات معلوم کروں گا۔ ایسا کرو۔ تم ابھی انہیں کال کرو۔''

ربانی نے تاباں سے کہا۔''اپنے والد سے پوچھو وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے تم سے کہیں۔ مجھ سے بعد میں باتیں ہوں گی۔''

تاباں نے کہا۔''ابو! یہ سراسر میرا معاملہ ہے۔ پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ آپ ان دونوں سے کس طرح معاملات طے کرنا چاہتے ہیں؟''

اس نے بیٹی کو سوچتی .... نظروں سے دیکھا پھر کہا۔''کچھ ایسی باتیں ہیں جو میں تم سے نہیں کر سکتا، تمہاری ماں سے کہوں گا۔ پھر یہ تم سے تنہائی میں بیان کر دیں گی۔''

بلقیس نے کہا۔''تو پھر آئیں۔ دوسرے کمرے میں چلیں۔ وہاں باتیں ہوں گی۔''

ماں باپ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی تاباں نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ اسی لمحے .... ربانی نظر آنے لگا۔ وہ بولی۔''تمہیں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ میں اچانک تم دونوں سے کچھ کہے سنے بغیر چلی آئی۔ تم میرے پیچھے آئے ہو، مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ رحمانی یقیناً مصروف ہوں گے۔''

''ہاں۔ ہم بیک وقت نہیں آسکتے تھے۔ میں جاؤں گا تو وہ آئے گا۔ سرمد ٹاؤن میں ہم قریب تھے۔ بیک وقت مل سکتے تھے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔''میرا دل عجیب سا ہے یا پھر میں باؤلی ہو گئی ہوں۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو رحمانی کے بغیر ادھورے لگتے ہو... اور رحمانی سے ملتی ہوں تو وہ تمہارے بغیر نصف لگتا ہے۔''

''یہی حال ہمارا ہے۔ ابھی تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے اور رحمانی کی کمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ ان لمحات میں دل کہہ رہا ہے، مجھے تمہاری قربت ملے اور اسے نہ ملے، یہ سراسر ناانصافی ہے۔''

''بہرحال انصاف اس طرح ہو جائے گا کہ تمہارے

جانے کے بعد وہ آجائیں گے۔''

وہ سرشار سا ہو کر بولا۔ ''یہ کیسی چاہت' کیسا عجیب سارومانس ہے۔ ہم تینوں کسی غرض اور بدنیتی کے بغیر ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہ رہے ہیں۔''

وہ ذرا دیر تک چپ رہے۔ اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ بے شک ابھی ان کے دل و دماغ میں کسی طرح کی ہوس نہیں تھی۔ ہوگی تو وہ اپنے اندر کی بات جانتے ہوں گے۔ شرم اور فطری شرافت کے باعث کچھ بول نہ پاتے ہوں گے۔

ویسے جسمانی ہوس کے بغیر انسانی رشتے قائم نہیں ہوتے۔ ابتدا ہوس سے ہی ہوتی ہے۔ ان تینوں کی زندگی میں بھی جلد یا بہ دیر ایسا وقت آنے والا تھا جب وہ فطری تقاضوں کے آگے جھکنے والے تھے۔

آگے جا کر تو وہی ہونا تھا جو خلدِ آدم سے ہوتا آیا ہے۔ اس دنیا میں گناہ ایک چیلنج ہے۔ اس چیلنج سے تمام عمر نمٹنا پڑتا ہے۔

تاباں نے کہا۔ ''امی اور ابو ہمارے متعلق جانے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ابو یقیناً انہیں سیاسی چالیں سمجھا رہے ہوں گے۔ کیا تم وہاں جا کر ان کی باتیں سننا چاہو گے؟''

''تم کہتی ہو تو ابھی جا کر سنتا ہوں۔''

''میرے اندر بے چینی ہے۔ امی کے یہاں آنے سے پہلے وہ باتیں سن لینا چاہتی ہوں۔''

''ہاں۔ رازداری سے سننے کے بعد ہی تمہارے والد کی ڈھکی چھپی سیاسی چالوں کا علم ہوگا، میں جا رہا ہوں۔ ابھی آجاؤں گا۔''

وہ بلقیس بیگم اور معظم خان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دونوں ایک بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ معظم، بیگم کی طرف جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا پھر ذرا رک گیا۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ ''اچانک ہی خوشبو سی محسوس ہو رہی ہے۔''

بلقیس نے کہا۔ ''ہاں۔ تھوڑی دیر پہلے تاباں کے کمرے میں بھی محسوس ہوئی تھی۔''

پھر وہ بڑی عقیدت سے بولی۔ ''میری بیٹی ایمان والی ہے۔ سرمد ٹاؤن سے آنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے وہ معطر رہتی ہے۔ میری بیٹی کے چہرے سے نور برستا ہے۔ اس کے آس پاس گناہ کی آلودگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

معظم نے ناگواری سے کہا۔ ''گناہ اور ثواب کی باتیں غریبوں تک رہنے دو۔ چھوٹے لوگ ثواب کمانے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں ملتا کچھ نہیں ہے۔ ہم اچھا بُرا نہیں دیکھتے۔ ضرورت کے مطابق جو ضروری ہوتا ہے، وہ کر گزرتے ہیں اور عیش کرتے رہتے ہیں۔''

پھر وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں۔ بیٹی کو گناہ اور ثواب کے مسئلے میں نہ الجھنے دو۔ ہماری دنیا کے کئی ملکوں میں شادی خانہ آبادی لازمی نہیں ہوتی ہے۔ آزادانہ جسمانی رشتے قائم ہوتے ہیں۔''

بیگم نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

وہ ناگواری سے منہ بنا کر بولی۔ ''آگے بولیں۔ اپنی بات پوری کریں۔''

اس نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ کے کئی ممالک میں کسی بچے سے باپ کا نام نہیں پوچھا جاتا۔ وہ ماؤں کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔''

بیگم نے کہا۔ ''میں اَن پڑھ جاہل نہیں ہوں۔ دنیاوی معلومات رکھتی ہوں۔ ایسا کون سا شیطانی فعل ہے جو ہماری دنیا میں نہیں ہوتا لیکن ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں صرف اپنے زبانِ دین سے دل سے اور دماغ سے سمجھ کر بولنا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''فار گاڈ سیک ابھی دین ایمان کی باتیں نہ کرو۔ ایسی باتوں کو عبادت گاہوں میں اور عوام کے گھروں میں رہنے دو۔ یہ سنہری موقع ہے۔ دو غیر معمولی طاقتور داماد ہاتھ آنے والے ہیں۔ انہیں ہر حال میں داماد بنائے رکھنے کی حکمتِ عملی اختیار کرو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

وہ ذرا اور قریب ہو کر بولا۔ ''ہماری بیٹی کبھی شادی نہیں کرے گی۔ ان دونوں سے دوستی رکھے گی تو کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں رہے گا۔ چٹکی بجاتے ہی تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم دنیا والوں سے کیا کہیں گے؟ وہ کس رشتے سے ان کے ساتھ رہے گی؟''

''ان کے ساتھ چوبیس گھنٹے نہیں رہے گی۔ دوستی میں ضرورت کے وقت کئی گھنٹے ساتھ رہتے ہیں پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ فری ریلیشن قائم کرنے والے اپنی روٹین بنا لیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اپنی سہولت کے مطابق ملتے بچھڑتے رہتے ہیں۔''

بیگم نے گھور کر پوچھا۔ ''یعنی میری بچی کسی کی شریکِ حیات نہیں رہے گی؟ ایک باپ کی زبان کھلم کھلا بیٹی کو دو مردوں کی طوائف بنا رہی ہے۔''

وہ ایک دم گرج کر بولا۔ ''بکواس مت کرو۔ منہ توڑ

دوں گا۔ میں اپنی بیٹی کی توہین کروں گا تو میری بھی توہین ہوگی۔ میری بات کو سمجھو' وہ عورتیں طوائف کہلاتی ہیں جو مال و دولت کے عوض خود کو پیش کرتی ہیں۔ ہماری بیٹی نہ مجبور ہے نہ خود کو فروخت کر رہی ہے۔ وہ تو اپنی مرضی سے دوست بن کر رہی ہے۔"

"یہ مانتی ہوں کہ اونچی سوسائٹی میں عورتیں اور مرد شناساؤں اور دوستوں کی حیثیت سے دن رات آزادی سے ملتے ہیں۔ ہوٹلوں اور کلبوں میں راتیں گزارتے ہیں۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ وہ ہمیشہ نیک نام رہتے ہیں۔"

وہ بیگم کے زانو پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یہی میں کہہ رہا ہوں۔ ہماری تاباں بھی ہمیشہ نیک نام رہے گی۔ اونچی سوسائٹی میں پتھروں کی نہیں، پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔"

"ہاں ہوتی ہے لیکن میری بچی پرہیزگار ہے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے۔ میں ابھی سے کہتی ہوں' وہ آپ کی مفاد پرستی اور سیاسی چالوں پر تھوک دے گی۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "عورتوں سے عقل کی بات کرنا سراسر حماقت ہے۔ میں آدم ربانی اور آدم رحمانی سے براہِ راست بات کروں گا۔"

"وہ بھی آپ کی بات نہیں مانیں گے۔"

"عورت دیوانہ بنا دے تو پھر ساری شرافت اور سارے اخلاقی اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ تاباں کے دیوانے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لیے میرے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے۔"

ربانی نے تاباں کے پاس آکر اسے معظم خان کے ناپاک منصوبے بتائے۔ وہ باتیں سن کر اس کا سر شرم سے جھک گیا کہ باپ ان دو مسیحاؤں کو بیٹی کا یار اور اپنا بندۂ بے دام بنانا چاہتا ہے۔

وہ شرمندگی سے بولی۔ "ابو اقتدار کی ہوس میں اندھے ہوگئے ہیں۔ وہ بیٹی کو دو کوڑی کا بنانا چاہتے ہیں.... سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ برسوں میں بھی اپنا اقتدار مستحکم رکھنے کی کامیاب چالیں چلتے رہیں گے۔"

"میں تمہارے باپ سے بات نہیں کروں گا۔ انہیں یہ جتانا ہوگا کہ وہ ہماری نظروں میں ایک کوڑی کے بھی نہیں ہیں۔"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ تاباں نے آگے بڑھ کر اسے کھولا۔ سامنے باپ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "ابو آپ جو کہنے آئے ہیں' وہ مجھے معلوم ہے۔ آپ جائیں آرام کریں۔ آدم ربانی اور آدم رحمانی اخلاق اور تہذیب کے خلاف کوئی بات تسلیم نہیں کریں گے۔"

باپ نے پوچھا۔ "کیا انہوں نے ہماری بات سنی ہے؟"

"سوری میں ان کے متعلق کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ آپ جائیں۔"

وہ بیٹی کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ ان دامادوں کو پھانسنے کا معاملہ کھٹائی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ انہیں ہر قیمت پر اپنا رشتے دار بنانا ہی ہوگا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں خلافِ تہذیب کوئی بات نہیں کروں گا۔ تمہاری شادی دینی اور دنیاوی قوانین کے مطابق ہوگی۔"

"دونوں سے ہو ہی نہیں سکتی۔"

"بیک وقت نہیں ہوسکے گی لیکن ہر دو چار ماہ کے بعد ایک کے نکاح سے نکل کر دوسرے کے نکاح میں جا سکو گی۔"

"یعنی شادی خانہ آبادی نہ ہوئی بازاری تماشا ہوگیا۔"

"یہ جو دونوں سے بیک وقت محبت کر رہی ہو۔ دونوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو کیا یہ بازاری انداز نہیں ہے؟"

"میں نے یہ کہا ہے کہ دونوں کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ لیکن یہ نہیں کہا ہے کہ دونوں کے ساتھ بیک وقت زندگی کے لمحات گزاروں گی۔"

معظم نے کہا۔ "یہ معاملہ کہیں تو جا کے فیصلہ کن ہوگا؟"

"یہ تو طے ہے کہ دونوں کی دلہن نہیں بن سکوں گی۔ یہ بھی طے ہے کہ ان کے بغیر مر جاؤں گی۔ موت نہ آئی تو دونوں سے بہت دور کہیں جا کر جی لوں گی۔"

"تمہاری وفا ان کے لیے رہے گی۔ کیا وہ دونوں بھی تمہارے بغیر جی لیں گے؟"

"ان کی باتیں وہ جانیں، میں تو اپنا سب کچھ ان کے نام کر چکی ہوں۔"

اس نے بیٹی کو محبت سے دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں ہارنا نہیں جانتا اور نہ ہی تمہیں ہارنے دوں گا۔ انسانی عقل ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ ہم ابھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیا سے کیا ہوجائے گا۔ میری آج کی بات یاد رکھو۔ وہ ضرور ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ آگے جا کر عقل کی کارستانی سمجھ میں آجائے گی۔"

وہ بیٹی سے بات کر کے چلا گیا۔ ربانی نے تاباں کے

قریب ہوکر کہا۔ ''بے شک ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میرا دل بھی یہ کہتا ہے کہ تم ہم دونوں کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ ہمارے ساتھ ہی زندگی گزارو گی۔ یہ بھید ابھی نہیں کھل رہا ہے کہ کیسے ہم تینوں ایک چھت کے نیچے رہ سکیں گے۔ لیکن یقین ہے کسی دن ضرور کوئی چونکا دینے والا راستہ ہموار ہوگا۔''

ایسے وقت آدم رحمانی نے آکر کہا۔ ''شام ہوگئی ہے۔ مزدور گھروں کو چلے گئے ہیں۔ مجھے یہاں آنے کا موقع مل گیا ہے۔ کیا ہورہا ہے یہاں؟ کیسی ہو تاباں؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''پہلے ٹھیک تھی۔ اب بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔ تم دونوں کو جوڑنے سے جیسے میرا وجود مکمل ہوجاتا ہے۔''

''اور تمہارے رُوبرو آتے ہی ہمیں ہمارے وجود کا پتا چلتا ہے۔ جیسے ہم تمہارے ہونے سے ہیں۔ ورنہ تم نہیں تو ہم نہیں۔''

ربانی نے کہا۔ ''تم تاباں سے باتیں کرو۔ میں معظم خان اور اعظم خان کو دیکھ کر آتا ہوں کہ وہ کیا کھچڑی پکا رہے ہیں۔''

وہ حاکمِ اعلیٰ ڈرائنگ روم میں تھے۔ نجومی کامران ان کے سامنے ادب سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ معظم نے اس سے کہا۔ ''یہ کوئی نہیں جانتا ہے کہ ہماری بیٹی ان دونوں کو پسند کرتی ہے۔ صرف تم جانتے ہو۔ ہم یہ بات باہر نہیں جانے دیں گے۔ تمہیں اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔ ورنہ...''

وہ خاکساری سے بولا۔ ''میں اپنی اوقات جانتا ہوں۔ میری زبان بند رہے گی لیکن یہ معاملہ چھپا نہیں رہے گا۔ سرمد ٹاؤن میں آپ کی صاحبزادی ان کے قریب رہتی ہیں۔ آئندہ بھی رہے گی۔ لوگ نادان نہیں ہیں۔ وہ بہت کچھ دیکھ رہے ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے۔''

''لوگوں کو سمجھنے دو لیکن ایک نجومی کی زبان پر یہ بات آئے گی تو سب کے لیے قابلِ یقین ہوجائے گی۔''

''آپ سے التجا کرتا ہوں۔ مجھے پابند نہ کریں۔ اپنی صاحبزادی کو سمجھائیں۔ وہ خود اپنی زبان سے کہتی پھرتی ہیں۔ مجھے ان ہی سے یہ حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ وہ آئندہ بھی نجومیوں، عاملوں اور مشیروں کو اس سلسلے میں بہت کچھ بتا سکتی ہیں۔ آپ ناحق مجھ پر پابندی عائد نہ کریں۔''

اعظم نے ڈانٹ کر کہا۔ ''ہم سے بحث نہ کرو۔ جو حکم دیا جارہا ہے اس کی تعمیل کرو۔''

معظم نے کہا۔ ''تمہیں تاباں سے جو معلوم ہوا، وہ تم نے ہم سے کہہ دیا۔ تمہارے اپنے علم نجوم کی مہارت کیا ہے؟ تم نے آدم ربانی اور آدم رحمانی کے متعلق کوئی کارآمد بات نہیں بتائی ہے۔''

کامران کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے اختیار میں، اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اس نے بے اختیار کہا۔ ''میری علمی مہارت کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ میں صرف ربانی اور رحمانی کے بارے میں ہی نہیں، آپ حضرات کے بارے میں بھی ایسے راز جانتا ہوں جو آپ کی اولاد بھی نہیں جانتی۔''

وہ ایسی باتیں کہہ کر گھبرا گیا۔ کیونکہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ آدم ربانی نے اسے بولنے پر مجبور کیا تھا اور وہ بے اختیار بولنے کے بعد سہم گیا تھا۔

وہ اعلیٰ حکام اسے گھور کر دیکھ رہے تھے پھر اعظم خان نے غرانے کے انداز میں پوچھا۔ ''اے دو کوڑی کے نجومی! تُو ہمارے بارے میں کیا جانتا ہے؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا جواب دے۔ وہ تو جیسے تاریکی میں بیٹھا ہوا تھا۔ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ اعظم خان نے ڈانٹا۔ ''بغلیں کیوں جھانک رہے ہو؟ کیا یہاں ڈینگیں مارنے آئے ہو؟''

اس نے بات بنائی۔ ''نہیں جنابِ عالی! میں بہت کچھ جانتا ہوں مگر چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ آپ حضرات کی بڑی باتیں چھوٹے منہ سے کیسے کہوں؟''

''ہمارا حکم ہے جو تمہارے علم میں ہے اسے بیان کرو۔''

اچانک ہی کامران نے سر اٹھا کر سامنے دیوار کو دیکھا۔ وہاں واضح طور پر لکھا ہوا تھا۔ ''ملک وہائٹ اسکائی کے ریکارڈ روم میں آپ کا ایک اقرار نامہ ہے...''

اس نے وہ تحریر پڑھی تو معظم چونک کر پوچھا۔ ''کیسا اقرار نامہ؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

دیوار پر دوسری تحریر ابھری۔ کامران نے پڑھا۔ ''اس اقرار نامے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے بڑے بھائی جواد خان کو بڑی رازداری سے قتل کرایا ہے۔ کیونکہ وہ سوتیلا بھائی آپ کو سیاست میں آگے بڑھنے سے روکتا تھا۔ وہائٹ اسکائی کے آقا نے اس کی جگہ آپ کو اقتدار میں لانے کا وعدہ کیا۔ اقرار نامے کے ذریعے آپ کی ایک کمزوری اپنے ریکارڈ روم میں رکھی ہے۔ تاکہ آپ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہا کریں۔ اسی لیے آپ ملک وہائٹ اسکائی کے آقاؤں کے زیرِ اثر رہتے ہیں۔''

وہ دیوار کی طرف دیکھ کر پڑھ رہا تھا۔ معظم اور اعظم نے پریشان ہو کر دیوار کو دیکھا۔ وہاں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ نوشتۂ دیوار صرف اس نجومی کو دکھائی دے رہا تھا اور وہ نجومی سحر زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

معظم خان غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''تمہیں ایسی بکواس کرنے کی سنگین سزا ملے گی۔ تم فراڈ ہو۔ دنیا کا کوئی نجومی کسی ملک کے ریکارڈ روم کا راز معلوم نہیں کر سکتا۔ اگر حرام موت نہیں مرنا چاہتے ہو تو فوراً بتاؤ' اتنی دور وہائٹ اسکائی کے خفیہ فائلوں کے متعلق کیسے جانتے ہو؟''

وہ غصے میں یہ تسلیم کر رہا تھا کہ ایسی کوئی خفیہ فائل سمندر پار موجود ہے۔ نجومی کو حوصلہ ہوا۔ اس نے اپنی سلامتی کے لیے بات بنائی۔ ''جنابِ عالی! میں صرف نجومی ہی نہیں ایک خطرناک عامل بھی ہوں۔ کالے جادو کے ذریعے پاتال میں چھپے ہوئے رازوں تک پہنچ جاتا ہوں۔''

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ دیوار پر پھر ایک تحریر ابھری۔ اس نے ادھر دیکھتے ہوئے پڑھا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قومی خزانے سے غبن کیے ہوئے دو ارب روپے ملک بلیو اسکائی کے ایک بینک میں محفوظ ہیں۔''

اس نے نوشتۂ دیوار کو پڑھتے ہوئے معظم خان کا بینک اکاؤنٹ نمبر اور لاکرز کے بارے میں بتایا تو وہ ایکدم سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

اعظم خان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم دیوار کی طرف ایسے دیکھ رہے ہو جیسے وہاں خفیہ فائل اور اکاؤنٹ نمبرز وغیرہ دکھائی دے رہے ہوں؟''

''جی ہاں۔ میرے قبضے میں ایک مؤکل ہے۔ وہ مجھے عالی جناب معظم خان صاحب کے متعلق جو بتا رہا ہے اسے میں بیان کر رہا ہوں۔''

دیوار پر پھر تحریر اُبھری۔ کامران نے پڑھا۔ ''محترم اعظم خان صاحب! میں آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ آپ حضرات نے جس طرح ملک بوستان کو لُوٹا ہے اور سمندر پار جہاں اربوں روپے کی جائداد بنا رکھی ہے، ان سب کی تفصیل بتا سکتا ہوں۔''

اور وہ نوشتۂ دیوار پڑھ کر بتانے لگا۔ اعظم خان بُری طرح پریشان ہو گیا۔ اس نے گھور کر پوچھا۔ ''تم میرے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟''

اس نے دیوار کو دیکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ ''آپ بڑی شرمناک زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے والد مرحوم نے ایک بہت ہی حسین اور طرح دار عورت رکھی تھی۔ اس عورت کو آپ نے پھانس لیا۔ باپ بیٹے ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ آخر باپ ہار گیا۔ بیٹے نے اسے جیت لیا۔''

وہ دونوں حاکمِ اعلیٰ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نجومی اندر ہی اندر سہما ہوا تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ شامت آچکی ہے وہاں سے شاید زندہ نہیں جا سکے گا۔ اسے اپنی مجبوری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ فرعونوں کے منہ پر سچ کیوں بول رہا ہے اور آہنی پردوں میں چھپا ہوا سچ اسے کیسے معلوم ہو رہا ہے؟

اس کی زندگی تو جیسے داؤ پر لگ گئی تھی۔ آگے جو ہونے والا تھا، اس سے تو نمٹنا ہی تھا۔ اس کے سامنے یکے بعد دیگرے تحریریں ابھر رہی تھیں اور وہ انہیں پڑھتا جا رہا تھا۔ ''جنابِ عالی! یہ شرمناک سلسلہ آپ کے خاندان میں اب تک جاری ہے۔ باپ اور بیٹے کی پسند نے ایک ناجائز بیٹی کو جنم دیا تھا۔ وہ جوان ہوئی تو آپ کا بیٹا حماد اس پر عاشق ہو گیا۔''

اعظم خان نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ''بکواس بند کرو یہ جھوٹ ہے۔ سو فیصد جھوٹ ہے۔''

وہ پڑھ رہا تھا۔ ''گناہ آگے بڑھ رہا ہے۔ عیاش حضرات ناجائز اولاد کو اہمیت نہیں دیتے۔ اہمیت نہ دینے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ ناجائز بیٹی آپ کا خون ہے اور آپ ہی کے بیٹے حماد اسے اپنی پسند بنانا چاہتا ہے اور جلد ہی اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔

''گناہ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ پہلے دادا پھر باپ اور اب بیٹا... گناہ کا یہ سلسلہ نسل در نسل آگے جا رہا ہے۔ میرا مؤکل اور بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ کیا اور آگے بیان کروں؟''

اعظم خان نے سفاکی سے کہا۔ ''ایسے رازوں سے آگاہ رہنے والے زندہ نہیں رہتے۔ تم یہاں سے جاؤ گے لیکن گھر نہیں پہنچو گے۔ تمہارا دردناک انجام تمہارے اپنے بھی نہیں دیکھ پائیں گے۔''

وہ موبائل فون نکال کر نجومی کامران سے بولا۔ ''سنو۔ میں تمہارے لیے سزائے موت سنا رہا ہوں۔''

پھر اس نے رابطہ ہونے پر کچھ کہنا چاہا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''رانگ نمبر...''

فون بند ہو گیا۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ درست نمبر پنچ کیے تھے اور رانگ نمبر کہہ دیا گیا تھا۔ اس نے دوبارہ نمبر پنچ کیے۔ دوسری بار بھی رانگ نمبر کی اطلاع دی گئی۔

نجومی کامران نے دیوار کو پڑھا۔ ''یہ میرا مؤکل ہے۔

یہ میری موت کا سامان نہیں کرنے دے گا۔"

اعظم خان نے اسے بے یقینی سے دیکھا پھر معظم خان سے کہا۔ "آپ اس نجومی کو اپنی بلیک فورس کے حوالے کریں۔ ہم دیکھیں گے کہ اس کا مؤکل کیا کرے گا؟"

معظم خان نے اپنے فون کو استعمال کیا تو وہاں سے بھی رانگ نمبر کی اطلاع دی گئی۔ کامران نے دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "عقل کے ناخن لو۔ میں خطرناک عامل ہوں۔ ان خطرناک مسیحاؤں کے خلاف تمہارے کام آسکتا ہوں۔"

ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ بات ایک جھٹکے سے دماغ کو لگی کہ وہ اس نجومی اور خطرناک عامل کو ربانی اور رحمانی کے خلاف مؤثر ہتھیار بنا کر ہمیشہ اپنے پاس سیکورٹی کے طور پر رکھ سکتے ہیں۔

انہوں نے دیوار کی جانب دیکھا پھر متاثر کرنے کامران کو قدرے عقیدت سے دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔ "ابھی تم نے کیا کہا ہے؟ کیا تم ربانی اور رحمانی سے نمٹ سکتے ہو؟ ان کے جادو کا توڑ کر سکتے ہو؟ ان کی کمزوریاں معلوم کر سکتے ہو؟"

معظم نے کہا۔ "جب یہ ہمارے اور وہائٹ اسکائی کے ریکارڈ روم کے راز معلوم کر سکتا ہے تو ان پُر اسرار مسیحاؤں کے اندر کے سارے بھید بھی معلوم کر سکتا ہے۔"

کامران نے بڑی شان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر پاؤں پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں عامل کامل ہوں۔ کوئی مذاق نہیں ہوں۔ میرا مؤکل مجھے بتائے گا کہ ان دو دشمنوں کے خلاف آپ کے کام آسکتا ہوں یا نہیں؟"

اسی وقت تاباں آدم رحمانی کے ساتھ وہاں آئی۔ ربانی اور رحمانی صرف تاباں کو دکھائی دے رہے تھے۔ کامران، تاباں کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم نے بیٹی کو دیکھتے ہی کہا۔ "ہم یہاں سیاسی معاملات میں مصروف ہیں۔ کچھ ضروری باتیں ہو رہی ہیں۔ پلیز اپنے کمرے میں جاؤ۔"

تاباں نے کامران کو دیکھ کر کہا۔ "یہ بزرگ نجومی میرے ہم سفر رہ چکے ہیں۔ یہ آدم ربانی اور آدم رحمانی کے معاملات سے نمٹنے یہاں آئے ہیں۔ آپ ابھی ملکی سیاست پر نہیں ہمارے ہی مسئلے پر باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حضرت کس طرح ہمارا مسئلہ حل کر رہے ہیں؟"

ربانی نے کہا۔ "تاباں! یہ لوگ تمہاری موجودگی میں ہمارے خلاف منصوبے نہیں بنائیں گے۔ بہتر ہے تم جاؤ اور ہمیں ان سے نمٹنے دو۔"

اعظم خان نے کہا۔ "بیٹی! تمہارے اور ان مسیحاؤں کے معاملے میں کوئی بات نہیں ہو رہی ہے۔ ہم آئندہ الیکشن کے سلسلے میں اس نجومی کی پیش گوئی سن رہے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

اس نے اپنے دونوں عاشقوں کو دیکھا پھر کہا۔ "جی ہاں۔ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

وہ مسکراتی ہوئی اپنے چاہنے والوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد معظم اور اعظم کی نظروں میں وہاں کوئی نہیں رہا تھا۔ جبکہ وہ دونوں آرام سے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔

اعظم خان نے کامران سے پوچھا۔ "ہاں۔ اب بولو تمہارا مؤکل ان دونوں کو ہمارے سامنے کمزور بنا سکے گا؟"

معظم نے پوچھا۔ "سب سے پہلے یہ بتاؤ' کیا ان میں سے کسی کو میرا داماد بنا سکے گا؟"

ربانی نے مسکرا کر رحمانی کو دیکھا پھر دیوار پر تحریر پیش کی۔ کامران نے پڑھا۔ "میرا مؤکل پہلے ربانی اور رحمانی کو دیکھے گا۔ سمجھے گا۔ پرکھے گا کہ وہ دونوں کتنے پانی میں ہیں۔ پھر مجھے بتائے گا پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔ ویسے یقین سے کہتا ہوں کہ میرا مؤکل ان کے مقابلے میں زبردست رہے گا۔"

معظم نے کہا۔ "اگر زبردست ثابت ہوگا تو تمہارے دن پھر جائیں گے۔ تم کنگال نہیں رہو گے۔ کروڑوں کی زمین و جائیداد کے مالک بن جاؤ گے اور سرکاری نجومی اور عامل بن کر ماہانہ دو لاکھ روپے کمایا کرو گے۔"

کامران خوشی سے صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ اسے اچانک غیبی قوت کیسے حاصل ہو رہی ہے؟ جب بھی کوئی تحریر دیوار پر اُبھرتی تھی، وہ اسے واضح طور سے پڑھتا تھا۔ اور وہی تحریریں ان حکمرانوں کو نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ کرشمہ وہ کرامات جو بھی تھیں' وہ اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

چونکہ وہ کرشماتی تحریریں اس کے حق میں تھیں۔ وہاں اس کا مان مرتبہ بڑھا رہی تھیں اس لیے وہ انہیں غیبی امداد سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ خیال تھا کہ شاید بعد میں اسے کسی مؤکل کے بارے میں معلوم ہو سکے گا۔

پھر یہ نہ سمجھ میں آنے والی باتیں پیش آتے ہی اسے بہت بڑی آفر دی گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے امیر کبیر بن رہا تھا۔ کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ کسی شک و شبے کے بغیر اس غیبی امداد پر ایمان لے آیا تھا۔

معظم نے کہا۔ ''اپنے مؤکل سے کہو۔ وہ ربانی اور رحمانی کے پاس جائے اور ہمیں ان کی اصلیت بتائے کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور انہیں کس طرح زیر کیا جاسکتا ہے؟''

اس بار رحمانی نے تحریر پیش کی۔ کامران نے پڑھا۔ ''یہ میرا مؤکل میرا تابعدار معلومات حاصل کرنے جارہا ہے۔ انتظار کرو۔ جلد ہی جواب ملے گا۔''

معظم اور اعظم کو اطمینان ہوا۔ انہوں نے اتنی دیر بعد اس پہنچے ہوئے عامل کو کھانے پینے کے لیے پوچھا۔ ملازم اس کے لیے پھل، خشک میوے اور مشروبات لے آئے۔ وہ کھانے پینے کے دوران اپنے مطالبات پیش کرنے لگا۔

اس نے کہا۔ ''دارالسلطنت کے مہنگے علاقے میں ایک بنگلا میرے نام کیا جائے، میرے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار بھیجا جائے اور وہاں بھی ایک بنگلا اور گاڑیاں ہمارے نام کی جائیں۔''

معظم نے کہا۔ ''اتنے نہ پھیلو۔ ہوا میں نہ اُڑو۔ پہلے ہمارے کام آؤ۔''

اعظم نے کہا۔ ''اگر ربانی اور رحمانی ہمارے زیرِاثر آتے رہیں گے تو تمہارے تمام مطالبات پورے کر دیے جائیں گے۔''

وہ مشروب پیتے ہوئے دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ ''یا اللہ! غیبی امداد جاری رہے۔ تیرے کرم سے تقدیر مہربان ہوگئی ہے۔ یہ مہربان ہی رہے۔''

دل میں طرح طرح کے اندیشے تھے مگر یہ یقین تھا کہ عروج سے زوال کی طرف جانے تک وہ اچھی خاصی دولت اور جائداد حاصل کرلے گا۔

ربانی اور رحمانی وہاں سے تاباں کے پاس آگئے۔ اسے بتانے لگے کہ کامران کو آلہ کار بنا رہے ہیں۔ اس کے ذریعے معظم خان اور اعظم خان کو الجھاتے رہیں گے۔ فی الحال ان سے جارحانہ انداز میں پیش نہیں آئیں گے۔ نرم رویہ اختیار رکھیں گے۔ کوشش یہی ہوگی کہ وہ بہ آسانی منفی سیاست سے باز آجائیں۔

تاباں نے پوچھا۔ ''ہمارے معاملات کیسے نمٹیں گے۔ میں بدنام نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے فوراً ہی سرمد ٹاؤن سے چلی آئی۔ لیکن اس بستی سے دور نہیں رہ سکوں گی۔ عوام کی فلاح و بہبود کا جذبہ مجھے وہاں کھینچتا رہے گا۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ہم یہی چاہتے ہیں، تم واپس آجاؤ۔''

''ضرور آؤں گی لیکن ہم وہاں آزادی سے نہیں مل سکیں گے۔ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز اور تنقید کا نشانہ بنتے رہیں گے۔''

''ہمیں ملنا ہوگا تو سرمد ٹاؤن سے دور ہوجایا کریں گے جیسا کہ ابھی یہاں مل رہے ہیں۔''

وہ تینوں چپ ہوکر اپنے طور پر سوچنے لگے۔ بڑے پیار سے وقت گزارتے وقت ایک دل ہوتا ہے اور ایک دل والی ہوتی ہے۔ تیسرا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو کباب میں ہڈی کہلاتا ہے۔

اور وہ تین تھے۔ تیسرا فاضل تھا اور یہ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ ان دو میں سے کون فاضل ہے اور کباب میں ہڈی ہے۔ وہ دونوں ہی ضروری تھے۔

ابھی عشقیہ رسمی ملاقاتیں تھیں۔ وصال کے لمحوں میں کیا ہونے والا تھا؟

اور ابھی وہ اتنی دور وصال کے تقاضوں کو اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ بعض اوقات عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی سمجھ میں نہیں آتے۔ شاید ان کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ شاید جسمانی ہوس نہیں تھی، روح سے لگاؤ تھا۔

غصے کا علاج

ایک شخص غصے کا بہت تیز تھا۔ اسے ایک عالم نے مشورہ دیا کہ جب غصہ آئے تو جنگل میں جاکر ایک درخت میں کیل ٹھونکنا، اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ آخر ایک دن اس کا غصہ ختم ہوگیا۔ تو اس نے جاکر عالم کو بتایا۔ اب عالم نے کہا کہ درخت سے کیلیں نکال لاؤ۔ آدمی گیا اور کیلیں نکال لایا۔ اب عالم نے اس کو درخت دکھایا جس میں کیلوں کی وجہ سے بہت سے سوراخ بن گئے تھے۔ عالم نے کہا یہ وہ سوراخ ہیں جو تم لوگوں کے دلوں میں کرتے ہو۔ یہ دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہوا اور اس نے اللہ سے معافی مانگی اور سچے دل سے توبہ کی۔

پیارے دوستو! ہمیں بھی چاہیے کہ تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہوئے خود پہ کنٹرول رکھیں اور لوگوں کے دلوں میں سوراخ نہ کریں ورنہ ان کے نشان رہ جاتے ہیں اور رشتوں میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں اس لیے کسی بھی معاملے میں عفوودرگزر سے کام لیں۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

فی الحال رومانوی تقاضے پورے کرنے کے لیے لازمی تھا کہ وہ تینوں بیک وقت نہ ملتے۔ ایک بار ربانی اس کے ساتھ بھرپور وقت گزارتا اور ایسے وقت رحمانی نہ ہوتا پھر رحمانی اس کے ساتھ کہیں تنہائی میں سیر و تفریح کرتا اور ربانی ان سے دور رہتا۔

ضروری نہیں کہ پیار کرنے والے تنہائی میں بہک جائیں۔ یہ یقین تھا کہ ان کے دلوں میں گمراہی کی سمت لے جانے والی ہوٹل نہیں ہے۔ وہ تنہائی میں بے جھجک نیک نیتی سے ایک دوسرے کی قربت چاہتے تھے اور ایسی قربت دنیا والوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

ربانی نے کہا۔ ''تاباں! کل میں سرمد ٹاؤن کے معاملات سنبھالوں گا۔ رحمانی تمہارے ساتھ سارا دن رہے گا۔ پرسوں یہ ٹاؤن میں رہ کر وہاں کی ذمے داریاں سنبھالے گا اور میں تمہارے ساتھ صبح سے شام تک رہوں گا۔ کیا تمہیں منظور ہے؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ مجھے منظور ہے۔''

تاباں سرمد ٹاؤن سے آکر جیسے بچھڑ گئی تھی۔ اب پھر مل رہی تھی۔ وہ تینوں خوش تھے۔ ربانی اور رحمانی تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں معظم، اعظم اور کامران باتیں کر رہے تھے۔ اس کے مؤکل نے کہا تھا کہ وہ ربانی اور رحمانی کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے جا رہا ہے۔ ابھی واپس آجائے گا۔ وہ تینوں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر کامران صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دیوار پر تحریر نظر آرہی تھی۔ وہ پڑھنے لگا۔ ''آدم ربانی اور آدم رحمانی سرمد ٹاؤن میں نہیں ہیں۔ وہ اسی محل میں ہیں۔''

یہ چونکا دینے والی اطلاع تھی۔ وہ صوفوں پر پہلو بدلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ''کیا واقعی یہاں ہیں؟ کیا تمہارا مؤکل انہیں سامنے لا سکتا ہے؟''

''وہ دونوں تاباں کے بیڈ روم میں ہیں۔ باہر نہیں آئیں گے۔''

''کیا بکواس ہے؟ یہ سراسر بے حیائی ہے۔ کیا دونوں تاباں کے بند کمرے میں ہیں؟''

''ہاں مگر الگ الگ کمرے میں ہیں۔''

''یعنی کہ کوئی ایک اس کے ساتھ کمرے میں ہے۔ دوسرا کسی دوسرے کمرے میں تنہا ہے؟''

کامران نے نوشتۂ دیوار پڑھتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے کمرے میں وہ دوسرا بھی تاباں کے ساتھ ہے۔''

معظم نے گھور کر پوچھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تاباں ایک کمرے میں ایک کے ساتھ ہے۔ دوسرے کمرے میں بھی دوسرے کے ساتھ کیسے ہو سکتی ہے؟ تاباں دو نہیں ایک ہے۔''

''میرے مؤکل نے غلط بیانی نہیں کی ہے۔ دو کمروں میں دو تاباں ہیں۔''

انہوں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ فوراً ہی صوفے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر آئے۔ پھر انہوں نے تاباں کے دروازے پر آکر دستک دی۔ اندر سے بیٹی کی آواز سنائی دی۔ ''پلیز۔ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں باتیں کر رہی ہوں۔''

''کیا وہ تمہارے کمرے میں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''جی ہاں۔ یہاں آدم ربانی ہیں۔ ہماری زندگی میں جو پیار بھری الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں انہیں ہم سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر آدم رحمانی کہاں ہے؟ ہم اس سے بات کریں گے۔''

''وہ ساتھ والے بیڈ روم میں ہے۔''

انہوں نے دوسرے بیڈ روم کے دروازے پر آکر دستک دی۔ پھر وہاں بھی تاباں کی آواز سن کر چونک گئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں رحمانی سے بہت ضروری باتیں کر رہی ہوں۔''

باپ نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''ہم نے ابھی دوسرے بیڈ روم میں تمہاری آواز سنی ہے۔ پھر تم یہاں بھی کیسے ہو؟''

''پتا نہیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو ایک ہوں اور ابھی رحمانی کے ساتھ ہوں۔''

معظم اور اعظم نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر تیزی سے چلتے ہوئے پہلے بیڈ روم کے دروازے پر آئے۔ وہاں دستک دینے پر بیٹی کی آواز سنائی دی۔ ''پلیز جائیں۔ کسی کی تنہائی میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا باپ ہوں۔ حکم دیتا ہوں۔ باہر آؤ۔''

''سوری۔ جوانی میں جوان بچے جوانی کی مانتے ہیں بڑھاپے کی نہیں۔ صبح سے پہلے دروازہ نہیں کھلے گا۔''

وہ غصے سے دروازے کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ ایک حاکم حکم عدولی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دروازہ توڑ کر بیٹی کی گردن دبوچ کر اس کے دوست کو گولی مار سکتا تھا۔

وہ ایک باپ کی حیثیت سے ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے بہت طاقت ور تھا۔ اس کے باوجود بہت مجبور تھا۔ ملازموں سے دروازہ تڑوا کر بیٹی کی بے حیائی کو مشتہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اپنی گردن جھک جاتی۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر اعظم سے بولا۔ ''میں بہت برداشت کررہا ہوں۔ مجبوری ہے برداشت کرنا ہی ہوگا لیکن میری ایک بیٹی دو کیسے ہوگئیں؟''

اعظم نے کہا۔ ''ہاں یقین نہیں ہورہا ہے آئیں پھر پوچھتے ہیں۔''

وہ دونوں پھر دوسرے دروازے پر آئے۔ وہاں دستک دینے پر دوسری تاباں کی آواز سنائی دی۔ اس نے بند دروازے کے پیچھے سے پوچھا۔ ''کیا پریشانی ہے؟''

''فارگاڈ سیک تھوڑی دیر کے لیے باہر آؤ۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں تم دو کیسے ہوگئی ہو؟''

''میں دو نہیں ایک ہوں۔ ابھی رحمانی کے ساتھ ہوں۔ پلیز جائیں آرام کریں۔ اب کچھ بولیں گے تو جواب نہیں ملے گا۔''

وہ دونوں ذرا دور ہوکر کبھی اس دروازے کو کبھی اس دروازے کو حیرانی سے دیکھنے لگے۔ معظم نے کہا۔ ''میری ایک ہی بیٹی ہے۔ کیا صبح ان دروازوں سے دو نکلیں گی؟''

آدم ربانی اور آدم رحمانی ڈرائنگ روم سے آکر ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ نہ وہ تاباں کے کمرے میں تھے اور نہ ہی وہ ایک سے دو ہوئی تھی۔

معظم نے اعظم سے کہا۔ ''اگرچہ یہ ناقابلِ یقین ہے۔ تاہم ایسا ہورہا ہے اور یہ بات میرے حق میں ہے۔ میری دو بیٹیاں ہوں گی تو کسی روک ٹوک کے بغیر دو داماد ہوجائیں گے۔ ان مسیحاؤں سے پکی رشتے داری ہو جائے گی۔''

''یہ کہو کہ پکی رشتے داری ہوچکی ہے۔ ان دو کمروں میں کیا ہورہا ہے؟ یہ اندر سے بند ہیں۔ ادھر بھی دولہا دلہن ہیں ادھر بھی دولہا دلہن ہیں۔ آپ دو دامادوں کے سُسر بن چکے ہیں۔''

اعظم نے معظم کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔''

معظم نے پوچھا۔ ''کیا کامران کے مؤکل نے تاباں کو ایک سے دو کیا ہے؟''

''شاید اسی نے یہ مشکل آسان کی ہے۔ یہ ماننا ہوگا کہ وہ آئندہ بھی ہمارے بہت کام آتا رہے گا۔''

''چلیں۔ اس سے پوچھیں کیا تاباں آئندہ بھی دو رہا کریں گی۔ اب تو بات اسی طرح بنے گی کہ وہ دو رہ کر دو دامادوں کا رشتہ بحال رکھے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ ربانی اور رحمانی ان کے ساتھ تھے۔ کامران نے حکمرانوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا میرے مؤکل نے درست کہا ہے' صاحبزادی ایک سے دو ہوگئی ہیں؟''

''ہاں، تم نے درست کہا ہے۔ اگر تمہارے مؤکل نے اسے ایک سے دو بنایا ہے تو سمجھو' تم اسی لمحے سے سرکاری نجومی اور عامل کامل کا عہدہ حاصل کرچکے ہو۔''

معظم نے کہا۔ ''اب مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ دونوں میرے تابعدار داماد بن کر رہ سکیں گے یا نہیں؟''

وہ بولا۔ ''اگر وہ تابعدار یا ہم مزاج نہ ہوئے تو انہیں پیار سے یا عداوت سے جھکایا جائے گا۔ میرا مؤکل ضرور انہیں آپ کے آگے جھکائے گا۔''

اس نے بے چینی سے کہا۔ ''کب تک جھکائے گا؟ جو کام آج ہوسکتا ہے' اسے کل پر نہ ٹالو۔''

''ٹالنا تو ہوگا۔ وہ دونوں عاشق نہ خواب گاہ سے باہر آئیں گے نہ آپ کی صاحبزادیاں انہیں آنے دیں گی اور نہ ہی میرے مؤکل سے ان کا سامنا ہوسکے گا۔ آپ حضرات کو کل صبح تک انتظار کرنا ہی ہوگا۔''

مجبوری تھی۔ دوسری صبح کا انتظار کرنا تھا۔ صبح دو دروازے کھلنے والے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق دو تاباں نمودار ہونے والی تھیں۔ کامران کو حکم دیا گیا کہ وہ اس وقت تک سرکاری محل کی انیکسی میں رہے گا۔ جب تک اس کا مؤکل ربانی اور رحمانی سے خاطر خواہ رابطہ نہیں کرے گا۔

اس رات کی صبح کرنی مشکل ہوگئی تھی۔ تجسس کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔ صبح ہوتے ہی دو تاباں کو دیکھنے کی بے چینی تھی۔ جو کبھی نہ ہوا' وہ نظر آنے والا تھا۔

اعظم خان اس رات اپنے محل میں نہیں گیا۔ اس نے وہیں معظم خان کے ساتھ رات گزاری۔ کبھی فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس روز بھی نہیں پڑھی لیکن اذان کے وقت دونوں اٹھ بیٹھے۔ کامران اللہ اللہ کررہا تھا۔ دعائیں مانگ رہا تھا کہ ایک کے بجائے دو نکلیں گی تو وہ حکمران اس نجومی کو سر پہ بٹھائیں گے۔

صبح ہوتے ہی اسے محل میں بلایا گیا۔ بڑے لوگ دن چڑھے تک سوتے رہتے ہیں لیکن تاباں عبادت کے لیے اٹھ گئی تھی۔ معظم اور اعظم نے دروازے پر آکر دستک دی پھر آواز دی۔ ''بیٹی اب تو دروازہ کھول دو۔''

دروازہ کھل ہی گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر بلقیس بیگم کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے میاں کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کل رات سے بیٹی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''

باپ نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''تاباں کہاں ہے؟ اب تو ہماری دو بیٹیاں ہوگئی ہیں نا؟''

بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔ ''دو بیٹیاں.....؟ یہ ایک اور بیٹی کہاں سے آگئی ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ میں نے کل رات دو بیڈ روم میں دو تاباں کی آوازیں سنی ہیں۔''

اعظم خان نے کہا۔ ''بھابی! میں گواہی دیتا ہوں۔ میں نے بھی سنی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اکثر بیٹی کے پاس آکر سوتی ہوں۔ ہم ماں بیٹی نے ساری رات ایک کمرے میں ایک بیڈ پر گزاری ہے۔ پھر دوسرے کمرے میں آپ دونوں نے تاباں کی آواز کہاں سے سن لی؟''

معظم نے کہا۔ ''تاباں نے خود اس دروازے کے پیچھے سے کہا تھا کہ وہ آدم ربانی کے ساتھ ہے اور اس دروازے کے پیچھے سے کہا تھا کہ آدم رحمانی اس کے ساتھ ہے۔''

بلقیس بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''توبہ توبہ نیک سیرت پاک دامن بیٹی کو الزام دے رہے ہیں۔ وہ اور کسی نامحرم کے ساتھ بیڈ روم میں تھی؟ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آرہی ہے؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے جو سنا ہے' سمجھا ہے وہ کہہ رہا ہوں۔''

''آپ نے بیٹی کی آواز بند کمرے سے سنی۔ اسے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور میں بند کمرے میں اس کے ساتھ رات گزار رہی تھی۔ یہ ماں اس کی پارسائی کی گواہ ہے اور باپ کیچڑ اچھال رہا ہے۔ خدا کے لیے جائیں۔ صبح سویرے دماغ خراب نہ کریں۔''

بیگم نے زوردار آواز کے ساتھ اس کے منہ پر دروازہ بند کردیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کل رات ان دروازوں پر جو سنا کیا وہ فریب سماعت تھا؟''

''اب تو یہی سمجھ میں آرہا ہے۔ ایک ماں چشم دید گواہ ہے کہ نہ وہ دو نامحرم تھے اور نہ ہی تاباں ایک سے دو ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی بیڈ روم میں ماں کے ساتھ تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کل رات ہمارے ساتھ کوئی جادوئی چکر چلتا رہا ہے۔''

''کامران کالا جادو جانتا ہے۔ اس کے مؤکل نے ہمیں الو بنایا ہے۔''

وہ دونوں غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ کامران فوراً ہی اٹھ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ معظم نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم کل رات سے ہمیں دھوکا دے رہے ہو۔ میری بیٹی ایک ہی ہے۔ وہ ایک ہی رہے گی۔ تمہارے مؤکل نے بند کمرے سے دو تاباں کی آوازیں سنائیں۔ شعبدہ بازی دکھائی۔ ہمارا قیمتی وقت ضائع کیا۔ اس کی سزا جانتے ہو؟''

نجومی کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ معظم نے اس کی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟ فوراً صفائی پیش کرو۔ ورنہ تمہیں الٹا لٹکا کر تمہاری کھال کھینچ لی جائے گی۔''

وہ انعام واکرام سے مالا مال ہونے آیا تھا اور اسے بہت کچھ ملنے والا بھی تھا۔ اب بازی پلٹتے دیکھ کر کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ وہ عاجزی سے بولا۔ ''میں تو وہی کہتا ہوں' جو مؤکل مجھے سمجھاتا ہے۔ پلیز مجھے تھوڑی مہلت دیں۔ میں معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا ہورہا ہے؟''

رحمانی اور تاباں میں یہ طے پایا تھا کہ آج کا دن وہ سیر وتفریح میں گزاریں گے۔ اس لیے وہ صبح ہی وہاں پہنچ گیا تھا پھر ان اعلیٰ حکام سے بھی اسے نمٹنا تھا۔

اس نے دیوار پر تحریر پیش کی۔ کامران فوراً اسے پڑھنے لگا۔ ''آدم ربانی اور رحمانی کسی کو نظر نہیں آتے۔ کل رات تاباں کی والدہ کو بھی نظر نہیں آئے۔ جبکہ دونوں وہاں موجود تھے۔''

اعظم خان نے پوچھا۔ ''تو پھر دوسری تاباں کہاں ہے؟''

وہ دیوار کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دوسری تاباں صرف اپنے محبوب کو دکھائی دے گی۔ ہم نے ایک انار اور دو بیمار کا مسئلہ حل کردیا ہے۔ آئندہ وہ دونوں ہی آپ کے داماد ہوں گے۔''

''جب دوسری تاباں نظر نہیں آئے گی تو ہم دنیا والوں کو کیسے یقین دلائیں گے کہ ہماری ایک اور بیٹی ایک اور داماد ہے؟''

''کوئی ضروری نہیں ہے کہ دوسرے داماد کو ظاہر کیا جائے۔ دوسرے سے در پردہ رشتہ رہے گا۔ میرے مؤکل نے اس بے حیائی اور بے غیرتی سے بچالیا ہے کہ ایک بیٹی کے دو شوہر اور آپ کے دو داماد ہوں گے۔ آئندہ آپ ان دونوں کو اپنا ہم مزاج بنا کر سیاسی استحکام حاصل کر سکیں گے۔''

معظم نے کہا۔''بیشک یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن....''

اعظم خان نے کہا۔''کوئی ضروری نہیں ہے کہ دنیا والوں کے سامنے دوسرے کو داماد کہا جائے۔ حالات ہمارے موافق ہیں۔ ہم یہ ظاہر کریں گے کہ تاباں نے ربانی سے شادی کی ہے اور رحمانی فی الحال شادی نہیں کرے گا جبکہ در پردہ دوسری تاباں کے ذریعے آپ کا داماد بن چکا ہوگا۔''

وہ سب اس معاملے کے الجھے ہوئے پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ الجھنیں ایسی پیچیدہ نہیں تھیں کہ سمجھ میں نہ آتیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ معظم خان دونوں کو داماد بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ اب جو دوسری بیٹی پیدا ہوئی تھی، وہ نادیدہ تھی لیکن رحمانی کی محبوبہ اور شریکِ حیات بن کر رہ سکتی تھی۔

معظم نے سر کھجاتے ہوئے سوچتے ہوئے کہا۔''میری بیگم تاباں کے ساتھ رہی۔ وہ دونوں اسے نظر نہیں آئے۔ بیگم نے بیٹی کو ان سے باتیں کرتے تو سنا ہوگا؟''

نوشتۂ دیوار نے کہا۔''سر کھجانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلقیس بیگم تمام رات گہری نیند سوتی رہیں۔ بیٹی نے اپنے عشقیہ معاملے میں انہیں راز دار نہیں بنایا ہے۔''

معظم نے قائل ہو کر کہا۔''ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ پیار و محبت کے معاملے میں لڑکیاں بزرگوں کو راز دار نہیں بناتی ہیں۔''

وہ اور سوچتے ہوئے بولا۔''ابھی میں نے بیگم سے باتیں کی تھیں۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو دو دامادوں کا مسئلہ حل ہونے کی خوش خبری ضرور سناتیں۔ وہ واقعی دوسری تاباں کے سلسلے میں انجان ہیں۔ میں ابھی جا کر تاباں سے بات کرتا ہوں۔''

ربانی دور بیٹھا یہ تماشے کر رہا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے تاباں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں تاباں کی تنہائی میں آنے سے پہلے سوچتے سمجھتے تھے کہ پتا نہیں وہ کس حالت میں ہوگی۔ اس لیے اخلاقاً پہلے اطلاع دیا کرتے تھے۔

تاباں نے فون پر سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔''کیا آسکتا ہوں؟''

''اتنی صبح آرہے ہیں۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ آجائیں۔''

دوسرے ہی لمحے میں وہ حاضر ہو گیا۔ بلقیس بیگم وہاں سے جا چکی تھی۔ ربانی اسے پچھلی رات کی باتیں بتانے لگا۔ وہ حیرانی سے بولی۔''تم نے یہ دوسری تاباں کا چکر کیوں چلایا ہے؟''

''تمہارے ابو کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا ہے کہ وہ مجھے اور رحمانی کو اپنی پلاننگ کے مطابق داماد بنا کر اپنی منفی سیاست جاری رکھ سکیں گے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ دوسری تاباں نادیدہ ہے۔ وہ صرف رحمانی کو نظر آتی رہے گی۔ یوں وہ رحمانی کی نادیدہ دلہن اور تم میری منکوحہ بن سکو گی۔''

تاباں نے پوچھا۔''حقیقتاً ایسا تو نہیں ہوگا؟ میں تمہاری منکوحہ بنوں گی تو رحمانی محروم رہے گا؟''

''ابھی منکوحہ بننے کا مرحلہ دور ہے۔ تم اپنے بزرگوں کو یہ فیصلہ سناؤ گی کہ ہماری شادی کم از کم دو چار ماہ بعد ہوگی۔''

''دو چار ماہ بعد کیوں؟''

''اتنی مدت میں ہم اپنے مسئلے کا حل نکالیں گے۔ تم ہماری شریکِ حیات کیسے بن سکو گی' یہ ابھی ہم نہیں جانتے۔ بس یقین ہے کہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔''

''میرے ابو اور انکل اعظم تم دونوں سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہم ان سے بات کریں گے لیکن انہیں نظر نہیں آئیں گے۔ انہیں طرح طرح سے الجھاتے رہیں گے اور اس طرح ان کے ڈھکے چھپے گہرے سیاسی معاملات کو قریب سے سمجھتے رہیں گے۔''

دروازے پر دستک سنائی دی، ربانی نے کہا۔''تمہارے ابو آئے ہیں۔ دروازہ کھولو۔''

تاباں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ معظم نے اندر آکر پورے کمرے میں ایک نظر ڈالی۔ وہ بیگم کو وہاں دیکھ کر گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔''تمہاری امی کہاں ہیں؟''

''وہ شاور لینے گئی ہیں۔ ابھی ہم ناشتے کی میز پر ملیں گے۔''

''میں تنہائی میں پوچھ رہا ہوں۔ اپنے باپ سے جھوٹ نہ بولنا۔ کیا تمہاری امی یہاں گہری نیند میں تھیں؟ اور آدم ربانی تمہارے ساتھ تھا؟''

''جی ہاں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میری ایک ہمزاد نہ جانے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ آپ نے دوسرے کمرے میں اس کی آواز سنی ہوگی۔''

"سن کر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ ہمزاد میری بیٹی ہے۔ اسے میرے پاس آنا چاہیے۔ وہ کہاں ہے اسے میرے سامنے بلاؤ۔"

"وہ نادیدہ ہے۔ اس کا تعلق باپ سے نہیں، صرف ہونے والے شوہر سے ہے۔ وہ صرف اسے نظر آیا کرے گی۔"

"وہ اچانک پیدا کیسے ہوگئی؟ اس دنیا میں رہے گی تو میری بیٹی کہلائے گی۔ اسے میرے سامنے آنا چاہیے۔"

"آپ سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ ہی امی نے اسے جنم دیا ہے۔ آپ اس پر کوئی حق جتا نہیں سکیں گے بلکہ اس کے احسان مند رہیں گے۔ اس کے نادیدہ وجود کے طفیل رحمانی بھی آپ کا داماد کہلاتا رہے گا۔"

وہ سوچنے لگا۔ واقعی رحمانی اور نادیدہ تاباں سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کے کام آنے والے تھے۔ وہ ان کے احسانات سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔

ربانی اور رحمانی نے اسے خوب الجھایا تھا۔ وہ انہیں دشمن سمجھنے کے باوجود ان کا احسان مند ہوگیا تھا۔ آئندہ کامران کے ذریعے مزید الجھنوں میں مبتلا ہونے والا تھا۔

تاباں نے کہا۔ "آپ کامران پر اعتماد کریں۔ وہ بہت پہنچا ہوا عامل ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کے ذریعے ہماری مشکلیں آسان ہو رہی ہیں۔"

"کیا تم مطمئن ہو؟ کیا تمہاری ہمزاد میری بیٹی بن کر رہا کرے گی اور رحمانی کو میرا داماد بنائے رکھے گی؟"

"مجھے تو پورا یقین ہے۔ ربانی اور رحمانی کو ان کی دلی آرزوؤں کے مطابق ایک ایک تاباں مل گئی ہے۔ ہمارا مسئلہ حل ہوتا نظر آرہا ہے۔"

"تو پھر شادی میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"شادی اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ ربانی اور رحمانی نے کہا ہے، وہ دو چار ماہ تک بوستان کو ایک مثالی ملک بنانے میں مصروف رہیں گے۔ اس کے بعد شادی خانہ آبادی ہوگی۔"

"یعنی دو چار ماہ تک مجھ سے رشتے داری نہیں ہوگی۔ وہ پرائے رہیں گے۔ میرا احترام نہیں کریں گے۔ میرے ملکی معاملات میں مخالفت کرتے رہیں گے۔ صاف صاف سن لو۔ پہلے میں ان دونوں سے ملاقات کروں گا۔ پہلے سیاسی معاملات طے کروں گا پھر شادی وادی کی باتیں ہوں گی۔ میری بات مانو۔ ان دونوں کو بلاؤ۔ میں ابھی ان سے دوٹوک باتیں کروں گا۔"

ربانی خاموش بیٹھا باپ بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ضرورت کے وقت تاباں سے بات کرتا تھا۔ اس کی باتیں معظم کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھیں۔ تاباں نے کہا۔ "وہ دونوں سرد ٹاؤن میں بہت مصروف ہیں۔ میں آج ہی ان سے ملاقات کا وقت مقرر کرلوں گی۔"

اس نے بیٹی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کمرے سے نکل کر کامران کے پاس آیا۔ ربانی بھی وہیں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ اعظم خان نے معظم سے پوچھا۔ "تاباں کیا کہتی ہے؟"

"وہ تسلیم کر رہی ہے کہ ایک سے دو ہوگئی ہے۔ دوسری تاباں کا وجود ہے لیکن وہ نادیدہ رہے گی۔ صرف اپنے ہونے والے شوہر کو نظر آتی رہے گی۔"

پھر وہ کامران سے بولا۔ "تمہارے مؤکل نے عجیب کرشمہ دکھایا ہے لیکن ہمارے سیاسی مسائل خاطر خواہ حل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ دو چار ماہ کے بعد شادیاں کرنا چاہتے ہیں۔"

کامران نے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"اپنے مؤکل سے کہو۔ ربانی اور رحمانی کو زیر کرے۔ انہیں اپنے زیر اثر لاکر ہمارا فرمانبردار اور تابعدار بنائے۔"

اعظم خان نے کہا۔ "آج نہ سہی دو چار ماہ کے بعد ہی سہی وہ ہمارے داماد بنیں گے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ہمارے پاس آکر اہم معاملات پر باتیں کریں۔"

معظم نے کہا۔ "تاباں کہتی ہے، وہ بہت مصروف ہیں۔ آج کسی وقت ان سے ملاقات کرائے گی۔"

کامران نے کہا۔ "میں اپنے مؤکل کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ ابھی کچھ کہنے والا ہے۔"

"اپنے مؤکل سے بولو۔ ابھی ان دونوں کو یہاں لے آئے۔ انہیں ہمارے سامنے مجبور اور بے بس بنا دے۔ کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟"

ربانی نے دیوار پر تحریر پیش کی۔ کامران نے پڑھا۔ "اے میرے آقا! کامران! میں تیرا تابعدار ہوں۔ تیرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لاسکتا ہوں لیکن میرے آقا! تجھ سے صرف کام لیا جا رہا ہے۔ تیری قدر نہیں کی جا رہی ہے۔ تیری صحیح قیمت ادا نہیں کی جا رہی ہے۔ ان سے صاف کہہ دے۔ اس ہاتھ دیں اور اس ہاتھ لیں۔"

معظم نے جلدی سے کہا۔ "میں ابھی دو لاکھ کا چیک دے رہا ہوں۔ وہ دونوں مجھ سے ملاقات کرنے آئیں گے تو ایک ہفتے کے اندر ایک شاندار بنگلا اور کار... تمہارے نام ہو جائیں گی۔"

دیوار پر جو تحریر ابھری، اس کے مطابق نجومی نے

کہا۔ ”انتظار کرو اور چیک لکھو۔“
معظم نے فوراً ہی فون پر اپنے پی اے کو حکم دیا۔ ”کامران کے نام سے دو لاکھ روپے کا چیک لے آؤ۔“
حکم کی تعمیل ہوئی۔ دس منٹ کے اندر اس کنگال نجومی کو دو لاکھ روپے کا چیک مل گیا۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے دیوار کی طرف دیکھا پھر پڑھا۔ ”آدم ربانی اور آدم رحمانی بہت مصروف ہیں۔ لیکن میرے مؤکل نے کسی ایک کو آنے پر مجبور کیا ہے۔ ربانی صرف دس منٹ کے لیے ابھی آرہا ہے۔“
دونوں حاکمِ اعلیٰ اپنی جگہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پورے ڈرائنگ روم میں نظریں دوڑانے لگے۔ وہ نظر نہیں آسکتے تھے۔ ربانی کچھ فاصلے پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری نظریں مجھے ڈھونڈ رہی ہیں۔ جیسا کہ جانتے ہو۔ میں نظر نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ہمارے درمیان صرف آواز کے ذریعے رابطہ رہے گا۔“
”تاباں کی طرح ہم سے بھی دوستانہ ماحول میں رو برو ہو۔ ہم تمہارے بزرگ ہیں۔ ہمارے سامنے آؤ۔“
”سچ سامنے آئے تو جھوٹ بھاگ جاتا ہے۔ تاباں ہماری ہم مزاج ہے۔ اس لیے ہم اسے سچ کی طرح نظر آتے ہیں۔ تم ہمیں دیکھ نہیں سکو گے۔ پہلے اچھی طرح سوچو سمجھو کہ اپنا منفی مزاج اور کھوٹی نیت بدل سکتے ہو یا نہیں؟ جب خود کو بدل لو گے تو ہمارے درمیان بات بن جائے گی۔“
”پلیز درمیانہ روی اختیار کرو۔ بات اس طرح بنے گی کہ ہم تمہاری ہدایات کے مطابق بعض معاملات میں سچ بولیں گے۔ تم دونوں ہمارے مفادات کے مطابق بعض معاملات میں جھوٹ بولو گے۔ ہم میں سے کسی کی ذات کو کسی سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی رہیں گی۔“
”یہ منافقت، یہ شیطانیت اپنے پاس رکھو۔ ہمارے درمیان ایسا سمجھوتا قیامت تک نہیں ہوگا۔“
”تو پھر یہ سمجھوتا کرو کہ ہمارے ملکی معاملات میں مداخلت نہیں کرو گے۔ ہمارے لیے مسائل پیدا نہیں کرو گے۔“
”یہ ملک بوستان تمہاری جاگیر نہیں ہے کہ یہاں اپنی من مانی کرو گے اور ہم تمہیں فرعون بننے کی چھوٹ دیتے رہیں گے۔ یہ لکھ لو کہ ہم فرعونوں کو سمندر میں غرق کرنے آئے ہیں۔“
پھر اس نے کہا۔ ”ملاقات کے آٹھ منٹ گزر چکے ہیں۔ دو منٹ بعد میں چلا جاؤں گا۔“
”ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آؤ گے تو ہم کسی نتیجے تک کیسے پہنچیں گے۔ ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔“
”شروع ہوتے ہی اختتام معلوم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوگی لاحاصل ہوگی۔ میں یہاں سے جا چکا ہوں۔“
معظم نے جلدی سے کہا۔ ”جسٹ اے منٹ۔ گفتگو سیر حاصل ہوگی۔ آج شام میرے ساتھ وقت گزارو۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“
”تمام باتیں ایک ہی بات پر آکر ختم ہو جاتی ہیں۔ تم چاہو یا نہ چاہو۔ چند ماہ بعد تمہاری بیٹی ہماری دلہن بن جائے گی۔“
وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”ایک حاکم کے سامنے حاکم بن کر نہ بولو۔ میرے حکم کے بغیر تم تاباں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔“
ربانی نے کہا۔ ”اس کی پارسائی کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کل اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ تم اس کا ہاتھ پکڑنے سے کیا روکو گے۔ ہم نے خود حیا کا پاس رکھا ہے۔“
پھر کامران نے تحریر پڑھی۔ ”جناب عالی! ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ وہ جا چکا ہے۔“
معظم نے غصے سے اٹھ کر کہا۔ ”ساری دنیا مجھ سے ملاقات کا وقت مانگتی ہے اور وہ مجھے وقت کا محتاج بنا کر گیا ہے۔ وہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ مجھے اپنا دشمن بنا کر خود سے دشمنی کر رہا ہے۔ میں اس کا جینا حرام کر دوں گا۔ اسے اپنی بیٹی کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دوں گا۔“
وہ غصے سے تنتناتا ہوا بیٹی کے کمرے میں آیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ ایک ملازمہ نے آکر کہا کہ ناشتے کی میز پر اس کا اور اعظم خان کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ دونوں ڈائننگ روم میں آئے۔ معظم غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے بیٹی کو گھور کر دیکھا پھر اعظم خان سے کہا۔ ”آپ ناشتا کریں۔ میں ابھی نہیں کھاؤں گا۔ پہلے ان دونوں کو کچا چباؤں گا۔“
بلقیس بیگم نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا؟ کیوں صبح سویرے انگارے چبا رہے ہو؟“
وہ بولا۔ ”تمہاری یہ لاڈلی میرے لیے انگارے بچھا رہی ہے۔ میں حکم دیتا ہوں۔ یہ میری اجازت کے بغیر اس پیلس سے باہر قدم نہیں رکھے گی۔“
تاباں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ناشتے کے بعد آؤٹنگ کے لیے جا رہی ہوں۔“
”جب تک ربانی اور رحمانی میرے قدموں میں آکر نہیں جھکیں گے، تب تک تم ان سے فون پر بھی بات نہیں کر

سکوگی۔‘‘

تاباں کا فون میز پر رکھا ہوا تھا۔ معظم نے اسے اٹھالیا۔ وہ بولی۔ ’’ابو! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں ایک بالغ، پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ ابھی جا کر کسی سے کورٹ میرج کر سکتی ہوں۔‘‘

’’تم یہاں نظر بند رہوگی۔ اس چار دیواری سے باہر لان میں بھی نہیں جا سکوگی۔ گارڈز میرے حکم کے بغیر تمہیں باہر نکلنے نہیں دیں گے۔ تم میرا غصہ جانتی ہو۔‘‘

بلقیس بیگم نے پوچھا۔ ’’کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ جوان بیٹی پر پابندیاں عائد کرنے کی نادانی کر رہے ہیں۔‘‘

اعظم خان نے کہا۔ ’’بھابی! وہ فرشتے اور مسیحا کہلانے والے بہت ہی مغرور اور بدمعاش ہیں۔ انہوں نے میرے دوست کی انسلٹ کی ہے۔ ایسے مغرور سر پھرے بدمعاشوں سے ہماری رشتے داری کبھی نہیں ہو سکے گی۔‘‘

تاباں نے کہا۔ ’’وہ نہ تو مغرور ہیں نہ بدمعاش ہیں۔ سیدھی سی بات کریں کہ وہ آپ حضرات کے سیاسی مزاج کے مطابق بدمعاشی نہیں کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

معظم نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ’’ہاں۔ ہم آگ اور پانی ہیں۔ کبھی ایک نہیں ہوں گے۔ ہمارے خاندان میں سیاسی شادیاں اور رشتے داریاں ہوتی ہیں۔ تاباں کی شادی اعظم خان کے چھوٹے بیٹے فواد سے ہوگی۔‘‘

تاباں نے اعظم خان سے کہا۔ ’’انکل آپ خوب جانتے ہیں۔ آپ کے دونوں بیٹے فواد اور حماد سیاسی غنڈے ہیں۔ میں ان کے نام پر تھوکتی ہوں۔‘‘

اعظم خان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ معظم خان سے بولا۔ ’’تمہاری بیٹی ضرورت سے زیادہ سر چڑھ گئی ہے۔ میں ایک جھٹکے سے گرانا جانتا ہوں۔ صرف تمہاری دوستی اور پارٹی ڈسپلن کا لحاظ کر رہا ہوں۔‘‘

بلقیس بیگم نے کہا۔ ’’پارٹی ڈسپلن یہی ہے کہ بیٹے بدمعاش ہوں تب بھی انہیں سر پر بٹھایا جائے۔ بیٹی ایمان والی ہو تو اسے ایمان سمیت پستی میں پھینک دیا جائے۔‘‘

پھر اس نے شوہر سے کہا۔ ’’کیا بھول گئے ربانی اور رحمانی نے چھ ماہ پہلے آپ دونوں کو کیسی سزائیں دی تھیں۔ آدھا ننگا کر دیا تھا۔ کیا کپڑے پھر بوجھ لگ رہے ہیں؟‘‘

معظم نے کہا۔ ’’انہیں جو شعبدہ بازی دکھانی تھی دکھا دی۔ اب ہم دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔‘‘

اعظم نے کہا۔ ’’وہ کریں جو کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ننگے ہو جائیں گے۔ شرم آئے گی تو مر جائیں گے۔ لیکن ان بدبختوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔‘‘

ربانی موجود تھا۔ تاباں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھانے کے لئے ایک سلائس اٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگا۔ معظم اور اعظم ادھر دیکھ کر چونک گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک سلائس آپ ہی آپ پلیٹ سے اٹھ کر فضا میں معلق ہو گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی اس سلائس پر مکھن لگا رہا ہے۔

اور جو لگا رہا تھا۔ اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ دونوں دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تاباں نے ہاف فرائی انڈے کی ایک پلیٹ خالی کرسی کے سامنے میز پر رکھ دی۔

بلقیس بیگم بیٹی کو اور خالی کرسی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے میاں کو پچکارتے ہوئے کہا۔ ’’پلیز بیٹھ جائیں۔ غصہ تھوک دیں۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔‘‘

وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ’’میں ان جادوئی ہتھکنڈوں سے خوفزدہ ہونے والا نہیں ہوں۔ مرد کے بچے ہو تو سامنے آؤ۔‘‘

جو سلائس فضا میں معلق تھا۔ وہ خالی کرسی کی طرف جا کر تھوڑا کم ہو گیا۔ یعنی اسے مزے سے کھایا جا رہا تھا۔ کھانے والے کا منہ ضرور ہوگا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ یہ اور غصہ دلانے والی بات تھی۔ وہ نادیدہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

اس نے بیٹی کو محل میں قیدی بن کر رہنے کا حکم سنایا تھا۔ وہ باہر جا کر اپنے چاہنے والوں سے نہیں مل سکتی تھی۔ اب ایک خاموش چیلنج تھا کہ ملنے والا خود ہی آ گیا ہے۔ اسے پکڑ سکتے ہو۔ اپنے گھر سے بھگا سکتے ہو تو بھگا دو۔

وہاں دو حکمران تھے۔ ان کے پاس دولت کی اور اسلحہ کی عسکری قوت تھی۔ وہ وسیع اختیارات کے مالک تھے۔ عوام کو چیونٹی کی طرح مسل دیا کرتے تھے لیکن اپنے ایک ذاتی اہم معاملے میں بالکل ہی صفر ہو گئے تھے۔

بڑی مشکل تھی۔ وہ مسلح گارڈز کو بلا کر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ماں باپ کی موجودگی میں وہاں بیٹی کا دوست چھپ کر ملنے آیا ہے۔ اسے کسی طرح پکڑو۔

یہ اپنے ہی گھر کی بے حیائی کو مشتہر کرنے والی بات ہوتی۔ فی الحال یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ شرمندگی اٹھانے سے بہتر ہے خاموشی اختیار کی جائے۔

اور طاقتور مغرور حکمرانوں کی انا اور خودداری کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ ان سے خاموش نہیں رہا جا رہا تھا۔ ان سے ایسی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کیا کر سکتے تھے؟

لوگوں کی زندگی بدلنے والے مسیحاؤں کی اپنی تلپٹ ہو جانے والی زندگی کے انوکھے واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

قدموں کی آہٹ کسی دشمن کی آمد کا پتا دیتی ہے تو کبھی دوست کے آنے کی خوش خبری... مگر بعض اوقات انہی قدموں کے نشانات افتاد میں مبتلا کر دیتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کے نقشِ پا... جو اپنی کہانی خود بیان کر رہے تھے...

مغرب سے درآمد ایک چونکا دینے والا اختصار نامہ

نقشِ پا

سکندر عسکیم

شیرف والٹ بکسبائی خشمگیں نگاہوں سے ان دونوں آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا ڈپٹی ڈکسن دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

"بارٹ ٹائسن کو کسی قابلِ نفرت شخص نے گولی ماردی ہے۔ اس کی لاش ملی ہے جس پر عقب سے گولی چلائی گئی ہے۔" شیرف نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

ایلن ٹاؤن کے نائٹ کلب کا خوش پوشاک مالک کارٹر یہ سنتے ہی اپنی کرسی پر پیچھے کی جانب جھک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات اُمڈ آئے تھے۔

شیرف کے مقابل بیٹھا ہوا دوسرا شخص گیراج کا مالک جم برٹن تھا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن شیرف کے لاش کے بارے میں بتانے پر اس کا جسم تن گیا تھا۔

"قصبے میں سب ہی کو معلوم ہے بارٹ ٹائسن کا پوری دنیا میں تم دونوں کے سوا اور کوئی دشمن نہیں ہے۔ تم تینوں جوڈی وائٹ سے گزشتہ ایک برس سے عشق لڑا رہے تھے اور ہم سب جانتے ہیں کہ تمہارے درمیان ایک دوسرے سے سخت رقابت تھی۔ اس بارے میں میرے ذہن میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہے کہ تم دونوں میں سے کسی ایک کا ٹائسن پر گولی چلانے سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔" شیرف بکسبائی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

یہ سن کر جم برٹن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چوکور چہرہ تمتما رہا تھا اور اس نے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ رکھی تھیں۔ کارٹر نے خاموشی کے ساتھ اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ دی۔ اس

کا چہرہ پھیکا پڑ رہا تھا جیسے اس کے چہرے کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔
شیرف بکسبائی نے رکھائی سے جم برٹن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھی۔
”مجھے جم برٹن کے گیراج کے عقبی ٹول شیڈ سے ہائیکنگ کے جوتوں کی ایک جوڑی، ایک گن اور اس کا خالی کارتوس ملا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسی کی ملکیت ہیں۔ گن کو صاف کر دیا گیا تھا کیونکہ اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات .... نہیں پائے گئے اور جم برٹن کا کہنا ہے کہ اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس لیے اب ہم سب مل کر ٹائسن کی رہائش پر چلیں گے تاکہ وہاں پر صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں۔“ شیرف بکسبائی نے کہا۔ پھر اپنے ڈپٹی سے مخاطب ہوا۔ ”ڈکسن میں چاہتا ہوں کہ تم جوتوں کی وہ جوڑی بھی ساتھ لے چلو۔“
وہ سب شیرف کی کار میں سوار ہو گئے۔
قصبے سے تقریباً ایک میل نکلنے کے بعد کار ہائی وے کی ہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔ پھر شیرف بکسبائی نے کار ایک کچے راستے پر اتار دی جو سیدھا ہارٹ ٹائسن کے ون مین فارم پر جا رہا تھا۔
”یہاں پر کل شام سے ہونے والی بوندا باندی کی وجہ سے زمین خاصی نرم ہو چکی ہے اور اس کچے راستے پر جوتوں کے نشانات پڑ چکے ہیں۔“ شیرف بکسبائی نے کار سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جوتوں کے نشانات کا ایک سیٹ جو نہ تو میرے جوتوں کا ہے اور نہ ہی کارٹر کے جوتوں کا جس نے ہارٹ ٹائسن کی لاش دریافت کی تھی اور نہ ہی یہ ہارٹ ٹائسن کے جوتوں کے نشانات ہیں۔ یہ نشانات قاتل نے بنائے ہیں۔“ شیرف نے ان نشانات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہے وہ نشانات...... یہ جوتوں کے بڑے سے نشانات۔“
پھر شیرف اپنے ڈپٹی سے مخاطب ہوا۔ ”ڈکسن! تمہارے پاس جو جوتے موجود ہیں دیکھنا کہ کیا وہ زمین پر بنے ہوئے جوتوں کے ان نشانات پر فٹ بیٹھ رہے ہیں؟“
ڈپٹی نے مٹی میں اٹے ہوئے ہائیکنگ شوز کو زمین پر بنے جوتوں کے نشانات پر رکھ دیا۔
”ہاں شیرف۔“ ڈپٹی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جوتے ان نشانات پر بالکل فٹ بیٹھ رہے ہیں۔“
یہ سُن کر شیرف کے حلق سے ایک غراہٹ کی سی آواز اُبھری۔ وہ جم برٹن کی جانب گھوم گیا۔
”آل رائٹ جم۔“ شیرف نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ ہائیکنگ جوتے پہن کر اس صاف زمین پر چلو۔“
اس توانا شخص نے حیرانی سے شیرف کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا اور ہائیکنگ جوتے پہننے لگا۔ پھر جب وہ صاف گیلی زمین پر چلا تو وہاں جوتوں کے نشان بن گئے۔
شیرف نے اسے جوتے اتارنے کا اشارہ کیا۔ پھر نائٹ کلب کے مالک کارٹر سے گویا ہوا۔ ”اب تم ان ہائیکنگ شوز کو پہن کر صاف نرم زمین کے دوسرے حصے پر چلو۔“
کارٹر اپنے زرد رو چہرے سے ایک لمحے کے لیے شیرف کی صورت تکنے لگا۔ پھر کچھ کہے بغیر ان جوتوں کو پہن کر ان کے فیتے کسنے لگا۔ وہ چند قدم صاف نرم زمین پر چلا اور پھر گستاخانہ نظروں سے شیرف کو دیکھنے لگا۔
شیرف بکسبائی نے زمین پر تازہ بنے ہوئے جوتوں کے نشانات کا بغور جائزہ لیا۔ پھر وہ جم برٹن کی جانب بڑھ گیا۔
”جم جو بات آج صبح عجیب سی لگی وہ یہ تھی کہ جب میں گیلی زمین پر چلا تو دیکھا کہ میرے جوتے نرم مٹی میں زیادہ دھنس رہے تھے۔ میں نے ان نشانات کا قاتل کے بڑے ہائیکنگ جوتوں کے نشانات سے موازنہ کیا تو قاتل کے جوتوں کے نشانات ان نشانات کے مقابلے میں ہلکے تھے اور تم تو مجھ سے بھاری بھرکم ہو۔“
پھر شیرف تیزی سے نائٹ کلب کے مالک کارٹر کی جانب گھوم گیا جو قدرے بے چین سا دکھائی دے رہا تھا۔
”صرف تم جیسے ہلکے وزن کا مالک ہی ان ہائیکنگ کے بھاری جوتوں کو پہننے کے باوجود گیلی زمین پر ہلکے نشانات بنا سکتا ہے، کارٹر۔“ شیرف بکسبائی نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”اب ان نشانات کو دیکھو جو تم نے اب بنائے ہیں۔ یہ اتنے گہرے نشانات نہیں ہیں جتنے جم برٹن کے چلنے سے بنے ہیں بلکہ من و عن ویسے ہی ہلکے نشانات ہیں جو قاتل کے جوتوں کے نشانات ہیں۔ تم نے جم برٹن کے جوتے پہن کر اور اس کی گن استعمال کر کے ہارٹ ٹائسن کے قتل کے الزام میں اسے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ تم نے گزشتہ شب ان چیزوں کو وہاں سے چوری کیا اور پھر ہارٹ ٹائسن کو قتل کرنے کے بعد انہیں واپس اس کے گیراج کے عقب میں واقع ٹول شیڈ میں چپکے سے واپس لا کر رکھ دیا۔ تمہیں معلوم تھا کہ بعد میں ہم ان چیزوں کو وہاں سے بہ آسانی تلاش کر لیں گے۔“
کارٹر بے بسی سے دانت پیسنے لگا۔
”تم نے ایک نہایت پرفیکٹ پلان پر عمل کیا تھا اور جم برٹن کو اس قتل کے الزام میں پھانسنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔“ شیرف بکسبائی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہارے وزن نے تمہیں دھوکا دے دیا اور تمہارا ساتھ نہیں دیا۔“

خونی موتی

تنویر ریاض

سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں قیمتی اور نایاب موتیوں کا خزانہ ہی نہیں بلکہ ایسی گمشدہ کہانیاں بھی ڈوبی ہوتی ہیں... جو کبھی نہ کبھی سطح آب پر ابھر کر انہونے راز منکشف کر دیتی ہیں... جڑواں بہنوں کی دلچسپ خونی رُوداد... ایک اپنی جاں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی... اور دشمنوں کی زہریلی نظریں دوسری کے تاک میں تھیں... خطرات میں گھری لمحہ بہ لمحہ سنسنی خیزی کی جانب گامزن ایک تیز رفتار سمندری کہانی...

دولت وہوس کے کھیل میں بربادیوں کا سودا کرنے والے سوداگروں کا منصوبہ...

میں اپنی بہن کی آخری رسومات میں موتیوں کا ہار پہن کر شریک ہوئی۔ اخبار نے اس کی قیمت ستّر ہزار آسٹریلوی ڈالر بتائی تھی۔ بروم جیسے چھوٹے شہر میں رہنے والوں کے لیے یہ ایک بڑی دولت تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید میری بہن نے یہ نیکلس بھی گروی رکھوا دیا ہو کیونکہ اسے پیسوں کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ اس نے گزشتہ برس اپنی بی ایم ڈبلیو کار بیچ دی تھی اور سڈنی کی بندرگاہ پر واقع اپارٹمنٹ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

ہماری ماں کی نظریں بھی اس نیکلس پر تھیں لہٰذا میں
اس کی خاص طور سے حفاظت کر رہی تھی کیونکہ میری جڑواں
بہن نے اسے میرے پاس رکھوایا تھا۔ تدفین کے اگلے روز
اخبارات میں میری تصویر شائع ہوئی جس میں نیکلس پہنے
اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا
ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ جس پر ممانے شدید اعتراض کیا
لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ
میں کبھی اس زخم کے لیے شیتو کو معاف نہیں کرسکوں گی جو اس
نے چاقو سے میرے چہرے کے دائیں جانب لگایا تھا۔

لیکن قتل ایک ایسا واقعہ ہے جس کی وجہ سے خاندان
ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں یا پھر ان میں دوری
پیدا ہوجاتی ہے۔ شیتو کے قتل کے بعد اس طرح جڑ گیا جس کا
پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مما، پاپا اور
میں اتنے قریب آئے تھے اور ایک دوسرے کا غم ہلکا کرنے
کی کوشش کررہے تھے۔ ہم نے جذبات سے مغلوب ہوکر
مقامی پولیس کا پیچھا لے لیا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے
اس قتل کی تفتیش میں دلچسپی لی لیکن کوئی سراغ نہ ملنے پر وہ بھی
بیزار ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے ہمارا
فون سننے یا پولیس اسٹیشن میں ملنے سے انکار کردیا۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک ایسا گھرانا جس
میں ایک دوسرے کے لیے برائے نام نرمی پائی جاتی تھی۔
اچانک ہی اس میں ایکا کیسے ہوگیا۔ کیا یہ شیتو کی محبت تھی یا
اس کے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم کو حاصل کرنے کا
لالچ۔ کیا اس کے بچھڑ جانے کے بعد بھی ہمارے دلوں میں
اس کی محبت باقی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہے لیکن یہ
احساس ضرور تھا کہ جس انداز میں وہ مری تھی، اس کا کھوج
لگانا بہت ضروری ہے۔

شیتو اور میں جڑواں بہنیں تھیں۔ پاپا نے ہم دونوں
کے نام بھی اپنے کاروبار کی مناسبت سے رکھے۔ وہ سمندر
سے موتی نکالنے کا کام کرتے تھے۔ شیتو کے معنی بھی موتی
ہیں اور میں کاشیکو ہوں جس کا مطلب ہے ساحلوں کی بیٹی۔
ان ناموں کا اثر آگے چل کر ہمارے مستقبل پر پڑا۔ میں
موتی تلاش کرنے لگی اور شیتو انہیں پہنا کرتی۔ اسے ایک
بڑی کمپنی نے ماڈل کے طور پر ملازم رکھ لیا تھا۔

بدقسمتی سے پاپا کو شراب نوشی کی عادت تھی جس کی وجہ
سے ہمارا چھوٹا سا کاروبار تباہ ہوگیا۔ سمندر میں کبھی کبھار
جانے کا مطلب تھا کہ کستورا مچھلی کی تلاش کے مواقع کم ملتے
تھے اور اس طرح ہمیں بہت کم منافع ہوتا۔ جب ہم پندرہ
سال کے ہوئے تو پاپا کو شدید مالی مشکلات کی وجہ سے اپنی
کشتی بیچنا پڑ گئی اور اس کے بغیر ہمارا کاروبار بالکل ہی
چوپٹ ہوگیا پھر قسمت کی دیوی میری بہن پر مہربان ہوئی
اور اسے مشہورِ زمانہ بروم ساؤتھ سی پرلز نے جیولری ماڈل
کے طور پر منتخب کرلیا۔ اب وہ اپنی گردن، کمر، رانوں اور
سینے پر ہیرے، موتی، نیلم اور پلاٹینم کے ہار، لڑیاں
اور نیکلس سجاتی۔ وہ مختلف نمائشوں اور فیشن شوز میں شریک
ہونے لگی۔ اس کی تصویریں بین الاقوامی رسالوں میں شائع
ہوتی تھیں اور اس کے اشتہار آسٹریلین ٹی وی پر چلتے تھے۔
اس کی وجہ سے بروم ساؤتھ سی پرلز کی فروخت دوگنا ہوگئی۔
مرد اس کی تصویریں اور اشتہار دیکھ کر آہیں بھرتے اور
عورتیں بروم ساؤتھ سی پرلز خرید کر اس جیسا بننے کی کوشش
کرتیں۔

لیکن خوش قسمتی کا یہ عرصہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور
دو ماہ قبل جنوری کے وسط میں میری بہن اس دنیا سے
رخصت ہوگئی۔ میں اسی وقت اکیس دن کے سفر کے بعد
واپس آئی تھی اور جانتی تھی کہ میرے ایک کمرے والے گھر
کے فریج میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ مکان ساحل
سے دو بلاک کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ میں نے ٹاؤن بیچ پر
واقع مون مارکیٹ پر رک کر اپنے لیے کچھ پھل، بسکٹ اور
جوس کے پیکٹ خریدے۔ راستے میں ہی تھی کہ مجھے سائرن
کی آواز سنائی دی جس پر میں نے کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ
عام طور پر سیاح ہماری مشہور چاند کو جانے والی سیڑھی دیکھ کر
پاگل ہوجاتے اور اپنی گاڑیوں کے ہارن بجانا شروع
کردیتے۔

پورے چاند کی رات سمندر میں جوار بھاٹا کی کیفیت
ہوتی اور لہروں کے گھٹنے بڑھنے سے ایک دلدلی خطہ بن
جاتا۔ جب چاند چڑھتا تو اس کی روشنی میں ریت پر پانی کی
ننھی ننھی لکیریں بننا شروع ہوتیں اور یوں لگتا جیسے آسمان تک
جانے کے لیے ایک روشن سیڑھی بن گئی ہے۔ یہ نظارہ دیکھنے
کے لیے ہر مہینے کی چودھویں شب سیاح ہمارے شہر کا رخ
کرتے تھے۔ میری بہن کی لاش بھی ایک امریکن جوڑے
نے دریافت کی تھی جو ہنی مون منانے ساحل پر آیا ہوا تھا۔

پاپا نے رات ایک بجے مجھے فون کیا جب انہیں شیتو
کے بارے میں اطلاع ملی پھر مجھے یاد آیا کہ دو روز قبل میں
ایڈیلیڈ میں سوتے سے اچانک جاگ گئی تھی۔ اس وقت
گھڑی میں دس بج کر بیالیس منٹ ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں
کا کہنا ہے کہ جڑواں بچوں کے درمیان ایک خاص تعلق ہوتا

ہے۔ بالکل ٹیلی پیتھی کی طرح۔ شیو اور میرے درمیان بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہم نادانستگی میں ایک جیسے کپڑے خریدتے۔ ایک جیسی بگی پہنتے، اسکول میں ایک جیسے نمبر حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ نویں جماعت میں ایک ہی لڑکے پر ہم دونوں کا دل آگیا۔

بہت سے لوگ اسے بکواس سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسی کوئی سائنس نہیں ہے جس سے ثابت کیا جاسکے کہ جڑواں بچے ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو محسوس کرسکتے ہیں لیکن پھر وہ میرے اس ڈراؤنے خواب کی کس طرح وضاحت کریں گے جس نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔

میرے ہاتھ ٹھنڈے اور پسینے سے تر ہوگئے تھے اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے شیو کے چہرے کو ساکت اور بے حس دیکھا جو میرے کمرے کی چھت پر تیر رہا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ میرا چہرہ نہیں تھا کیونکہ اس پر کنپٹی سے لے کر ہونٹ کے کونے تک زخم کا نشان تھا۔

میں بمشکل تمام بستر سے اٹھ کر بیٹھی اور اپنے والدین کو فون پر کہا۔ ''سڈنی میں شیو سے رابطہ کریں اگر وہاں سے جواب نہ ملے تو پولیس کو فون کیا جائے اور اس بات کا یقین کرلیں کہ انہوں نے ایمبولینس بھیج دی ہے۔''

مما نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ میرے اور شیو کے بندھن کو جانتی تھیں۔ ان کے ٹیلی فون نے شیو کی زندگی بچالی۔ اس نے کسی وقتی صدمے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بھاری مقدار میں کوکین لے لی تھی۔ کسی نہ کسی طرح معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن مما نے سارا الزام میرے سر ڈال دیا کہ میری وجہ سے یہ خبر عام ہوئی اور اس کے نشے کرنے کی عادت لوگوں کے لیے گفتگو کا موضوع بن گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس کی کمپنی نے بھی تنبیہ کی کہ دوبارہ ایسا واقعہ پیش نہ آئے۔

کیا یہی وہ تعلق تھا جس نے مجھے ایڈ بلیڈ نامی کشتی پر سوتے سے جگا دیا۔ کیا واقعی دس بج کر بیالیس منٹ اس کے مرنے کا وقت تھا۔ جب پاپا نے مجھے فون پر بتایا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ انہیں اپنے ان فضول خیالات کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ اس کے بجائے میں نے انہیں تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ میں صبح اسپتال جاکر تمام انتظامات کرلوں گی۔ میں جانتی تھی کہ پاپا میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ مردہ خانے جاکر لاش کو شناخت کرسکیں۔

فون رکھنے کے بعد میں خود بھی مضطرب ہوگئی۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی۔ اوپر سے جیکٹ چڑھائی اور چابیاں لے کر موٹر بائیک کی طرف چلی لیکن میرے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ میں موٹر بائیک اسٹارٹ نہ کرسکی چنانچہ مجبوراً ٹیکسی کا سہارا لینا پڑا۔ مردہ خانے کے دروازے پر اندھیرا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ استقبالیہ پر کوئی نہیں تھا اور آنے والوں کے لیے رکھی گئی پلاسٹک کی سبز کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگی۔ کوئی جواب نہ ملنے پر دوبارہ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں مایوس ہوکر واپسی کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ ایک نوجوان شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بولا۔

''کیا شور مچا رکھا ہے؟''

''میں یہاں اپنی بہن کی لاش شناخت کرنے آئی ہوں۔''

اس نے میرے چہرے پر لگے ہوئے نشان کو دیکھا اور بولا۔ ''معاف کرنا خاتون، مردہ خانہ آٹھ بجے کھلتا ہے۔ تمہیں صبح دوبارہ آنا ہوگا۔''

میں نے اس کی گردن میں لٹکے ہوئے کارڈ پر نام پڑھا اور بولی۔ ''دیکھو جیف، میں نہیں سمجھتی کہ دوبارہ اپنے اعصاب پر قابو پاسکوں گی۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

اس نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور بولا۔ ''کیا میں تمہارے بارے میں جان سکتا ہوں؟''

''یقیناً۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام شیکو ناگاوا ہے۔ میری بہن ڈوب کر ہلاک ہوگئی ہے اور اس کی لاش ساحل سے ملی ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا ورنہ بہت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔''

''یہ دنیا مشکلات سے بھری ہوئی ہے اور مجھے بہت دکھ ہوگا اگر تمہاری ملازمت چلی گئی کیونکہ کسی نہ کسی کو یہ معلوم ہوہی جائے گا کہ تم وقفے کے دوران نشہ کررہے تھے اور اس کے بعد تمہارے لیے مسائل کا ایک پہاڑ کھڑا ہوجائے گا۔''

اس نے چند لمحے میرے الفاظ پر غور کیا اور آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہارے پاس مرنے والی کی کوئی تصویر ہے؟''

میں نے اپنی جیکٹ سے ایک تصویر نکال کر اسے پکڑا دی جو چند برس قبل کھینچی گئی تھی۔ جیف نے تصویر کو غور سے دیکھا اور اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اپنی بہن کا نام بتادیا تھا۔ اس

لیے وہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی درازوں کے لیبل پڑھتا گیا۔ جب وہ بائیں جانب کی آخری دراز پر پہنچا تو اس نے اسے باہر کی جانب کھینچ لیا۔ بدبو کا ایک بھبکا آیا اور میں نے بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

''تمہاری بہن کیسے مری؟''

''پانی میں ڈوب کر۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا سر ایک جانب جھکاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، مجھے یاد آگیا۔ میں نے ڈاکٹر کو اس کے بارے میں کہتے ہوئے سنا تھا۔ یہ ایک مشہور ماڈل تھی لیکن یہ ڈوب کر ہلاک نہیں ہوئی۔''

اس نے لاش پر سے چادر ہٹائی۔ اس کا سوجا ہوا نیلا چہرہ میرے سامنے تھا۔ جس پر جگہ جگہ داغ تھے اور سمندر... کے پانی نے اس کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے روکھے بال ریت اور نمک سے اٹے ہوئے تھے اور اس کے جسم سے سڑاند پھوٹ رہی تھی جو ہمیشہ خوشبو میں بسا رہتا تھا۔ یکایک مجھے متلی محسوس ہونے لگی۔

''یہی ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''پاپا کا چھوٹا موتی۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کی پلکیں بند کر دیں۔ اس کی جلد سرد اور سخت ہوگئی تھی۔ میری انگلیوں پر بھی ریت کے ذرے چپک گئے۔

مجھے ایک بار پھر زور کی ابکائی آئی اور میں نے جلدی سے قریب میں لگا ہوا ایلومینیم کا بیسن پکڑ لیا۔

جیف نے مجھے تولیا دیتے ہوئے کہا۔ ''اس تصویر کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تم دونوں جڑواں بہنیں ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا مجھے کسی کاغذ پر دستخط کرنا ہوں گے؟''

جیف نے چادر بدلی اور لاش کو دوبارہ بند کر کے ہینڈل لگا دیا پھر اس نے ایک فائل میں سے کچھ کاغذات نکال کر دستخط کرنے کے لیے میری طرف بڑھا دیے۔ پہلے کاغذ پر دستخط کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دوسرا کاغذ دیکھا۔ اس پر لکھا تھا، موت کی وجہ، میں نے دوبارہ پہلا صفحہ دیکھا۔ وہ دراصل پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ تھی جو جیف نے غلطی سے مجھے تھما دی۔ میں نے چور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پوری رپورٹ پڑھ ڈالی۔ آخر میں آٹھ ضرب دس کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں سمجھی کہ یہ غلطی سے لگ گئی ہے لیکن جب اسے غور سے دیکھا تو بہت کچھ سمجھ میں آگیا۔

کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد میں نے جیف کو نقدی کی شکل میں اس کی خدمت کا معاوضہ ادا کر دیا۔ صبح چھ بجے کے قریب ٹیکسی کے ذریعے میری واپسی ہوئی تو موٹر سائیکل اسی جگہ کھڑی تھی جہاں میں چھوڑ کر گئی تھی۔ البتہ میرے چھوٹے سے گھر کا بیرونی دروازہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ میں نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا اور وہاں کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کرسیاں الٹی ہوئی اور کشن زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ میرے سفری کاغذات بھی پورے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر بکھری ہوئی چیزوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش کی اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑی۔ کچھ دیر یونہی بے سدھ پڑی رہی جب میرے اوسان بحال ہوئے تو کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ جس کسی نے بھی نقب زنی کی وہ جا چکا تھا لیکن میں خوف میں مبتلا ہوگئی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

میں نے پولیس کو فون کر دیا اور پھر رینگتی ہوئی ایک ٹوٹے ہوئے صوفے تک پہنچی اور اس کے ایک کنارے سے ٹک کر بیٹھ گئی پھر جب مجھے اپنے ہاتھوں میں حرکت محسوس ہوئی تو سکون کا سانس لیا۔ جہاز پر کئی ہفتوں کی محنت، شیتو کی لاش اور اس نقب زنی نے مل کر میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ میں نے فرش پر سے ایک کمبل اٹھا لیا اور اسے اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔

اسی عالم میں میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر سوئی رہی لیکن کسی کے چلانے کی آواز سن کر مجھے اٹھنا پڑ گیا۔ میں نے اپنا سر پیچھے کر کے صوفے کے بازو پر رکھا اور اپنے تباہ شدہ دروازے کو دیکھنے لگی۔ مجھے وہاں ٹام لیفورے نظر آیا جو کمرے میں اپنا راستہ بناتے ہوئے مجھے نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں صوفے سے اٹھی اور کافی ٹیبل سے چاقو اٹھا لیا جو پھل کاٹنے کے کام آتا تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے میرے لہجے کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''چاقو رکھ دو۔ میں نے ابھی ابھی شیتو کے بارے میں سنا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ شاید وہ مزید کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو۔ تمہارے ڈیڈی

تم سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔''

اس نے راستے میں پڑی ہوئی کرسی اٹھائی اور میرے قریب آ گیا اور میں سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ کیا کبھی اس شخص نے میری بہن سے محبت کی تھی۔

''میں انہیں فون کردوں گی۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟'' اس نے چاروں طرف اپنے سر کو گھماتے ہوئے کہا۔

''آج ملازمہ نہیں آئی۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''اب تم میرے گھر سے چلے جاؤ۔''

اس نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم اب بھی مجھ سے نفرت کرتی ہو؟''

''شیو مر چکی ہے اور اب تم آزاد ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' میں نے کافی کی میز سے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ صحیح نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

میں نے چاقو سنک میں پھینک دیا اور بولی۔ ''کیونکہ اس نے تمہیں طوائف کے ساتھ دیکھ لیا تھا یا وہ اس لیے چلی گئی ہو کہ تم نے کوکین پلا کر اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ دونوں میں سے کون سا واقعہ پہلے پیش آیا۔''

اس نے ایک بڑا سا تکیہ اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ ''شیو یہ تکیہ میرے لیے لائی تھی جب اسے کمپنی سے پہلی تنخواہ ملی۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''میری چیزوں کو ہاتھ مت لگاؤ۔''

اس نے دو قدم آگے بڑھائے اور میرے بہت قریب ہو گیا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور بولی۔ ''چلے جاؤ۔''

''میری بات سنو، شیو کسی مشکل میں تھی جو اس کے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔''

میں نے اس کی بات سنی اور حقائق کے بارے میں سوچنے لگی جو پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوئے تھے لیکن میں نے اپنا سر جھٹک دیا اور بولی۔ ''میں یہ کیسے مان لوں کہ تم دوبارہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔''

اس نے اپنا سر نیچے کیا اور میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''ہم ایک عرصے سے دوست ہیں اور اس دوران تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ ہٹایا اور بولی۔ ''میں تم پر کیوں بھروسا کروں۔ تمہاری شہرت ویسے بھی اچھی نہیں ہے اور تمہارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مچھلیوں کے کاروبار میں تم سب سے زیادہ حساب کتاب میں گڑبڑ کرتے ہو۔''

''میں شیو کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ، کافی پینے چلتے ہیں۔''

''میں کافی نہیں پیتی۔'' میں نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''تم خود ہی چلے جاؤ۔''

''اتنی ضد ٹھیک نہیں۔ یہاں کوئی دروازہ بھی نہیں ہے۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔ ''تیار ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔''

باتھ روم کا دروازہ بند کر کے میں نے آٹھ ضرب دس کی وہ تصویر نکالی جسے میں نے رپورٹ سے الگ کر کے اپنی جینز میں چھپا لیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی سائز یعنی اٹھارہ ملی میٹر قطر کا موتی تھا تاہم تصویر میں اس کی آب و تاب نمایاں نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اسپتال کا فوٹوگرافر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی طرح اپنی پروڈکٹ کی تشہیر نہیں کر سکتا جو مجھ جیسے لوگوں کو بھی دس ہزار کا نیکلس خریدنے پر قائل کر لیتے ہیں۔

میں نے شاور کھولا اور گرم پانی کی پھوار میرے بدن کو بھگونے لگی۔ میں نے گہری سانس لے کر پُرسکون ہونے کی کوشش کی لیکن اپنے ذہن کو سوچنے سے نہ روک سکی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ٹام اس بارے میں کیا جانتا ہے اور شیو کس مشکل میں گرفتار تھی۔

جب پولیس والے آئے تو میں نے جلدی سے اپنے سامان کی فہرست تیار کی۔ جس میں سے صرف میری اور شیو کی ایک پرانی تصویر فریج پر سے غائب تھی۔ یہ تصویر ممانے ساحل پر اس وقت کھینچی تھی جب ہم دونوں تیرہ سال کی تھیں۔ ہم دونوں نے تیراکی کے نئے لباس پہن رکھے تھے۔ وہ دونوں پولیس والے لیام واکر اور کوپر ریلے ہمارے اسکول کے ساتھی تھے لیکن ان کی دوستی مجھ سے نہیں بلکہ شیو اور ٹام سے تھی۔

''تمہاری بہن کی موت کا بہت افسوس ہوا۔'' واکر نے کہا۔ یہ بات اس نے دسویں بار کہی تھی اور مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ اسکول کے زمانے میں اس کا عاشق تو نہیں تھا۔

ریلے نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں۔''

اس کے بعد وہ دونوں محتاط ہو گئے۔ ہمارے بارے

میں ہر کوئی جانتا تھا۔ کم از کم ان دونوں کو تو سب باتوں کا علم تھا کہ کس طرح شیو نے مجھے حادثاتی طور پر زخمی کر دیا جب وہ مجھے اور مما کو پاپا کے غصے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیو نے پولیس کو یہی کہانی سنائی تھی۔

واکر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کون تمہارے گھر میں نقب لگا کر فریج پر رکھی ہوئی تصویر لے جاسکتا ہے؟''

''شاید کوئی ایسا شخص جس کے ساتھ شیو کا اسکول کے زمانے میں تعلق رہا ہو۔'' میرے پاس اس احمقانہ سوال کا اس سے بہتر جواب نہیں تھا۔

ریلے نے ایک مرتبہ پھر واکر کو دیکھا اور مجھ سے بولا۔ ''مس ناکا گاوا۔ تم اپنی بہن کی موت پر کچھ زیادہ غمزدہ نظر نہیں آرہی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

میرا دل چاہا کہ زور سے قہقہہ لگاؤں۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے اور اتنی سی دیر میں تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اپنی بہن کی موت پر افسردہ نہیں ہوں؟ لیکن اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس قتل سے میرا کوئی تعلق ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ کمپنی کے کم از کم بیس غوطہ خور اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں گزشتہ تین ہفتوں سے کھلے سمندر میں موتی تلاش کر رہی تھی۔''

ریلے نے اپنی بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ تمہاری بہن کو قتل کیا گیا ہے۔''

''میں مردہ خانے گئی تھی اور میں نے اس کی گردن پر زخموں کے نشان دیکھے ہیں۔ اگر میرے اور شیو کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائیاں ہوتی تھیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں انصاف نہیں چاہتی۔''

واکر نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے دماغ میں کوئی اور بات آئے تو مجھے ضرور فون کرنا۔''

اگر ممکن ہوتا تو ان کے جانے کے بعد میں دروازہ بند کر دیتی۔ میں نے مما اور پاپا کو فون کر کے کہہ دیا کہ گھر ٹھیک کرنے کے بعد ان سے ملنے آؤں گی۔ مما نے کہا کہ وہ میری مدد کے لیے آئیں گی لیکن انہوں نے اپنی شکل نہیں دکھائی جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

مجھے یاد آیا کہ چند ماہ قبل پڑوسیوں نے اپنے گھر کی تزئین و آرائش کی تھی لہٰذا میں نے ان سے پرانا دروازہ مانگ لیا اور اپنی سی پوری کوشش کر کے اسے چوکھٹ میں لگا دیا۔ کام ختم کرنے کے بعد میں نے چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل گئی۔ میری نظر کچن کی کھڑکی پر گئی اور میں سوچنے لگی کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے جو تیرہ سالہ بہنوں کی تصویر چرائے گا۔ میرے ذہن میں بہت سی باتیں آنے لگیں گو کہ میں پولیس والوں کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کر چکی تھی اس کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

جب میں ماما، پاپا سے ملنے ان کے گھر پہنچی تو دو سراغ رساں کچن ٹیبل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ دونوں درمیانی عمر کے تھے۔ ان میں سے گہرے سوٹ والے نے بولنے میں پہل کی۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ تمہاری بیٹی ڈوب کر ہلاک نہیں ہوئی بلکہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔''

اس کے ہاتھ میں بھی ویسی ہی آٹھ ضرب دس کی تصویر تھی جو میں چرا کر لائی تھی۔ ''یہ موتی اس کے حلق میں تھا۔ مسٹر ناکا گاوا، تم نے پہلے بھی اسے دیکھا تھا؟''

میرے والد موتی ڈھونڈنے والے غوطہ خوروں کی دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد تیرہویں صدی میں جاپان سے ہجرت کر کے آسٹریلیا آگئے تھے۔ انہوں نے ایک پرانی لیکن کارآمد کشتی خریدی اور سمندر میں موتیوں کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔ میرے دادا نے اس کاروبار میں خوب پیسا کمایا کیونکہ انہیں شراب یا کسی اور بری چیز کی لت نہیں تھی لیکن پاپا کے لیے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ دکان، اوزار اور جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو انہوں نے کشتی سے بھی ہاتھ دھو لیے۔ یہی وہ وقت تھا جب شیو نے میرے چہرے پر چاقو سے زخم لگایا۔

پاپا نے تصویر ہاتھ میں لی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ ''سن ستاسی میں مجھے ایسا ہی موتی ملا تھا۔ اس کا قطر ساڑھے سولہ ملی میٹر اور رنگ ہلکا سرمئی تھا لیکن میں نے ایسا موتی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

دوسرے سراغ رساں نے بھی گہرے سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بیٹی کی انگلیوں کے ناخنوں میں جو ریت کے ذرے ملے ہیں، وہ روئے بک بے کے نہیں ہیں کیونکہ اس کے ذرات ذرا موٹے ہیں۔ شاید کسی دوسرے جزیرے کے ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی؟ ممکن ہے کہ اپنی کمپنی کی کسی اشتہاری مہم کے لیے تصویریں بنوانے گئی ہو؟''

مما نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد ایک گھنٹا یہاں گزارا تھا اور کہہ رہی تھی کہ وہ شام کی پرواز سے سڈنی واپس چلی جائے گی۔“

میں نے پہلے سراغ رساں سے پوچھا۔ ”اس کی موت کے وقت کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اسپتال والوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت کو تقریباً اڑتالیس گھنٹے ہوچکے ہیں۔ اس میں آٹھ گھنٹے کی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کم و بیش یہ وہی وقت ہے جب میں نے دو راتیں قبل وہ منحوس خواب دیکھا تھا اور دس بج کر بیالیس منٹ پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔

اسی وقت عقبی دروازے پر ایک مانوس دستک سنائی دی اور تھامس لیفورے سینئر اندر داخل ہوا۔ وہ گزشتہ دس سال سے سڑک کے پار ہمارے سامنے والے مکان میں رہ رہا تھا۔ جب اس کی بیوی کا کینسر کی بیماری کے سبب انتقال ہوا تو اس نے وہ گھر بیچ دیا کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق وہاں کی ہر چیز سے بیوی کی یاد آتی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد کیپٹن لیفورے نے اپنے آپ پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی لیکن اس کے باوجود اس میں صنفِ مخالف کے لیے کشش تھی۔ ٹام اس کا بیٹا تھا اور دونوں باپ بیٹے اپنی پُرفریب مسکراہٹ اور اعتماد کی بدولت خواتین کی توجہ حاصل کرلیتے تھے۔

”تمہارے لیے یہ ایک مشکل وقت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”شیو کی موت کا بہت افسوس ہے۔“

پاپا اپنی جگہ سے اٹھے اور لیفورے کے سینے سے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ مما بھی ان سے لپٹ گئیں البتہ میں نے اپنے آپ کو اس تماشے سے الگ رکھا۔

”ہم اس کیس میں سراغ رساں ہیں۔“ دوسرے گرے سوٹ والے نے کہا۔ ”کیا تم مرنے والی کو جانتے ہو مسٹر...؟“

کیپٹن لیفورے نے اپنا تعارف کروایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں شیو سے زیادہ کاشیکو کو بہتر طریقے سے جانتا ہوں۔ میں کمپنی کے جہاز کا کپتان ہوں اور کاشیکو کا شمار ہمارے بہترین غوطہ خوروں میں ہوتا ہے۔ جہاں تک شیو کا تعلق ہے تو وہ اور میرا بیٹا ٹام ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ان کی شادی ہونے والی تھی لیکن معاملات آگے نہ بڑھ سکے اور کئی سال پہلے دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ یہ جان کر دونوں خاندان بہت پریشان ہوئے، یہ ہمارے لیے ایک مشکل وقت تھا۔“

”علیحدگی کا فیصلہ تمہارے بیٹے یا مرنے والی میں سے کس نے کیا تھا؟“

لیفورے نے پہلے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر پاپا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”شیو نے منگنی ختم کی تھی۔“

”تمہارے بیٹے کا اس پر کیا ردِعمل تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ خوش نہیں تھا۔“

”کیپٹن، کیا اس نے کبھی اسے کوئی دھمکی دی یا نقصان پہنچانے کی کوشش کی؟“

لیفورے نے اپنا ماتھا رگڑا اور بولا۔ ”صرف اتنا یاد ہے کہ شیو نے اس پر الزامات لگائے تھے۔“

”اور وہ الزامات کیا تھے، کیپٹن لیفورے؟“

”شیو کا کہنا تھا کہ ٹام نے اس کا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی تھی۔“ میں نے کہا۔

تجہیز و تکفین والی صبح میں سورج نکلنے سے پہلے اٹھ گئی اور اپنی موٹر بائیک پر سوار ہوکر پورٹ ڈرائیو پر واقع اس قبرستان کی جانب چل دی جو موتی تلاش کرنے والے جاپانی غوطہ خوروں کے لیے مخصوص تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اچھے وقتوں میں دادا، ہم دونوں بہنوں کو لے کر قبرستان کی صفائی کے لیے لے کر آیا کرتے تھے گوکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے خاندان کے کتنے لوگ یہاں دفن ہیں لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ اس قبرستان کو اچھی حالت میں رکھنا ہمارا فرض ہے۔

میں نے ٹام کو اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا جب میرے گھر میں نقب زنی ہوئی تھی لیکن میں اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں کئی دنوں تک پولیس اسٹیشن جاتی رہی صرف یہ جاننے کے لیے کہ انہیں شیو کے قتل کے بارے میں کوئی معلومات ملی یا نہیں۔ میں یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے یا محض کہانیاں سناتے رہے۔ جب ان سے کچھ معلوم نہیں ہوا تو میں نے ٹام کو فون کیا لیکن اس کی جانب سے بھی جواب نہیں ملا تو میں نے اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا کہ وہ مجھے قبرستان میں تدفین والے روز صبح ساڑھے سات بجے مل جائے۔

جب وہ آٹھ بجے تک نہیں آیا تو میں اپنی جگہ سے اٹھی اور جوتوں پر جمی ہوئی گرد صاف کرنے لگی۔ مما نے مجھ سے کہا تھا کہ ناشتا ان کے ساتھ کروں۔ شاید اس روز انہیں میری ضرورت تھی۔ میں موٹر سائیکل کی جانب بڑھی کہ

اچانک ٹام میرے سامنے آ گیا۔

"مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔" وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

میں لمحہ بھر کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ "تم نے کہا تھا کہ شیو کچھ پریشان تھی۔ اس سے تمہارا کیا مطلب تھا؟"

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبالی پھر اس کی نظر میرے چہرے پر گئی تو اس نے وہ سگریٹ دوبارہ پیکٹ میں رکھ لی اور بولا۔ "سوری، میں بھول گیا تھا کہ تم سگریٹ کا دھواں برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں نے جیکٹ کی جیب سے آٹھ ضرب دس کی تصویر نکالی اور اسے پکڑاتے ہوئے بولی۔ "اس موتی کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے اور اس طرح کی چیزیں خفیہ نہیں رہ سکتیں۔"

"کون کہہ سکتا ہے کہ یہ موتی کہاں سے ملا؟ کسی غوطہ خور کی ٹوکری سے گر پڑا یا ممکن ہے کہ کمپنی نے اسے بنایا ہو۔"

"تم بھی ان سراغ رسانوں کی طرح مجھے بہلا رہے ہو۔" میں غرائی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے پکڑ لیے اور بولا۔ "تمہیں اس بارے میں خاموش رہنا ہوگا جب تک ہمیں مزید معلومات نہ مل جائیں۔"

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ مجھ پر بھروسا کر سکتا ہے یا نہیں پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ "دی انڈین پرنسز، بھی اس کمپنی کے بیڑے میں شامل ہے۔ چھ ماہ پہلے یہ افواہ سننے میں آئی تھی کہ اس طرح کا ایک موتی سمندر سے ملا لیکن اسے کمپنی میں دینے کے بجائے غوطہ خور نے خود رکھ لیا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آیا اور میں سمجھا کہ کسی نے یونہی بے پر کی اڑائی ہے لیکن پھر میں نے اس موتی کی تصویر اخبار میں دیکھی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ غوطہ خور اس وقت بھی انڈین پرنسز پر کام کر رہا تھا۔"

"وہ کون تھا۔ مجھے بتاؤ ٹام، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ ہم تقریباً سبھی غوطہ خوروں کو جانتے ہیں۔ کمپنی کے بیڑے میں بیس کشتیاں ہیں اور ہر کشتی پر بیس غوطہ خور ہیں۔ ہم اسے تلاش کر سکتے ہیں۔"

اس کے ہاتھ ابھی تک میرے کندھوں پر تھے۔ مجھے ان میں لرزش محسوس ہوئی جو کہ ایک عجیب بات تھی پھر اس نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں گزشتہ دو سال کا ریکارڈ دیکھتا ہوں، ہم اس غوطہ خور کو تلاش کر لیں گے۔"

میں نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم پہلے کی طرح دوبارہ ایک ساتھ کام کر سکیں گے۔"

اگلے چھ ہفتے یونہی گزر گئے۔ میرا زیادہ وقت پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتے اور مما پاپا کے جھگڑے نمٹاتے ہوئے گزرتا۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ان دونوں کے مسائل حل کرنا میرے بس کی بات نہیں لیکن کم از کم میں اپنی بہن کے قاتل کو تلاش کرنے میں تو مدد کر سکتی ہوں۔ وہ موتی بالکل منفرد تھا اور چند کمپنیاں ہی ایسے موتی پیش کر سکتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کام کا آغاز کرنے کے لیے بروم ساؤتھ سی پرلز کا جہاز ہی مناسب رہے گا۔

ٹام اور میں کافی عرصے سے ایک ساتھ جہاز پر نہیں گئے تھے لہٰذا اسے ایڈ بلیڈ نامی جہاز پر دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اپنا سامان چیک کر کے لاکر میں رکھا اور کچن کی طرف بڑھ گئی لیکن وہ وہاں بھی نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کیپٹن کے کیبن میں اپنے باپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہوگا۔ اس روز میری پسندیدہ ڈش تیار ہوئی تھی۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کیبن میں آ گئی۔

ہمارا جہاز رات کے کسی پہر منزل مقصود پر پہنچا۔ عام طور پر وہ جگہیں جہاں کستورا مچھلی پائی جاتی ہے، وہ خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ کپتان اور اس کے نائب کے علاوہ کسی کو اس بارے میں علم نہیں ہوتا۔ پنک ٹاڈا میکسیما نامی کستورا مچھلی صرف آسٹریلیا اور تاہیٹی کے سمندروں میں پائی جاتی ہے اور موتی بنانے والی کمپنیوں کو ان کی مسلسل فراہمی جاری رہتی ہے۔ غوطہ خور کے طور پر میرا کام یہ تھا کہ میں سمندر کی تہ میں جا کر زیادہ سے زیادہ مچھلیاں پکڑوں۔ اس کا سیزن جنوری سے مارچ تک رہتا ہے۔ بدقسمتی سے اسی سیزن میں دنیا کی انتہائی مہلک مچھلی جیلی فش بھی بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے جس کا ڈنک تیس سیکنڈ میں انسان کی جان لے لیتا ہے۔

میں طے شدہ وقت کے مطابق صبح پانچ بجے اٹھی اور تیار ہو کر سبز چائے پینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ ٹام نے مجھے اس غوطہ خور کے بارے میں بتانے کا وعدہ کیا تھا لیکن ناکام رہا۔ چند ہفتے قبل ہماری ایک کیفے میں ملاقات ہوئی تو

اس نے بتایا۔ ”ڈیڈی کہتے ہیں کہ وہ کمپنی سے انڈین پرنسز کا ریکارڈ حاصل نہیں کر سکے۔ وہ لوگ بھی اس موتی کے چرائے جانے پر پریشان ہیں۔ ڈیڈی نے دوسرے کپتانوں سے بھی رابطہ کیا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں پھر میں نے اپنے طور پر کچھ لوگوں سے پوچھا۔“

”کچھ پتا چلا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”ان لڑکوں نے بتایا کہ وہ سڈنی سے تعلق رکھنے والا ایک نیا غوطہ خور تھا۔ اس کی لاش گزشتہ اکتوبر میں کولسب پوائنٹ پر ملی تھی۔“

میں نے محسوس کیا کہ پہلی بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے سب کچھ بتادیا ہے اور اب میں ایڈ بلیڈ کے کچن میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا میں ہی بے وقوف تھی جو اس پر یقین کرتی رہی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں بقیہ چائے ختم کی اور تیار ہونے کے لیے اپنے کیبن میں آگئی۔

جیلی فش کے کاٹے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ کھال کا ایک انچ حصہ بھی ظاہر نہ ہو۔ اسی لیے سمندر میں غوطہ لگانے سے پہلے میرے ساتھی کوڈی اور میں نے ایک دوسرے کا ہڈ، ماسک اور دستانے وغیرہ چیک کیے۔ اس کے بعد ہم پلیٹ فارم پر چڑھ گئے۔ جہاں غوطہ خوروں کو آکسیجن کی فراہمی کے لیے ربر کے پائپ اور رسے لگے ہوئے تھے۔ ان رسوں کی لمبائی اتنی تھی کہ غوطہ خور کو کافی فاصلے تک بھی آکسیجن ملتی رہتی تھی۔

تیس فٹ کی گہرائی پر جانے کے بعد بے وزنی کی کیفیت کے علاوہ پانی کا تیز بہاؤ بھی اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ میں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے اپنے ساتھی کا پہلا سگنل موصول ہوا۔ اس وقت میرا تھیلا مچھلیوں سے آدھا بھر چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مقررہ وقت میں یہ پورا بھر جائے گا۔

کیپٹن لیفورے نے بتدریج کشتی کا رخ شمال کی طرف کرنا شروع کیا۔ اس حصے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا جس کی وجہ سے مچھلیوں کو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا حالانکہ وہ اچھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ میں ایک بڑی مچھلی کا پیچھا کر رہی تھی جب مجھے ربر کے پائپ کے ذریعے آنے والی آکسیجن میں کمی کا احساس ہوا۔ میں نے آہستہ آہستہ سانس لیتے ہوئے اس سیاہ ربر کے پائپ کی جانب دیکھا جس پر میری زندگی کا دارومدار تھا، وہ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اب میرے زندہ بچنے کی امید ختم ہو چکی تھی۔

میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی بیلٹ کھولی اور پشت کے بل اوپر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے جو تھوڑی بہت سپلائی مل رہی تھی اس سے میں وقفے وقفے سے سانس لیتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا کہ تیس فٹ کا فاصلہ ہزاروں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میرے پھیپھڑے دکھنے لگے لیکن اپنے بچاؤ کے لیے مجھے سانس لینا ضروری تھا۔ جیسے تیسے کر کے سطح آب پر پہنچی تو وہاں ایک نیا خطرہ میرا منتظر تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ جہاز کا بھاری بھرکم لنگر عین میرے سر کے اوپر تھا اور کوئی بھی تیز لہر مجھے اس کے رسوں میں الجھا سکتی تھی اور اس طرح ڈوبنے سے پہلے ہی میری گردن ان تاروں کے شکنجے میں آسکتی تھی۔

میں نے کشتی پر سے ایک آواز سنی۔ کیپٹن لیفورے نے پیلے رنگ کی ٹیوب نیچے پھینکی جو موجوں کے اوپر تیرنے لگی پھر ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اسے فضا میں اچھال دیا اور وہ مجھ سے پانچ فٹ کے فاصلے پر آن گری۔ میرے بازوؤں میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنے لگی۔ جب میں ٹیوب کے قریب پہنچی تو دونوں بازو بڑھا کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا پھر میں پشت کے بل تیرتی ہوئی لنگر سے دور اور کشتی سے قریب ہوتی چلی گئی۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر میرا سامان الگ کیا گیا اور مجھے ایک اونی کمبل میں لپیٹ دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ دو لڑکوں نے مجھے ایک اسٹریچر پر ڈالا اور نیچے کیبن میں لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ٹام آیا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ڈیڈی نے آج کے لیے مچھلیاں پکڑنے کا کام ملتوی کر دیا ہے۔“

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ اس پر خوش نہیں ہوں گے۔“

”سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔ میں نے تمہارا آکسیجن کا پائپ چیک کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سورج کی گرمی سے اسے نقصان پہنچا۔ وہ پائپ زیر آب جا کر کٹ گیا تھا۔ اس لیے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ تمہارے ساتھی نے بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ ڈیڈی چاہتے ہیں کہ سارے کے سارے بارہ پائپ چیک کیے جائیں اور ضروری ہو تو انہیں بدل دیا جائے۔ وہ اس معاملے میں بہت محتاط ہو گئے ہیں۔“

اس نے میرا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اچانک ہی میری ساری تھکن غائب ہو گئی اور میرا ذہن ہوشیار

ہو گیا۔ اس کی ران کا دباؤ میری ران پر پڑ رہا تھا اور میں خاصی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہٹ جائے۔

"تمہاری طرح میں بھی اس طرح کے ایک حادثے سے گزر چکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "غوطہ خوری ایک خطرناک کام ہے۔ تمہیں کچھ عرصہ آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولی۔ "کیا یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں، اسے تم مفت مشورہ سمجھ سکتی ہو۔"

"یہ مشورے اپنے پاس رکھو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ بستر سے اٹھ کر اسٹول پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ڈیڈی نے کہا ہے کہ اگلے دو گھنٹے تک تم پر نظر رکھی جائے۔ اگر تمہاری طبیعت بہتر نہ ہوئی تو تمہیں اسپتال بھیج دیا جائے گا۔ اب کمر کے بل سیدھی لیٹ جاؤ۔ ہمیں اس طوفان سے بچنے کے لیے کسی جزیرے کا رخ کرنا ہوگا۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور چت لیٹ گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ کیپٹن لیفورے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کے علاوہ طوفان کے بارے میں بھی اس کا اندازہ درست تھا۔ ہم سب اس جزیرے میں پہنچ کر محفوظ ہو سکتے تھے جہاں کمپنی نے موتی نکالنے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ ٹام نے مجھے نظریں جھکا کر دیکھا اور بولا۔ "ہمیں کس موضوع پر بات کرنا چاہیے؟"

"میں نہیں جانتی۔" میں نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے سڈنی میں میری بہن کا گلا گھونٹنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میرا موقف جاننا چاہو گی؟"

مجھے اس کی وضاحت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں اس سے اپنا فاصلہ برقرار رکھنا چاہتی تھی لیکن شیو کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش نے مجھے اس کی بات سننے پر مجبور کر دیا۔

"شیو صرف کوکین کی ہی عادی نہیں تھی۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "بلکہ اسے پارٹیوں میں بھی جانے کا چسکا لگ گیا تھا جبکہ مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔"

میں نے اپنے دونوں بازو کمبل میں چھپا لیے۔ ٹام نے ہی پہلی بار ہم دونوں بہنوں کو اسکول میں کوکین سے متعارف کروایا تھا۔ شیو اس کی عادی ہو گئی جبکہ میں دوسری دلچسپیوں میں کھو گئی۔

"اس رات ایک مووی ڈائریکٹر پارٹی دے رہا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ شیو گھر پر رہے۔ اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا اور کہا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ میرے ساتھ گھر پر رہ کر کیا کرے گی جبکہ اسے سڈنی کے خوب صورت لوگوں کے ساتھ پارٹی میں شریک ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ اسے پارٹی میں نہیں جانے دوں گا۔"

میں بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکی۔ البتہ میں نے اس کی گہری سانس لینے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اس سے محبت کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ چند ہفتے قبل اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک مشہور فیشن ڈیزائنر سے ملتی رہتی ہے جس نے اسے کئی قیمتی ملبوسات تحفے میں دیے تھے۔ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی... اسی لیے میں پاگل ہو گیا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں اسے چھوڑ کر ایک قریبی پب میں چلا گیا۔ وہاں کافی وقت گزارنے کے بعد اپارٹمنٹ میں آیا تو وہ واپس نہیں آئی تھی۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چار بجے کے قریب واپس آئی تو ہم دونوں میں ایک بار پھر جھگڑا ہوا۔ اس نے اپنا جوتا مجھ پر مارا اور ہماری منگنی ٹوٹ گئی۔"

"کیا تم نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر وہ تمہیں چھوڑ کر گئی تو تم اس کا گلا گھونٹ دو گے؟"

اس نے دیوار پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ ساری باتیں یاد نہیں جو اس رات میں نے کہی تھیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ طوفانی انداز میں کمرے سے باہر نکلی اور دروازہ لاک کر کے چلی گئی۔ میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور کچھ پتا نہیں کہ کتنی دیر بے سدھ پڑا رہا پھر دروازے کی چرچراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو وہاں مقامی پولیس کے تین آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیو نے میرے خلاف رپورٹ درج کروائی ہے کہ میں نے اسے دھمکی دی ہے حالانکہ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ میں نے کبھی اسے دھمکی نہیں دی۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کی بات کا یقین کروں۔ اگر شیو نے جھوٹ بولا تو ٹام بھی قابلِ بھروسا نہیں تھا۔

وہ ایک بار پھر میرے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور میرے چہرے کے زخم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیسے لگا؟"

"شیو مجھے پاپا سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور بولا۔ ''تم ہر ایک کو یہی کہانی سناتی ہو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری جانب منہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم اس وقت کیا کر رہے تھے جب میں نے سمندر میں غوطہ لگایا تھا؟''

وہ کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''شاید تمہیں سوتے میں بھی آنکھ کھلی رکھنا پڑے کیونکہ تم نہیں جانتیں کہ کس پر بھروسا کر سکتی ہو۔''

ہم شام سات بجے جزیرے پر پہنچے۔ میں مستقل لیٹے لیٹے تھک گئی تھی لیکن کیپٹن لیفورے کا اصرار تھا کہ مجھے چوبیس گھنٹے تک چت ہی لیٹنا ہے۔ وہاں عملے کے لیے مناسب تعداد میں کیبن نہیں تھے لہٰذا ٹام نے میرے لیے ایک چھوٹے سے اسٹور روم میں بندوبست کر دیا۔ یہاں ایک یا دو دن ٹھہرنے کا پروگرام تھا جب تک کہ طوفان وہاں سے گزر نہ جائے۔ جہاز کا عملہ اوزاروں کی مرمت اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا جبکہ میں اپنے کمرے میں آرام کرتی رہی۔

بہت زیادہ آرام کرنے کی وجہ سے میری آنکھ نصف شب کے قریب کھل گئی جب میں نے کمرے سے باہر کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز سنی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ باہر کچھ لوگ یہاں پر ہونے والے کام کے بارے میں بات کر رہے ہیں لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''وہ موتی ایک ملین ڈالر کا تھا لیکن اب وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور پولیس کے پاس ہے۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کی لاش کو سمندر میں ڈبو دیتے اور وہ ساحل پر نہ آتی۔ اب وہ لوگ قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں اور اس کی بہن اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ غوطہ لگانے کے بعد زندہ نہیں بچے گی لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔۔اس لیے مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھو۔''

میں دوسرے آدمی کا جواب نہ سن سکی پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں ہمیشہ یہی کہتی آئی تھی کہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹ سکتی ہوں لیکن اب مجھے اس پر یقین نہیں رہا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ آکسیجن پائپ کا الگ ہونا حادثہ نہیں تھا اور میرے گھر میں ہونے والی نقب زنی بھی کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور یوں لگا جیسے پورا کمرا گھوم رہا ہو۔

میں ایک آواز پہچان سکتی تھی، وہ آواز کروکی تھی جو

میرین بیالوجسٹ تھا۔ اس کا تعلق سڈنی سے تھا لیکن وہ گزشتہ تیس برس سے بروم میں رہ رہا تھا۔ اس کا شمار موتی نکالنے کی صنعت کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ میری بہن کے قتل میں کیسے ملوث ہوسکتا ہے تاہم مجھے قاتل کا سراغ لگانا تھا اور اسی مقصد کی خاطر میں نے اپنا شہر چھوڑا تھا۔ اس اسٹور روم میں بند رہ کر میں یہ معما حل نہیں کرسکتی تھی۔

میں نے اپنے بیگ کی تلاشی لی تو مجھے ایک چاقو مل گیا۔ اسے میں نے اپنے گھٹنے سے اوپر باندھ لیا۔ دوسری صبح اٹھ کر میں نے کمرے سے باہر جھانکا۔ وہاں کام کرنے والے لوگوں کی آمدورفت شروع ہوچکی تھی لیکن مجھے کرو نظر نہیں آیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور باہر آگئی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے، یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ کرو مجھے مردہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کے علاوہ میرا دوسرا دشمن کون تھا۔

میرے قدم اوپن ائر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئے جہاں عملے کے کچھ لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں نے وہاں اپنے پرانے ساتھی کوڈی کو دیکھا اور اس کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے کئی بار اس بات پر معذرت کرچکا تھا کہ سمندر میں غوطہ لگانے کے دوران اس نے بغور میری نگرانی نہیں کی لیکن میں اسے یہ نہیں بتا سکی کہ پائپ کا الگ ہونا ایک حادثہ نہیں تھا۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کسے رازدار بناؤں۔

اسی وقت کیپٹن لیفورے وہاں آگیا اور اس نے اپنے لیے ایک کپ کافی منگوائی پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو بولا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کیا ٹام نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنا مچھلیوں کا کوٹا تقریباً پورا کرلیا تھا اور اوپر آتے ہوئے ایک بھی مچھلی نہیں گرائی۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم زندہ ہو۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ باپ بیٹے میں بہت زیادہ مشابہت تھی لیکن ایک بہت بڑا فرق تھا اور وہ یہ کہ میں کیپٹن لیفورے پر بھروسا کرسکتی تھی۔ ہال تقریباً خالی ہوگیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا وہ میری بات پر یقین کرے گا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، ابھی اور اسی وقت۔''

اسی وقت کرو ہال میں داخل ہوا۔ وہ کیپٹن کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ وہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور آرڈر دینے کے بعد دوبارہ میری جانب دیکھنے لگا۔

کیپٹن نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ طوفان کی وجہ سے کشتی کو تھوڑا سا نقصان پہنچا ہے۔ مجھے وہ کام دیکھنا ہے۔''

میں قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کرو کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔''

کیپٹن نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ مچھلیاں گننے میں ڈنڈی مارتا ہے تو یہ غلط ہے، اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔'' پھر اس نے کن انکھیوں سے کرو کی طرف دیکھا جو ابھی تک مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

''مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''کیا ہم کہیں علیحدگی میں بات کرسکتے ہیں؟''

اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے وقت نکال لوں گا۔ تیس منٹ کے اندر مجھ سے سن سیٹ پوائنٹ پر ملو۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی لیکن مچھلیاں گننے میں ڈنڈی مارنے والی بات میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اگر کرو موتی چرا رہا تھا تو اس کا طریقہ کار کیا تھا۔ مجھے کیپٹن کو قائل کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت تھی۔ اس کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں فیکٹری میں چھپ کر جاؤں۔ شاید وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔

عمارت میں داخل ہوکر میں نے لیبارٹری کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو مقفل تھا۔ اندر سے کوئی آواز آرہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا، میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں مجھے روشن دان نظر آیا۔ میں تیزی سے اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی پھر میں الماری پر چڑھی اور روشن دان کے راستے لیبارٹری میں داخل ہوگئی۔

ایک بڑی سی میز پر کرو کی تصویر رکھی تھی جس میں وہ کمپنی کے صدر کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ کمپیوٹر کھلا ہوا تھا اور اس کے اسکرین پر بہت سی فائلیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک انڈین پرنسز کی بھی تھی پھر میری نظر ایک بیگ فائل پر گئی۔ اس پر سمو لکھا ہوا تھا۔ یہ اس غوطہ خور کا

نام تھا جس کے ساتھ میں بھی کام کر چکی تھی۔ میں نے فائل کھولی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس تصویر میں شیو کی ہتھیلی پر وہی موتی نظر آ رہا تھا جس نے اس کی جان لے لی۔

میں روشن دان کے ذریعے واپس اپنے کمرے میں آئی تو بہت سی باتیں میرے دماغ میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ ٹام نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شیو کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اسے مار دیا جائے۔ اب مجھے واقعی کیپٹن کی مدد کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

سن سیٹ پوائنٹ کو جانے والا راستہ ایک چٹان پر ختم ہوا جو زمین سے بیس فٹ اونچی تھی۔ میں ایک گیلے پتھر پر بیٹھ کر کیپٹن کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری بہن کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔“

مجھے اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ اسے یہ بات کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

”یہ جگہ بہت مناسب ہے۔ میں نے بھی یہی سوچ کر یہاں بلایا تاکہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے دستانے نکال کر اپنے ہاتھوں پر چڑھا لیے۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

”تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس حادثے سے تو بچ گئی تھیں لیکن جلد ہی تم محسوس کرو گی کہ تمہارا سر کسی چٹان سے ٹکرایا ہے۔“

”ٹھہرو....!“ میں چلائی۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ شیو کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ بہت خوب صورت تھی۔ جب میں نے تم دونوں بہنوں کو دیکھا تو تمہارے گھر کے سامنے مکان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں تم دونوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے شیو پر ڈورے ڈالنا شروع کیے لیکن وہ میری نیت بھانپ گئی اور اس نے تمہارے چہرے پر چاقو سے زخم لگا کر بدصورت بنا دیا۔“

”تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی؟“

”ہمیں ماضی کو نہیں دہرانا چاہیے۔ شیو نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ دیکھ لو اس کا کیا انجام ہوا۔“

”تم نے ہی شیو کو قتل کیا ہے؟“ میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ جاننے کا حق ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”وہ مجھے بلیک میل کر رہی تھی لیکن میں اس کے مطالبات پورا کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھے تباہ کرنے کی دھمکی دی۔ اگر وہ مجھ پر زیادتی کا الزام لگا دیتی تو میں سب کچھ کھو دیتا۔ میری پنشن، میری ساکھ اور بہت کچھ...“

”تم ابھی تک آزاد ہو۔ تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔ بیوی کی بیماری نے مجھے مقروض کر دیا۔ اسی لیے مکان بیچنا پڑ گیا لیکن پھر بھی قرض ادا نہ ہو سکا۔“

میری سمجھ میں بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ ”اس غریب غوطہ خور سمر کا کیا قصور تھا۔ اسے مارنے کا منصوبہ کس نے بنایا؟“

”میں نے کرو کے ساتھ اسے راستے سے ہٹانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ جب ہمیں موتی مل گیا تو میں شیو کو اس جزیرے پر لے کر آیا۔ وہ اس کو دیکھ کر پاگل ہو گئی اور ہمارے درمیان طے ہو گیا کہ وہ ہمارے چرائے ہوئے موتیوں کی ماڈلنگ کرے گی لیکن دوسرے دن وہ موتی کرو کے دفتر سے غائب ہو گیا۔“

”اور تم اسے بہلا پھسلا کر یہاں لے آئے؟“

”اس نے کوکین چڑھائی ہوئی تھی اور نشے کی حالت میں اپنی مٹھی کھول کر وہ موتی مجھے دکھا دیا۔ میں نے اس سے واپسی کا مطالبہ کیا تو وہ قہقہے لگانے لگی اور بولی کہ اس نے ایک خط لکھ کر تمہارے گھر پر چھوڑ دیا ہے جس میں اس نے میری زیادتی کا ذکر کیا ہے لہٰذا میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ اس نے موتی پہاڑی سے نیچے پھینک دیا لیکن اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے زمین پر گرا دیا اور اس کا سر ریت میں دبانے لگا۔ میں اسے مارنا چاہ رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں اخبارات سے پتا چلا کہ اس نے وہ موتی اپنے منہ میں رکھ لیا تھا۔“

وہ میرے قریب آ گیا۔ میں پیچھے کی جانب کھسکی اور چٹان کے کنارے پر پہنچ گئی۔ نیچے سمندر کی لہریں بے قابو ہو رہی تھیں اور ان کی پھوار میری ٹانگوں پر پڑ رہی تھی۔ میں ہلکا سا جھکی اور اپنا چاقو نکال لیا۔

”کاشیکو، اپنے لیے مشکل پیدا نہ کرو۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

میں اپنا چاقو دائیں بائیں فضا میں لہرانے لگی تاکہ وہ میرے مزید قریب نہ آئے لیکن وہ پھر بھی میری طرف بڑھا۔ میں نے چاقو والا بازو فضا میں بلند کیا تو اس نے

میرا دوسرا بازو پکڑ لیا لیکن میں گھوم کر اس کی پشت پر آ گئی اور میرا چاقو اس کے کان پر لگا۔ وہ پیچھے کی جانب لڑکھڑایا اور چٹان کے کنارے پر پہنچ گیا لیکن میں ابھی تک اس کی گرفت میں تھی۔ اگلے لمحے ہم دونوں نیچے کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے تکلیف کی شدت کی وجہ سے مجھے چھوڑ دیا۔ میں ایک ابھری ہوئی چٹان پر جا گری۔ میرے ہاتھ زخمی ہو گئے اور پورے جسم میں درد کی لہر ابھری۔ چند سیکنڈ بعد کیپٹن کا جسم زمین سے ٹکرایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مجھ میں نیچے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن اوپر کا منظر دیکھ کر مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ میں چٹان کے نکلے ہوئے حصے سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی لیکن اوپر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن میری نگاہ اپنے چاقو پر گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر چٹان کی سطح کو کھرچنا شروع کیا تاکہ اوپر جانے کے لیے راستہ بنا سکوں۔ اس طرح میں دو فٹ اوپر جانے میں کامیاب ہو گئی۔

ایک سایہ مجھ پر جھکا اور ٹام کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا جہاں اس کے باپ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسے اذیت میں دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا پھر اس نے اپنی نظریں میری جانب کیں اور گھٹنوں کے بل جھک کر میری کلائیاں پکڑتے ہوئے بولا۔ ''کاشیکو، چاقو پھینک دو۔''

''نہیں۔'' میں چلائی۔

اس نے میری کلائیاں سختی سے پکڑ لیں اور کہا۔ ''مجھ پر بھروسا کرو۔''

مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا لیکن میری گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور چاقو پھینک دیا۔ اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ میری پسلیاں بری طرح فریاد کر رہی تھیں۔ ٹام نے مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور بولا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے کاشیکو۔''

وہ بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ خاموش ہو جائے کیونکہ اس کی آواز میں چھپے ہوئے درد کو محسوس کرنا میری برداشت سے باہر تھا لیکن وہ بولتا رہا۔

''مجھے کرو پر شک تھا اور میں نے ڈیڈی کو اس بارے میں بتا دیا تھا لیکن ان کا ردِعمل بڑا عجیب تھا۔ وہ شک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ انہوں نے شیو کے ساتھ کیا کیا؟''

''تم نے بھی تو میرا چہرہ زخمی ہونے کے بعد مجھے فون کرنا چھوڑ دیا تھا۔'' میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے، اس وقت میں صرف پندرہ سال کا تھا۔ مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی۔''

یہ کہہ کر وہ رونے لگا اور میں یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ کیا صرف افسوس کر دینا کافی ہے۔

☆☆☆

''مس ناکاگاوا!'' میں نیند سے بیدار ہوئی تو دیکھا کہ دو سراغ رساں میرے بستر کے پاس کھڑے کافی پی رہے تھے۔ میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ جب میں نے گہری سانس لی تو درد کی ایک شدید لہر ابھری اور مجھے یاد آ گیا کہ میری تین پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

''مس۔'' ایک سراغ رساں بولا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند رکھیں لیکن بولتی رہی۔ میں نے انہیں شیو، کرو، کیپٹن، بدقسمت غوطہ خور سمز اور اس موتی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن بہت سی باتیں چھپا لیں۔ میں نے انہیں اس رات کے بارے میں نہیں بتایا جو میں نے ٹام کے ساتھ گزاری تھی یا یہ کہ کپتان نے میری بہن کے ساتھ زیادتی کی تھی اور شیو نے چاقو سے میرا چہرہ اسی لیے بگاڑ دیا کہ میرا بھی وہی انجام نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ان باتوں کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

والدین مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مما نے مجھے ساتھ رہنے کی پیشکش کی۔ جب میں نے رضامندی ظاہر کی تو وہ تھوڑی سی حیران ہوئیں۔ مما نے مجھے پہننے کے لیے ایک پرانا گاؤن دیا اور ہم بنگلے کے عقبی صحن میں بیٹھ گئے۔ آسمان پر پورا چاند اپنی روشنی بکھیر رہا تھا اور چند بلاک کے فاصلے پر مجھے وہ سیڑھی نظر آ گئی جو چاند تک جاتی تھی جسے دیکھنے کے لیے سیاح دور دور سے آتے تھے۔

میں نے نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر شیو کا نیکلس نکالا۔ اس کا ہر موتی پراسرار لگ رہا تھا جیسے کسی فرشتے کا ہالہ شیشے کی گیند میں مقید ہو گیا ہو۔ میں نے مما کی انگلیاں پکڑیں اور آہستہ سے شیو کا نیکلس ان کے گرد لپیٹ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ آسمان پر شیو کی روح ضرور مطمئن ہو گئی ہو گی کہ میں کم از کم اس کے قاتل کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مکافاتِ عمل تھا۔

اماں نے صبح سے پھیلاوا پھیلایا ہوا تھا۔ کوٹھری جسے اسٹور روم ہونے کا شرف حاصل تھا اور بہ قول خلیل کے یادوں کا قبرستان تھا۔ اماں آج وہاں سے گڑے مردے اکھاڑ رہی تھیں۔ سال میں ایک بار چیزوں کو نکال کر دھوپ دکھائی جاتی تھی۔ اماں کے خیال میں سال نو کی پہلی دھوپ چیزوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ میں نے صحن سے گزرتے ہوئے دوسری بار لکڑی کے صندوق سے ٹھوکر کھائی اور بھنا کر کہا۔ "اماں دھوپ ہے کہاں جو تم سامان پر سامان نکالے

گڑے مردے

کاشف زبیر

جلیل اور راجا کے ایکشن کے بغیر کئی کہانیاں ادھوری رہ جاتی ہیں... ان دونوں کی ملی جلی جگت بازیاں ایک دوسرے کو جوڑے رکھتی ہیں... دونوں کی زندگی بھی ایک ہی نشیب و فراز سے گزرتی ہے... اس دفعہ خاندان کے بزرگوں نے اپنی ہی کہانی بیان کی ہے... جو یقیناً آپ سب کے لیے متاثر کن اور پرلطف ثابت ہو گی...

شرارتوں اور ہنگاموں کا ہلچل مچا دینے والا شگفتہ سلسلہ

جا رہی ہو۔"

"آنکھیں کھول کر دیکھو میرے بچے، چھت پر دھوپ ہی دھوپ ہے۔" اماں نے کہا تو میرے چودہ میں سے سولہ طبق روشن ہو گئے۔ اماں کا مطلب واضح تھا، مجھے یہ گڑے مردے اٹھا کر چھت تک لے جانے تھے۔ اماں نے سچ مچ میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس لیے جیسے ہی اماں اس بار کوٹھری میں گئیں، میں دبے قدموں چھت پر نکل آیا۔ کراچی میں سردی یوں آتی ہے جیسے بینک میں ڈاکو آتے ہیں یعنی کبھی کبھی اور اچانک۔ کل رات اچھا بھلا پنکھا چلا کر ہلکی رضائی کے ساتھ سویا تھا، صبح اٹھا تو خود کو فریزر میں محسوس کیا۔ اے سی تھا نہیں ورنہ سمجھتا کہ وہ تیز ہو گیا ہے۔ وطنِ عزیز میں ساری تکلیف دہ چیزیں سرحد پار سے آتی ہیں۔ ان میں ایک سردی بھی ہے۔ دہشت گردوں کے ساتھ منشیات اور اسلحے کا ذکر بیکار ہے کیونکہ یہ تو اب ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

شنو چھت پر دو سال پرانے سوٹ میں تازہ ترین جسامت کو خلاصہ کیے بال خشک کر رہی تھی۔ اس کا سانس رک رہا تھا۔ مگر خوب صورت نظر آنے کے لیے خواتین اس قسم کی چھوٹی موٹی مشکلات کو خاطر میں کہاں لاتی ہیں؟ بہ قول اماں کے اوپر دھوپ ہی دھوپ تھی لیکن یہاں دھند ہی دھند تھی۔ آسمان پر سورج بجھا بجھا سا تھا۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا اور بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔

"جلیل۔" شنو نے برہمی سے کہا۔ "تجھے دو مہینے پہلے گرم سوٹ دیے تھے سلنے کو۔"

"استاد اکرم پولیس اور ڈاکٹروں کے علاج سے صحت یاب ہو گیا ہے لیکن فی الحال سوٹ کاٹنے کے قابل نہیں ہے۔ قینچی صراطِ مستقیم پر چلانے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ جیسے ہی وہ ٹھیک ہو گا میں تمہارے سوٹ سلوا دوں گا۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "ویسے یہ سوٹ برا نہیں ہے بس تمہاری کھال سے زیادہ فٹ ہے۔"

"بدتمیز۔" شنو شرمائی اور غصہ بھول گئی۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔"

"ہر بار دیکھنے کو کچھ زیادہ فیصد ملتا ہے۔" میں نے موسم کی مناسبت سے سرد آہ بھری۔ "تم چین کی معاشی ترقی کی رفتار سے ترقی کر رہی ہو۔ اوسطاً دس فیصد سالانہ۔"

شنو نہیں سمجھی اور پھر شرمائی۔ اس نے اٹھلا کر کہا۔ "جلیل تو اس بار نیو ایئر پر سی ویو نہیں لے گیا۔"

"کیونکہ وہاں جانے والوں کو پولیس لے جا رہی تھی اور رات تھانے میں گزرتی نیو ایئر کی۔"

"چل نیو ایئر چھوڑ، مجھے پارلر جانا ہے۔" اس نے کہا۔ "چار گھنٹے کا کام ہے۔"

"چار گھنٹے۔" میں نے غور کیا۔ "کیا دلہن بننے کی پریکٹس کرو گی۔"

وہ شرمائی۔ "نہیں بس چھوٹے موٹے کام ہیں، ان میں ہی دیر ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے لے جاؤں گا لیکن کوئی ڈھنگ کا سوٹ پہن لینا، اس حلیے میں لے کر نہیں جاؤں گا۔"

"یہ گھر کا سوٹ ہے، اماں اس میں باہر جانے ہی نہ دیں۔" وہ نیچے جاتے ہوئے بولی۔ "بارہ بجے تک جانا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ سورج خاصا اوپر نکل آیا تھا۔ میں نے راجا کو کال کی جو حسبِ معمول عارفہ نے ریسیو کی اور موبائل راجا کو دے دیا۔ راجا نے بے وقت کال کرنے پر مجھے بے نقط سنائیں۔

میں نے کہا۔ "دیکھ بے راجا اگر تو نے زیادہ بکواس کی تو تیرے باپ کو بتا دوں گا کہ اس وقت تو کہاں دستیاب ہو سکتا ہے۔"

"بتا دے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ابا دو دن پہلے تھانے سے آیا ہے۔ الٹا تیرے گلے پڑ جائے گا۔"

"باپ کے علاوہ بھی تیرے کچھ دشمن ہیں۔"

"جن میں تو سرِ فہرست ہے۔" راجا نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اگرچہ نیچے جانے میں خطرہ تھا مگر اوپر ہوا زیادہ کاٹ رہی تھی۔ میں سیڑھیوں سے نیچے آیا اور فوراً ہی سجدے میں چلا گیا۔ مگر سجدہ مکمل ہونے سے پہلے ماتھا لکڑی کی پٹی سے ٹکرایا اور مجھے نظر آنے والے اجرام فلکی یقیناً نئے تھے۔ کیونکہ پہلی بار نظر آ رہے تھے۔ جب تک یہ اجرام فلکی نظر آتے رہے، میں نے لیٹے رہنا مناسب سمجھا۔

"جلیل، کیا آج صحن میں لیٹنے کا ارادہ ہے۔" خلیل نے پاس آ کر پوچھا۔ آنکھوں کے آگے مطلع صاف ہو رہا تھا اس لیے میں اٹھ بیٹھا اور بھنا کر کہا۔

"اس کباڑ خانے میں کہیں لیٹنے کی جگہ ہے۔"

"تب کیوں لیٹے ہو؟" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

"اماں اندر بیٹھی رو رہی ہیں۔"

میں نے گومڑ سہلایا اور فکر مند ہو گیا۔ اماں رو رہی ہیں... یہ تو ابا کی برسی کے دن کی روایت ہے۔ سنا ہے ابا یہی روایت شادی کی سالگرہ کے دن مناتے رہے جب تک کہ دنیا سے نہیں گزر گئے۔ میں نے اماں کے کمرے میں

جھانکا۔ انہوں نے ابا کی چیزیں چاروں طرف پھیلائی ہوئی تھیں۔ ان کے کپڑے اور ذاتی استعمال کی چیزیں۔ میں نے غور کیا تو اماں کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندا نظر آیا جسے وہ یوں دبوچے ہوئے تھیں جیسے خلیل اپنے بعض ناخلف کبوتر دبوچتا ہے ان کے پر کترنے کے لیے۔ اماں کے چہرے پر بے شک آنسو تھے مگر ساتھ ہی غیظ اور غضب کے آثار بھی تھے اس لیے میں نے ذرا محفوظ فاصلے پر ہو کر پوچھا۔ ''اماں خیریت تو ہے... کیا ابا کی یاد آرہی ہے؟''

''کاش کے تیرے ابا زندہ ہوتے۔'' اماں نے ایسے آتش فشاں لہجے میں کہا کہ مجھے ابا مرحوم کی عافیت بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ اماں سے کچھ بعید نہیں تھا، وہ ان کی گوشمالی کے لیے وفات پا کر بھی ان کے پاس جا سکتی تھیں۔

''خیر تو اماں، ابا بے چارے سے بعداز مرگ کیا خطا ہوگئی جو لال بھبوکا ہورہی ہو؟''

''لے دیکھ اپنے باپ کے کرتوت...'' اماں نے کاغذات یوں پھینک دیے جیسے خلیل کبوتر کے پر کتر کر اسے پھینک دیتا ہے۔ کاغذات کچھ قدامت کی وجہ سے اور کچھ اماں کے غصے کی تاب نہ لا کر چرمر ہو گئے تھے۔ میں نے احتیاط سے انہیں سمیٹا۔ یہ کل چھ خطوط تھے اور ابا کی رائٹنگ میں تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کیونکہ میں ابا کی ہینڈ رائٹنگ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے احتیاطاً پہلے خطوں کے ابتدائی اور آخری جملہ جات پر نظر ڈالی۔ تمام خطوط ''میری پیاری چھنو'' سے شروع ہو کر ''تمہارے رفو'' پر ختم ہوئے تھے۔ ابا کا نام رفیق الزماں تھا اس لیے رفو تو سمجھ میں آتا تھا۔ مگر اماں کا نام نورالنساء تھا اس لیے چھنو کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ اس بار میں نے نفسِ مضمون پر بھی نظر کی اور قائل ہوگیا کہ عشق و عاشقی کے زبان و بیان میں زمانے کی قید نہیں ہے۔ میں تقریباً ان ہی الفاظ میں براہِ راست شنو سے تبادلہ خیال کرتا ہوں۔ میں نے جھجک کر پوچھا۔

''اماں تمہیں یقین ہے کہ یہ خط ابا نے تمہیں نہیں لکھے تھے؟''

''اس وقت مجھے پڑھنا کہاں آتا تھا۔'' اماں نے چمک کر کہا۔ ''تیرے ابا کے گزرنے کے بعد تو میں نے پڑھنا سیکھا تھا۔''

اماں نے ابا کی وفات کے بعد تعلیم بالغان اسکول سے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ ابا نے خطوط پر باقاعدہ تاریخ تک ڈالی ہوئی تھی۔ اور یہ تاریخ آج سے پینتیس برس پہلے کی تھی جب اماں ابا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ چھ خطوط دو مہینے میں تقریباً ہفتہ دس دن کے فرق سے لکھے گئے تھے اور ابا نے اس میں چھنو کے لیے اپنے جذبات جن الفاظ میں بیان کیے تھے انہیں پڑھ کر میرے کان سرخ اور گرم ہو گئے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی اس طرز کا ماہر ہوں پر ابا تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے تھے۔ اماں کا غیظ و غضب سمجھ میں آرہا تھا کیونکہ ابا نے کبھی ان سے یوں اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ اماں ابا اس پرانے محلے کی ایک ہی گلی میں رہتے تھے اور ان کے گھر والوں نے یہ رشتہ طے کیا تھا یعنی ان کی لو میرج نہیں تھی۔ اس زمانے میں لو میرج عام طور سے کورٹ میرج ہوتی تھی۔ یعنی گرفتارِ محبت جوڑا گھر سے مفرور ہو جاتا تھا اور عدالت جا کر شادی کر لیتا۔ اماں نے تو شادی والے دن بلکہ رات ابا کو دیکھا تھا اور ابا نے بھی اماں کو دور دور سے دیکھا تھا۔ اس لیے یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ابا نے یہ خط کسی تیسری ہستی کو لکھے تھے۔

ان خطوط میں ابا نے مذکورہ خاتون کے حسن و دلکشی کی وضاحت کے لیے جو استعارے استعمال کیے تھے وہ... ناقابلِ یقین ہی نہیں ناقابلِ بیان بھی تھے اس لیے مجھے خطوط پڑھتے ہوئے نہ صرف دقت پیش آئی بلکہ اماں سے تقابل کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ہستی اماں ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ ابا کے انداز سے تو لگ رہا تھا کہ انہیں مس یونیورس سے محبت ہوگئی تھی۔ میں نے اماں سے پوچھا۔ ''یہ خطوط کہاں تھے جو آج تمہارے ہاتھ لگے؟''

''تیرے ابا کی جو پیٹی ہے نا اس کے نیچے اخبار کی جو تہ بچھی ہے اس کے نیچے تھے۔ آج پہلی بار وہ تہ ہٹائی تو ان کے یہ کرتوت سامنے آئے۔''

''پر اماں ہو سکتا ہے ابا کو کوئی لڑکی اچھی لگی ہو اور اس سے سیٹنگ نہ ہوئی ہو... میرا مطلب ہے کہ اس نے ابا کو گھاس نہ ڈالی ہو... اُف میرا مطلب ہے کہ اس کی پہلے سے کہیں سیٹنگ ہو اور پھر ابا کی تم سے شادی ہوگئی۔ اس لحاظ سے ابا قابلِ معافی ہیں۔''

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔'' اماں نے خفگی سے کہا۔ ''خطوں پر لکھی تاریخ غور سے دیکھ... یہ ہمارا رشتہ طے ہوجانے کے بعد کے خطوط ہیں۔''

میں نے غور کیا تو واقعی خطوط پر تاریخ ان ہی دنوں کی تھی جب اماں ابا کا رشتہ طے ہوگیا تھا اور دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ میں نے سر سہلایا۔ یہ تو ابا

نے فوت ہونے کے بعد مسئلہ کھڑا کیا تھا۔ اول تو رشتہ طے ہو جانے کے بعد انہیں محبت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ کب عشق کا مہلک وائرس انسان کو چمٹ جائے؟ اس معاملے میں وہ قابلِ معافی تھے۔ لیکن اگر انہوں نے اماں سے رشتہ ہونے کے بعد محبت کر ہی لی تھی تو خط لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر دل پر کس کا زور ہے؟ خیر اگر انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خط لکھ ہی لیے تھے تو انہیں محبوبہ مذکورہ کو پوسٹ کر دینے چاہیے تھے۔ جیسا کہ اس زمانے میں طریقہ کار تھا۔ بائی ائر یعنی پتھر پر باندھ کر اور اگر اپنے نشانے پر بھروسا نہ ہو تو محبوبہ کے برادرِ خرد کے ہاتھ بھیجا جاسکتا تھا۔ نشانے اور بھروسے کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا لیکن ابا جان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ہمت کی کمی کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکے ہوں گے۔ بہرحال اس صورت میں انہیں یہ خطرناک خطوط کسی خفتہ بم کی طرح اپنے یادگاری صندوق میں نہیں رکھنے چاہیے تھے۔ یہ بم اب پھٹے تھے۔ ابا تو رہے نہیں تھے لیکن اماں یوں آنسو بہا رہی تھیں جیسے ابھی ابھی ابا جان نے دوسرے عقد کا فیصلہ کر لیا ہو۔ حالانکہ نوے فیصد شوہروں کی طرح وہ صرف سوچ سکتے ہوں گے، فیصلے کی جرات کہاں ہوگی۔ اماں نے ناک سڑکتے ہوئے کہا۔

''جلیل، میں تیرے ابا کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''اماں ایک تو انہوں نے شادی آپ سے کی اور دوسرے وہ دنیا سے جا چکے ہیں۔'' میں نے اماں کو تسلی دی۔ ''اب آپ چھوڑیں۔''

''کیسے چھوڑ دوں۔'' اماں نے بلبلا کر کہا۔

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''آپ کیا کریں گی، وہ تو اس دنیا سے جا چکے ہیں، کیا حساب لینے ان کے پاس جائیں گی؟''

''تیرے ابا جا چکے ہیں لیکن وہ کلموہی تو یہیں ہوگی۔'' اماں نے حسد سے کباب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اُسے نہیں چھوڑوں گی۔''

''اُسے... اس بے چاری نے کیا قصور کیا ہے؟''

''بے چاری...؟'' اماں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے جلدی سے ان سے اتفاق کر لیا۔

''سوری اماں، میرا مطلب ہے کہ اب آپ کیا کریں گی؟''

''ناک چوٹی کاٹ دوں گی اُس کی...'' اماں نے اعلانِ جنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گی۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے فکرمند ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ کا ارادہ ان خطوط کو فوٹو کاپی کرا کے تقسیم کرنے کا ہے تو اس میں آپ کے مجازی خدا کا نام بھی آتا ہے جو اتفاق سے ہمارے ابا بھی ہیں۔''

اماں نے ایک بار پھر زبان و بیان کی غلطی پکڑتے ہوئے جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''اتفاق سے... جلیل بے حیا...''

''سوری اماں زبان پھسل گئی۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ نے چھنو کو بدنام کیا تو نام ابا کا بھی بدنام ہوگا اور ہمارا بھی۔''

''میں اس کے شوہر اور اس کی اولاد کو اس کے کرتوت بتاؤں گی۔'' اماں اس وقت اسٹار پلس فیم ولن خاتون بنی ہوئی تھیں اور کسی صورت افہام و تفہیم پر راضی نہیں تھیں۔ میرے مٹی پاؤ مشورے پر جب وہ مجھ پر مٹی ڈالنے پر تیار ہو گئیں تو مجبوراً مجھے ان سے پھر اتفاق کرنا پڑا تھا اور یہ وعدہ بھی کہ میں اس خاتون کو تلاش کر کے رہوں گا۔ چاہے میری باقی عمر اسی کی تلاش میں کیوں نہ گزر جائے۔

☆☆☆

لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اپنی باقی عمر اس خاتون کی تلاش میں گزار دوں جو اَب کم سے کم پچاس برس کی ضرور ہوگی اور جوانی میں اس پر ابا عاشق ہو چکے تھے۔ سردی اور بعض دیگر حالات کی وجہ سے فارغ تھا۔ ٹیلر شاپ بند تھی اسی لیے شنو کے سوٹ نہیں سل سکے تھے اور اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے یہ کام نمٹانے کا فیصلہ کیا اور میں راجا کی تلاش میں نکلا۔ اگر عارفہ نے اس کی جان چھوڑ دی تھی تو اس صورت میں اس کے کیفے ڈی پھوس میں پائے جانے کے امکانات روشن تھے۔ میرا اندازہ ہمیشہ کی طرح درست نکلا۔ راجا کیفے ڈی پھوس میں موجود تھا اور دیوداس اسٹائل میں چائے پی رہا تھا۔ چائے کی بھاپ اس کے منہ سے آہ بن کر نکلتی تھی۔ یہ آہ و بکا یقیناً عارفہ کی وجہ سے تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''جلیل تو ہمیشہ غلط وقت پر کال کرتا ہے۔''

''درست بات یہ ہے کہ میں جب کال کرتا ہوں تو غلط جگہ پر ہوتا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''مجھے امید تھی جلد عارفہ تجھے عاق کر دے گی۔''

''اس نے عاق نہیں کیا۔'' راجا نے دانت نکالے۔
''اس کا باپ تیری کال کی طرح غلط موقع پر آ گیا تھا۔''
''تو اسے نہیں ٹال سکا ہوگا۔''
''عارفہ نے مجھے پچھلے دروازے سے نکال دیا۔''
''دیکھ راجا عارفہ کے چنگل سے نکل آ ورنہ کسی دن بری طرح پھنسے گا۔''
''نصیحتیں کرنے کے لیے میرا باپ کافی ہے۔''
میں باپ نہیں ہوں، میں تیرا یار ہوں اور تجھے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''
''تو آنکھیں بند کر لے۔'' راجا نے خلوص سے مشورہ دیا۔ ''کوئی فائدہ نہیں میرے لیے جلنے کڑھنے کا۔''
''کہہ تو تو ٹھیک رہا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''چھوڑ اس بات کو، یہ بتا کہ تیرے اماں ابا بھی اسی محلے میں رہتے تھے جہاں میرے اماں ابا شادی سے پہلے رہتے تھے۔''
''ہاں لیکن بھول رہا ہے میرے اماں ابا اب بھی وہیں رہتے ہیں۔'' راجا نے یاد دلایا۔ ''مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟''
''یار مجھے ایک ایسی خاتون کی تلاش ہے جو آج سے پینتیس برس پہلے چھنو کہلاتی تھی۔''
''بیٹے اسی لیے کہتا ہوں کہ شنو کو بھگا کر لے جا... تیری اور اس کی اماں جیتے جی تم دونوں کو ایک نہیں ہونے دیں گی۔ ہاں مر گئے تو شاید ایک ہی قبر میں دفن کر دیں۔''
''بکواس نہ کر...''
راجا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''اب دیکھ تو شنو کی نام کی ہم قافیہ ناموں کی خواتین کی تلاش میں ہے چاہے وہ پینتیس برس پہلے کی کیوں نہ ہو۔''
''راجا پوری بات تو سن لیا کر... میڈیا نہ بن جو فوراً ہیڈ لائن چلا دیتا ہے۔''
راجا نے آنکھیں گھمائیں۔ ''تو بات ابھی باقی ہے۔''
میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ راجا کو بتایا تو وہ دم بہ خود رہ گیا۔ ''جلیل تیرے ابا ایسے نکلیں گے... میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''
''سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔ ''لیکن یار جوانی میں آدمی ایسی حرکت کر جاتا ہے اور پھر ابا نے صرف خط ہی تو لکھے تھے۔''
''تو کیسے کہہ سکتا ہے؟'' راجا نے جرح کی۔ ''بات پینتیس سال پہلے کی ہے اور قصہ تیری اماں سے بھی شادی سے پہلے کا ہے۔''
''یار تو اماں کو جانتا ہے... ان کا شوہر ایسی حرکت کر سکتا ہے؟''
راجا نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن بات پرانی ہو گئی ہے۔''
''ہاں لیکن اماں کا صدمہ تو تازہ ہے نا... وہ ہر صورت اس خاتون کا سراغ لگانا چاہتی ہیں۔''
''ٹال دے، کہنا کہ چھنو کا انتقال ہو گیا۔ تیرے ابا کی وفات کا سن کر خودکشی کر لی تھی۔''
میں نے انکار کیا۔ ''میں اس معاملے میں اماں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ان سے کچھ بعید نہیں ہے وہ خود تحقیق کرنے پہنچ جائیں اور میں مارا جاؤں۔''
''تب تلاش کر...'' راجا نے بھنا کر کہا۔ ''میرا دماغ کیوں کھا رہا ہے؟''
''یار معاملہ تیرے محلے کا ہے۔''
''تو جانتا ہے میں خود وہاں کم پایا جاتا ہوں۔ پڑوسی تو چھوڑ بعض اوقات ابا میری شکل بھول جاتا ہے۔ میں بھی وہاں کسی کو نہیں جانتا... میرا مطلب ہے بیس سال سے اوپر کی کسی لڑکی سے واقف نہیں ہوں۔''
''ہو سکتا ہے وہ خاتون ان ہی بیس سال سے کم عمر کسی لڑکی کی ماں ہو۔''
راجا کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ راجا ہڈحرام کسی بھی کام کا آغاز ہمیشہ اسی طرح کرتا تھا۔ اسے راضی کرنا پڑتا تھا۔ ''یار محلے میں کتنے گھر ہوں گے زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس... ان میں کتنی چھنو ہو سکتی ہیں۔''
''تو بھول رہا ہے ہر گھر کم سے کم تین منزلہ تھا جو اب چار پانچ منزلہ ہو گیا ہے اور چھنو تو ہر دوسرے تیسرے گھر میں پائی جاتی ہوگی۔'' راجا نے مزاحمت جاری رکھی پھر اس نے نقطہ اٹھایا۔ ''تو جانتا ہے یہ کتنا خطرناک کام ہے۔ جب تیری اماں ہنگامہ کرے گی تو چھنو اور اس کے گھر والوں کی طرف سے بھی جوابی کارروائی ہوگی۔''
''ہم پہلے اسے تلاش کریں گے۔''
''ہم نہیں صرف تو۔'' راجا نے تصحیح کی۔ ''میں ابھی تیرے ساتھ شامل نہیں ہوا ہوں۔''
''او کے، فی الحال میں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسے تلاش کروں گا اور اس کے بعد حالات کا جائزہ لے کر اماں کو

آگاہ کروں گا۔''

''اس کے بعد جو ہوگا وہ تو اچھی طرح جانتا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''جلیل کیا تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے تو اپنی اماں کو نہیں جانتا ہے؟''

''جانتا ہوں یار۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پر یار اماں نے بات ہی ایسی کی کہ میں انکار نہیں کرسکا۔ اماں نے طعنہ دیا کہ میں ساری دنیا کے پھڈوں میں ٹانگ اڑاتا پھرتا ہوں اور ماں کے لیے ایک کام نہیں کرسکتا، اب تو خود سوچ کہ میں انکار کرسکتا تھا۔''

''نہیں کرسکتا تھا۔'' راجا نے اعتراف کیا۔ ''ماں تو ماں ہوتی ہے۔''

''بس یار اسی لیے مجبور ہوگیا۔ اب مجھے یہ کام کرنا ہی ہے ہر صورت۔''

راجا نے فریاد کی۔ ''تیری تو اماں ہیں پر میرا کیا قصور ہے؟''

''تو میرا یار ہے، کتنی بار ہم نے ساتھ کام کیا... کیا نا؟ تو اس میں کیا حرج ہے... اگر رقم کا معاملہ ہے تو...''

''بکواس نہ کر... میں کتنا ہی کمینہ صحیح، کیا تجھ سے اس کام کے بدلے کچھ لے سکتا ہوں۔'' راجا نے بات کاٹ کر کہا۔

''تب میرا ساتھ دے، میں وعدہ کرتا ہوں اگر خطرہ ہوا تو تجھ پر آنچ نہیں آئے گی۔''

راجا نے سوچا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

میں نے خوش ہو کر چھوٹے کو اشارہ کیا اور اسے دو دودھ پتی لانے کو کہا۔ چھوٹے نے اطلاع دی۔ ''استاد نے ادھار بند کردیا ہے۔ بولتا ہے محبت کا قینچی ہوتا ہے۔''

''تیرے استاد کی...'' میں نے کہا۔ مگر جب چھوٹا ڈھٹائی سے کھڑا رہا تو مجبوراً مجھے ایک نوٹ اس کی ٹرے پر رکھنا پڑا۔

''یار مجھے ایک خیال آرہا ہے۔'' راجا نے چھوٹے کے جانے کے بعد کہا۔ ''یہ فتو کمینہ بھی تو اپنا بچپن کا یار ہے۔''

''ہاں، بڑے ہو کر آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''اس کے اماں ابا بھی وہیں کے رہنے والے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''فتو کی اماں کا نام سلیمہ ہے۔''

میں چونکا۔ ''تیرا مطلب ہے... چھنو...؟''

راجا نے دانت نکالے۔ ''تصدیق کرنے میں کیا حرج ہے۔''

میں نے فتو کی طرف دیکھا جو پتیلے سے چائے انڈیل رہا تھا اور متفکر ہوگیا۔ یہ ایک اور مسئلہ سامنے آگیا تھا۔ ابھی میں اماں کی طرف سے پریشان تھا اور اب دوست کا مسئلہ سامنے آگیا تھا۔ اگر سچ مچ فتو کی اماں وہی چھنو نکل آتی جسے کبھی ابا نے عشقیہ خطوط لکھے تھے تو معاملہ طربیہ سے المیہ رخ اختیار کرسکتا تھا۔ خاص طور سے جب فتو کے پہلوان سالے اس میں کودتے اور امکان یہ تھا کہ میری چٹنی بن جاتی۔ فتو سے دوستی تھی لیکن تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہتے تھے اس لیے جو کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''تو تصدیق کرسکتا ہے۔''

''میں...'' وہ بدکا۔ ''میں کیسے کرسکتا ہوں۔''

''تیری اماں کی فتو کی اماں سے دوستی ہے... دونوں رہتی بھی ایک محلے میں ہیں۔''

''فرض کر اگر اماں تصدیق کردیتی ہے کہ فتو کی اماں ہی چھنو کہلاتی تھی تب بھی یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہی چھنو تھی جسے تیرے ابا نے لو لیٹر لکھے تھے۔'' راجا نے ایک نقطہ اور اٹھایا۔

''یار پہلے ایک چیز کی تصدیق تو ہوجائے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اچھا موقع ہے، تیرا ابا اس وقت گھاٹ پر ہوگا۔''

مگر بدقسمتی سے راجا کا باپ گھر کے سامنے موجود تھا اور گدھا گاڑی پر کپڑے لاد رہا تھا۔ راجا نے گلی میں جانے سے انکار کردیا۔ میں نے کہا۔ ''ابے چند گالیاں ہی کھانی ہیں نا، کھالینا۔''

''بات گالیوں کی نہیں ہے، انہیں تو میں وٹامن کی گولیاں سمجھ کر کھالیتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ابا گھاٹ لے جائے گا اور شام سے پہلے جان نہیں چھوٹے گی۔''

راجا ٹھیک کہہ رہا تھا اس لیے مجبوراً اس کے باپ کی روانگی تک صبر کرنا پڑا تھا۔ جیسے ہی راجا کا باپ گدھا گاڑی لے کر گلی سے نکلا راجا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں البتہ وہیں رہا۔ راجا نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ اگر خدانہ خواستہ اس کا باپ ناگہانی طور پر واپس آجائے تو میں اُلو کی آواز میں اسے سگنل دے دوں۔ راجا مجھے کتے کی آواز میں سگنل دیتا تھا اور میں نے اُلو منتخب کیا تھا جو ہمارے ہاں نہ سہی مغرب میں بہرحال کچھ عزت رکھتا تھا۔ ویسے راجا بھی کبھی کبھی حسرت سے کہتا کہ کاش اوپر والا اسے کتے کی صورت میں سہی مغرب میں پیدا کرتا۔ وہاں وہ کم سے کم

موجودہ زندگی سے بہتر ہوتا۔ میں راجا کے انتظار میں کھڑا تھا کہ کوئی عقب سے ٹکرایا اور میں گرتے گرتے بچا۔ مجھ سے ٹکرانے والی بڑی بی تو دھان پان سی تھیں مگر انہوں نے تھیلا اپنے وزن سے زیادہ کا اٹھا رکھا تھا اور وہی مجھ سے ٹکرایا تھا۔ میں نے خفگی سے کہا۔

''اماں پوری گلی چھوڑ کر مجھ سے ہی ٹکرانا تھا یہ بورا۔''

''ارے تو اور کہاں جاؤں۔'' وہ تنک کر بولیں۔ ''میرے گھر کے دروازے سے تو جڑا کھڑا ہے تو...''

''سوری۔'' میں نے کھسیا کر کہا اور جلدی سے پیشکش کی۔ ''میں تھیلا اندر پہنچا دیتا ہوں۔''

''ارے جب بازار سے یہاں تک لے آئی ہوں تو دو قدم اور بھی لے جا سکتی ہوں۔'' انہوں نے تنک کر کہا مگر تھیلا مجھے پکڑا دیا۔ میں تھیلا اٹھا کر اندر لے گیا۔ چھوٹا سا مکان تھا اور بڑی بی اکیلی ہی لگ رہی تھیں۔

''کیا اکیلی رہتی ہو؟''

''ہاں بیٹا، دو بیٹے ہیں مگر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''تو بہوؤں سے بنا کر رکھنی تھی۔''

''پہلی والی سے بنا کر نہیں رکھی اور دوسری بنانے والی نہیں تھی۔ پہلی والی تنگ آ کر گئی اور دوسری جانے کے ارادے سے آئی تھی۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر چونک کر مجھے دیکھا۔

''تو نور النساء کا بیٹا ہے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں مگر آپ کیسے جانتی ہیں؟''

''بنی بنائی اسی کی صورت ہے تو۔ میرے تو سامنے کی بچی تھی نور مگر شادی کے بعد یہاں کم آتی تھی۔''

اماں کی سسرال والوں کیا میکے والوں سے بھی کم بنتی تھی اس لیے ان کے چکر مہینے بعد ہی لگتے تھے حالانکہ پیدل کا راستہ ہے دونوں محلوں میں۔ بڑی بی ان روایتی خواتین میں سے لگ رہی تھیں جن کی زندگی کا محور آس پاس کی مکمل خبر رکھنا ہے۔ جدید عالمی جاسوس تنظیموں کی جدِ امجد ہمارے ہاں کی ایسی ہی خواتین ہیں۔ اب میں ان سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا اور وہ مجھے پرانے قصے سنانا چاہتی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں جان چھڑا کر باہر نکلا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں راجا نہ آجائے اور مجھے نہ پا کر نو دو گیارہ نہ ہو جائے۔ وہ مشکل سے ہاتھ آتا۔ دوسری طرف بارہ بجنے والے تھے اور شنّو کی ڈیڈ لائن بھی پاس تھی۔ میں بروقت باہر آیا۔ راجا منہ اٹھائے یوں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے میں یہاں سے براہِ راست آسمان کی طرف پرواز کر گیا ہوں اور ساتھ ہی اس کے منہ سے کچھ ناگفتنی بھی نکل رہی تھیں جو ظاہر ہے کہ میری شان میں تھیں۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''میں یہاں ہوں، اوپر کیا دیکھ رہا ہے؟''

راجا نے ملاحظے کے لیے اپنا سر پیش کیا جس پر تازہ بیٹ موجود تھی۔ بلاشبہ یہ نشانے بازی کا عمدہ نمونہ تھا۔ اب میں سمجھا کہ راجا اوپر کیا تلاش کر رہا تھا اور کسے بے نقط سنا رہا تھا۔ ''چھوڑ یار۔'' میں نے اسے تسلی دی اور ٹشو دیا۔ ''اپنا سر اور دل صاف کر لے۔''

راجا نے ملٹی کلر بیٹ صاف کی جو صاف ہونے کے بجائے اس کے بالوں میں ہیئر کلر کی طرح پھیل گئی تھی اور اس نے ایسا شیڈ دیا تھا کہ راجا کے بالوں کا یہ حصہ اچھا ڈائی ہوا لگ رہا تھا۔ اس لیے جب ہم کیفے ڈی پھوس کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں سامنا ہونے والا ہر لڑکا اور لڑکی غور اور شوق سے راجا کو دیکھتا تھا۔ راجا خوش ہو گیا۔ ''لگتا ہے آج میں اچھا لگ رہا ہوں۔''

حالانکہ راجا اتنا ہی اچھا لگ رہا تھا جتنا کہ استاد جانی چریا چڑیا گھر کا رنڈوا ہو جانے والا بندر لگ سکتا تھا۔ مگر میں نے یہ بات راجا کو بتانا مناسب نہیں سمجھی۔ فی الحال وہ میرے لیے کام کر رہا تھا اور اگر بگڑ جاتا تو میرا کام رک جاتا۔ اس لیے میں نے تائید کی اور ہم کیفے ڈی پھوس پہنچ گئے۔ راجا نے چائے آنے تک منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی اور پہلی بھاپ اس نے گرم چائے کی نکالی۔ میں بے تاب تھا۔ ''راجا جلدی سے بتا، تیری اماں نے کیا سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔''

''انکشافات نہ صرف سنسنی خیز بلکہ تہلکہ خیز بھی ہیں۔'' راجا نے میرے تجسس کی آگ پر پیٹرول چھڑکتے ہوئے کہا اور پیالی منہ سے لگا لی۔ مجبوراً میں نے بھی کپ اٹھایا۔ نصف کپ کے بعد راجا نے اسٹارٹ لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''اماں کا کہنا ہے کہ فتو کی اماں ہی محلے کی سب سے مشہور چھنّو تھیں۔''

میں نے بہ مشکل سنا اور راجا سے کہا۔ ''اونچا بول، یہاں کسی کے سن لینے کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہ سب سے مشہور چھنّو سے کیا مراد ہے؟''

''فتو کے ابا سے شادی سے پہلے ان کے کم سے کم تین افیئر چلے تھے۔ تینوں کامیاب رہے یعنی کسی سے شادی نہیں ہوئی اور فتو کے ابا سے ناکام رہا۔''

"یعنی شادی ہوگئی۔" میں نے راجا کی بات پر غور کیا۔ "کیا فتو کی اماں کو اس شادی کا صدمہ تھا؟"

"بالکل۔" راجا نے جیب سے ایک تڑا مڑا کاغذ نکالا۔ وہ اس وقت ایک عمدہ سی گرم جیکٹ میں تھا جو یقیناً کسی گاہک کی تھی اور دھلنے آئی تھی۔ "اماں نے کچھ تاریخیں بیان کی ہیں جو میں نوٹ کر کے لایا ہوں۔ تجھے معلوم ہے مجھے صرف نوٹوں کی گنتی کی حد تک حساب سے دلچسپی ہے۔"

راجا کی ٹیڑی میڑی رائٹنگ میں دو تاریخیں درج تھیں۔ "اماں کا کہنا ہے ایک تمہارے اماں ابا کی شادی کی تاریخ ہے۔ دوسری فتو کے اماں ابا کی شادی کی۔"

اماں ابا کی شادی کی تاریخ تو مجھے ازبر تھی۔ دوسری تاریخ ان کی شادی کے تین دن بعد کی تھی۔ گویا دونوں شادیوں میں صرف تین دن کا فرق تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ راجا کا خدشہ درست ثابت ہونے والا تھا۔ گویا فتو کی اماں ہی وہ چھنو تھیں جن سے ابا کو محبت ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت یوں زیادہ اندوہناک تھی کہ اماں کی ان سے بھی دوستی تھی۔ بلکہ وہ تینوں یعنی راجا کی اماں سمیت ایک گروپ کی تھیں۔ اب اماں کو پتا چلتا کہ ان کی سہیلی ہی ان کی جڑ کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی تو ان کے دکھ کا تو پتا نہیں چلتا مگر ان کے غیظ و غضب کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ اماں آتش فشاں کی طرح پھٹتیں اور ان کے طیش کے لاوے میں نہ جانے کیا کچھ خاکستر ہوجاتا۔ راجا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مشورہ دیا۔ "گول کر جا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اماں سے چھپانا مشکل ہے اور دوسرے میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔"

"دیکھ یار فساد ہوا تو تیری میری اماں کا کچھ نہیں جائے گا۔ مرد ہونے کے ناتے ہماری چٹنی بنے گی، تو فتو کے سالوں کو جانتا ہے۔"

"بالکل جانتا ہوں، ان میں سے ایک اس وقت یہاں حرام خوری میں مصروف ہے۔" میں نے تیسری میز کی طرف اشارہ کیا۔ "میں کوشش کروں گا کہ اماں قابو میں رہیں۔"

"تیری مرضی۔" راجا کھڑا ہوگیا۔ "میں کچھ دن کے لیے روپوش ہوجاتا ہوں۔"

"ڈرمت، کچھ نہیں ہوگا یار۔" میں نے اسے اور خود کو تسلی دی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا جہاں فی الحال اماں کے بجائے شنو آتش فشاں بنی میری منتظر تھی کیونکہ میں پورے نصف گھنٹے لیٹ پہنچا تھا۔ اسے بائیک پر لاد کر روانہ ہوا تو اس نے راستے میں چٹکیاں کاٹ کر اس تاخیر کا بد لیا۔ اسے بیوٹی پارلر کے سامنے اتار کر میں نے خفگی سے کہا

"اب خود واپس آنا۔ میری کھال اتار دی ہے کمر سے۔"

"اگر تم نہیں آئے تو میں سیدھی تمہارے گھر آؤں گی۔" اس نے جوابی کارروائی کا اعلان کیا اور میں نے فور ہتھیار ڈال دیے۔

"شنو بلیک فی میلر، میں آؤں گا۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اب مجھے چار گھنٹے بعد آنا تھا اس لیے میں واپس گھر آیا جہاں اماں نے رونا دھونا بند کر دیا تھا مگر پھیلاوا مزید پھیلا دیا تھا اور آتے ہی مجھے حکم دیا۔ "یہ سب اوپر لے جا دھوپ میں۔"

بدقسمتی سے دھند چھٹ گئی تھی اور سورج نکل آیا تھا۔ خلیل چالاکی سے کام لیتے ہوئے سودا لینے جا چکا تھا اور مجھے معلوم تھا وہ شام سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ ابھی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے مزید کچھ تفتیش کروں گا اتنی جلدی اماں کو بتانا مناسب نہیں تھا۔ سامان اوپر لے جانے کے دوران قسطوں میں اماں سے کچھ گفتگو اس طرح سے ہوئی۔

لکڑی کی خالی پیٹی اوپر لے جاتے ہوئے۔ "اماں بات خاصی پرانی ہے یعنی پینتیس برس پہلے کی اور تم ساٹھ سے اوپر کی ہوگئی ہو تو کیا سب ٹھیک سے یاد ہے؟"

اماں نے تنک کر کہا۔ "ارے یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے جو میں بھول جاؤں۔"

ابا مرحوم کے کپڑوں کا بنڈل اٹھاتے ہوئے۔ "کچھ یاد ہے تمہارے محلے میں کتنی چھنو تھیں؟"

اماں کے جواب کے دوران مزید تین چیزیں اوپر لے گیا۔ "کیوں نہیں یاد ہے... ایک تو سیما خالہ کی بیٹی تھی ثمینہ مگر وہ تو ایک سال پہلے بیاہ کر لاہور چلی گئی تھی... دوسری چھنو ہمارے مالک مکان کی بیوی تھی اور عمر میں میری اماں سے صرف دو سال چھوٹی تھی... تیسری چھنو اصل میں عارفہ تھی۔"

یہاں میں نے مداخلت کی اور بے ساختہ کہا۔ "نادر شاہ کی دخترِ بداختر۔"

اماں نے واپسی پر مجھے گھورا۔ "اس سے تیرا کیا تعلق ہے؟"

"کوئی تعلق نہیں ہے اماں بس جانتا ہوں اُسے۔"

"سمجھ لے ایسی ہی چیز تھی۔ پر تیرے ابا نے خطوط

میں زمین آسمان کے جو قلابے ملائے ہیں وہ ان پر پورا نہیں اترتی۔''

اماں ٹھیک کہہ رہی تھیں، اُس دور میں آزاد خیال عورتوں کا قحط تھا۔ اگر کوئی بھینس صفت عورت بھی ذرا آزاد خیال ہوجاتی تو دور دور سے اس کے پروانے چلے آتے تھے۔ اس زمانے میں لوگ شکل وصورت کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ مگر اماں کے خیال میں ابا اس پر نہیں مر سکتے تھے۔ انہوں نے آتشِ حسد میں جلتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی اور ہی کلموہی ہے اور مجھے تو لگتا ہے تیرے ابا نے اس کی شناخت چھپانے کے لیے اسے چھنّو کا نام دے دیا تھا۔''

میں نے سوچا کہ اماں کو اپنی سہیلی چھنّو کیوں یاد نہیں آرہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہاری کوئی ہم عصر اور ہم عمر چھنّو بھی ہو لیکن تم کو یاد نہ ہو۔''

''کہا تو ہے یہ پرانی بات ہے جو میں بھول ہی نہیں سکتی۔''

''اماں اپنی دوستوں کے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے آخری پھیرا لگاتے ہوئے کہا۔

''تو جانتا تو ہے تیرے دوستوں کی مائیں ہیں۔ پتا نہیں ہم تینوں کے نصیب میں کیا تھا جو ایسی اولادیں پیدا کیں۔'' اماں نے سب محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے کردیے۔

''یعنی راجا اور فتو کی امائیں۔''

''ہاں ہم تینوں ہم عمر تھے اور پاس پاس رہتے تھے۔ اسکول کی شکل کسی نے نہیں دیکھی اس لیے کبھی ایک کے گھر میں پائے جاتے اور کبھی دوسرے کے گھر میں، الگ اس وقت ہوتے جب اماؤں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا تھا۔''

''تمہاری فتو کی اماں سے زیادہ دوستی تھی یا راجا کی اماں سے؟'' میں نے ہوشیاری سے اپنی تفتیش جاری رکھی اور اماں کو ایسا تاثر دیا جیسے برسبیل تذکرہ پوچھ رہا ہوں۔

''سچی بات ہے میری سلیمہ سے بنتی تھی۔ سلطانہ ذرا تنک مزاج تھی۔ ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتی۔ اس سے دن میں تین بار تو لڑائی ہوتی تھی۔ مگر سلیمہ بہت اچھی فطرت کی تھی۔ اگر کڑوا بول دو تب بھی ہنس کر برداشت کرلیتی تھی۔ میں خود کون سی کم تھی۔'' اماں نے حقیقت پسندی سے کام کیا۔ ''اسی لیے سلطانہ سے لڑائی ہوتی تھی۔''

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی اماں کو پتا چل جائے کہ ان کی نہ ہونے والی سوکن اصل میں ان کی عزیز ترین سہیلی تھی تو اس کے بارے میں ان کے تمام اچھے جذبات بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے۔ اماں نے ٹنڈے گوشت پکائے تھے۔ انٹرویو کا باقی حصہ میں نے کچن میں توے سے اترتی گرما گرم روٹیاں کھاتے ہوئے مکمل کیا۔ جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ اماں کو سلیمہ پر کسی قسم کا شک تو کیا شائبہ تک نہیں تھا۔ اگر اماں کی بات درست تسلیم کرلی جائے کہ ابا نے مذکورہ خاتون کو خفیہ رکھنے کے لیے چھنّو کا کوڈ نیم رکھا تھا تو بھلا راجا کی اماں کو کیسے پتا چلا کہ سلیمہ خالہ چھنّو بھی کہلاتی تھی اور جو بات راجا کی اماں کو پتا تھی وہ میری اماں کے علم میں کیوں نہیں تھی جو دعوے کے مطابق سلیمہ سے زیادہ نزدیک تھیں۔ جب میں نے انٹرویو مکمل کرلیا تو اماں نے شروع کیا۔

''تو نے اب تک کیا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں اماں، اتنی جلدی میں کیا کرسکتا ہوں۔'' میں صاف مکر گیا۔ مگر اماں نے یقین نہیں کیا۔

''جلیل میں تجھے جانتی ہوں۔ تو ویسے تو سخت ہڈحرام ہے لیکن جب ایک کام لے لے تو اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھتا جب تک اسے پورا نہ کرلے۔ ابھی تو کہاں گیا تھا؟''

''راجا کے پاس۔'' اماں کے اچانک سوال پر میں نے بوکھلا کر سچ اگل دیا۔

''تجھے شنو کے ساتھ بیوٹی پارلر جانا تھا اس لیے راجا کے پاس بلاوجہ نہیں گیا ہوگا۔'' اب اماں نے شرلاک ہومز کی طرح قیاس کے گھوڑے دوڑانے شروع کیے۔ ''سچ سچ بتا تو راجا کے پاس کیوں گیا تھا؟''

''تاکہ اسے اپنی مدد پر آمادہ کرسکوں۔''

''یعنی تو نے اسے بتا دیا۔ اس کا مطلب ہے راجا نے سلطانہ کا ذکر کیا ہوگا۔ وہ اب بھی اسی محلے میں رہتی ہے اور میری بچپن کی دوست ہے۔ کیا تو اس سے ملا تھا؟''

میں اماں کی سراغ رسانی کی صلاحیت پر اتنا دنگ ہوا کہ اس بار بھی بوکھلا کر سچ بول گیا۔ ''نہیں راجا گیا تھا اپنی اماں سے پوچھنے۔''

''اس نے کیا کہا؟''

اب میں کشمکش میں پڑ گیا، اگر جھوٹ بولتا اور اماں بھانپ جاتیں تو ان کے لیے کون سا مسئلہ تھا، برقع پہن کر دس منٹ میں راجا کے گھر پہنچ جاتیں اور اس کے بعد گڑبڑ شروع ہوجاتی اور سچ بولتا تو گڑبڑ کا آغاز دس منٹ پہلے ہوجاتا۔

اس لیے میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا جسے عرف عام میں سیاست بھی کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''اماں میرے علم میں کچھ کچی پکی آئی ہے مگر ابھی میں تم کو نہیں بتا سکتا۔ تمھیں تھوڑا صبر سے کام لینا ہوگا۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں اس کام سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، تم خود جاکر راجا کی اماں سے معلوم کرلینا۔''

خلافِ توقع اماں مسکرانے لگیں۔ ''جلیل تو بہت مکار ہے۔ کیسے بات بناتا ہے۔ تو اپنے ابا کے مقابلے میں زیادہ کامیاب شوہر ہوگا۔''

''اماں پہلے شوہر تو ہونے دو پھر کامیاب اور ناکام بھی دیکھ لینا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ویسے شنو کو کم مت سمجھو، تمام بیویاں اپنے شوہروں کے معاملے میں بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔''

''یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے عورت کو صرف ایک مقصد دیا ہے کہ اپنے شوہر کو اپنا بنالو مگر ہم عورتیں شوہر کو اپنا کم بناتی ہیں اور اس کی زندگی کو عذاب زیادہ بناتی ہیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو پچھتاتی ہیں۔''

''اماں یہ تم کہہ رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ورنہ آج تک تو میں ابا کے بارے میں سنتا آیا ہوں۔''

''تیرے ابا کے خط نکلے تو پہلے مجھے غصہ آیا تھا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ میں اتنی اچھی بیوی نہیں تھی جتنی تیرے ابا چاہتے ہوں گے ورنہ وہ یہ خط سنبھال کر کیوں رکھتے۔''

غالباً اماں جذباتی ہو رہی تھیں اور میں نے سوچا کہ ان جذبات سے فائدہ اٹھاؤں اس لیے میں نے جلدی سے کہا۔ ''اماں یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ٹریفک یک طرفہ ہو یعنی دوسری خاتون کو سرے سے علم ہی نہ ہو کہ ابا ان کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی امکان ہے کہ وہ اس محلے کی نہ ہو۔ ورنہ آپ کو ضرور یاد ہوتا کہ آپ کے محلے میں کوئی اتنی حسین لڑکی بھی تھی۔''

اس پر اماں ذرا خفا ہوگئیں۔ ''میں ہی سب سے خوب صورت تھی۔''

میں نے اماں سے اتفاق سے کیا۔ ''تب اس معاملے کو ختم کردو۔ کیا فائدہ صرف دکھ ہوگا اور شاید جھگڑا ہو۔''

''میں نے سوچ لیا ہے کہ اب جھگڑا نہیں کروں گی اور شاید اُسے بتاؤں بھی نہیں مگر اسے ایک بار دیکھوں گی ضرور۔'' اماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''جلیل تجھے اس کلمو ہی کو تلاش کرنا ہوگا۔''

''اماں میں کوشش کرسکتا ہوں، گارنٹی نہیں دے سکتا۔''

''اگر تو نے دو دن میں اسے تلاش نہ کیا تو میں خود تلاش کروں گی اور آغاز سلطانہ سے کروں گی۔''

میں شنو کو لینے گیا تو موسم ابر آلود ہونے لگا تھا اور میں اسے بھاگم بھاگ لے کر آیا اور پھر اسے ہی ساتھ لگا کر اوپر سے سامان اتارا کیونکہ بارش ہونے والی تھی۔ آخری پھیرے میں بوندا باندی شروع ہوگئی اور میں نے بہ مشکل ابا کے کپڑوں کو بھیگنے سے بچایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اماں یادوں کے گڑے مردے پھر دفنا دیں گی اگلے برس کے لیے مگر اماں نے فی الحال انہیں باہر ہی رکھنے کا سوچا تاکہ جیسے ہی دھوپ نکلے وہ انہیں ٹھیک سے دھوپ دکھا کر پھر اندر رکھیں۔ اماں کی وارننگ نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ اگرچہ اماں کا موڈ کچھ بدلا تھا اور وہ معقولیت کی بات کر رہی تھیں مگر کیا کہا جاسکتا تھا کہ کب ان کا موڈ پھر بدل جائے اور وہ پہلے کی طرح غضب ناک ہوجائیں۔ اس لیے مجھے کچھ کرنا تھا اور اس کے لیے سب سے پہلے میں نے خود راجا کی اماں سے جاکر ملنے کا فیصلہ کیا۔ راجا کی اماں مزاج میں اماں سے کم نہیں تھیں مگر راجا کے حق بہر حال نرم تھیں۔ بدقسمتی سے جب میں اگلے دن صبح سویرے یعنی بارہ بجے وہاں پہنچا تو راجا کا باپ باہر نکل رہا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''راجا منحوس نہیں ہے اس لیے دفع ہوجا۔''

''میں راجا سے نہیں خالہ سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے راجا یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔''

''اسے تم جیسے دوستوں کی صحبت نے ڈبو دیا ہے۔'' وہ جاتے ہوئے بولا۔ ''مل لو اپنی خالہ سے۔''

سلطانہ خالہ صحن میں اماں کی طرح ایک انبار پھیلائے بیٹھی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ گڑے مردے نہیں بلکہ تازہ مردے تھے یعنی دھلنے کے لیے آنے والے کپڑے۔ وہ انہیں چھانٹ کر الگ کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''آج خالہ کی یاد کیسے آئی؟'' پھر خود ہی اس سوال کا جواب بھی دیا۔ ''یقیناً چھنو کے چکر میں آئے ہو گے۔''

''خالہ اس چکر نے تو مجھے چکرا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم سلیمہ خالہ کو چھنو قرار دے رہی ہو جبکہ اماں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''ارے تو نور کو یاد کہاں ہوگا؟'' وہ بولیں۔

''ایسا مت کہو، اماں کو سب یاد ہے کہ کس کے کیا کرتوت تھے۔'' میں وہیں بیٹھ گیا۔ ''خالہ یہ معاملہ کردو ورنہ اماں خود میدان میں آجائیں گی اور تم جانتی ہو کہ اماں کیسی عورت ہیں؟''

''اگر یہ معما ہے تو اپنی اماں سے پوچھو کہ اسے کیوں نہیں یاد ہے۔'' سلطانہ خالہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ویسے وہ اس کا بہت ساتھ دیتی تھی۔''

''خالہ اگر سلیمہ خالہ ہی وہ چھنو ہیں تو تم جانتی ہو کتنا بڑا فساد ہوگا۔''

''ارے میں تو شروع سے جانتی تھی جس دن یہ بھانڈا پھوٹے گا بھونچال آجائے گا۔'' سلطانہ خالہ نے کڑے تیوروں سے کہا۔ ''بس نور کی وجہ سے خاموش رہتی تھی۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''یعنی تم شروع سے جانتی تھیں؟''

''ہاں یہ سلیمہ میٹھی چھری تھی، ایک طرف نور کا دم بھرتی تھی اور دوسری طرف اس کی جڑیں بھی کاٹ رہی تھی، وہ تو اس کے نصیب میں نہیں تھا ورنہ آج وہ تمہاری ماں ہوتی اور نور بیٹھی رہ جاتی۔''

سلطانہ خالہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ معاملہ میرے اندازے سے کہیں آگے جا چکا تھا اور اس میں صرف سلیمہ خالہ ہی نہیں بلکہ ابا بھی شامل تھے۔ جیسا کہ ان کے خطوط سے بھی ظاہر ہے۔ میں نے ڈوبتے لہجے میں یہی سوال کیا تو وہ بولیں۔ ''میاں مرد ہی آگے بڑھتا ہے ورنہ عورت کی کیا مجال کہ خود سے آگے بڑھ سکے۔'' سلطانہ خالہ نے کہتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس کی مرضی تھوڑی چلتی ہے۔''

''تو ابا میاں کے گھر والوں نے اماں کا رشتہ کیوں بھیجا؟''

''مجھے کیا پتا۔'' وہ پھر تنک کر بولیں۔ ''مجھ سے پوچھ کر تھوڑی بھیجا تھا۔''

اماں کا کہنا درست ثابت ہو رہا تھا، سلطانہ خالہ اماں کی طرح ہی ٹیڑھے مزاج کی عورت تھیں۔ اگر اماں اس سلسلے میں آکر ان سے ملیں تو سچ مچ بڑا فساد ہوگا۔ بات کھلے گی اور سلیمہ خالہ تک جائے گی تو ان کے بچے میدان میں آجائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور اماں کو کیسے کہوں کہ اس پر مٹی ڈالیں۔ وہ پھر مجھ پر مٹی ڈالنے پر آمادہ ہو جاتیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ شنّو سے مشورہ کروں جو مستقبل میں میری مشیرِ خاص ہوتی۔ وہی مجھے بتاتی

کہ مجھے فلاں کام کرنا ہے اور فلاں نہیں کرنا۔ جیسا کہ ساری بیویاں مشیر بن کر اپنی مرضی چلاتی ہیں۔ جب میں نے شنو کو بتایا تو وہ پہلے تو اس بات پر خفا ہوگئی کہ میں نے اسے اتنی دیر سے کیوں بتایا۔ ”جلیل ابھی ہماری شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور تو مجھ سے باتیں چھپانے لگا ہے۔“

”ابھی ہی چھپا سکتا ہوں۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”بعد میں تو تم حلق سے نکلوا لوگی۔“

اس بچ بیانی پر شنو مزید خفا ہوئی تھی لیکن بہرحال میں نے اسے منا لیا۔ کیونکہ جاسوس بڑے میاں موسم کی خرابی کی وجہ سے چھت پر نہیں تھے اس لیے مجھے منانے میں آسانی ہوئی اور جلد شنو کا غصہ شرم میں بدل گیا اور اس نے مجھے بے حیا کا لقب اور ایک عدد دھکا دے کر واپس اپنی حدود یعنی چھت پر بھیجا اور بولی۔ ”جلیل تو بالکل بے لگام ہو گیا ہے۔“

”سرے سے لگام ہی نہیں ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”جب نکاح کی لگام تمہارے ہاتھ میں آئے تب بے لگامی کا الزام دینا۔“

شنو نے واپس جانے کی دھمکی دی تو مجبوراً مجھے اصل موضوع پر آنا پڑا تھا۔ میں نے اسے سلطانہ خالہ کے بارے میں بتایا جو آمادۂ فساد تھیں اور صرف اماں کی آمد کی منتظر تھیں۔ سلیمہ خالہ اس چکر سے بے خبر تھیں۔ مگر ظاہر ہے اگر اماں کو پتا چل جاتا تو وہ بھی بے خبر نہ رہتیں۔ میں نے بے بسی سے شنو کی طرف دیکھا۔ ”میں استاد ٹی ٹی سے لے کر جانی چڑیا تک سب سے نمٹ سکتا ہوں لیکن ان دو خواتین سے کیسے نمٹوں، یہ سمجھ نہیں آرہا ہے۔“

شنو نے بھی راجا والا مشورہ دیا۔ ”خالہ کو سب اوکے کی رپورٹ دے دو۔“

میں نے سر کو مشرق مغرب میں حرکت دی۔ ”اماں کو پتا نہیں لیکن ان کو پیش رفت کی بھنک پڑ گئی ہے، اگر میں نے غلط بیانی کی تو وہ سلطانہ خالہ کے پاس پہنچ جائیں گی۔“

شنو سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”دیکھ جلیل تو نے سلطانہ خالہ کا جو رویہ بتایا ہے، ایسا لگ رہا ہے وہ بھی اس چکر میں کہیں نہ کہیں شامل ہیں۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ ذاتی دلچسپی لے رہی ہیں۔ ورنہ آج کل کون کسی کے پھڈے میں یوں کھل کر بات کرتا ہے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”خالہ کا انداز سلیمہ خالہ کے لیے خاصا معاندانہ لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ان کے خلاف کوئی کینہ دبائے ہوئے ہوں۔“

اچانک شنو نے پرجوش ہو کر کہا۔ ”ابھی میں نے ڈائجسٹ میں ایک کہانی پڑھی ہے۔ بالکل اسی طرح کی تھی۔ تین سہیلیاں ہوتی ہیں۔ ایک آدمی ان میں سے ایک سہیلی سے محبت کرتا ہے۔ دوسری سہیلی اس سے محبت کرتی ہے...“

”اور اس کی شادی تیسری سہیلی سے ہو جاتی ہے۔“ میں نے کہا تو شنو اچھل پڑی۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

میں نے دانت نکالے۔ ”میں بھی ڈائجسٹ پڑھتا ہوں۔“

”تب تجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں بھی وہی کہانی ہے۔“

”وہی کہانی کیسے ہے؟“

”دیکھ میں بتاتی ہوں۔ تیرے ابا یعنی خالو چھنو یعنی سلیمہ خالہ سے محبت کرتے تھے۔ سلطانہ خالہ ان سے محبت کرتی تھیں اور...“

”اور ابا کی شادی اماں یعنی تیسری سہیلی سے ہوگئی۔“ میں نے پُرتحسین نظروں سے شنو کو دیکھا۔ ”تو نے ثابت کر دیا کہ میری نصف بہتر تو ہی ہوگی۔“

”جیسے تو میرا نصف بدتر ہوگا۔“ شنو نے شرما کر کہا۔

میں نے اپنا خراج تحسین واپس لینے کا سوچا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ شنو نے آخری جملے سے قطع نظر نہایت عقل مندی کی بات کی تھی جو کہ وہ عام طور سے کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اس لیے اسے معاف کیا جا سکتا تھا۔ شنو نے معما کسی قدر حل کر دیا تھا اگرچہ اب فساد کا خطرہ پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ وہی تینوں سہیلیاں نہیں تھیں بلکہ میں، راجا اور فتو بھی آپس میں دوست تھے۔ سلطانہ خالہ کا کردار ولن کا سا تھا اور اب وہ حسرتِ ناتمام کے ہاتھوں آتش فشاں بن کر سب بھسم کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر سوال وہی تھا کہ اگر سلیمہ خالہ ہی مفروضہ چھنو تھیں تو اماں کو یہ بات یاد کیوں نہیں آرہی تھی۔ میں نے شنو سے پوچھا تو اس نے حیرت سے کہا۔ ”جلیل تجھے اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ سلیمہ خالہ صرف تیرے ابا کے لیے چھنو تھیں اور خالہ کو ہرگز اس کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ سلطانہ خالہ شروع سے یہ سب جانتی تھیں اس لیے وہ کسی طرح جان گئیں کہ سلیمہ خالہ کو تیرے ابا چھنو کہتے تھے۔“

میں نے جذباتی ہو کر غیر پارلیمانی حرکت کرنا چاہی مگر شنو نے ایک بار پھر بروقت مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ حیا سے لال پیلی ہو کر بولی۔ ”جلیل یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

”اسے خراج تحسین کہتے ہیں جو میں تمہارے حسن کو اکثر پیش کرتا رہتا ہوں۔ آج یہ تمہارے سر میں بھری عقل کو خراج تحسین ہے۔“

”تمہارے تو خیال میں میرے سر میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”آج سے میں اپنا یہ خیال واپس لیتا ہوں۔ شنو تو نے سارا معما ہی حل کر دیا۔“

”معما حل ہو گیا مگر یہ سوچ اب کیا ہو گا۔ یہ تو تین طرفہ لڑائی ہو گی۔“

”مجھے، راجا اور فتو کو شامل کر تو فساد شش پہلو ہو جائے گا۔“ میں نے مرے لہجے میں کہا۔ ”یہ تینوں امائیں تو سکون سے اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں گی۔ ہمیں تو باہر جانا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کا سامنا بھی کرنا ہو گا۔ کچھ نہ ہونے کے باوجود ہماری دوستی تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔“

یہ سچ۔“ شنو نے خوش ہو کر کہا پھر جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے ایسا نہ بھی ہو۔“

”تم اماں کو نہیں جانتی ہو۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”جتنا تم میرے دوستوں سے خار کھاتی ہو اس سے کہیں زیادہ اماں کھاتی ہیں۔“

”تو دوست بھی تو تم نے راجا، جمی اور فتو جیسے چن کر بنائے ہیں۔“

”دوستی کی طرح محبت پر بھی اختیار نہیں ہے۔ ورنہ میں کترینہ کیف یا سنی لیون سے محبت نہ کرتا۔“ میں نے آفاقی حقیقت بیان کی۔

اس بار شنو غصے سے لال بھبوکا ہو گئی۔ اس نے واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”جلیل تو ان جیسی واہیات عورتوں کے لائق ہے۔“

میں مسکرایا۔ یہ بھی شنو کی محبت تھی جو مجھے ان کے لائق کہہ رہی تھی ورنہ وہ تو مجھے جوتے کی نوک پر بھی نہ رکھیں۔ شنو نے معما تو حل کر دیا تھا مگر اب اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نکالنا تھا کہ اماں بھی مطمئن ہو جائیں اور امن عامہ میں خلل بھی نہ پڑے۔ برسوں پہلے دنیا سے گزر جانے والے ابا جی بھی اولاد کے لیے اتنا بڑا مسئلہ کھڑا کر سکتے ہیں اس کا اندازہ مجھے اب ہوا تھا۔ میں نے راجا سے مدد لینے کا سوچا اور ارادہ ملتوی کر دیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ میں چاہنے کے باوجود راجا سے مدد نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے ایک بار پھر سلطانہ خالہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں کامیاب ہو جاتا تو وہی مسئلے کو سلجھا سکتی تھیں۔ مگر میں بات کیسے کرتا اور وہ بھی اتنی معیوب بات۔ مگر مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ اگلے دن صبح میں راجا کے گھر پہنچا تو خوش قسمتی سے اس کا باپ گھر سے نکل رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر حسبِ معمول طنز کیا۔ ”کیا بات ہے، آج کل بھانجے کو خالہ کی بہت یاد آ رہی ہے۔“

”اماں نے بھیجا ہے۔“ میں نے بہانہ کیا۔ سلطانہ خالہ حسب معمول کپڑے چھانٹ رہی تھیں۔ انہوں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

”جلیل خیریت سے آیا ہے؟“

”نہیں خالہ خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابا نے جو کیا سو کیا مگر اب تم اور اماں اس آگ کو گھروں تک پھیلانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”میں کہاں سے آ گئی بیچ میں۔“ وہ تیز لہجے میں بولیں۔ ”کیا دھرا تو تیرے ابا اور اس حرافہ سلیمہ کا ہے۔“

”خالہ مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں۔“ میں نے کہا۔ ”اول تو یہ کہ سلیمہ خالہ سے تمہارا کیا تنازعہ ہے؟“

انہوں نے بدک کر کہا۔ ”میرا تنازعہ کیوں ہونے لگا اس سے؟“

”تب تم ان کے لیے یوں بات کیوں کرتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ ابا نے مفروضہ چھنو کا نام اپنے طور پر رکھا تھا، تمہیں کیسے پتا چلا اس کا؟“

سلطانہ خالہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ ”بس پتا چل گیا۔ شاید سلیمہ نے بتایا تھا۔“

”تمہاری سلیمہ خالہ سے شروع سے نہیں بنتی تھی۔ تم دونوں بس اماں کی وجہ سے آپس میں دوست تھیں۔ تب خالہ نے یہ راز کی بات تمہیں کیوں بتائی۔“

”تو کیا تیری اماں کو بتاتی۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”خالہ میں نے ایک کہانی پڑھی ہے، اتفاق سے یہ بھی تین سہیلیوں کی ہے، میں تمہیں کہانی سناتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ڈائجسٹ میں چھپنے والی کہانی کا خلاصہ سنا دیا۔ جیسے جیسے میں کہانی سنا رہا تھا خالہ کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا اور آخر میں وہ سانولے سے سفید ہو گیا۔ کہانی سنانے کے بعد میں نے کہا۔ ”خالہ کہانیوں اور حقیقی زندگی

میں خاص فرق نہیں ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اگر اصلی زندگی میں ایسی کہانی ہو تو بہت سی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ اوپر والے نے تم لوگوں کے مقدر میں جو لکھا تھا اس پر صبر کرنا ہی سب سے بہتر ہے۔ اماں نے بھی صبر کیا، گھر والوں نے جہاں رشتہ کیا وہیں شادی کر لی۔ میں گواہ ہوں، انہوں نے اماں کی تیز زبان کے باوجود ان سے دل سے نبھا کیا۔ کبھی تکلیف نہیں دی۔ ہماری خاطر محنت کرتے کرتے دنیا سے گزر گئے۔ سلیمہ خالہ کا میں نہیں جانتا مگر وہ بھی اپنے گھر میں خوش ہیں، اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت آج بھی کر رہی ہیں۔ اللہ نے تمہیں بھی گھر اور شوہر دیا۔ بے شک راجا نا خلف اولاد ہے مگر خالو تو اچھے ہیں۔ صبح سے شام تک محنت کر کے تمہیں خوشحال رکھا ہے۔ تینوں سہیلیوں میں سب سے زیادہ پیسا تمہارے پاس ہے۔ خالہ آگ سے کھیلو گی تو تمہارا اپنا گھر بھی جل جائے گا۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے جلیل۔ میں واقعی آگ سے کھیلنے لگی تھی۔ پر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ”کیسی غلطی، کیا اماں...؟“

سلطانہ خالہ نے سر ہلایا۔ ”آج وہ صبح سویرے میرے پاس آئی تھی۔“

”تب میں سو رہا ہوں گا۔“ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ ”تم نے اماں کو سب کہہ دیا؟“

سلطانہ خالہ کا جھکا ہوا سر کہہ رہا تھا کہ انہوں نے ”سب“ سے بھی زیادہ کہہ دیا تھا۔ انہوں نے برسوں سے دل میں دبی نارسائی کی آگ کو اماں کے دل تک اس ہوشیاری سے منتقل کیا کہ انہیں اصل بات کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ انہوں نے اپنا دامن بچاتے ہوئے سلیمہ خالہ کو قصوروار بنا دیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”خالہ تم نے اچھا نہیں کیا، اب آگے کیا ہوتا ہے اللہ ہی بہتر کرنے والا ہے۔“

”میں نور سے بات کر لیتی ہوں، اس سے کہہ دیتی ہوں کہ میں نے سب غلط کہا ہے۔“

”اماں تب بھی حقیقت تو جاننا چاہیں گی اور تم میں اتنی ہمت ہے کہ سچ کہہ سکو۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا اور باہر نکل آیا۔ میں جس بات سے ڈر رہا تھا وہی ہوئی تھی۔ جب میں صبح سو کر اٹھا تو اماں کا موڈ سنجیدہ اور کچھ رنجیدہ تھا، اس وقت میں سمجھا نہیں تھا لیکن اب سمجھ میں آ گیا۔ میں باہر نکلا تھا کہ

سامنے سے وہی بڑی بی اپنا بڑا سا تھیلا اٹھائے ہانپتی کانپتی چلی آ رہی تھیں، مجھے دیکھ کر کہا۔

”شکر ہے کوئی تو نظر آیا، بیٹا یہ ذرا گھر تک تو لے چل۔“

”چلو اماں۔“ میں نے بادلِ ناخواستہ تھیلا اٹھا لیا اور ان کے گھر تک آیا۔ تھیلا رکھ کر میں نے مشورہ دیا۔ ”اماں انا کو ایک طرف رکھ کر بیٹے سے بات کر لو۔ اگر اس میں ذرا بھی انسانیت ہو گی تو تمہارے پاس واپس آ جائے گا۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ بڑی بی نے سرد آہ بھری۔ ”اب زندگی کا بوجھ اکیلے نہیں اٹھایا جاتا۔“

”یہ بات پہلے سوچ لیتیں تو یوں اکیلے نہ ہوتیں۔ خیر اب بھی وقت ہے، بیٹے اور بہو کو منا لو۔“ میں نے نصیحت کرتے ہوئے کہا اور اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اماں تم اس دن کہہ رہی تھیں کہ میری اماں کو جانتی ہو؟“

”اے بیٹا سب کو جانتی ہوں۔“ وہ بولیں۔

”تب تم سلیمہ خالہ اور سلطانہ خالہ کو بھی جانتی ہو گی۔“

”میں نے کہا نا میرے ہاتھ کی کھیلی بچیاں ہیں، ان کو سلائی کڑھائی سکھائی تھی میں نے۔“

”ان میں سے چھٹو کون کہلاتی تھی؟“

بڑی بی نے جو جواب دیا اسے سن کر میں اچھل ہی پڑا تھا۔ ”سچ کہہ رہی ہو اماں، تمہیں ٹھیک سے یاد ہے نا؟“

بڑی بی نے بھی اماں والا جواب دیا۔ ”ارے یہ آج کل کی بات ہے جو بھول جاؤں۔“

”میرا مطلب ہے پکی بات ہے نا؟“

”ہاں وہ چڑتی تھی جب اسے چھٹو کہتے، اس لیے یہ نام چلا نہیں ورنہ وہی چھٹو کہلاتی تھی۔“ بڑی بی نے کہا اور پھر مزید کئی حوالے دیے۔ میں قائل ہو گیا کہ ان کی یادداشت کام کر رہی تھی۔ میں بڑی بی کا شکریہ ادا کر کے فوری گھر روانہ ہو گیا۔ مگر جب گھر پہنچا تو اماں غائب تھیں اور خلیل نے اطلاع دی۔

”آج کسی کی خیر نہیں ہے۔ اماں بہت بُرے موڈ میں گئی ہیں۔“

میں جو بہت جوش سے واپس آیا تھا، میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ”کتنی دیر ہوئی اماں کو گئے ہوئے؟“

”تمہارے جانے کے آدھے گھنٹے بعد ہی نکلی تھیں۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس بات کو ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا یعنی اب تک جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہو گا۔ میں کوٹھری میں آیا جہاں سارا سامان مع ابا کے کپڑوں کے سب ویسے ہی پھیلا ہوا تھا۔ میں ابا کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ بید کی بنی تھی اور اس پر بید کی چھال سے ہی بُنائی کی گئی تھی۔ بے خیالی میں، میں ابا کے کپڑے ٹٹول رہا تھا کہ ایک جیب میں مجھے کچھ محسوس ہوا اور میں نے نکال کر دیکھا تو یہ چھوٹے سائز کی کلر تصویر تھی۔ چار بائی تین کا سائز تھا اور کسی باغ میں موجود خاتون پھولوں کے درمیان خود گلاب لگ رہی تھیں۔ میں چونکا کیونکہ خاتون میں وہ ساری خصوصیات تھیں جو ابا نے اپنے عشقیہ خطوط میں بیان کی تھیں اور مزید غور پر انکشاف ہوا کہ یہ اماں کی جوانی بلکہ نوجوانی کی تصویر تھی۔ میں نے تصویر پلٹ کر دیکھی تو اس کے پیچھے لکھی تاریخ سے ثابت ہوا کہ یہ شادی کے چند دن بعد کی تصویر تھی۔ تاریخ کے ساتھ تصویر کی پشت پر کچھ اور بھی لکھا ہوا تھا اور اس سے بڑی بی کی بات کی مکمل تصدیق ہو گئی تھی۔ مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ اچانک باہر سے اماں کی آواز آئی۔

''جلیل... ارے او جلیل... کہاں مر گیا ہے؟''

''یہاں ہوں اماں۔'' میں نے کوٹھری سے نکل کر کہا۔ ''اب ایسا کرو کہ ابا کی چیزوں کے نیچے مجھے بھی دفن کر دو۔''

اماں نے سنا ہی نہیں اور برقع اتارتے ہوئے مسرور لہجے میں بولیں۔ ''دماغ درست کر دیا جھوٹی کا، آئندہ منہ نہیں دکھا سکے گی۔''

''اماں، تم نے بالکل غلط کیا ہے۔''

''میں نے ٹھیک کیا ہے۔'' وہ بولیں۔ ''جھوٹے کو اس کے گھر تک ضرور پہنچانا چاہیے۔''

''اماں سلیمہ خالہ بے قصور ہیں۔ ان بے چاری کو نہ تو کچھ پتا ہے اور نہ انہوں نے کچھ کیا ہے اور نہ ہی ابا اُن سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اماں نے اطمینان سے کہا۔ ''اور تجھ سے کس نے کہا کہ میں سلیمہ کے پاس گئی تھی۔''

''پھر کس کی گوشمالی کر کے آ رہی ہو؟''

''سلطانہ کی۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''وہ ہمیشہ کی طرح فساد کرانے ڈالی نکلی۔ اصل میں تو وہ خود تیرے ابا کے چکر میں تھی مگر انہوں نے گھاس نہیں ڈالی۔ وہ تو بس مجھ سے محبت کرتے تھے۔'' کہتے ہوئے اماں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''تیرے ابا کے کپڑے درست کر رہی تھی تو اس میں سے...''

''یہ تصویر نکل آئی۔'' میں نے تصویر اماں کے سامنے کی جس کے پیچھے ابا کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ''پیاری چھنو جسے میں چھنو کہہ نہیں سکتا۔''

''اماں، چھنو اصل میں تم تھیں اور تمہیں یاد نہیں رہا۔''

''ہاں کیونکہ یہ شروع دنوں کی بات تھی۔ میں نے بہت برا منایا۔ اگر کوئی... کہتا تو میں لڑ پڑتی تھی۔ اس لیے لوگوں نے کہنا چھوڑ دیا۔ پتا نہیں تیرے ابا کو کیسے پتا چل گیا مگر میں نے ان کو بھی کہنے نہیں دیا تھا۔ پھر میں سچ مچ بھول گئی۔''

''مجھے پرانے محلے کی ایک بڑی بی نے بتایا۔'' میں نے اماں کو بتایا تو انہوں نے سر ہلایا۔

''ہاں، میں شاہدہ خالہ کو جانتی ہوں۔''

''میں بھاگا ہوا گھر آیا مگر تم نہیں تھیں تو میں سمجھا کہ سلیمہ خالہ کی طرف جا چکی ہو۔'' میں نے سکون کی بہت گہری بلکہ کئی سانسیں لیں۔ ''یہ سلطانہ خالہ بہت...''

''جلیل۔'' اماں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''یہ میرا اور میری سہیلی کا معاملہ ہے، خبردار جو اس کے بارے میں ایک لفظ کہا۔ میں نے جو کہنا تھا خود کہہ آئی ہوں۔ آئندہ اس بارے میں سوچنا بھی مت۔ انسان غلطی کا پُتلا ہے اور دل پر کس کا زور چلتا ہے۔ میں نے اسے معاف کیا اور اپنا دل بھی صاف کر لیا۔''

''اماں تم بہت اچھی اور عظیم ہو۔'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

''چل چل اگر ابھی ایک کام کہہ دیا تو میں ہی سب سے بری بن جاؤں گی۔''

''اللہ نہ کرے جو میں تمہیں برا سمجھوں۔'' میں نے اماں سے لپٹ کر کہا۔ ''اماں اب میری شادی کر دو۔ اس طرح تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کیونکہ سدھرنا تو نے کبھی نہیں ہے اور نہ ہی میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم ہے۔'' خلاف توقع اماں نے کہا تو میں نے مسرت آمیز چیخ ماری، اس پر خلیل اندر سے دوڑتا ہوا آیا اور صحن میں رکھی پیٹی سے ٹکرا کر منہ کے بل گرا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 12

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہرنا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

کار کبیل دادا چلا رہا تھا۔ زہرہ بیگم اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھی۔ باقی دو مسلح گارڈز عقبی سیٹوں پر چوکس بیٹھے تھے۔ بیگم ولا کے باہر پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر کبیل دادا کے دماغ میں جانے کیا سوجھی کہ اس نے فوراً کار کا اسٹیئرنگ دائیں جانب گھما دیا۔ وہ دوسری طرف ایک نسبتاً تنگ گلی نما راستے میں داخل ہو گئے۔

''یہ کیا حرکت ہے کبیل دادا؟'' زہرہ بانو نے قدرے چونک کر پوچھا۔ لہجہ تیز اور تحکمانہ تھا۔

کبیل دادا نے راستہ کاٹنے کے بعد گاڑی ایک جگہ کسی ویران پلاٹ کے قریب روک دی اور زہرہ بیگم سے مؤدبانہ بولا۔

''بیگم صاحبہ! پہلے اندر کی صورتِ حال کا جائزہ لینا ضروری ہے، مجھے کسی سازش کی بو آ رہی ہے۔''

''تم بیگم ولا میں کسی سے فون پر رابطہ کرنا چاہتے ہو؟''

''جی بیگم صاحبہ۔''

''مگر پولیس کی اندر موجودگی سے ایسی صورت میں...'' زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے دانستہ رکی تو کبیل دادا نے کہا۔

''قریب ہی ایک پی سی او ہے۔ میں وہاں جا کر جہانگیر سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسے میں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی خراب صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں۔ بالائی منزل کے جس کمرے میں وہ رہتا ہے، وہاں ایک الگ لینڈ لائن نمبر کا ٹیلی فون سیٹ رکھا ہے۔''

زہرہ بیگم، کبیل دادا کی بیدار مغزی اور محتاط روی سے متاثر ہو کے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''بہت اچھے! اب جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو، ہمارا اس طرح زیادہ دیر یہاں ٹھہرے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔'' زہرہ بیگم کا ستائشی لہجہ کبیل دادا کو ہمیشہ ایک دیدنی مسرت سے دوچار کر دیتا تھا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے گاڑی ذرا ریورس کی، ایک یوٹرن لیا اور بائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک پبلک کال آفس کے سامنے موجود تھا۔ کبیل دادا نے سوئچ آف کیا اور دروازہ کھول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر پی سی او میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے بیگم ولا کا دوسرا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ کبیل دادا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چوتھی بیل کے بعد پانچویں بیل جانے لگی تو دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ کبیل دادا کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اس نے ہیلو کہا۔

''کون؟'' دوسری جانب سے بھی مختصراً کہا گیا مگر اس شناسا سا آواز کو پہچان کر یک دم کبیل دادا کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

''جہانگیر! میں بول رہا ہوں، کبیل دادا... خیریت تو ہے؟ یہ پولیس کیوں آئی ہے، بیگم ولا میں؟''

اپنے استاد کی آواز پہچان کر دوسری جانب جہانگیر کو جیسے چند ثانیے کے لیے سانپ سونگھ گیا پھر اس کی جوش سے لرزتی آواز ابھری۔

''آ... آ... آپ لوگ کدھر ہو اس وقت استاد؟ خیریت سے ہو نا سب؟ اور بیگم صاحبہ؟''

''جہانگیر۔'' کبیل دادا ہولے سے غرایا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو جلدی۔ پولیس کیوں آئی ہے؟'' استاد کی ڈانٹ کھا کر جہانگیر فرفر بولنے لگا۔ ''استاد! یہ پولیس یہاں کی نہیں ہے، نئے پنڈ سے آئی ہے۔ انسپکٹر اپنا نام جرار خان بتاتا ہے۔ اس کے پاس یہاں کے این سی ایم کا سرچ وارنٹ بھی ہے، وہ بیگم صاحبہ کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ نکے چودھری ممتاز خان نے بیگم صاحبہ کے خلاف رپورٹ کروائی ہے کہ بیگم صاحبہ کے ایک خاص آدمی اور... اور... نہ جانے وہ انسپکٹر کیا بک رہا تھا کہ لئیق شاہ نے چودھری ممتاز کے آدمی وسیم عرف چھیما کو قتل کر ڈالا ہے اور مفرور ہے۔''

''کیا...؟'' یہ سنسنی خیز انکشافات سن کر بے اختیار کبیل دادا چیخ پڑا۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بیگم ولا میں نہیں بلکہ ایک پرائیویٹ کال آفس میں ہے۔ اگرچہ وہ کیبن میں تھا مگر ایک اوپن کیبن تھا جس کے سامنے دکان کا بڑا سا کاؤنٹر اور کرسیاں بچھی تھیں۔ وہاں کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ کبیل دادا کی کھرکھراتی ہوئی بھاری آواز پر وہ سب ہی اس کی جانب عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی اور دل کی سینہ توڑ دھڑکنوں اور تنے ہوئے اعصاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

''تم خود اس وقت بیگم ولا میں کس پوزیشن میں ہو؟ میرا مطلب ہے پولیس اور وہ ذلیل جرار خان تمہیں ایک جگہ محدود کیے ہوئے ہے؟'' جہانگیر اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

''میں اوپر ہی موجود ہوں۔ پولیس اور وہ انسپکٹر نیچے موجود ہے۔ ہمارے دس بارہ ساتھیوں کو ایک کمرے میں کھڑا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اوپر بھی آئے تھے، میں نے ٹیلی

فون کا والیم کم کر دیا تھا۔ کہیں فون کی گھنٹی کی آواز پر پولیس دوبارہ اوپر نہ آ جائے۔ فون تو کسی کا بھی آسکتا ہے۔''

کمیل دادا تیزی کے ساتھ کام کرتے اپنے ذہن کے ساتھ دوسری طرف سے جہانگیر کی مختصر اصراحت بھری گفتگو سنتا رہا اور ساتھ ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل بھی سوچتا رہا۔

''جہانگیرے! یہ تو نے عقل مندی کا کام کیا۔ پولیس کی گاڑی دیکھ کر ہم نے بھی اپنا راستہ فوراً بدل لیا تھا۔''

''اوشاوا... استادا...! یہ تو بڑی عقل مندی کی تم نے۔ اِدھر آنا بھی نہیں۔ پولیس اور خاص کر انسپکٹر جرار کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔'' جہانگیرے کی جوش میں دبی دبی آواز ابھری۔

''سن جہانگیر! میں بیگم صاحبہ کو لے کے کہیں اور جا رہا ہوں... تو ایک کام کر... پولیس کی نظروں سے خود کو بچا کر رکھنا، اور میں اس نمبر پر دوبارہ تجھے کال کروں گا... رب راکھا۔'' کہہ کر کمیل دادا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پیسے دے کر وہ باہر نکلا اور جیپ نما گاڑی میں سوار ہوا۔ اسٹارٹ کی اور فوراً ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان زہرہ بانو گردن موڑے اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ گاڑی چلانے کے دوران میں ہی کمیل دادا نے اسے جہانگیر سے حاصل کردہ ساری تازہ صورتِ حالت گوش گزار کر ڈالی۔ جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے زہرہ بانو کو بھی سکتہ لے ڈوبا اور پھر بے اختیار اس نے کہا۔

''کک... کیا... یہ سچ ہے؟'' کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی اور چہرے پر رکھ دیے۔ زہرہ بیگم کو اس قدر تشویش زدہ اور افسردہ دیکھ کر کمیل دادا کے دل کو ایک گھونسا لگا۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ ایک ذرا ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر گردن موڑ کے مضطرب الحال زہرہ بانو کی طرف دیکھا پھر دل کی گہرائیوں سے بولا۔

''بیگم صاحبہ! حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ... لگتا ہے اس بار دشمن نے بڑی اوچھی چال چلی ہے... ہم بھی اس کا منہ توڑ جواب دیں گے۔''

''میرے خدا...'' زہرہ بانو کے لبوں سے پھر متوحش سے انداز میں برآمد ہوا۔ ''یہ... یہ... سب ہو کیسے سکتا ہے؟ لئیق شاہ تو خود اچانک غائب تھا پھر اس بدمعاش چھیمے کا قتل وہ کیوں اور کیسے کر سکتا ہے؟''

''یہی بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں بیگم صاحبہ! اور مجھے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔'' کمیل دادا پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''وہ کیا؟''

''بیگم صاحبہ! مجھے لگتا ہے لئیق شاہ کو جب کہیں سے بھی انصاف نہیں ملا ہو گا تو وہ مایوس ہو کر خود ہی... اپنے ماں باپ کو زندہ آگ میں جلانے والوں سے انتقام لینے کے لیے کمربستہ ہو گیا ہو گا۔ اس نے اس بات کا بھی پکا کھوج لگا لیا ہو گا کہ یہ کارستانی وسیم عرف چھیمانے ہی نکے چودھری ممتاز خان کے کہنے پر کی ہو گی اور پھر... اس نے...''

''نہیں کمیل دادا۔'' معاً ہی زہرہ بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ وہ اب قدرے سنبھل چکی تھی اور خود کو کافی حد تک ''شاک'' کی کیفیت سے نکال چکی تھی۔ آگے بولی۔

''اگر ایسا ہوتا تو لئیق شاہ... ایک عام مہرے کے بجائے مہرہ کھسکانے والے کو سب سے پہلے انجام تک پہنچاتا اور وہ ممتاز خان ہوتا۔ مگر مجھے یہ کوئی اور سازش لگتی ہے، کوئی گہری اور دہری چال... مم... مجھے تو لئیق شاہ کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی ہے کمیل دادا، گاڑی روکو... اور بیگم ولا چلو واپس۔'' اچانک زہرہ بانو نے حکم صادر کر دیا۔ کمیل دادا کے لیے زہرہ بانو کا یہ حکم غیر متوقع تھا۔ تشویش آمیز حیرت سے بولا۔

''بب... بیگم صاحبہ! یہ... یہ... آپ کیا کہہ رہی...؟''

''کمیل دادا... وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں بس۔'' زہرہ بانو نے خاصے تیز اور درشت لہجے میں کہا۔ آواز کا اٹل پن اور لہجے کی قطعیت نے کمیل دادا کو مزید بولنے سے قاصر رکھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی، اور ایک یوٹرن لیا۔ اب اس کا رخ بیگم ولا کی طرف تھا۔ مگر گاڑی کی رفتار اس نے دانستہ پہلے کی نسبت کم ہی رکھی تھی۔ وہ شاید زہرہ بیگم کو کچھ سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کی دانست میں زہرہ بانو نے ایسا فیصلہ جوش میں آ کر کیا تھا جب مزید کچھ دیر گزر گئی تو ناچار کمیل دادا نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اگر آپ بیگم ولا جانے سے پہلے کسی وکیل کا بندوبست کر لیتیں تو مناسب تھا۔ وہاں جا کر پولیس آپ کو دھر لے گی۔ خدا کے لیے اپنے فیصلے پر ایک بار غور کر لیں۔'' کمیل دادا کے لہجے میں منت کے ساتھ ایک بے بس سی لجاجت بھی اتر آئی تھی مگر زہرہ بانو کے چہرے پر جوش اور ٹھنڈی ہوئی اتھاہ سنجیدگی سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ آخری اور اٹل فیصلہ کیا تھا لہٰذا اس نے کمیل دادا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بیگم ولا تک کا راستہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ صورتِ

حال گمبھیر تھی۔ کبیل دادا کو زہرہ بانو کی تشویش کھائے جارہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ میں خفیف سا لرزہ طاری ہونے لگا تھا پھر جس وقت ان کی گاڑی بیگم ولا کے گیٹ پر پہنچ کر رکی تو باہر موجود دو وردی پوش پولیس والے فوراً آگے بڑھے۔

''کبیل دادا... ہمت سے کام لو... ہو سکتا ہے کہ بعد کے حالات کا مکمل طور پر انحصار تم پر ہو۔''

بڑے ہی عجیب سے لہجے میں اس کے برابر بیٹھی زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر یہ الفاظ خاصے گہرے اور اسرار بھرے انداز میں کہے تھے۔ تب پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایکا ایکی کبیل دادا کو اپنے اندر ایک عجیب سی مضبوطی کا احساس ہونے لگا۔ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے اس کے ہاتھوں کا ارتعاش عنقا ہونے لگا پھر جب وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تو گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دونوں وردی پوش پولیس والوں کے سامنے اپنے پورے گرانڈیل قد کے ساتھ دیوار بن کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''خبردار! جو بیگم صاحبہ کو ہاتھ بھی لگایا ہو، یہ کوئی مفرور مجرم نہیں ہیں اور اِدھر ہی موجود ہیں۔ ہٹو آگے سے۔''

کبیل دادا کے پُراعتماد اور بارعب لہجے کا ان دونوں پولیس والوں پر خاطر خواہ اثر ہوا کیونکہ وہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ان کا رخ اندر ہی کی طرف تھا۔ اپنے ساتھ کبیل دادا کی یہ لپک دیکھ کر زہرہ بانو کے حسین و دلکش چہرے پر فخریہ سی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ کبیل دادا کی سنگت میں اندر داخل ہوگئی۔

☆☆☆

زہرہ بانو ایک خوب صورت پختہ روش پر باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک بڑے کمرے میں پہنچی تو وہاں سب سے پہلے اس کی نگاہ انسپکٹر جرار خان پر پڑی، جو ایک صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ایک ٹیلی فون سیٹ اس کے سامنے رکھی گلاس ٹاپ میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک ٹھنڈے پانی کی بوتل اور کانچ کے دو گلاس بھی رکھے ہوئے تھے، چند مسلح پولیس اہلکار بھی وہاں اٹین شن کھڑے تھے۔ ایک نائب بھی انسپکٹر جرار کے برابر میں بیٹھا تھا جبکہ زہرہ بانو کے آٹھ دس آدمی ایک جانب قطار کی صورت میں کھڑے تھے۔

''یہ کیا تماشا لگا ہوا ہے یہاں؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی زہرہ بیگم نے بہ آواز بلند کہا تو انسپکٹر جرار خان نے ٹیلی فون پر اپنی گفتگو کا سلسلہ فوراً ہی موقوف کر دیا اور زہرہ بانو کو گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رول تھا جو تھوڑی دیر پہلے صوفے پر ہی اس کے دائیں جانب رکھا ہوا تھا۔

زہرہ بانو کو دیکھتے ہی اس کے آدمیوں نے کورس میں اسے سلام بھی کیا تھا۔ انسپکٹر جرار کے کھڑے ہوتے ہی اس کا نائب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رول کیا ہوا فارم نما کاغذ بھی تھا۔ انسپکٹر جرار نے زہرہ بیگم کی طرف بہ دستور گھورتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ قریب کھڑے اپنے نائب کی طرف بڑھایا، اس نے فوراً وہ رول کیا ہوا کاغذ اسے تھما دیا۔ جسے انسپکٹر جرار نے زہرہ بیگم کے سامنے کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''یہ سرچ وارنٹ ہے... اور میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

''کس جرم میں؟'' زہرہ بانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔ ساتھ ہی اس نے وہ سرچ وارنٹ بھی اس کے ہاتھ سے لے کر کھول کے دیکھا۔ یہ ایف سی ایم ملتان کی طرف سے جاری کردہ تھا اور اس کی قانونی حیثیت اس حد تک تھی کہ پولیس بغیر کوئی سبب بتائے بیگم ولا میں چھاپا مار سکتی تھی۔

''تمہارے ایک خاص آدمی لئیق شاہ نے چودھری ممتاز خان کے آدمی وسیم اور چھیما کا قتل کر ڈالا ہے اور خود مفرور ہوگیا ہے۔'' انسپکٹر جرار خان نے اپنے تئیں زہرہ بانو کے سامنے ایک سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بولنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اسے بتاتے ہوئے اندر ہی اندر حظ اٹھا رہا ہے۔ نہیں جانتا تھا کہ یہ حقیقت پہلے ہی سے زہرہ بانو کو معلوم ہو چکی تھی، یہی سبب تھا کہ زہرہ بانو نے بھی پریشان یا تشویش زدہ ہونے کے بجائے بہ یک ترنت کہا۔

''لئیق شاہ ہمارا ملازم اور ہمارے سالونٹ پلانٹ کے مزدوروں کا لیڈر تھا۔ مگر مل کے بند ہونے کے بعد... دوسرے مزدوروں اور ورکرز کی طرح اس سے بھی ہمارا کوئی تعلق یا ناتا نہیں رہا تھا۔''

انسپکٹر جرار توقع لگائے بیٹھا تھا کہ زہرہ بیگم کو.... اول تو یہ انکشاف ہی .... بدحواس اور پریشان کر ڈالے گا مگر اسے یوں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیتا پا کر اسے الجھن سی ہونے لگی، جسے وہ اپنے چہرے سے ظاہر ہونے دیے بغیر ایک اور حربہ استعمال کرتے ہوئے خبیثانہ سی مسکراہٹ سے بولا۔

''مفرور و مطلوب ملزم... لئیق شاہ سے تمہارے کس

قسم کے تعلقات ہیں، یہ پورا پنڈ اچھی طرح جانتا ہے۔"

"انسپکٹر..." زہرہ بانو گرجی۔ "تم کس طرح... بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے لئیق شاہ کو ایک مفرور اور مطلوب ملزم گردانے کی کوشش کر رہے ہو؟ جبکہ نئے پنڈ کے لوگ تو یہ حقیقت بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ... وہ پچھلے کچھ دنوں سے غائب ہے اور شنید ہے کہ اسے کسی خطرناک مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔"

انسپکٹر جرار خان کے یہاں آنے کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ وہ زہرہ بانو کے سامنے اس طرح کے اہم اور سنسنی خیز انکشافات کر کے اسے پریشان اور ہراساں کرنے کی کوشش کرے گا اور دباؤ ڈالے گا مگر زہرہ بانو پوری خود اعتمادی کے ساتھ اسے منہ توڑ جواب دے رہی تھی۔ جرار خان یہ سوچنے پر مجبور ہورہا تھا کہ زہرہ بانو کی گفتگو اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی ہی غمازی نہیں کررہی تھی بلکہ وہ قانون کی بنیادی شقوں سے بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔

انسپکٹر جرار خان درحقیقت چودھری ممتاز خان کی طرف سے ملے ہوئے ایک "ٹاسک" کے تحت ہی یہاں آیا تھا۔

"اور کچھ انسپکٹر؟" زہرہ بانو کی تیز اور بھانپتی نگاہوں نے اکڑے ہوئے انسپکٹر جرار کے چہرے سے اس کے غبارے کی ہوا نکلنے کا اندازہ کرتے ہی سوالیہ انداز میں کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رول کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے کے دوران بولا۔

"میں یہاں آ کر تمہارے خلاف بہت کچھ کرسکتا تھا مگر مجھے وڈے چودھری الف خان کا خیال آجاتا ہے۔ آپ اگر ہم سے تعاون کی بات کریں تو ہمارے لیے اور آپ کے لیے بھی بہت سی آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔"

انسپکٹر جرار خان کو مصالحانہ رویہ اختیار کرتے پا کر زہرہ بانو نے بھی مصلحت اسی میں جانی کے سردست اتنا ہی "کافی" ہے۔ لہٰذا اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بڑے کروفر کے ساتھ براجمان ہوگئی۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کے تعاون کرنے والی بات پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں بھی اس سلسلے میں آپ کے تھانے میں آچکی تھی، حالانکہ وہ ہمارا قانونی حق بھی تھا مگر آپ تو ہم سے دو گھڑی باتیں کرنا تو درکنار ملاقات کا ہی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔" بیٹھتے ہی زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تو انسپکٹر جرار نے منافقانہ لہجے میں کہا۔

"تھانہ جگہ ہی ایسی ہے کہ وہاں ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا لگا ہی رہتا ہے پھر آپ کے کیس کی نوعیت بھی بہت کمزور تھی۔"

"ہمارے کیس کی نوعیت کمزور تھی؟" زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھویں سکیڑ کر مصنوعی حیرت سے کہا اور اس حیرت میں طنز کی کاٹ بھی شامل تھی۔ "مجھ پر کچھ مسلح لوگوں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا اور اس وقت کے تھانہ انچارج انسپکٹر جہانزیب نے وسیم عرف چھیما کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار بھی کرلیا تھا بس عدالت میں چالان پیش کرنے کی دیر تھی کہ ایک سازش کے تحت اس فرض شناس انسپکٹر جہانزیب کا نہ صرف فوراً تبادلہ کروادیا گیا بلکہ سارے مجرموں کو بھی رہا کردیا گیا۔ سازش کرنے والے شاید اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس طرح وہ حقیقت کو دبا دیں گے جبکہ انسپکٹر جہانزیب بھی زندہ ہے اور وہ ریکارڈ بھی جسے "داخلِ دفتر" کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

زہرہ بیگم نے انسپکٹر جرار کو ایک اور جھٹکا دیا تھا۔ زہرہ بانو کی کھاگ اور بھانپتی ہوئی نگاہیں اس راتب خور راشی انسپکٹر جرار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کی کیفیات کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی جسے چودھری ممتاز سے اس وقت "ڈکٹیشن" لینے کی اشد ضرورت پڑ رہی تھی۔ وہ ساری باتیں سننے کے بعد صوفے پر بیٹھے بیٹھے کسمسا کر پہلو بدلتے ہوئے بولا تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ حلق سے اس کی آواز پھنسی پھنسی سی برآمد ہورہی تھی۔

"اب تو وہ چھیما بے چارہ خود ہی مقتول بن چکا ہے اور پولیس کو لئیق شاہ کی تلاش ہے۔"

"چھیما مقتول کیسے بنا؟ ہم نہیں جانتے۔" زہرہ نے فوراً کہا۔ "مگر لئیق شاہ کو بغیر ٹھوس ثبوت کے اس کا قاتل گردان کر اس کی تلاش میں شرفا کے گھر چھاپے مارنا جو خود بھی فریادی کی حیثیت رکھتے ہیں، کہاں کا انصاف ہے انسپکٹر جرار خان؟"

"میں یہاں آپ کو گرفتار کرنے کی حیثیت سے آیا تھا" وہ زہرہ بانو کے منہ توڑ جواب سے زچ ہو کے بولا۔ "لیکن اب میرا ارادہ بدل چکا ہے اس لیے کہ بات بڑھنے سے مزید صورتِ حال خراب ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں نے آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی۔"

"مجھ سے کس قسم کا تعاون درکار ہے آپ کو انسپکٹر؟" زہرہ بانو نے اس کی طرف اشتباہ انگیز نگاہوں سے دیکھتے

ہوئے کہا۔

انسپکٹر جرار ہولے سے کھنکھارا پھر بولا۔ ''لئیق شاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''لئیق شاہ کہاں اور کدھر ہے؟ اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔'' زہرہ بانو نے گہری متانت سے کہا۔

''لیکن اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ بھی گیا تو سب سے پہلے اس کے دفاع میں میرا ہی قدم آگے بڑھے گا۔ ٹھوس شواہد کے ساتھ۔ اور پھر ممکن ہے ماضی سے متعلق کئی اور بھی ایسے حقائق آشکارا ہو جائیں جنہیں عارضی طور پر دبا دیا گیا ہے۔'' زہرہ بانو نے دانستہ آخر میں تہدیدی لہجہ اختیار کیا۔ جانتی تھی وہ کہ یہ راتب خور... ایک ایک بات کی رپورٹ ممتاز خان کو دے گا۔ ایک طرح سے زہرہ بانو نے بلیک میل کرنے کے انداز میں ان دونوں پر دباؤ ڈالنے اور اپنے مذموم ارادوں سے روکنے کے لیے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو خاطر خواہ ثابت ہونے کا اشارہ بھی دے رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انسپکٹر جرار یہاں جس ارادے کے لیے آیا تھا، وہ اسے بدلنا پڑ رہا تھا۔

''آپ کی کہی ہوئی باتیں ابھی قبل از وقت ہیں۔ ہمیں پہلے لئیق شاہ کو گرفتار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد خود ہی حقائق سامنے آجائیں گے۔ آپ سے اتنا ضرور کہوں گا زہرہ صاحبہ! آپ بھی ایک معزز شہری ہونے کا ثبوت دیں اور لئیق شاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں پولیس سے تعاون کریں، بہ صورت دیگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوا کہ لئیق شاہ نے اس دوران آپ سے کسی قسم کا رابطہ کیا تو پھر میں وڈے چودھری (الف خان) کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چلتا بنا۔

زہرہ بانو کی مدلل گفتگو' ان کے آئندہ کے اٹل ارادے... اور بروقت ذہانت نے بالآخر پولیس کو یہاں سے بے نیل مرام ہی جانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ جس پر کبیل دادا کو ایک خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی اور وہ توصیفی لہجے میں زہرہ بانو سے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

''شاواجی بیگم صاحبہ! آپ کا بیگم ولا چھوڑنے کے بجائے گودے چاڑ کر واپس یہاں لوٹنے کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ ورنہ شاید صورتِ حال اور ہوتی۔'' اس کی بات سن کر زہرہ بانو نے ایک دلکش مسکراہٹ سے کہا۔

''کبیل دادا! یہی سب کچھ ممتاز خان چاہتا ہے کہ وہ ہمیں ڈرا کر قانون کی نظروں میں بھگوڑا بنا دے۔ تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکے، مگر ہم نے اس کا یہ حربہ ناکام بنا دیا۔ اگر ہم ڈر کے بیگم ولا کا رخ کرنے کے بجائے کہیں اور کا رخ کرتے تو پھر چوہے بلی کا یہ کھیل ہمارے دشمنوں کے حق میں کامیاب ثابت ہوتا۔''

''بالکل صحیح فرمایا آپ نے بیگم صاحبہ۔'' کبیل دادا متاثر کن لہجے میں بولا۔

کبیل دادا نے کسی کو چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے کا کہا پھر زہرہ بانو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ اسے اب تشویش میں ڈوبا نظر آرہا تھا اور وہ اس کی وجہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کبیل دادا اپنے تئیں ... کوشش کرتا کہ وہ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی طرف سے تفکیر آمیز پریشانی سے دور رکھے مگر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ احساس برچھی کی طرح چبھتا تھا کہ زہرہ بانو پوری طرح سے لئیق شاہ کے متعلق دلی و دماغی طور پر گرفت میں آچکی تھی، ایک بار اس نے زہرہ بانو کی لئیق شاہ سے توجہ ہٹانے کی بھی کوشش چاہی تھی تو اسے زہرہ بانو کے نہایت سخت رویّے اور طیش کا سامنا کرنا پڑا تھا پھر اس میں دوبارہ یہ جرأت نہ ہو سکی تھی کہ وہ اس کی توجہ لئیق شاہ سے ہٹانے کی سعی کرتا لیکن رقابت کا زہر پھر بھی کم نہیں ہوا، گزرتے وقت کے ساتھ اس کا اثر سوا ہی ہوتا رہا۔ ایک بار پھر اس نے زہرہ بانو کے سامنے لئیق شاہ کے کردار سے متعلق ایک قیاس آرائی پر مبنی مفروضہ گھڑتے ہوئے کہا۔

''خدا نہ کرے کہ لئیق شاہ سے ایسا کوئی سنگین جرم ہوا ہو لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو ہم بھلا لئیق شاہ کے لیے کیا کر سکیں گے؟'' وہ یہ بات کہہ کر درحقیقت زہرہ بانو کے لئیق شاہ کے بارے میں آئندہ کے خیالات اور عزائم جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لئیق شاہ سے متعلق وہ رقابت کے چور جذبے میں آکر ایسی بات زہرہ بانو سے کہہ تو جاتا تھا مگر بعد میں اندر سے ڈرتا بھی تھا کہ کہیں پھر اس کی کوئی بات اسے بری نہ لگ جائے اور وہی ہوا بھی۔ کبیل دادا کی بات پر زہرہ بانو نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر اسی لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا کبیل دادا؟ کیا ہم لئیق شاہ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے؟ اپنے ایک ایسے وفادار اور جاں نثار ساتھی کو جس نے کئی خطرناک حالات اور مواقع میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری جان بچائی۔ حتیٰ کہ ہم سے وفاداری کے پاداش میں دشمنوں نے اس کے گھر کو بھی آگ لگا دی اور اس کے بوڑھے ماں باپ کو بھی زندہ جلا ڈالا اور تم کہتے ہو کہ ایسے محسن کو ہم ان

ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں؟ ہرگز نہیں، یہ خود غرضی اور بے حسی کی انتہا ہوگی۔ مجھے حیرت ہے کبیل دادا! تم جیسا آدمی بھی ایسی بات کرسکتا ہے؟ یا پھر تمہارے انتخاب میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔''

زہرہ بانو کی اس آخری بات نے کبیل دادا کو سر سے پاؤں تک جھنجوڑ ڈالا۔ ''نن... نہیں بیگم صاحبہ! آ... آپ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔'' پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بول گیا ہے۔ بات بناتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''مم... میرا مطلب تھا... میرے دل میں بھی اپنے ساتھیوں کے لیے بہت قدر و قیمت ہے لیکن شاید لئیق شاہ ہمارے درمیان کبھی نہیں رہا اس لیے میرے ذہن میں یہ باتیں ابھریں جو بہرحال غلط ہیں۔''

''وہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے... کبیل دادا۔'' زہرہ بانو نے یکایک عجیب اور گہرے لہجے میں کہا۔ اس کی سوچتی ہوئی کشادہ آنکھیں... کبیل دادا کو کسی غیر مرئی نقطے پر اٹکی محسوس ہونے لگیں اور زہرہ بانو کے اس جملے نے اسے بھی آج بہت کچھ باور کرا دیا تھا کہ ''خبردار! دوبارہ بیگم صاحبہ اور لئیق شاہ کے درمیان خطِ تنسیخ کھینچنے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ خود دور کردیا جائے گا۔''

یہ سوچ کر کبیل دادا اندر سے لرز سا گیا۔ بیگم صاحبہ سے دور ہونا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اسے اس کے محور سے دور کردیا گیا ہو۔ بھٹکنے کے لیے... ہمیشہ کے لیے... دور خلاؤں میں... پھر وہ یک دم جیسے ایک ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوگیا اور خفت مٹانے کی غرض سے بولا۔

''میں معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ، مجھے واقعی لئیق شاہ سے متعلق ایسا کچھ کہنا نہیں چاہیے تھا، شاید اس کی وجہ وہی ہو جو میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ درحقیقت میں خود بھی کافی دنوں سے یہ محسوس کررہا تھا کہ آپ کی پریشانیوں اور ذہنی کرب کا زیادہ سبب لئیق شاہ ہی ہے مگر...''

''ہرگز نہیں... کبیل دادا۔'' زہرہ بانو نے مسکت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''لئیق شاہ کبھی بھی ہمارے لیے پریشانیوں یا ذہنی کرب کا باعث نہیں بنا ہے، نہ ہی بن سکتا ہے۔ اس غریب اور سادہ انسان نے ہماری خاطر اپنی زندگی تج ڈالی ہے۔ ہم سے وفاداری کے جرم کی وہ سزا بھگت رہا ہے اور اس وقت نہ جانے کہاں دربدر ہورہا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے یکایک زہرہ بانو کی آواز بھرا گئی۔ قدرتی کاجل لیے کشادہ اور گہری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے، حسین بیضوی چہرے کی گوری شاداب رنگت میں نمناکی کی پرچھائیں ڈیرے ڈالنے لگی تھیں۔ پُرتعیش نشست گاہ کی فضا یک دم سوگوار ہوگئی۔ تھوڑی دیر پہلے باقی ساتھی جا چکے تھے، جہانگیر بھی تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہاں اب صرف زہرہ بانو اور کبیل دادا موجود تھے۔ ادھیڑ عمر ملازمہ چائے کی ٹرے رکھ کے اور دونوں کے لیے ایک ایک کپ چائے کا بنا کر جا چکی تھی۔ بیگم صاحبہ کو غم زدہ دیکھ کر کبیل دادا اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ ان کا دکھ اسے اپنا دکھ محسوس ہونے لگا۔ ایک خفتہ جذبے تلے اسے احساسِ ندامت نے ادھیڑ ڈالا... کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی؟ جبکہ معلوم بھی تھا بیگم صاحبہ کو لئیق شاہ سے متعلق ایسی گفتگو... اندر سے جھیروں جھیر کر ڈالتی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے تمہاری کبیل دادا... کہ تم اپنے جذبۂ رقابت تلے اپنے محبوب کے دکھ اور غم کا بھی پاس نہ رکھو۔ لئیق شاہ کو دیکھو... اپنے عمل سے... اپنی حیات درماندہ سے ثابت کررہا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ دلی وابستگی اور انسیت کیا شے ہوتی ہے؟ جو بغیر کسی اظہارِ محبت کے اپنا آپ منواتی ہے اور ایک تم ہو کہ اپنے محبوب کو (بیگم صاحبہ) دکھی کر ڈالتے ہو۔ تم بیگم صاحبہ کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو۔ شاید کوسوں دور... کیوں؟ سوچو ذرا کبیل دادا... سوچو...''

کبیل دادا ساری رات سوچتا ہی رہا تھا اور صبح تک رت جگے نے اسے جوہرِ محبت سے آشنا کردیا تھا کہ محبت میں خود غرضی کا جذبہ سرائیت کرجائے تو اسے گھن لگ جاتا ہے جبکہ ایثار... خاموش وفا اس جذبے کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

رات کے پچھلے پہر وہ یہ سب سوچ کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اب خود کو پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ رقیبانہ خیالات بھی... شیطان ہی کی کارستانی ہوتے ہیں... وہ اب ان سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرے گا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی تقدیر آخر کب تک اسے محبت اور رقابت کے بیچ لٹکائے رکھے گی؟''

صبح ہوئی تو رات بھر جاگتے اور سوچتے رہنے کے باعث اس کی آنکھیں نیند سے سرخ ہورہی تھیں۔ ناشتا کرنے کو جی نہیں چاہا۔ دو کپ چائے اس نے ضرور پی تھی۔ طبیعت میں کسلمندی طاری تھی۔ جب بیگم صاحبہ سے اس کا آمنا سامنا ہوا تو وہ ان کا... پژمردہ سا چہرہ دیکھ کر چونک پڑا۔ صاف لگتا تھا کہ رات بھر انہوں نے بھی رت جگے میں

بتاتی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں، چال ڈھال سے تھکاوٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر کبیل دادا کے دل کو پھر ایک گھونسا لگا۔ احساسِ جرم بڑھنے لگا تو دل و دماغ اس کی تلافی پر اکسانے لگا۔

''ہم کس قدر بے بس ہو گئے ہیں کبیل دادا! کہ لئیق شاہ کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے۔''

گروہ میں زہرہ بانو کے بعد کبیل دادا کی مستند حیثیت کی پاسداری میں جب ایک بار پھر دونوں رُوبرو ہوئے تو زہرہ بانو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تھکے تھکے اور مایوس سے لہجے میں کہا۔ کبیل دادا کو ان کی متورم سی آنکھوں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ نے رات بھر کس کی یادوں میں کروٹیں بدل کر گزاری تھی۔ بہرحال... وہ اپنا دردِ نہاں بھلا کر زہرہ بانو سے بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! ہم بے بس نہیں ہیں۔ میں تو نئے پنڈ سے لوٹنے سے پہلے ہی آپ کو اس بات کی تسلی دے چکا ہوں کہ آپ کے بہ خیر و عافیت یہاں بیگم ولا لوٹ آنے کے بعد میں اور طیفہ (طفیل) اگلے دن ہی دوبارہ لئیق شاہ کی تلاش میں نئے پنڈ روانہ ہو جائیں گے۔''

اس کی بات سن کر زہرہ بیگم نے قدرے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کبیل دادا پُرعزم ہو کے بولا۔ ''اور بیگم صاحبہ! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی جان کی بازی لگا کر لئیق شاہ کا نہ صرف سراغ لگا کر رہوں گا۔ بلکہ اسے اس خبیث انسپکٹر جرار کے ہتھے بھی نہیں چڑھنے دوں گا۔''

''کک... کیا واقعی... ایسا ہو جائے گا کبیل دادا؟'' زہرہ بانو نے جیسے بچوں جیسی بہلاوے والی مسرت آمیز حیرت سے کہا تو کبیل دادا نے سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ایسا بالکل ہوگا بیگم صاحبہ! آپ بس میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کیجیے گا کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ لئیق شاہ کا سراغ کون بتا سکتا ہے؟'' اس کے مضبوط مگر ذومعنی لہجے نے زہرہ بانو کو لئیق شاہ سے متعلق تلاش کی غیر یقینی حد تک سوچ کو یقین میں بدل دیا تھا۔ کبیل دادا نے بھی پہلی بار زہرہ بانو کے ملیح رنگت چہرے سے خوشی پھوٹتی محسوس کی تھی۔

''بیگم صاحبہ! اب آپ کا بیگم ولا میں موجود رہنا ضروری ہے۔ آپ یہاں رہتے ہوئے صرف ایک کام تیار رکھیے گا کہ کسی طرح انسپکٹر جہانزیب سے رابطہ کر کے پرانے کیس کی ریکارڈ کاپی حاصل کر لیں ساتھ ہی ایک وکیل کا بھی بندوبست کر کے رکھیں تا کہ جس وقت میں لئیق شاہ کو لے کر یہاں پہنچوں تو پولیس ہمیں تنگ نہ کر سکے۔'' وہ بولا۔

زہرہ بانو اپنے مقربِ خاص ساتھی کی بات اور اس کا لائحہ عمل سمجھ رہی تھی۔ پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ بھی لئیق شاہ کی تلاش میں اس کے شانہ بشانہ ہو گی لیکن اب حالات اور ہو گئے تھے، معاملہ صرف لئیق شاہ کو تلاش کرنے کا ہی نہیں تھا بلکہ اسے جھوٹے الزامات سے بھی بچانا تھا یہی سبب تھا کہ زہرہ بانو کی کبیل دادا کا لائحہ عمل جان کر کچھ امید ہو چلی تھی کہ وہ لئیق شاہ کی تلاش میں درست خطوط پر کام کر رہا ہے۔ پھر کبیل دادا نہیں رکا۔

نصف گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنے دو ساتھیوں اور جہانگیر کے ساتھ نئے پنڈ روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کار خود کبیل دادا ڈرائیو کر رہا تھا۔ جہانگیر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ طیفہ عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ تینوں کے پاس بھرے ہوئے پستول اور فاضل راؤنڈ... تھے۔ دن نکلا ہوا تھا اور موسم خوش گوار تھا۔ نئے پنڈ پہنچ کر کبیل دادا نے سیدھا اپنے آبائی گھر کا رخ کیا۔ کار روک کے سب نیچے اترے، کبیل دادا نے تالا کھولا۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ان تینوں نے یونہی تھوڑا وقت وہاں گزارا اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچے اور دھول اڑاتے ناہموار راستوں پر کار دوڑاتے ہوئے یہ تینوں... پنڈ کے ایسے علاقے کی طرف نکل آئے جدھر لئیق شاہ کا گھر تھا اور اس کی برادری سے تعلق رکھنے والے یہاں رہتے تھے۔ ایک جگہ کار روک کر کبیل دادا نے... کسی سے برادری کے معتبر آدمی کا اتا پتا معلوم کیا اور اس کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

لئیق شاہ کی تلاش کے سلسلے میں کبیل دادا سمجھتا تھا کہ اسے یہاں سے کچھ نہ کچھ تو ایسے حقائق کا پتا ضرور چلے گا، جو اس کی تلاش میں بنیادی حیثیت ضرور رکھتے ہوں گے، اس کے بعد اس نے دیگر چند لوگوں سے بھی اپنے تئیں معلومات لینی تھی۔

برادری کی معتبر شخصیت سے مراد ان کا سردار نہ تھا بلکہ ایسی مقامی شخصیت تھی جس سے کسی معاملے پر سب سے پہلے ملاقات کی جاتی تھی، وہ ایک ساٹھ، پینسٹھ سالہ آدمی تھا جو چودھری اللہ وسایا کے نام سے مشہور تھا۔ لئیق شاہ جس برادری سے تعلق رکھتا تھا، وہ کوئی زیادہ بڑا زمیندار طبقہ نہیں تھا۔ لہٰذا جب وہ چودھری اللہ وسایا سے ملنے اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا وہ ڈیرے پر تھا اور وہیں اس کی بیٹھک تھی،

کسی نوعمر لڑکے نے انہیں بتایا اور تینوں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ بڑی سی گارے مٹی کی چہار دیواری تھی، چوبی دروازوں کا پھاٹک تھا جس کا ایک پٹ ٹوٹ کر بھر بھری مٹی والی زمین میں دھنس چکا تھا اور اس کی مرمت کرانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اندر کہیں کہیں اناج کے ڈھیر... چبوتروں کی صورت نظر آرہے تھے، ذرا ذرا فاصلوں پر کچھ چارپائیاں اور سرکنڈوں کے مونڈھے پڑے نظر آرہے تھے، کار ایک طرف روک کر یہ تینوں نیچے اتر آئے، ایک چھپر تلے انہیں تین چار بھینسیں جگالی کرتی نظر آئی تھیں۔ اس کے قریب ہی جدھر سرکنڈوں کا بڑا سا سائبان تنا ہوا تھا، اس کے تلے انہیں ایک کوٹھری نما بیٹھک کا دروازہ دکھائی دیا۔ باہر ہی .... موٹے نقشین پایوں والی نسبتاً بہتر حالت میں ایک چارپائی اور اس کے سامنے دو اونچی پشت گاہ والے مونڈھوں پر چار پانچ افراد بیٹھے دکھائی دیے۔ دو پرانی موٹر سائیکلیں بھی ایک طرف سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی تھیں۔ مذکورہ افراد کے درمیان حقہ بھی رکھا تھا۔ وہ باتوں اور گڑگڑی جمانے میں مصروف تھے۔

ان تینوں کو دیکھ کر روایتی انداز میں ان لوگوں نے پہلے تو ان کا پُرتپاک استقبال کیا، پھر لسی پانی پوچھنے کے بعد آنے کا مطلب دریافت کیا تو کبیل دادا نے چودھری اللہ وسایا کا پوچھا۔

''جی میں ہوں، اللہ وسایا۔ خیریت تو ہے؟'' ایک سفید لنگی اور کرتہ پہنے ساٹھ پینسٹھ سالہ آدمی نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ایک دبلا اور خاکستری رنگ والا آدمی تھا۔ شکل وصورت سے بھلا مانس ہی معلوم ہوتا تھا۔

جب کبیل دادا نے پہلے اپنے باپ منشی فضل دین کے بیٹے کی حیثیت سے تعارف کروایا تو اللہ وسایا کے جھریوں پڑے چہرے پر اُلجھن کی لکیریں بھی رل مل گئیں، جبکہ اس کے ساتھ موجود باقی آدمیوں کے بشروں پر تلخی کے آثار نمودار ہوگئے۔ چودھری الف خان کے ملازمین کی حیثیت سے ان کا تعارف بڑا تھا اور ممتاز خان اس کا بیٹا ہے، یہ حوالہ اس تلخی کا باعث تھا باوجود اس کے ان لوگوں نے ان تینوں کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا مگر ان میں ایک نسبتاً جوان اور گھری مونچھوں والا شخص کچھ زیادہ ہی ناگوار نظروں سے ان کی طرف گھور کے دیکھ رہا تھا۔ کبیل دادا نے بھی ایک تیز نظر اس کے اینٹھے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی، اسے اس کی شبیہ میں بوڑھے اللہ وسایا کے چہرے کی کچھ مماثلت نظر آئی تھی، جس سے اس نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ اس کا بیٹا ہی ہوسکتا تھا۔

''جی بولیں؟ ہم آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟'' بالآخر اللہ وسایا نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز البتہ طوعاً وکرہاً ہی محسوس ہوا تھا۔ کبیل دادا نے بھاری اور سنجیدہ آواز میں بوڑھے سے کہا۔

''بزرگو! پہلے تو ہم آپ کو یہ بات بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا چودھری ممتاز خان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اس حویلی سے...''

''او باؤ! یہ کہانی ہم بہت سن چکے جی... کسی اور نوں سناؤ جا کے ھن... اسی نئیں آندے ایسی گلاں وچ...'' اس مذکورہ غصیلے نوجوان نے کبیل دادا کی بات پر اپنا ایک ہاتھ جھٹک کر اس سے کہا تو کبیل دادا نے اس کی طرف گھورتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''کہانیاں تو اور بھی بہت سی بنی ہیں جو یقیناً آپ سب نے بھی سن رکھی ہوں گی۔''

''کیسی کہانیاں؟'' اس غصیلے مزاج نوجوان کے برابر میں بیٹھے دوسرے آدمی نے کبیل دادا کو گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو کبیل دادا بھی اس بار اسی لہجے میں بولا۔

''یہی کہ لئیق شاہ کو اپنی برادری کے جرگے میں انصاف دلانے کے لیے تم لوگوں نے ہی اسے اکسایا تھا اور قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے سے منع کرنے کا مشورہ دیا تھا پھر اسے نہ تم لوگ انصاف دلا سکے الٹا بے چارہ وہ خود قانون کی نظروں میں اب مجرم بن چکا ہے۔'' یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جس نے ان دونوں کے منہ پر تالے لگا دیے اور وہ بغلیں جھانکنے لگے، تب ہی چودھری اللہ وسایا کبیل دادا سے اپنی خفت مٹانے کی غرض سے نرم لہجے میں گویا ہوا۔

''ذرا کھل کر گل بات کرو... آخر معاملہ کیا ہے؟ اب پولیس بجائے مجرموں کو پکڑنے کے لئیق شاہ کو کیوں تلاش کر رہی ہے؟''

اس کی بات پر کبیل دادا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بہت غور اور بھانپتی ہوئی نظروں سے اللہ وسایا کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ کیا اب تک انہیں یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ پولیس اب لئیق شاہ کو وسیم المعروف چھیما کے قتل کے الزام میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی، گویا پولیس یہاں تفتیش وتلاشی کے سلسلے میں آئی تک نہیں تھی، کیوں؟

''بزرگو! لگتا ہے تم لوگوں کو اس حقیقت کا ابھی تک نہیں پتا چلا ہے کہ پولیس لئیق شاہ کو کیوں ڈھونڈتی پھر رہی

ہے؟''

کبیل دادا نے بھی دانستہ اسرار بھرا لہجہ اختیار کیا اور باری باری ان سب کے چہروں کی طرف بھی دیکھا تھا کہ ممکن ہو انہیں معلوم ہو اور دانستہ تجاہل عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کر رہے ہوں اور وہی ہوا۔ کبیل دادا کی گھاگ نظروں نے فوراً ان سب کے چہروں کے تاثرات تاڑ لیے کہ وہ یہ بات دانستہ اپنے تک ہی محدود کیے ہوئے تھے۔

''پتا ہے جی... ہمیں پتا ہے... وہ سب پتا ہے۔'' اس بار اللہ وسایا کے ایک ہم سن بوڑھے نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پولیس کا کام یہی ہے اصل مجرموں کے بجائے... غریب بے گناہوں کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اس میں بھی تم لوگوں کی ہی کوئی سازش ہے۔''

''ہماری نہیں کہو چاچا جی! صرف چودھری ممتاز کی سازش۔'' کبیل دادا نے اس دوسرے عمر رسیدہ آدمی کی تصحیح کرنی چاہی تو وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔''

''ایک ہی بات نہیں ہے......'' کبیل دادا نے بھی آگے سے بغیر ٹھہرے جواب دیا۔

''لئیق شاہ، زہرہ بی بی کا ایک وفادار ملازم تھا، جب لئیق شاہ کے گھر کو آگ لگوائی گئی تھی تو زہرہ بی بی ازراہِ ہمدردی خود بھی یہاں آئی تھیں، اس کے باوجود تم نہیں سمجھ رہے کہ... ہمارا اور زہرہ بی بی کا تکے چودھری ممتاز خان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں بہن بھائیوں کے بیچ سگے سوتیلے والا معاملہ ہے۔ اس لیے ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی نہ یہ بن سکتی ہے۔''

''ہمیں چودھری الف خان کے خاندانی معاملات اور جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی دلچسپی ہے مگر بعض مفادات میں یہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ اونچی حویلی والوں کا عام وتیرہ ہے۔'' ایک تیسرے جوان نے اپنی علیت بگھارنے کی کوشش چاہی تھی تو... کبیل دادا نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کی اس فضول کی ہٹ دھرمی کے باعث یہ معاملہ الجھ کر سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ تم خود تو یہاں مزے اور آرام سے بیٹھے ہو جبکہ تمہاری اپنی برادری کا آدمی (لئیق شاہ) جو بے چارہ مظلوم ہونے کے باعث نہ جانے کدھر خطروں کی گود میں پڑا ہے؟ تم لوگوں نے اب تک اس کے لیے کیا کیا ہے؟ ایک غلط مشورہ دے کر اب اسے تنہا چھوڑ کے یہاں خود مزے سے چوپال سجائے بیٹھے ہو، تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ جب دوسرا اس کی مدد کے لیے آگے بڑھ رہا ہے تو تم لوگ اس پر کیڑے نکال رہے ہو۔''

کبیل دادا کو جوش آ گیا۔ وہ پھٹ پڑا تھا۔ طیبہ اور جہانگیر... بہ غور یہ سب سن رہے تھے۔

''اے منہ سنبھال کے بات کرو... ورنہ...'' اس مچھیل سے نوجوان کو طیش آ گیا۔ باقی سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''بس... بس... کاکے! اپنا یہ جوش سنبھال کے رکھ۔'' کبیل دادا نے بیٹھے بیٹھے اس سے کہا۔ ''تو چودھری اللہ وسایا نے اس نوجوان کو ڈپٹ دیا۔

''اوئے پتر اکرم! بیٹھ جا آرام سے۔ میں بات کر رہا ہوں نا... یہ جوان بالکل صحیح کہہ رہا ہے... اگر کسی کو ہماری باتیں پسند نہیں ہیں تو میرے ڈیرے اور بیٹھک سے اٹھ کر چلا جائے... یا پھر خاموش یہاں بیٹھا رہے۔''

چودھری اللہ وسایا کو بالآخر یہ کہنا پڑا تھا اور کوئی تو نہیں اٹھا مگر اکرم نامی وہ مچھیل نوجوان، جو بلاشبہ اللہ وسایا کا بیٹا ہی تھا اور اس کا ہم عمر نوجوان دونوں وہاں سے غصے سے اٹھ کر چلے گئے۔

''میں ان دونوں کی طرف سے معافی مانگتا ہوں تم سے۔'' ان دونوں کے وہاں سے جاتے ہی بوڑھے اللہ وسایا نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر شرمندگی سے کہا تو کبیل دادا نے فوراً دوستانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

''او... نہیں... نہیں چودھری جی، غلط فہمیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں لیکن یہ اچھا ہوتا ہے کہ کچھ باتیں سمجھ کر اور کچھ تلخ اور سچے حقائق کو تسلیم کر کے انسان معاملہ فہمی کی راہ نکالے۔ ہم بھی اس لیے ہی آئے ہیں۔ تمہاری برادری سے تعلق رکھنے والے ایک مظلوم آدمی (لئیق شاہ) کی مدد کرنے... اور اس سلسلے میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

کبیل دادا کی بات پر اللہ وسایا نے کھلے دل سے اس بات کا اظہار کر دیا کہ وہ ان کی ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہے۔ تب کبیل دادا نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے اس سے کہنا شروع کیا۔

''ہم لئیق شاہ کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔ کچھ روز پہلے زہرہ بی بی کے ساتھ ہم یہاں آئے بھی تھے، تب ہی ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ اچانک کچھ دنوں سے غائب ہے۔ انہی باتوں کی وجہ سے تمہاری برادری کے کسی آدمی نے ہم سے کوئی خاص تعاون نہیں کیا نہ ہی لئیق شاہ کے سلسلے میں کچھ بتایا، نہ

... اپنی برادری کے جرگے سے انصاف نہ ملنے یا اسے تنہا چھوڑ دینے کے بعد لئیق شاہ اپنے دل میں کیا عزائم رکھتا تھا تاکہ ہم کچھ اندازہ قائم کرسکتے، میں پہلے آپ سے ایک سوال پوچھوں گا کہ کیا آپ لوگوں نے اب تک لئیق شاہ کی تلاش کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھایا؟ اگر نہیں تو کیوں؟''

کمبیل دادا کی بات پر ایک بار پھر وہ سب اپنی اپنی بغلیں جھانکنے لگے مگر اللہ وسایا جو اَب تک کی باتوں اور حقائق کو کھلے دل سے سمجھ اور تسلیم کر رہا تھا خفت بھرے لہجے میں بولا۔

''نہیں، یہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم نے لئیق شاہ کی تلاش کے بارے میں کچھ کیا اور نہ ہی اسے انصاف دلانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات کیے، بس چپ چپا کے بیٹھ گئے۔ ہمیں خود اپنے اس عمل پر شرمندگی ہے۔'' ان کی شرمندگی اور بے حسی پر ماتم کرنے کا کمبیل دادا کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنے مشن کے لائحہ عمل کے مطابق چودھری اللہ وسایا سے کہا۔

''دیکھو چودھری صاحب! دشمن ایک کے بعد ایک ہمارے خلاف چالیں چل رہے ہیں، ہم ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اس کے لیے آپ سب کو بھی سرگرم ہونا پڑے گا۔ آپ اپنی پنچایت اور برادری کے وڈے سائیں لوگوں کو اکٹھا کریں، متعلقہ تھانے کا گھیراؤ کریں۔ انسپکٹر جرار خان جو درحقیقت چودھری ممتاز خان کا راتب خور اور ایک راشی افسر ہے، اس کے خلاف نعرے لگائیں۔ پرانی تاریخوں میں لئیق شاہ کی گمشدگی کے سلسلے میں چودھری ممتاز خان کے خلاف اغوا کی ایف آئی آر کٹوائیں، اپنے احتجاج کا دائرہ شہر اور کمشنر ہاؤس تک وسیع کریں۔ تب ہی تم کو انصاف ملے گا مگر اس کا اصل مقصد یہی ہوگا کہ دشمنوں کو کم از کم اس طرح دیدہ دلیری سے چیرہ دستیاں کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور جب ہم لئیق شاہ کو ڈھونڈ نکالیں گے تو اس کے لیے پہلے سے کوئی مشکلات نہیں کھڑی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک دن لئیق شاہ کو ضرور ڈھونڈ لیں گے، اسی مقصد کے لیے ہی ہم نکلے ہیں۔''

کمبیل دادا کی بات پر چودھری اللہ وسایا نے کھلے دل اور جوش و جذبے کے ساتھ اس کی تائید کی، بولا۔

''آپ اب بالکل فکر نہ کریں۔ میں آج سے ہی برادری کے لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں تیار کروں گا۔'' اس کی بات پر اس کے ہم عمر بوڑھے نے اس سے کہا۔

''اللہ وسایا! ان لوگوں کو یہ حقیقت تو بتا دو کہ ہماری برادری کے کچھ لوگ چودھری ممتاز خان سے دشمنی مول لینے کا خطرہ نہیں چاہتے ہیں اور وہ دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے پھر رہے ہیں جب ہی تو لوگ اپنا اپنا منہ اس ڈر سے چھپائے بیٹھے ہیں۔'' اس نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا اور کمبیل دادا اس نئے انکشاف پر چونکے بنا نہ رہ سکا، بولا۔

''اگر اس طرح کا ان لوگوں نے وتیرہ اپنا لیا تو پھر کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ تم لوگوں کو یہ بات انہیں سمجھانا ہوگی پورے جوش و جذبے کے ساتھ۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک کمبیل دادا کے ذہن میں ایک خیال جھماکے سے کلک ہوا۔ اس نے اللہ وسایا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ جو ابھی دونوجوان غصے سے اٹھ کر گئے ہیں، یہ کون تھے؟''

''وہ جی ایک تو میرا بیٹا اکرم تھا اور دوسرا کاشف عرف کاشی تھا۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے مرحوم بھائی محمد علی کا بیٹا۔ اور میرا ہونے والا داماد بھی۔ وٹے سٹے کی شادی ہے۔ کاشی کی بہن یعنی میری بھتیجی میرے پتر اکرم کی منگ (منگیتر) ہے۔ ابھی چند روز میں ان کا دھیا ہونے والا ہے۔ ہم اسی سلسلے میں یہاں چوپال ڈالے بیٹھے تھے۔''

''ہوں۔'' اس کی بات سن کر کمبیل دادا نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری خارج کی پھر گومگو سے لہجے میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔

''اس کا مطلب ہے ان دونوں کا تعلق بھی برادری میں اس گروہ سے ہے جو چودھری ممتاز سے ڈرتا ہے اور اس کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا ہے۔''

''ان کی تم فکر نہ کرو جی، میں ان دونوں منڈوں کو سمجھا دوں گا۔'' اللہ وسایا نے جلدی سے کہا مگر کمبیل دادا آگے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

بہرحال... اس نے اللہ وسایا اور وہاں موجود دیگر لوگوں سے کچھ سوالات کیے اور اللہ وسایا کے ساتھ برادری کے دیگر لوگوں سے بھی ملا، ان کی قیاس آرائیاں سن کر اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرتا رہا پھر اس دوران اسے معلوم ہوا کہ لئیق شاہ کا ایک پرانا بچپن کا دوست بختیار علی بھی تھا۔ اس سے ملنا بھی ضروری خیال کرتے ہوئے وہ تینوں اس کے گھر تک جا پہنچے۔ خاصا بھرا پُرا گھر تھا۔ سب مل جل کے رہتے تھے۔ بختیار علی کو باہر بلایا گیا۔ خاندان کے دیگر بڑے بھی باہر آئے تھے، اللہ وسایا ساتھ تھا۔ اس لیے وہ کمبیل دادا وغیرہ سے بھی ادب تمیز سے پیش آ رہے تھے۔ اللہ وسایا نے کمبیل دادا کو بتا دیا تھا کہ یہ خاندان اس گروہ سے تعلق رکھتا

تھا جو چودھری ممتاز خان سے ڈرتا نہیں تھا۔ بختیار علی، لئیق شاہ اور کبیل دادا کا ہم عمر ہی تھا نیز کبیل دادا کی بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے انداز و اطوار سے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے دوست لئیق شاہ کے سلسلے میں انہیں بہت کچھ بتانے کے لیے بے چین بھی نظر آتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ بختیار علی، کبیل دادا کو اندر ایک بیٹھک میں لے آیا۔ بیٹھک کیا تھی، اندرونی کوٹھری نما کمروں سے ملحقہ یہ بھی ایک کمرا تھا جس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ طیفہ اور جہانگیر کو کبیل دادا نے باہر کار میں ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کی تھی جبکہ چودھری اللہ وسایا واپس اپنے ڈیرے کی طرف لوٹ چکا تھا۔

گودڑی بچھی ایک چارپائی اور دو پرانے سے مونڈھے، اس کمرے کا کل فرنیچر تھا۔ دیواروں پر اسلامی طغرے آویزاں تھے۔ سادہ سی بیٹھک تھی۔ کبیل دادا نے اپنے بیٹھنے کے لیے مونڈھا سنبھال لیا۔ بختیار علی نے بھی اس کے برابر کا مونڈھا سنبھال لیا۔

''پہلے یہ بتاؤ جی کیا پیو گے؟'' بختیار علی نے خوش دلی سے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کمرے کا جو دوسرا دروازہ اندر کھلے صحن میں وا ہوتا تھا۔ وہاں کچھ عورتوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ساتھ ہی لسی بلونے کی مخصوص گھرر، گھرر کی آواز بھی ان میں شامل تھی۔

کبیل دادا نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ کھانے پینے سے معذرت کرلی پھر بولا۔

''دوست! اس وقت کسی شے دی لوڑ نہیں۔ بس ایک ضروری کام ہے۔ وہ پورا ہو جائے تو فکر سے آزادی ملے، ورنہ ایسے میں کھانا پینا بھی کب اچھا لگتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کبیل دادا نے اسے ساری بات صراحت کے ساتھ بتا دی۔ جسے سنتے ہی بختیار علی کا چہرہ پہلے تو خاصا افسردہ نظر آنے لگا پھر جواباً بولنے سے چند ثانیے پہلے اس کے چہرے پر جوش کی سی سرخی طاری ہوگئی۔

''اپنے یار لئیق شاہ سے تو میں خود بھی شرمندہ ہوں، وہ تو میرا بچپن کا دوست ہے اور میں نے اسے انصاف دلانے کے لیے بہت کوشش کی تھی، میں خود اس بات کے خلاف تھا کہ اسے جرگے سے فیصلہ لینے کے بجائے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے کیونکہ جرگے میں تو صرف وہی فیصلہ کامیاب جاتا ہے جو آپس کی برادری میں کسی تنازعے کی صورت ہو۔ غیر برادری میں بھلا جرگے کے فیصلے کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی؟ مگر ہمارے معتبر اس بات پر بضد تھے کہ دونوں برادری کے جرگہ کمیٹی کے افراد شامل ہوں، وغیرہ... مگر ایسا نہ ہوسکا۔ لئیق شاہ بے چارہ کیا کرتا؟ برادری کے بڑوں کے فیصلے کے آگے اس نے بھی مجبوراً اپنا سر جھکا لیا جب اپنوں سے بھی اسے انصاف نہ ملا تو اس وقت تک برادری دو حصوں میں بٹ چکی تھی بلکہ دو حصوں میں کیا بٹ گئی تھی، زیادہ تر لوگ ایک آدمی کی خاطر وڈے چودھری (الف خان اور ممتاز خان وغیرہ) سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی، میں بات صاف کہوں گا، باؤ کبیل! ہماری برادری ایک غریب طبقے پر مشتمل ہے اور بیشتر لوگ وڈے چودھریوں کی نوکریاں کرتے ہیں۔ کھیت مزدوری کے بڑے بڑے ٹھیکے ان کو ملتے ہیں۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو کر بالآخر لئیق شاہ نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش چاہی تو یہی لوگ اور ان کی عورتیں جھولیاں پھیلا کر اس کے ارادوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں کہ اس جنگ میں ان کے چولہے سرد پڑ جائیں گے اور یہ کہ یہ لوگ وڈے چودھریوں کی لڑائی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ میرا یار لئیق شاہ... بزدل یا کم ہمت نہیں تھا باؤ کبیل۔ وہ تو شیر جیسا دل رکھتا تھا مگر یار بڑا دل کا نرم بھی تھا اور خدا ترس بھی... تب پھر پتا ہے باؤ کبیل! میرے یار نے کیا فیصلہ کیا؟''

بختیار علی اتنا بتا کر اسرار بھرے انداز میں رکا۔ اب اس کی آواز دھیمی ہونے لگی تھی، کبیل دادا بہ غور بھویں سکیڑے اس کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ بختیار علی نے اس بار بہت نیچی آواز میں اسے بتایا۔

''میرے یار لئیق شاہ نے جو فیصلہ کیا تھا، اس نے کسی کو خبر تک نہیں لگنے دی تھی، اور اس کے اس آخری فیصلے سے صرف میں ہی آگاہ تھا۔''

''اس نے بالآخر کیا فیصلہ کیا تھا؟'' کبیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر بے چینی سے پوچھا۔

''اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وڈے چودھریوں سے اکیلے جنگ لڑے گا اور اپنے بوڑھے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے گا۔'' بختیار علی نے بتایا تو کبیل دادا چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ''میں اپنے یار کو اس کے اٹل ارادوں سے روک نہیں سکتا تھا مگر میں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' وہ آگے بتانے لگا۔ ''وہ کہتا تھا... یہ میرے اکیلے کی جنگ ہو گی وڈے چودھریوں کے ساتھ جو میں یہاں رہتے ہوئے نہیں لڑ سکتا۔ اس کے لیے مجھے یہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنا ہوگا۔ اپنا الگ ٹھکانا بنانا ہوگا۔ میں نے پھر اس کا ساتھ

دینے کی ہامی بھری تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ میں نے اسے بہت تلاش کیا اور اس کی تلاش میں جہاں جا سکتا تھا گیا بھی۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' اس کے چہرے اور لہجے سے اداسی مترشح ہونے لگی۔ کبیل دادا بڑے غور سے بختیار علی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا اپنا یہ خیال کچھ کچھ درست ثابت ہو رہا تھا کہ لئیق شاہ کے پُراسرار اور اچانک غیاب میں خود اس کا بھی ہاتھ ہے اور کوئی بعید نہیں کہ چھیما کا قتل بھی اس کے ذاتی انتقام کی ایک کڑی ہو جبکہ کبیل دادا اپنے اس خیال کا زہرہ بانو سے اظہار بھی کر چکا تھا لیکن زہرہ بانو نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ لئیق شاہ کے ''غیاب'' کو اغوا سمجھے ہوئے تھی۔

''اور باؤ کبیل! ایک حقیقت اور بھی بتاتا چلوں۔'' بختیار علی نے کچھ دیر کے توقف سے کہا پھر جانے کیا سوچ کر بولا۔ ''پتا نہیں یہ حقیقت تمہیں بتانی بھی چاہیے یا نہیں... مگر بہت کم لوگ ہی یہ حقیقت جانتے ہیں، ان میں، میں بھی شامل ہوں بلکہ یہ حقیقت خود لئیق شاہ نے ہی مجھے بتائی تھی۔''

''کون سی حقیقت؟ کیسی حقیقت؟ مجھے بتاؤ۔'' کبیل دادا نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا مگر بختیار علی شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ جسے بھانپ کر کبیل دادا نے اسے اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''دیکھو بختیار علی! تم ایک سمجھ دار انسان ہو اور لئیق شاہ کے گہرے دوست بھی... تم یقیناً اب تک اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ لگا چکے ہو گے کہ ہم بھی لئیق شاہ کے دوست اور اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں مگر یہاں کے لوگوں کو ہماری طرف سے کچھ غلط فہمیاں ہیں۔''

''آپ چھوٹی بی بی زہرہ بانو کے آدمی تو نہیں ہو؟'' بختیار علی نے اچانک پوچھا تو کبیل دادا نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی، اس پر بختیار علی نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔ زہرہ بانو کے بارے میں بھی وہ اکثر مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ میں اس کی بہت سی اندر کی باتوں کا رازداں بھی ہوں اور بہت کچھ جانتا ہوں۔''

''تم لئیق شاہ سے متعلق کسی حقیقت کا ذکر کر رہے تھے؟'' کبیل دادا نے اسے یاد دلایا تو وہ ایک گہری ہمکاری بھر کے بولا۔

''باؤ کبیل! میرا یار لئیق شاہ شروع سے ہی اکیلا آدمی تھا۔ بہت اکیلا اور تنہا۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ ذرا کھل کر بتاؤ۔'' کبیل دادا نے الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک جھٹکے دار انکشاف کیا۔

''لئیق شاہ کے اندر ایک ازلی دکھ بھی پل رہا تھا۔ اسے ایک .... کی تلاش تھی۔''

''کیسا دکھ؟ کیسی تلاش؟''

''اپنے ماں باپ کی۔''

''کیا مطلب؟ وہ تو بدقسمتی سے آگ میں...''

''وہ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔'' بختیار علی نے اس کی بات کاٹی تو کبیل دادا چونک پڑا۔

''مگر وہ انہیں اپنے ماں باپ کی طرح ہی سمجھتا تھا۔ شاید اس وقت وہ گیارہ، بارہ سال کا ہی تھا جب انہیں ملا تھا... پھر وہ انہی کا ہی ہو کے رہ گیا مگر پھر جیسے جیسے وہ جوان ہوتا گیا، اس کے اندر کی یہ کسک بھی بڑھتی جارہی تھی کہ اس کے ماں باپ اب کہاں تھے؟ شاید اس کی تڑپ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اپنے ماں باپ کا چہرہ یاد تھا۔ ان کی محبت، ان کی شفقت اسے نہیں بھولی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد بھی پھر انہیں اور بچے کی بھی خواہش تھی جو کئی برس گزر جانے کے باوجود پوری نہ ہو سکی وہ مزاروں پر منتیں مرادیں مانگنے بھی جایا کرتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی اللہ والے بزرگ نے انہیں نوید تو دی تھی کہ ان کے ہاں ایک اور بیٹا بھی ہوگا۔ اور یہ مراد کب بر آنی تھی، یہ معلوم نہ تھا۔ پھر انہی دنوں ایک حادثے میں وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا وہ بڑے لرزہ خیز حالات تھے جو صرف لئیق شاہ ہی جانتا ہے۔ تاہم وہ اپنے ماں باپ کو بھولا نہیں تھا، ہاں! میں نے لئیق شاہ کو اکثر بڑے فخر سے یہ کہتے ضرور سنا تھا کہ اس کا باپ... ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کی ڈیوٹی سرحد کی ایک چوکی پر ہوتی تھی، خود ان کا گاؤں بھی سرحدی علاقے میں تھا۔''

''ہوں... ٹھیک ہے۔'' کبیل دادا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ظاہر ہے اسے لئیق شاہ کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم بولا۔

''دیکھو بختیار علی! اب تو تمہیں ہماری نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم اپنا کوئی خیال ظاہر کر سکتے ہو کہ لئیق شاہ جب تمہارے سامنے وڈے چودھریوں سے تنہا جنگ لڑنے کے لیے اپنے عزائم کا اظہار کر چکا تھا اور پھر اچانک غائب بھی ہو گیا تھا تو وہ... کہاں اور کس کے پاس جا سکتا ہے؟ ضرور اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ تو ہوگا؟ کسی

سے مدد لینے کا... تم آخر اس کے بچپن کے دوست تھے، کچھ نہ کچھ تو اندازہ تم نے بھی لگایا ہی ہوگا اب تک؟''

کبیل دادا کی بات پر بختیار علی کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا پھر بولا۔''باؤ کبیل! اب آپ سے کیا چھپانا، میں خود پچھلے کئی دنوں سے خاموشی سے اس کی تلاش میں مصروف ہوں۔ دو تین جگہ جا بھی چکا ہوں۔ جہاں جہاں مجھے شبہ ہوا تھا اس کی موجودگی کا... مگر ناکامی ہوئی۔ اب ایک جگہ اور جانا تھا... مگر سوچتا ہی رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جگہ بہت دور ہے لیکن امید بھی ہے کہ میرے یار کا کچھ نہ کچھ سراغ مل سکتا ہے۔''

''ہمارے پاس گاڑی ہے۔ چاہو تو ابھی نکل چلتے ہیں۔'' کبیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً کہا۔''ویسے وہ جگہ کون سی ہے؟ اور کہاں ہے؟''

بختیار علی جواباً بولا۔''یہاں سے پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بستی نما قصبہ آتا ہے، وہاں سے قطب پور جانے والا ایک کچا راستہ نکلتا ہے۔ قطب پور تو بہت دور ہے مگر اس راستے پر مزید پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر کھرروڑ کے نام سے ایک نیم صحرائی علاقہ آتا ہے۔ وہاں لئیق شاہ کا ایک پرانا جاننے والا رہتا تھا، یا رہتی تھی۔''

''کیا مطلب؟ رہتا تھا؟ یا رہتی تھی؟'' کبیل دادا نے قدرے الجھ کر درمیان میں پوچھا تو وہ ہولے سے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ہاں جی! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ وہ شخصیت تھا اور تھی کے درمیان والی ہی ہے جی...''

''تمہارا مطلب ہے ہیجڑا...؟''

''ہاں جی۔''

''بات سمجھ میں نہیں آئی بختیار علی! لئیق شاہ جیسے آدمی کا بھلا کوئی اس قسم کا یار بھی ہو سکتا ہے؟'' کبیل دادا نے کڑوا سا منہ بنا کے کہا تو وہ اس بار گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ایسی بات نہ کریں جی، آپ نے ابھی لئیق شاہ کے ماضی کی داستان نہیں سنی ہے جو بہت دردناک اور لرزہ خیز ہے۔ بجلی نام کا تو خواجہ سرا ہے... مگر میرا یار اُسے مردوں کا مرد کہتا ہے۔''

''ابھی چل سکتے ہو ہمارے ساتھ وہاں؟''

''میں تیار ہوں جی، چلو۔''

''چلو پھر... زیادہ دیر مناسب نہیں، اندھیرا پڑنے سے پہلے ہمیں لوٹنا بھی ہوگا۔''

''بس جی، آپ باہر گاڑی میں بیٹھو، میں ابھی باہر آتا ہوں۔'' بختیار علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کبیل دادا باہر آ گیا۔ باہر کار میں طیفہ اور جہانگیر اس کے منتظر تھے، کبیل دادا نے انہیں ساری بات بتا دی۔

بیگم ولا سے روانہ ہوتے وقت زہرہ بانو نے کبیل دادا کو یہ ہدایت بھی کر رکھی تھی جس قدر ممکن ہو سکے، لئیق شاہ کی تلاش سے متعلق مہم سے اسے بھی آگاہ کیا جاتا رہے۔ لہٰذا کبیل دادا نے طیفے کو ساری بات سمجھا کے نئے پنڈ سے شہر (ملتان) روانہ ہونے کی ہدایت بھی کر دی۔ تھوڑی دیر میں جب بختیار علی گھر سے نکلا اور یہ لوگ کار میں روانہ ہو گئے تو طیفے کو لاری اڈے پر اتار دیا گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ مذکورہ قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار اب کبیل دادا کے بجائے... جہانگیر چلا رہا تھا۔ کبیل دادا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اور بختیار علی عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ باتوں کے دوران کبیل دادا نے اس سے تازہ صورتِ حالات کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا تھا، کبیل کی طرح بختیار علی کا بھی یہی خیال تھا کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لئیق شاہ نے سب سے پہلے چھیما کا ہی شکار کیا ہوگا کیونکہ اس کے گھر کو آگ اس نے ہی ممتاز خان کے ایما پر لگائی تھی، اور مزید یہ کہ وہ اس کا خاص آدمی بھی تھا۔ اس سے بختیار علی کے اس خیال کو بھی تقویت ملی تھی کہ یہ ''فریضہ'' انجام دینے کے بعد لئیق شاہ پولیس وغیرہ سے بچنے کے لیے بجلی کے پاس پناہ لیے ہوئے ہوگا اور کچھ عرصے بعد وہ... ممتاز خان پر بھی ہاتھ ڈالنے کے لیے کمربستہ ہو سکتا تھا۔

گھنٹے بھر کی نان اسٹاپ اور تیز رفتار ڈرائیونگ سے یہ لوگ بجلی والے قصبے جا پہنچے۔ بجلی کا تعلق کسی اور شہر سے تھا۔ وہ بہاولپور سے یہاں آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شادیوں اور تقریبات میں وہ ڈانس کرتا اور طبلہ بجایا کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں ان سے ملا اور ہر بات پر تالی پیٹ پیٹ کر اس نے کم از کم کبیل دادا کا دماغ ضرور پگھلا کر رکھ دیا۔ بہ الفاظ دیگر دماغ کی دہی بنا ڈالی۔ ابتدا میں کبیل دادا کو یہاں آنا بے سود ہی معلوم ہوا کیونکہ لئیق شاہ کا یہاں بھی کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا تاہم ایک خاص بات بجلی کے توسط سے انہیں ضرور معلوم ہوئی تھی جو خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اس نے بتایا تھا۔

''لئیق شاہ تو اپنا بچہ ہے۔ ایک وقت اس نے ہمارے ساتھ گزارا ہے۔ وہ یہاں آیا تھا... دنیا سے... اپنے لوگوں سے وہ بے چارہ غریب بڑا مایوس نظر آتا تھا۔ میرے گلے لگ کے روتا رہا۔ یہی کہتا تھا... بجلی آپا! میں اپنے

دشمنوں کو اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو اکیلا اور ایک غریب مزدور آدمی۔۔۔ وڈے چودھریوں سے کیسے مقابلہ کرے گا؟ تو وہ بولا تھا کہ مجھے اب اپنی جان کی پروا نہیں۔''

''کیا وہ تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی مدد لینے آیا تھا؟'' کبیل دادا نے بجلی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''مدد کیسی جی۔۔۔؟ وہ اس سلسلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بڑا جی دار آدمی تھا وہ۔۔۔ میرے پاس تو وہ ایک ہی مقصد کے لیے آتا تھا۔'' بجلی نے حسبِ عادت ایک عدد تالی بجا کے کہا تو کبیل دادا الجھ سا گیا، بولا۔

''وہ پھر تمہارے پاس کس قسم کی مدد کے لیے آتا تھا؟''

''اپنے ماں پی (ماں باپ) کی تلاش .... اس نے میرے سپرد یہ کام کر رکھا تھا۔ خود بھی کوشش کرتا رہتا تھا مگر میں تو اس کے ماضی سے واقف ہوں نا، چلے پاؤں کی بلی ہوں میں۔۔۔ گھر گھر جاتی ہوں۔۔۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہوں۔''

''اپنے انتقام کے سلسلے میں اس نے تم سے کوئی مدد نہیں لی؟ پھر وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اور اب ہمیں وہ کہاں مل سکتا ہے؟'' اس بار بختیار علی نے بجلی سے سوال کیا۔ وہ بولا۔

''چھیما کے قتل سے کچھ روز پہلے ہی وہ میرے پاس آیا تھا یہی سب کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا، بدمعاش چاہیے تو مجھے بتائے۔۔۔ مگر وہ نہ مانا لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔۔۔ وہ اب گیا کدھر ہے؟ چھیما کو ہلاک کرنے سے زیادہ وہ چودھری ممتاز خان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا چھیما کے ہتھے۔۔۔ یا چھیما اس کے ہتھے کیسے چڑھ گیا؟''

''تم سے آخری ملاقات کے بعد اس نے تمہیں بتایا تو ہوگا کہ وہ اب کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟'' کبیل دادا نے بے چینی سے پوچھا۔

''بتایا تو تھا۔۔۔ مجھے۔''

''پھر۔۔۔؟''

''یہی کہ۔۔۔ وہ نئے پنڈ میں چودھری ممتاز خان سے انتقام لے گا مگر پہلے کچھ دن غائب ہو کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرے گا کہ وہ۔۔۔ بددل ہو کے نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکا ہے۔''

''تت۔۔۔ تمہارا مطلب ہے کہ لئیق شاہ کہیں نہیں گیا؟ اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ نئے پنڈ میں ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے؟'' کبیل دادا کی رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جواباً بجلی نے پورے یقین کے ساتھ اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ کبیل کچھ سوچنے کے انداز میں بولا۔

''ایک بات اور سمجھ میں نہیں آئی بجلی۔۔۔ چھیما کیسے ہلاک ہوا؟''

''چٹاخ۔'' کی زوردار آواز سے بجلی نے بتالی پیٹی اور خالص زنانہ انداز میں بولا۔ ''اے ہے بوا! تم تو ایسے مجھ سے ہر بات یقینی طور پر پوچھے جا رہے ہو جیسے میں کوئی نجومی ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ کبیل دادا پہلے تو کچھ گڑبڑا گیا پھر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

''دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ لئیق شاہ غائب ہونے سے پہلے تمہارے پاس آیا تھا اور اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا۔ اس کی آخری ملاقات تم سے ہوئی تھی۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے مگر اس کے یہاں آنے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔'' بجلی بولا۔

''وہ کیا؟'' کبیل دادا نے اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ چھیما کا آبائی گاؤں ہے۔''

''او۔۔۔ اچھا۔''

''تو پھر اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے چھیما پر ہی ہاتھ ڈالنے آیا تھا اور اب اس نے دوبارہ نئے پنڈ کا رخ کیا ہوگا۔''

''یقیناً۔''

''تمہارا شکریہ بجلی۔ اب ہم چلیں گے۔'' کبیل دادا نے رخصت ہونے کی غرض سے کہا اور جیب سے چند بڑے نوٹ نکال لیے اور بجلی کی طرف بڑھائے تو وہ تڑخ سے بولا۔

''جی کرتا ہے ایک تالی تیرے گال پر بھی بجا دوں۔ لئیق شاہ میرا بچہ ہے۔ میری انگلی پکڑ کے چلا ہے۔ کوئی اپنے بچے کے ٹکے گھرے کرتا ہے کیا؟''

کبیل دادا کو شرمندگی کا احساس ہوا، ایسے ہی وقت بختیار علی نے اسے ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ پھر رخصت ہونے کی غرض سے بجلی سے بولا۔

''ہم جانتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے۔۔۔ چل ناراض نہ ہو، تیری بڑی مہربانی، اب چلتے ہیں۔''

واپس لوٹتے وقت انہیں شام کے سرمئی اندھیاروں نے آلیا۔ ''یار! یہ بجلی تو اتنی عمر کا نہیں لگتا تھا پھر کیسے کہہ رہا تھا

کہ اس نے لئیق شاہ کو انگلی پکڑ کے چلایا ہے؟ کیا لئیق شاہ ان کے قبیلے سے تو تعلق نہیں رکھتا؟'' کافی دیر سے کبیل دادا کے دل و دماغ میں یہ کھچڑی پک رہی تھی، ایک بار پھر رقابت کا جذبہ شربن کے اسے اکسانے لگا کہ جب بیگم صاحبہ کو یہ پتا چلے گا کہ لئیق شاہ کے بچپن یا لڑکپن کا ایک حصہ خواجہ سراؤں میں گزرا ہے تو وہ لئیق شاہ کے بارے میں کیا سوچے گی؟

''او... نہیں باؤ کبیل! بگلی ہم سے بھی دگنی عمر کا ہے۔ جسم کا دبلا پتلا اور عمر کا چور ہے۔ اس لیے ایسا نظر آتا ہے۔'' بختیار نے کہا۔ کبیل اس سے مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

وہ نئے پنڈ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ کار جہانگیر ہی چلا رہا تھا۔ بختیار عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کبیل دادا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تازہ ترین شواہد یہی بتا رہے تھے کہ لئیق شاہ نئے پنڈ میں ہی کہیں موجود ہے۔ شاید ممتاز خان کی گھات میں... مگر کہاں؟ اور کس جگہ؟ یہ ڈھونڈنا باقی تھا۔ اس بار لئیق شاہ کی تلاش کسی مفروضے پر نہیں تھی۔ مگر نئے پنڈ میں بھی اس کے ٹھوس شواہد نہیں تھے، امکان اغلب تھا کہ وہ وہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن کبیل دادا کی سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی تھی کہ اگر جیسا واقعی لئیق شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا تو یقیناً متعلقہ تھانے کی پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے بھی مارے ہوں گے پھر لئیق شاہ کا نئے پنڈ میں چھپے رہنے کا کیا جواز بن سکتا تھا؟ ایک اور خیال بھی اس کے ذہن میں لمحے بھر کو آیا تھا۔ کیا خبر... لئیق شاہ سرے سے کہیں روپوش ہی نہ ہو؟ ممکن ہے وہ چودھری ممتاز خان یا اس کے کارندوں کی قید میں ہو؟ اس وقت سب کچھ ممکن تھا۔

اچانک شام کے جھکے جھکے سرمئی اندھیاروں میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ پھر دوسرا اور تیسرا... پہلے دھماکے میں کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے جہانگیر کی چیخ ابھری تھی۔ اس کا ہاتھ بہکا تو گولی چلنے کے دوسرے دھماکے میں کار کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ کبیل دادا اور بختیار علی یک دم نیچے جھک گئے۔ تیسری گولی کار کی باڈی میں لگی تھی۔ کبیل دادا کا دل یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ کار ڈولنے لگی تھی اور کھیتوں میں اتر کر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی کسی جھنڈ دار درخت سے ٹکرائی۔ کبیل دادا نے جہانگیر کا جائزہ لیا۔ وہ سیٹ پر آڑھا ترچھا لڑھک کر بے سدھ ہو گیا تھا۔ اس کی گردن سے خون کی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ گولی اس کی گردن کو چھید گئی تھی شاید... وہ کراہ رہا تھا۔ کبیل نے بختیار علی کو جہانگیر کی خبر لینے کی ہدایت کی اور خود اپنا پستول سنبھالا اور تیزی سے دروازہ کھول کر کھیتوں میں رینگ گیا۔

اس وقت ان پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی... دونوں روشنی میں نہا گئے۔ بختیار علی سے زیادہ کبیل دادا نے بروقت اور بلاخیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے پستول سے پہلے تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر تلے اوپر فائر جھونک دیے اور اپنے پستول کی شعلے اگلتی نال کا رخ تھوڑا اوپر کیا تو ایک زوردار چھناکے سے اسے نامعلوم حملہ آوروں کی گاڑی کی ونڈ اسکرین کا شیشہ دھماکے سے چھنا سنائی دیا۔ اس میں ایک انسانی کریہہ انگیز چیخ بھی شامل تھی۔ کبیل دادا تیزی سے کھیت کی ایک نسبتاً اونچی منڈیر کی آڑ لیتا ہوا رینگ گیا۔ نامعلوم مگر متوقع حملہ آوروں کی گاڑی کی ''آنکھیں'' پھوڑنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک دشمن نے بے وقوفی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کوئی بڑی سی چارجر لائٹ کی روشنی پھینکی۔ کبیل دادا نے فوراً ایک متوقع خدشے کے پیش نظر لڑھکنی لگائی، ٹھیک اسی جگہ پر دو تین فائر ہوئے۔ اس کے بعد کبیل دادا کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو شعلے لپکے... دشمن کی چیخ ابھری، لائٹ گر پڑی... وہ بجھی نہیں تھی۔ اس کا رخ بدل گیا اور اس رخ پر کبیل دادا نے دو مسلح افراد کو روشنی میں متحرک دیکھا جو اُن کی کار کی طرف لپک رہے تھے۔ کبیل دادا نے لیٹے لیٹے ان پر فائر جھونک مارے دونوں چت سے گرے۔ مگر ایک لنگڑاتا ہوا تاریکی میں دوڑا۔ یک دم سناٹا طاری ہوتے ہی کبیل دادا سمجھ گیا کہ یہ تماشائے خوں رنگ جس طرح اچانک اور تیزی کے ساتھ شروع ہوا تھا اسی طرح اب اس کا ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے سائے کے تعاقب میں دوڑا۔ جوش کے مارے اس کا رُواں رُواں اس وقت متحرک تھا۔ اس نے تھوڑی دیر میں اس جالیا۔ نیچے گرتے ہی کبیل دادا نے اس پر قابو پالیا تھا۔

☆☆☆

سرمئی شام کے دھڑکتے ہوئے اندھیارے اب رات کے چیختے ہوئے سناٹوں میں بدلنے لگے تھے۔ بچنے والے آخری حملہ آور کو قابو کیا جا چکا تھا۔ بختیار علی نے کبیل کی ہدایت پر فوری عمل کرتے ہوئے زخمی جہانگیر کی خبر لی تھی، گولی جہانگیر کی گردن میں ہی لگی تھی مگر خوش قسمتی سے شہ رگ کو نقصان پہنچائے بغیر ''چھاؤ'' ہو گئی تھی۔ (گردن چھید کر پار ہو گئی تھی) بختیار علی نے خون روکنے کے لیے رومال باندھ دیا تھا۔ اگرچہ کار کی ڈگی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ جہانگیر ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ کبیل دادا کے

چہرے پر فکر و تشویش کے آثار طاری تھے، اپنے ساتھی کو بھی بچانا تھا اور ہاتھ آئے دشمن کی بھی خبر لینا تھی مگر اس کی مشکل بختیار نے یہ کہہ کر حل کر دی۔

''باؤ کبیل! کار میں فاضل ٹائر تو ہوگا۔ تم جلدی سے ٹائر بدلو۔ میرا چاچا حکیم ہے۔ گھر میں ہی اس کا مطب ہے جہانگیر کی اس سے مرہم پٹی کروا لیتے ہیں۔ وہ اس کی دوا دارو بھی کر دے گا۔'' کبیل دادا نے ہونٹ بھینچ کر سوچنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر تیزی کے ساتھ اس نے کار کا ٹائر بدلا اور اس دوران ایک اور فوری لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ یہ لوگ روانہ ہو گئے، دشمن کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی ان کے لیے غیر شناسا تھا مگر توقع قوی تھی اس بات کی کہ وہ کس کا آدمی ہو سکتا تھا؟ مطب میں بختیار علی اور جہانگیر کو چھوڑ کر کبیل دادا اپنے گھر آ گیا، دشمن کو گھسیٹ کر کار سے اتارا اور تالا کھول کے اندر کوٹھری میں لایا پھر پستول نکال کر اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔

''مجھے تم سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کس کے آدمی ہو، تم اپنے ساتھیوں کا بھی میرے ہاتھوں حشر دیکھ چکے ہو۔ تمہارا ابھی وہی حشر کروں گا، مجھے صرف تمہارے منہ سے سچ سننا ہے۔ بولو، یہ چھیما کے قتل اور لئیق شاہ کا کیا معاملہ ہے؟ وہ کدھر ہے اس وقت؟''

دشمن کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں آزاد کر دی گئی تھیں۔ اسے ایک مونڈھے پر بٹھا رکھا تھا۔ اس کی عمر تیس اکتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم دبلا پتلا قد کا لمبا تھا بلکہ کبیل دادا کا ہم قد تھا۔

''مجھے نہیں پتا تم کیا بول رہے ہو؟ پپ... پانی پلا دو مجھے ایک گلاس۔'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کبیل دادا کا پستول والا ہاتھ یک دم حرکت میں آیا۔ دشمن کے حلق سے اذیت ناک کراہ خارج ہو گئی۔ پستول کے کندستے نے اس کے دائیں گال کا جبڑا ادھیڑ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے کبیل دادا خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔ لئیق شاہ کو تو ہم ڈھونڈ ہی لیں گے، پر تجھے میں اذیت ناک موت سے ضرور دوچار کر دوں گا، میرے سوال کا جواب دو۔''

کبیل دادا کی درندگی کی ایک جھلک وہ کچھ دیر پہلے اپنے دو تین ساتھیوں کی موت کی صورت دیکھ چکا تھا، اس وقت بھی اسے کبیل دادا کی وحشت لہو رنگ آنکھوں اور چہرے سے سفاکی جھلکتی صاف نظر آ رہی تھی کہ اس پر بری طرح خون سوار تھا۔ خون تھوکتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا تو اس کا لب و لہجہ ابھی تک کسی خوف یا دباؤ سے عاری ہی محسوس ہوتا تھا۔

''زندہ تم بھی نہیں بچو گے... اگر ہمیں پہچان ہی گئے ہو تو یہ بھی سن لو اچھی طرح کان کھول کر چودھری صاحب کے آدمی ادھر بھی کسی وقت پہنچ جائیں گے۔ ہمیں بہت پہلے سے تمہاری یہاں نئے پنڈ میں آمد کا علم ہو چکا تھا اور ہم ادھر ہی ہلا بولنے آئے تھے مگر تم لوگوں کی قسمت اچھی تھی... جو ہمیں نہیں ملے۔'' اس کی ڈھٹائی آمیز گفتگو پر ایک بار پھر کبیل دادا کا دماغ الٹنے لگا۔ مگر اندر سے اسے تھوڑی تشویش بھی ہوئی کہ کم از کم یہ بات جھوٹ بول رہا تھا۔ کبیل دادا نے اپنے پستول کی نال اس کی پیشانی سے چپکا دی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی تم سے کچھ پوچھنے کے لیے اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر کبیل دادا نے انگوٹھے سے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔

''ٹھ... ٹھہرو... خ... خدا کے لیے مجھے مت مارو... میں... میں تو حکم کا غلام ہوں جی...'' اچانک وہ گھگیا کر بولا۔ کبیل دادا کا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ تاہم پھر بھی وہ اسے سفاک نظروں سے گھورتے ہوئے پُر قطعیت سنگ دلی سے بولا۔

''تم جیسے بھاڑے کے ٹٹو میرے لیے ذرا سی بھی اہمیت نہیں رکھتے جن پر میں اپنا وقت برباد کروں... کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم سچ نہیں بولو گے، تمہارے ساتھیوں کی طرح یقینی موت تمہارا بھی مقدر بن چکی ہے اب...''

گرانڈیل کبیل دادا یوں تو مردانہ وجاہت کا حامل تھا مگر اس کی وجاہت میں ایک کرختگی تھی۔ چہرہ بھی کسی چھٹے ہوئے خونخوار بدمعاش سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ عمر کا نوجوان ہی تھا۔ مگر چند سال بڑا ہی نظر آتا تھا۔ اچھی خاصی دھاک دشمن پر پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ یہ کہتے ہی کبیل دادا نے لبلبی دبا دی۔

''ٹرچ'' کی آواز کوٹھری نما کمرے میں ابھری تھی اور دشمن کے منہ سے گھٹی گھٹی کراہ خارج ہو گئی۔

''اوہو... شاید مقابلے میں میرا پستول خالی ہو گیا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔'' کبیل دادا نے ایکٹنگ کی اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی ہتھیلی میں چار گولیاں تھیں۔

"تیرے لیے تو ایک ہی گولی کافی ہوگی۔" کہتے ہوئے کبیل دادا نے چاروں گولیاں پستول میں بھر دیں اور دوبارہ اس کی نال دشمن کی پیشانی سے لگا دی۔

"نن... نہیں... خدا کے لیے نہیں... رب دا واسطہ... مجھے نہ مارو، میں... میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ رب دی سوں... ایک ایک لفظ سچ بولوں گا۔" وہ خوف زدہ ہو کے بولا۔ کبیل دادا کا یہ دوسرا ڈراما بھی کامیاب گیا تھا۔ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ پستول خالی تھا۔ بہرحال پستول کی نال اس کی پیشانی سے ہٹائے بغیر درشتی سے بولا۔

"چل پھر بولتا جا... میرے پاس اب اپنا سوال دہرانے کا بھی وقت نہیں ہے مگر یاد رکھنا... مجھے جیسے ہی تیرا کوئی بھی لفظ جھوٹ اور دھوکا لگا، میں ٹریگر دبا دوں گا۔ تو نہیں جانتا کہ میں نئے پنڈ آ کر بہت سی باتوں سے آگاہ ہو چکا ہوں۔"

"ٹھ... ٹھیک ہے... پپ... پر... یہ پستول...؟"

"بکواس نہیں، شروع ہو جا۔" کبیل دادا نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور پھر وہ فرفر بولنے لگا۔

"چودھری ممتاز کے کہنے پر وسیم عرف چھیما اپنے ساتھیوں کی مدد سے گن پوائنٹ پر لئیق شاہ کو یرغمال بنا کے ڈیرے پر لے گیا تھا۔ چودھری صاحب بھی وہاں پہنچنے والے تھے۔ اس دوران لئیق شاہ اور چھیما کی آپس میں تلخ باتیں بھی ہوتی رہیں اور چھیما نے غرور میں آ کر لئیق شاہ کو یہ حقیقت بھی بتا ڈالی کہ اس کے گھر کو آگ بھی انہی لوگوں نے لگائی تھی۔ چودھری ممتاز کے کہنے پر... لئیق شاہ اندر سے زخمی تھا شاید اسے یہی بات چھیما کے منہ سے سننے کی دیر تھی کہ ایک موقع پر جب باہر چودھری ممتاز کی گاڑی کی آواز ابھری اور ہمارے کچھ ساتھی ان کے استقبال کے لیے باہر کو لپکے تو لئیق شاہ نے چھیما پر حملہ کر دیا۔ اور اس کا پستول چھین کر اسے گولی مار دی۔ ایک دو ساتھی ہمارے بھی وہاں موجود تھے جن میں، میں بھی شامل تھا۔ ہمیں اس پر قابو پانے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر وہ خود بھی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فرار ہو گیا لیکن درحقیقت وہ وہاں سے فرار نہیں ہوا تھا، وہیں ڈیرے پر کہیں گھات لگائے بیٹھ گیا تھا۔ وہ چودھری ممتاز کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت شاید کچھ زیادہ ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ اسی جوش میں اس نے وہیں چودھری ممتاز پر بھی حملہ کر دیا۔ جو ناکام ثابت ہوا، اس نے راہِ فرار اختیار کی، ہمارے آدمیوں نے اس کا پیچھا کیا اور بالآخر اسے پکڑ لیا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا، کبیل دادا کا دل کسی ہولناک خیال سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اپنی اس اچانک اندر ابھرنے والی کیفیت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پھ... پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ لئیق شاہ کا چودھری ممتاز نے کیا کیا؟ کیا اسے مار ڈالا؟"

"نہیں۔" دشمن نے نفی میں جواب دیا اور کبیل دادا کے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔ بے شک لئیق شاہ اس کا رقیب تھا مگر وہ اس کے زندہ بچ جانے پر مطمئن بھی تھا شاید اس لیے کہ اس نے خود... زہرہ بانو سے وعدہ کیا تھا، بیگم ولا سے روانہ ہوتے وقت کہ وہ لئیق شاہ کو زندہ ان کے سامنے ڈھونڈ کر لائے گا۔

"تو پھر اب لئیق شاہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" کبیل دادا نے اگلا سوال کیا تو وہ ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پانی مانگنے لگا مگر کبیل دادا نے نہایت درشتی سے انکار کر دیا اور پہلے اسے جواب دینے پر اکسایا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"کک... کیا اس کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے نا... وعدہ کرو...؟"

"ہاں، لیکن پہلے میں تمہارے اس آخری جواب کی سچائی کا یقین کروں گا۔ اس کے بعد... لہٰذا اب آخر میں مجھ سے جھوٹ بولنے کی یا چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔"

"وعدہ کرتے ہو؟"

"وعدہ نہیں کر سکتا۔" کبیل دادا نے مسکت جواب دیا۔ تب وہ قدرے طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے تم سچے آدمی ہو اور سچ سننے کے بعد مجھے ہلاک نہیں کرو گے، ورنہ جھوٹا وعدہ کر کے مجھ سے سچ سننے کی کوشش کرتے۔"

"وقت ختم ہو گیا، جلدی بولو۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے یہ کام کرنا ہے، لئیق شاہ کی آزادی۔" کبیل دادا مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

"لئیق شاہ اس وقت چودھری ممتاز خان کی قید میں ہی ہے اور اطمینان رکھو وہ کم از کم ابھی اسے ہلاک کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اسے یرغمال بنا کر اپنی سوتیلی بہن زہرہ بانو کی کمزوری بنانا چاہتا ہے۔ اس سے جائداد کے اسٹیمپ پیپر سائن کروانا چاہتا ہے۔"

"اس بات کا تو مجھے بھی شبہ ہے لیکن اس نے پولیس کا ڈراما کیوں رچایا ہے، لئیق شاہ کو مفرور مجرم ثابت کر کے؟"

"سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ زہرہ بانو سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد... وہ لئیق شاہ کو چمیسا کے قتل کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دے گا۔" اس نے بتایا اور کبیل دادا چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے رہا پھر بولا۔

"ممتاز خان نے لئیق شاہ کو کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"وراثت علی اور رئیس خان کے پاس۔" اس نے بتایا۔

یہ نام سن کر کبیل دادا قدرے چونکا تھا۔ وہ کبھی ان دو اشخاص سے ملا نہیں تھا مگر چودھری ممتاز خان کے ان دونوں ماموؤں کے نام سن رکھے تھے جو ممتاز خان کی ماں اور چودھری الف خان کی پہلی بیوی مہرالنسا کے بھائی تھے۔ کبیل دادا کا باپ منشی فضل محمد ان کا پرانا خدمت گار تھا اور اس حوالے سے کبیل بھی کبھی کبھار باپ کے ایما پر ان کے کھیتوں وغیرہ میں کام کر لیا کرتا تھا۔ کئی بار اس نے چودھری الف خان کی زمینوں پر ٹریکٹر بھی چلایا تھا۔ تاہم اسے کبھی وراثت علی اور رئیس خان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

بھویں سکیڑ کر اس سے بولا۔

"تم کہیں ممتاز خان کے ماماؤں کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟"

"ہاں، وہی ہیں یہ دونوں... وڈی زمیندارنی (چودھرائن) کے دونوں بھائی۔" وہ اثبات میں سر ہلا کے بولا تو کبیل نے پوچھا۔

"کدھر رہتے ہیں دونوں؟ اور انہوں نے لئیق شاہ کو کہاں رکھا ہوا ہے؟ مگر ممتاز خان نے لئیق شاہ کو ان کے حوالے کیوں کیا؟"

"چودھری ممتاز خان کو زہرہ بانو سے خطرہ تھا کہ وہ یا ان کے آدمی لئیق شاہ کو ان کے چنگل سے چھڑا نہ لیں۔ کیونکہ اب تک وہ اس کے تقریباً تمام ٹھکانوں سے واقف تھے۔ پھر چودھری ممتاز نے پولیس کا بھی ڈراما رچانا تھا۔ اس لیے یہ سب کچھ اسی احتیاط کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔"

"مجھے ان دونوں کا ٹھکانا بتاؤ، میں اسی وقت وہاں جا کر تمہاری بات کی تصدیق کروں گا۔" کبیل دادا بولا۔ "مگر میرا ایک آدمی یہاں موجود رہے گا۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا سوچنا بھی مت... نہ ہی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرنا، سمجھے تم؟"

"سب کچھ تو بتا دیا ہے تم کو... بھلا اب کیا چھپاؤں گا مگر اب سوچتا ہوں تم سے بچ گیا تو چودھری ممتاز مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" وہ مایوس اور شکست خوردہ ہونے لگا تھا۔ کبیل دادا اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"اسے بھلا کیسے پتا چلے گا کہ یہ حقیقت تم نے آشکارا کی ہے؟"

"وہ بڈھی روح ہے جی... بڑا شیطانی ذہن کا مالک ہے چودھری ممتاز خان... اسے یہ پتا چل ہی جائے گا کہ ہمارا تم سے ٹاکرا ہوا، کیونکہ اسی نے ... تو ہمیں نئے پنڈ کی حدود میں مقرر کر رکھا تھا جانتا تھا وہ کہ لئیق شاہ کے سلسلے میں زہرہ بانو کا کوئی نہ کوئی آدمی یہاں کا رخ کر سکتا ہے۔ ہم تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے، مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ ابھی واپسی میں ہمیں موقع ملا تو تم پر ناکام حملہ کر کے میں خود پھنس گیا۔" اس کی بات بھی صحیح تھی کبیل بولا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تم زہرہ بانو کی وفاداری کا کیوں نہیں دم بھر لیتے... آخر کو وہ بھی وڈے چودھری الف خان کی وہٹی ہے۔"

"ہمیں سب پتا ہے جی... زہرہ بانو کی حقیقت... مگر ان کی نگاہوں میں ایک ایسے آدمی کی بھلا کیا حیثیت ہو گی جو ایک سے غداری کر کے دوسرے سے وفاداری کا دم بھرے... غداری تو میں بھی نہیں کر رہا... پر مجبور ہوں... مرنے سے بھی نہیں ڈرتا... مگر مجھے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آتا ہے۔ میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟"

"بات تمہاری بھی ٹھیک ہے، پر میں تم سے سچ بتانے کے صلے میں ایک وعدہ ضرور کرتا ہوں... تمہیں ممتاز خان یا اس کے آدمیوں سے ہمیشہ کے لیے بچانے کا ایک طریقہ تمہیں ضرور بتا دوں گا۔ مگر تمہیں ایک بات بتا دوں کہ چودھری ممتاز خان جیسے بدطینت، بے رحم اور خونی آدمی کے مقابلے میں زہرہ بی بی یعنی بیگم صاحبہ بالکل مختلف انسان ہیں۔ وہ ایک نیک شریف اور ہمدرد خاتون ہیں۔ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھتی ہیں۔ ان کی اور ان کی مرحومہ ماں ستارہ بیگم کی تو پورا پنڈ تعریفیں کرتا تھا۔"

"ہاں جی، آپ ٹھیک کہتے ہو، پر میرے لیے کیا سوچا ہے؟"

"مجھے رئیس خان اور وراثت علی کے بارے میں بتاؤ، انہوں نے لئیق شاہ کو کہاں یرغمال بنا کے رکھا ہے؟" کبیل دادا نے پوچھا مگر جب اسے بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر

زبان پھیرتے دیکھا تو بالآخر اسے بھی ترس آ گیا۔ "ٹھہرو، میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پستول اُڑسا اور باہر صحن میں آ گیا۔ ایک بدہیئت سی گھڑونچی پر مٹکا دھرا تھا، جست کے گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ اندر کوٹھری میں آ گیا۔ اسے پانی پلایا۔ اس نے ایک اور گلاس مانگا۔ کبیل دادا نے دوسرا گلاس بھی اسے پلا دیا۔ پھر خالی گلاس ایک طرف کھری چارپائی پر پھینکنے کے انداز میں رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ پانی سے حلق تر ہوا تو وہ بولا۔

"وراثت علی اور رئیس خان نے لئیق شاہ کو اپنے اینٹوں کے بھٹے والے کچے ڈیرے میں رکھا ہوا ہے۔ وہاں چودھری ممتاز کے دو مسلح آدمی بظاہر چوکیداری کے بھیس میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"ان کا بھٹا یا کچا ڈیرا کس طرف ہے؟" کبیل دادا نے اس کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ جواباً بولا۔

"پرانی کھوہ والا جو راستہ قبرستان سے گزر کر چاچا جمانی کی زمینوں کی طرف جاتا ہے۔ وہیں ان کا بھٹا ہے۔"

کبیل دادا خود بھی اسی علاقے کا تھا۔ اپنے ذہن میں خیالی نقشہ بناتے ہوئے اس نے فوراً محتاط اندازہ لگا لیا کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اب وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ جہانگیر زخمی تھا۔ بختیار علی اسے اپنے چاچا حکیم کے مطب میں لے کر گیا ہوا تھا۔ موجودہ حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ جو کچھ کرنا ہے، صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے ممتاز خان کے آدمی کو وہیں چھوڑا اور خود راتوں رات کار میں مطلوبہ جگہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے درمیانی پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ فضا خنک ہو رہی تھی۔ چہار سو سناٹے کا راج تھا۔ آوارہ جانور بھی دور کہیں دبک گئے تھے۔ کبیل دادا سب سے پہلے مذکورہ حکیم کے مطب پہنچا۔ حکیم صاحب نے جہانگیر کی گردن کی پٹی کر دی تھی۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ کبیل دادا بختیار علی اور جہانگیر کو لے کر روانہ ہوا اور سیدھا بختیار علی کے گھر پہنچا۔ بختیار علی نے جہانگیر کی طرف سے کبیل کو مکمل تسلی دے دی تھی کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہے مگر وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن کبیل دادا نے بڑی مشکل سے بختیار علی کو وہیں رکنے پر رضامند کیا اور خود روانہ ہو گیا۔

اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کبیل دادا کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس وقت ایک عجیب سے جوش تلے اس کا رُواں رُواں متحرک تھا۔ وہ خود کو کامیابی کے بس لبِ بام ہی سمجھ رہا تھا۔ جیسے ہی اسے کچے ڈیرے کے بھٹے کا چبوترا سا بنا دکھائی دیا، وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے کار کی ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔ قدرے قریب پہنچ کر اس نے کار روک دی اور نیچے اتر آیا۔ ڈبے سے اس نے کچھ فاضل راؤنڈ نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیے پھر پستول سنبھالے آگے بڑھا۔

اینٹوں کا بھٹا کسی چھوٹے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہلکا ہلکا دھواں اگل رہا تھا۔ اندر غالباً اینٹوں کا جہنم دہک رہا تھا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی پھونس کی مڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ شاید بھٹے کے چوکیدار وغیرہ کے رہنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

کبیل دادا وہاں سے ہٹ کر پرلی طرف آیا تو اسے کچے ڈیرے کی چار دیواری دکھائی دی۔ کبیل دادا نے ایک جگہ شکاری بلے کی طرح دبک کر اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی بمشکل چار پانچ فٹ ہو گی۔ اندر وسیع و عریض میدان نما احاطہ تھا۔ وہاں کچی پکی اینٹوں کے چبوتروں کے ڈھیر سے بنے نظر آ رہے تھے۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی بھی کونے میں دکھائی دی۔ کچھ تعمیراتی سامان بھی پھیلا ہوا تھا۔ کھولی نما کوٹھریاں بنی نظر آئیں۔ وہاں سناٹا تھا۔ فقط ایک بلب.... پھاٹک کی پیشانی پر بغیر کسی ہولڈر کے تار کے سہارے جھول رہا تھا اور اس کے گرد مچھروں کا جھرمٹ رقصاں تھا۔

کبیل جھکے جھکے انداز میں دبے پاؤں دیوار کے قریب پہنچا اور دیوار کی آڑ لیے اسی طرح جھکے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور عقبی دیوار کی طرف نکل آیا۔ تھوڑا سر ابھار کے اس نے اندر دیکھا۔ دو چارپائیاں پڑی دکھائی دیں جو خالی تھیں۔ ایسے ہی وقت دور کہیں کسی آوارہ گیدڑ کے السائے ہوئے انداز میں چلانے کی آواز ابھری تو کبیل دادا ٹھٹک سا گیا۔ اسے کچھ اطمینان تو تھا کہ ممتاز خان کے یہاں دو عدد پہرے پر موجود آدمیوں کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کا راز فاش بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضرور وہ دونوں اندر کہیں بے فکری میں خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ یہ بات بہرحال کبیل دادا کے حق میں جاتی تھی۔

اس طرف کہیں کہیں سے دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ بیشتر جگہ تو کوئی آدم گزار سوراخ بھی نظر آئے۔ ایسے ہی ایک سوراخ سے اکڑوں بیٹھ کر کبیل دادا اندر داخل ہو گیا۔ چند ثانیے اپنی جگہ دبکا گرد و پیش کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد محتاط روی سے آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہی اسے کہیں قریب سے کسی شکاری کتے کی غراہٹ سنائی دی تو

اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ تب اسے اس بات کا سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ ہر جگہ آتشیں ہتھیار کام نہیں آیا کرتے، اسے اپنے ساتھ کوئی سنگین یا چاقو رکھنا چاہیے تھا۔ کتّے پر کم از کم اس وقت گولی چلا کر شور ڈالنے کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی وہ اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ دفعتاً ہی کُتّے کی غراہٹیں کسی ذبحہ ہوتے جانور کی خرخراتی آوازوں میں بدل گئیں اور پھر یکلخت جیسے ہر سو آسیبی سناٹا چھا گیا۔ اس کے دائیں طرف گارے مٹی اور کہیں کہیں پکی سرخ اینٹوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو بادی النظر میں گودام کا ہی نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک کوٹھری کی دیوار کی آڑ لیے وہ ذرا آگے کو سرکا اور تھوڑا سر آگے نکال کر دیکھنا چاہا تو معاً ہی اسے اپنے عقب میں ایک آہٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑا اس کے بالکل پیچھے... بلکہ عین سر پر ایک بوری نما چادر سی ڈالے ایک کبڑا آدمی جس کے ایک ہاتھ میں خون آلود درانتی تھی۔ رات کے اس پہر سناٹے جیسے ماحول میں اس کریہہ صورت زرد آنکھوں والے کبڑے آدمی کو خون آلود درانتی پکڑے اپنے پیچھے کھڑے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو کبیل دادا جیسے گرانڈیل آدمی کا لہو بھی خشک ہو گیا اور ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔

”شی... ی... ی...“ اس آدمی نے ایک انگلی اپنے سوکھے ہونٹوں پر رکھ دی پھر سرسراتی سرگوشی میں بولا۔

”تو چور ہے؟ پر یہاں کیا چوری کرنے آیا ہے؟“ اس نے کہا۔ اسے کم از کم انسانوں کی طرح بولتے پا کر کبیل دادا کی جان میں جان آئی، تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”نن... نہیں، میں چور نہیں ہوں... پر تو کون ہے؟“ کبیل دادا کو وہ خود کوئی چور معلوم ہو رہا تھا۔ اس کریہہ صورت کبڑے آدمی کی ایلی زرد زرد آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی خون آلود درانتی کو لہراتے ہوئے کہا۔ ”میں... میں اس کی پیاس بجھانے آیا ہوں... پر یہ خون اس کُتّے کا ہے جو مجھ پر حملہ آور ہونے والا تھا۔“ کبیل دادا اس عجیب اور ڈراؤنی صورتِ حال پر بری طرح ششدر ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے اس عجیب الخلقت آدمی پر اب چور کا ہی گمان ہو رہا تھا مگر بہرحال اس نے اس کی ایک مشکل ضرور حل کر دی تھی کہ اپنی تیز دھار درانتی سے ایک خونخوار کُتّے کا خاتمہ کر دیا تھا۔

”تو چور نہیں ہے تو پھر یہاں کیا کرنے آیا ہے؟“ کبڑے نے سرگوشی میں پوچھا۔ اس کی زرد آنکھوں میں شک کے سائے ابھرے۔

”اگر یہاں چوری کے لیے کچھ نہیں پڑا تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ جواب دینے کے بجائے کبیل دادا نے الٹا سوال داغ دیا۔ وہ دل میں اب تہیہ کر بیٹھا تھا کہ اس بدہیئت کبڑے نے اس کا ”معاملہ“ خراب کرنے کی کوشش چاہی تو وہ اسے اِدھر ہی دبوچ کر ختم کر ڈالے گا۔ اس کی بات پر کبڑا اپنی زرد آنکھوں کو خاکستری حلقوں میں تیز تیز گردش دیتے ہوئے بولا۔

”میں... میں یہاں لالاں کو مارنے آیا ہوں۔“

”لالاں...؟ یہ کون ہے؟“ کبیل دادا نے الجھ کر پوچھا۔

”میری زن (بیوی) ہے۔“ اس نے عجیب سا انکشاف کیا۔

”لیکن... وہ یہاں... کیا کر رہی ہے؟“

”وہ... اِدھر ان دونوں مسٹنڈے چوکیداروں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے آئی ہوئی ہے اور میں اسے رنگے ہاتھوں ان دونوں حرام زادوں سمیت ہلاک کرنے آیا ہوں تاکہ لوگ جان لیں کہ ایک بیمار آدمی میں بھی اپنی غیرت کے لٹیروں کو ہلاک کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔“ اس کی آواز میں اب ارتعاش سا پیدا ہونے لگا تھا۔ تاروں بھری روشنی میں جب کبیل دادا کو .... تھوڑی دیر اس کا جائزہ لینے کا موقع ملا تو اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ شخص بیمار بھی ہے۔ اس کا لبوترا خاکستری چہرہ متورم سا نظر آ رہا تھا۔ کبیل دادا کو یہ سارا قصہ سمجھنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی۔ یہ شخص اپنی بدکردار بیوی کو اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے والے دونوں آدمیوں سمیت موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا۔ کبیل دادا کے لیے عجیب وغریب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ بالآخر اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، تم ان دونوں چوکیداروں کا ابھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان کے پاس اسلحہ ہے مگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ اس کی بات پر وہ ہولے سے کھانسا پھر بولا۔

”لگتا ہے تیرا بھی کچھ ان دونوں چوکیداروں کے ساتھ ایسا ہی کچھ معاملہ ہے... چل ٹھیک ہے تو ان دونوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانا اور میں اس درانتی کی پیاس لالاں کے خون سے بجھاؤں گا۔“

کبڑے کی بات پر کبیل دادا کا حلق کڑوا سا ہونے

لگا مگر یہ وقت لمبی چوڑی تمہیدیں باندھنے کا نہیں تھا۔ ورنہ یہ کبڑا اس کا کام خراب بھی کرسکتا تھا۔ ابھی اس کبڑے کی کہانی سننے کے بعد اس بیمار پر ہاتھ اٹھانا یوں بھی کبیل دادا کا شیوہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ دونوں کس کوٹھری میں موجود ہیں؟''

''ہاں، آؤ میرے ساتھ۔'' کبڑا فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پلٹ گیا۔ کبیل دادا پستول لیے اس کے عقب میں چل دیا۔ وہ کبڑا اسے لیے دو کوٹھریوں کی درمیانی مختصر گلی نما جگہ سے گزارتا ہوا ایک ایسی کوٹھری کے قریب لے آیا جہاں باہر ایک بڑے سی گودڑی نما چارپائی بچھی ہوئی تھی اور دو مونڈھے دھرے تھے۔ چارپائی کے ساتھ دو رائفلیں ٹکی ہوئی تھیں۔

''لگتا ہے وہ کمینی... اندر ایک ساتھ دونوں سے...'' اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا۔ یک دم جوش میں بولا۔

''میں... میں... ان تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ آپے سے باہر ہونے لگا۔ کبیل دادا پریشان ہوگیا۔ اس کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس نے ذرا درشت سی سرگوشی میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

''او کبڑیا! تیری مت (عقل) ماری گئی ہے؟ اپنے نال توں مینوں بھی مروائے گا۔ ذرا سنبھال اپنے کو...''

کبیل دادا نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کبڑے نے معاملہ خراب کرنے کی کوشش چاہی تو وہ اسے ایک ہلکا ہاتھ دکھا دے گا مگر اسے عقل آگئی۔ کبیل دادا نے سب سے پہلے دونوں رائفلوں پر قبضہ جمایا اور انہیں ناکارہ بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے کبڑے کے ہاتھ سے کچھ سوچ کر درانتی اچک لی۔ ٹھیک اسی وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دونوں یک دم اپنی جگہ دبک گئے۔ کبیل دادا نے دانستہ کبڑے کو اپنے پیچھے رکھا تھا کہ کہیں وہ اپنی ''لالاں'' کو ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر برافروختہ نہ ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

بلب کی پیلی پیلی روشنی میں کبیل دادا نے دو لحیم شحیم سے آدمیوں کو... ایک بھرپور شباب والی عورت کے ساتھ ہنستے بولتے باہر نکلتے دیکھا۔ عورت کو دیکھ کر کبیل دادا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کچھ زیادہ حسین تو نہ تھی مگر گندمی رنگت کی صحت مند اور بھرپور عورت ضرور تھی۔ قد بھی لمبا تھا، اس نے عام سی گھریلو چست شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شلوار کا رنگ سرخ تھا اور قمیص ہلکی پھول دار تھی۔ بالوں کی موٹی سی چٹیا بنی ہوئی تھی

''واہ نی کڑیئے! کیا بات ہے تیری... آج تو ہمارے ہوش ہی گم کردیے۔'' کبیل دادا نے ایک آدمی کو تعریفی جملہ کہتے سنا۔ ادھر اس کے پیچھے کھڑے کبڑے نے بھی سن لیا کہ وہ آدمی کس کی تعریف کررہا ہے۔ ایک بار پھر اس کے خاکستری لبوترے چہرے پر اختلاج قلب کے تاثرات ابھرے جسے دیکھ کر کبیل دادا کو اس کی طرف سے پھر پریشانی لاحق ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اسے ڈپٹ کر خود پر قابو پائے رکھنے کی ہدایت کی۔

کبیل دادا نے دیکھا عورت کے چہرے سے ایسی کسی خوشی یا مسرت آمیز تسکین کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کی جگہ اس کا چہرہ اترا اترا اور کسی مجبوری کی غمازی کرتا نظر آرہا تھا۔ دوسرے آدمی نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اسے تھمائے۔ ''یہ لے... عیش کر...''

''عیش میرے نصیب میں کہاں ہے۔ میرے شوہر کا علاج ہو جائے، میرے لیے یہی بہت ہے۔'' اس عورت نے پژمردہ سے لہجے میں کہا اور کبیل دادا کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ وہ بے چاری یہاں اپنی کوئی پیاسی مسرت کشید کرنے نہیں آئی تھی، بلکہ اپنے بیمار شوہر کے علاج کے سلسلے میں اپنے جسم کا سودا کرنے آئی تھی، کبڑے نے بھی یہ سب سن لیا تھا اور اب اپنی بیوی کے یہ الفاظ سن کر اسے سکتہ ہوگیا تھا جبکہ ادھر دفعتاً ہی وہ دونوں آدمی گودڑی بچھی چارپائی کے قریب پہنچ کر بری طرح چونکے۔ اس چارپائی کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے ٹکی ہوئی ان کی رائفلیں غائب تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب کبیل دادا بجلی بن کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ رائفل کو اس نے لٹھ کی طرح استعمال کرتے ہوئے پہلے ایک کا سر پھاڑ ڈالا۔ وہ تیورا کر گرا جبکہ دوسرے کے پیٹ پر زوردار لات رسید کر ڈالی۔ لالاں نامی وہ عورت حیران کھڑی رہ گئی۔ دوسرا آدمی لات کھاتے ہی فوراً سنبھل گیا اور بھیڑیے جیسی غراہٹ کے ساتھ کبیل دادا پر جھپٹا۔ ڈیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ہی برابر تھے۔ تاہم کبیل دادا کی رگوں میں خون اس وقت لاوے کی طرح اچھال مار رہا تھا۔ وہ تصور میں بیگم صاحبہ کا پُرمسرت چہرہ دیکھ رہا تھا، جو لئیق شاہ کے دیدار کا رہینِ منت ہی ہوسکتا تھا اور بیگم صاحبہ سے کیے گئے وعدے اور ان کے پژمردہ چہرے کی... مسرت لوٹانے کے لیے کبیل دادا نے یہ خطرناک مہم اپنی جان کی پروا کیے بغیر انجام تک پہنچائی تھی۔

دونوں باہم دست و گریبان ہوئے تو اس نے کبیل دادا کے پیٹ پر گھٹنا رسید کر دیا۔ ضرب زوردار تھی جس نے کبیل دادا کو چند ثانیوں کے لیے بلبلا کر رکھ دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس جاں کش درد کو پی گیا اور سنبھلتے ہی اپنے بھاری کندھے کی ایک زبردست ٹھوکر اسے رسید کر دی۔ یہ ضرب اس کے لیے غیر متوقع اور زوردار تھی۔ وہ بری طرح الٹے قدموں لڑکھڑا کے چارپائی کے ابھرے ہوئے چوبی پائے پر پشت کے بل گرا اس کے حلق سے ابھرنے والی بھیانک کراہ سے کبیل دادا کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی، وہ پٹ سے زمین پر گرا اور لاچار ہو کر پڑ گیا۔

بھرے بھرے بدن والی سرو قد لالاں آنکھیں پھاڑے کبیل دادا کو ایک طرف کھڑی تکے جا رہی تھی۔ کبیل دادا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی وہ کبڑا جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ معاملہ ''ٹھنڈا'' پڑتے ہی کہیں وہ دل جلا کبڑا درانتی لیے اپنی بیوی لالاں پر حملہ نہ کر دے۔ ''تت... تم کون ہو؟ ان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟'' لالاں نے پھنسی پھنسی آواز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کبیل دادا نے ایک بار پھر گردوپیش پر نظر دوڑائی پھر اس کی طرف چند قدم بڑھا دیے۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔

''مجھے تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں، صرف یہ پوچھنا ہے کہ میرا ایک آدمی یہاں ان کی قید میں تھا۔ تجھے پتا ہے وہ کس کوٹھری میں بند ہے؟'' اس کی بات پر لالاں کا خوف کچھ کم ہوا۔ تاہم اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواباً کہا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن وہ سامنے والی کوٹھری میں ضرور کوئی ہو سکتا ہے۔'' اس نے پکی سرخ اینٹوں کے ایک ڈھیر کے قریب والی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے ان کو وہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ کچھ عجیب سی آوازیں وہاں سے آتی تھیں۔''

اس کی بات سن کر کبیل دادا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پہلے لالاں کا قضیہ نمٹانا چاہتا تھا کہ کہیں یہ بعد میں اس کے بارے میں کسی کو بک نہ دے۔ لہٰذا اسے بلیک میل کرنے کے انداز میں بولا۔ ''سن! تیرا نام لالاں ہے نا؟'' اس کی بات پر عورت کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''تت... تو مجھے کیسا جانتا ہے؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میں تجھے نہیں جانتا ہوں پر تو ہوشیار ہو جا تیرا خصم (شوہر) اِدھر ہی کہیں ننگی درانتی لیے... موجود ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کبیل دادا نے اسے مختصراً لفظوں میں ساری بات بتا دی۔ لالاں کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''کک... کدھر گیا وہ پھر؟''

''پتا نہیں، ابھی تو ادھر ہی تھا۔'' اس نے بتایا۔ لالاں فوراً ایک طرف کو لپکی اور کبیل دادا نے سامنے والی کوٹھری کی راہ لی۔ قریب پہنچ کر ایک زوردار لات مار کر لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ توڑ ڈالا۔ اندر اندھیرا تھا اس نے سوئچ ٹٹول کر آن کر دیا، کمرا بمشکل آٹھ بائی دس کا تھا اور بالکل سپاٹ مگر ایک کونے پر... کوئی اس جیسا کسرتی جسامت والا شخص رسن بستہ حالت میں ناہموار فرش پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا۔ نیچے صرف شلوار تھی۔ جسم پر زخموں کے نشانات دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ اسے وقتاً فوقتاً تشدد کا بھی نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ نوجوان کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زخم خوردہ تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر کبیل دادا کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص تشدد کا ہی نہیں بلکہ کم خوراکی کا بھی شکار تھا۔ یہ لئیق شاہ ہی تھا۔ کبیل دادا نے جلدی جلدی اس کے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بند کھولے، وہ ہوش میں آنے لگا تھا اور ہولے سے کراہ بھی رہا تھا۔ اس نے نیم وا سی آنکھیں کھول کر گویا اپنے نجات دہندہ کی طرف دیکھا۔ ایک تیز غراتی ہوئی سی کراہ نما آواز اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ وہ زخمی اور نڈھال ہونے کے باوجود اس پر پل پڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ اسے شاید دشمنوں کا ہی آدمی سمجھ رہا تھا اور یوں بھی اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں لگتا تھا۔

''اوئے... ہولا رہ... میں ہوں کبیل دادا... بیگم صاحبہ کا آدمی... کیا بھول گیا مجھے؟'' کبیل دادا نے بالآخر بتایا تو لئیق شاہ کی مزاحمت ڈھیلی پڑ گئی۔

''چل اٹھ، ہمت پکڑ... لئیق شاہ! وقت کم ہے ہمارے پاس... میں نے ان دونوں مردودوں کو بیکار کر دیا ہے۔'' کہتے ہوئے کبیل دادا نے اسے سہارا دیا۔ لئیق شاہ کی حالت واقعی ناگفتہ ہو رہی تھی، کبیل دادا نے اسے سہارا دیے کوٹھری سے باہر نکلا۔ باہر اسے لالاں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ لئیق شاہ کو لیے ابھی چند قدم آگے بڑھا تھا کہ بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ اسے کسی عورت کے رونے اور سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جو بلاشبہ لالاں کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

کبیل دادا پھر آگے بڑھا، وہ اس راستے سے لئیق شاہ کو لیے واپس لوٹنا چاہتا تھا جہاں اس کی کار موجود تھی۔ ایک کوٹھری کی دیوار کے پاس اسے وہ درانتی بردار کبڑا دکھائی دیا تھا۔ لالاں کے رونے کی آواز بھی اُدھر ہی سے آرہی تھی، اور اسی کے دل میں یہ خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں اس کے کبڑے شوہر نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ تو نہیں کر دیا۔ وہ لئیق شاہ کو سنبھالے وہاں سے گزرا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ کیا دیکھتا ہے کبڑا زمین پر ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح پڑا تھا اس کی گردن پر گہرا چرکا لگا ہوا تھا جس سے خون بھل بھل بہہ کر بھربھری مٹی والی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ خون آلود درانتی کبڑے کی لاش کے پاس ہی پڑی تھی اور لالاں بکھرے بالوں کے ساتھ اس کی لاش کے پاس بیٹھی ماتم کناں تھی۔ یہ عجیب اور نئی صورتِ حال کبیل دادا کے لیے مخمصے کا باعث تھی، پھر چشم زدن میں اس نے یہی اندازہ لگایا کہ اس کے بیمار کبڑے شوہر نے بیوی پر حملہ کرنا چاہا ہوگا لیکن وہ خود سے دگنی توانا اور صحت مند بیوی کا مقابلہ نہ کرسکا ہوگا یوں موقع پاتے ہی لالاں نے اپنی جان بچانے کے دوران میں الٹا اپنے کمزور اور مدقوق شوہر کی گردن پر تیز دھار درانتی چلادی ہوگی۔

''یہ تم نے کیا کیا... پاگل عورت؟ اپنے خصم (شوہر) کو مار ڈالا؟'' کبیل دادا نے غصیلے لہجے میں کہا تو الم نصیب لالاں ماتم کناں آواز میں بولی۔

''کاش! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ مجھے ہی مار ڈالتا مگر... میں نے اسے نہیں مارا ہے، اس نے خود ہی دل برداشتہ ہو کر میرے سامنے اپنے گلے پر درانتی پھیر ڈالی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کبیل دادا ایک گہری اور متاسفانہ سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''اسے تو ہونا ہی تھا دلبرداشتہ... تو نے اس کے ساتھ کیسی گندی بے وفائی کی تھی۔ اکٹھے دو مردوں کے ساتھ تو اپنا منہ کالا کرنے یہاں آئی تھی۔''

''میں نے ایسا مجبوری میں کیا تھا اور وہ بھی بشیرے کی خاطر ہی تو کیا تھا تاکہ شہر کے وڈے اسپتال میں اس کا علاج کرواسکوں۔'' وہ آبدیدہ لہجے میں بولی۔ ''بس اس بات پر اس نے میرے سامنے اپنی گردن پر درانتی پھیر لی۔''

کبیل دادا کو ابھی تھوڑی دیر والا وہ عبرت اثر منظر یاد آگیا جب کبڑے کو اپنی بیوی کی اس بات پر یک دم سکتہ ہوگیا جو اس نے لالاں کو ان دونوں مسٹنڈوں سے یہ کہتے سنا تھا۔ ''عیش میرے نصیب میں کہاں۔ میرے بیمار شوہر کا علاج ہوجائے یہی کافی ہے۔''

کبیل دادا اب عجیب سے شش و پنج کا شکار ہوگیا تھا۔ ایک طرف زخمی لئیق شاہ کو سنبھالے ہوئے تھا اور دوسری طرف لالاں والا مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی غیرت گوارا نہیں کررہی تھی کہ ایک دکھی عورت کو جو بہرحال مجبور بھی تھی اور جان بوجھ کر گناہ کی طرف مائل نہیں ہوئی تھی، حالات نے اسے بے حوصلہ اور مجبور کر ڈالا تھا، ایسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جانا اس کی مردانگی کو زیب نہیں دے رہا تھا، بولا۔

''اب رونا دھونا بند کر... جو ہوا سو ہوا... باہر میری کار موجود ہے چلتی ہے میرے ساتھ تو تجھے تیرے گھر اتارتا چلوں؟''

اس کی بات پر لالاں نے سر اٹھا کر کبیل دادا اور پھر ساتھ ٹکے ہوئے نڈھال سے لئیق شاہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر بولی۔

''تم میری فکر نہ کرو، تم اپنے ساتھی کو لے کر چلے جاؤ، لگتا ہے تمہاری ڈاڈھی دشمنی ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا

تھا کہ اچانک ایک تیز شور کی سی آواز ابھری۔ وہ سب بری طرح چونکے۔ کم از کم کبیل دادا کو یہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ گاڑیوں کی آوازیں تھیں جو اس کچے ڈیرے کے پھاٹک کے باہر رکی تھیں۔ اس نے گردن گھما کے اس طرف دیکھا۔ پھاٹک کی پیشانی پر لگے بلب کی روشنی میں اسے دو گاڑیاں رکتے اور اس کے اندر سے کئی مسلح افراد اترتے دکھائی دیے۔ یکلخت اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی، پل کے پل وہ ان کی آمد کی وجہ سمجھ چکا تھا جب وہ اور جہانگیر وغیرہ خواجہ سرا بجلی سے ملاقات کر کے واپس نئے پنڈ کی طرف لوٹ رہے تھے تو ممتاز خان کے آدمیوں نے جو بقول اس کے یرغمال ساتھی کے انہیں اندازہ تھا پہلے سے کہ لئیق شاہ کی تلاش میں بیگم صاحبہ یا اس کے آدمی نئے پنڈ کا رخ کریں گے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ لہٰذا یقیناً اب تک چودھری ممتاز کو اس ناکام حملے کی کسی نہ کسی طرح خبر ہو چکی ہو گی، اور لامحالہ اس کا خیال یرغمالی لئیق شاہ کی طرف گیا ہو گا کہ کہیں بیگم زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کے آدمی یہاں تک تو نہیں پہنچ گئے؟

اچانک دو تین ہوائی فائر بھی ہوئے، لالاں ہراساں نظر آنے لگی۔ جبکہ خود کبیل دادا بھی گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ لالاں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ دونوں جواں مرد اس وقت سخت مشکل میں ہیں۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے کبیل دادا سے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے کبیل دادا بول پڑا۔ ”لالاں! تم اِدھر میرے زخمی ساتھی کو سنبھالو، میرے پاس پستول ہے میں ان دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔“ اس پر لالاں نے کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، یہ تعداد میں زیادہ اور سب کے سب مسلح لگتے ہیں... آؤ میرے ساتھ دونوں۔“

وہ اٹھ کر آگے بڑھی، وقت کم تھا اور اس سے زیادہ سنگین تر... کبیل دادا لئیق شاہ کو سنبھالے اس کے عقب میں ہو لیا۔ لئیق شاہ کو بھی کافی ہوش آ چکا تھا۔ اس نے اپنے سہارے سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ بہت جلد کبیل داد کو اندازہ ہو گیا کہ لالاں کا مشورہ مان کر اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ یہاں کے سارے چور اور محفوظ راستوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پار کر کے وہ انہیں ایسی جگہ لے آئی جہاں خود رو گھنی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ ان کے درمیان چھپتے چھپاتے تیزی سے چلتے ہوئے قدرے کھلے راستے پر آ گئے۔ یہاں کچے پکے سے گھروں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ لالاں کا گھر قریب ہی واقع تھا، وہ

انہیں اندر لے آئی، دروازہ بند کر کے یہ لوگ اندر کمرے میں آ گئے۔ گھر کا صحن مختصر سا تھا۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا اور وہی منظر پیش کرتا تھا جو ایک غریب اور عسرت کے مارے مکینوں کا مقدر ہوتا ہے۔ اندر چارپائی بھی ایک تھی، ایک دو سالخوردہ سی کرسیاں اور موڑھا نما نشست تھی۔ کبیل دادا نے لئیق شاہ کو چارپائی پر ڈال دیا۔ لالاں نے کمرے کی بتی جلا دی تھی، البتہ صحن کی بجھا دی تھی۔

لالاں نے ایک ٹیڑھے میڑھے جست کے جگ میں پانی بھر کے باری باری دونوں کو دیا۔ اس کے بعد ایک نگاہ لئیق شاہ پر ڈالی پھر کبیل دادا سے بولی۔

”یہ تمہارا بھائی ہے؟“

”بھائی ہی سمجھ مگر یہ میرا ساتھی ہے۔“ کبیل دادا نے جواب دیا تو لالاں باری باری عجیب سی نگاہ دونوں پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”تم دونوں ایک ہی جیسے ڈیل ڈول کے ہو خیر، تم اب باہر مت نکلنا... تمہارے دشمن ہر طرف پھیل چکے ہوں گے اب تک۔ پھر تمہارے ساتھی کی حالت بھی ٹھیک نہیں لگتی۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ کسی خیال کے تحت کبیل دادا نے اس سے پوچھ لیا کیونکہ لالاں کے کہنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ انہیں محتاط رہنے کی تنبیہ کرنے کے بعد کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

”میں اُدھر جا رہی ہوں کچے ڈیرے پر... اپنے شوہر کی لاش اٹھانے۔“ اس بار کبیل دادا اسے یوں تکنے لگا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ تمہارا وہاں اس وقت جانا ہمیں بھی خطرے میں ڈال دے گا تم ابھی اِدھر ہی ٹھہرو... اور مجھے کچھ سوچنے دو۔“

”میں صبح ہونے سے پہلے بشیرے کی لاش یہاں لانا چاہتی ہوں۔“ اس نے توجیہہ پیش کرتے ہوئے کبیل دادا کو سمجھانے کی کوشش چاہی۔ ”ورنہ مجھ پر اس کے قتل کا الزام لگ جائے گا۔ گاؤں والے باتیں بنائیں گے میرے خلاف۔“

”تو یہاں لا کر کیا تمہارا بشیرا زندہ ہو جائے گا؟ اس کی خودکشی اور موت تو تم یہاں بھی نہیں چھپا سکتیں؟“ کبیل دادا اسے گھورتا ہوا بولا۔

”میں بہانہ کر دوں گی، رات چور نے نقب لگائی تھی، مقابلے میں وہ مارا گیا۔“ وہ بولی۔

”ہرگز نہیں، اس کی لاش کو ابھی وہیں پڑا رہنے دو۔“

کبیل دادا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور اسے سمجھانے کی کوشش میں مزید بولا۔

''تھوڑی دیر گزرنے دو... میں خود باہر جا کر پہلے حالات کا جائزہ لے آؤں... پتا نہیں میری کار اب وہاں موجود بھی ہوگی یا دشمنوں نے بے کار کر دی ہوگی۔''

''گگ... کبیل...!'' معاً چارپائی پر دراز لئیق شاہ نے اسے نحیف سی آواز میں پکارا۔ تو لالاں اور کبیل دادا دونوں ہی اس کی طرف بیک وقت متوجہ ہوئے جبکہ کبیل دادا اس کے قریب ہی چارپائی پر ٹک کر بیٹھ گیا اور بہ غور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

''ہاں... میں ٹھیک ہی ہوں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے صبح ہونے سے پہلے...'' لئیق شاہ نے کہا تو کبیل دادا بولا۔

''تم فکر نہ کرو، میرا بھی یہی ارادہ ہے اس لیے میں ذرا باہر جا کے حالات کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔''

''تت... تم مجھے کسی طرح کھروڑ پہنچا دو... وہاں ایک قصبہ ہے...''

''بجلی کے پاس جانا چاہتے ہو؟'' کبیل دادا نے اس کی بات کاٹ کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور اس کی بات پر لئیق شاہ بری طرح ٹھٹکا۔

''پریشان نہ ہو... ہم تمہاری تلاش میں وہاں بھی گئے تھے، بختیار علی نے بتایا تھا بجلی کے بارے میں۔'' کبیل دادا بولا اور لئیق شاہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کبیل پھر بولا۔ ''مجھے بیگم صاحبہ نے ہی تمہاری تلاش میں بھیجا تھا، وہ اس سے پہلے خود بھی آئی تھیں۔ اب ان کا یہ حکم ہے کہ میں تمہیں لے کر ملتان بیگم ولا پہنچوں... اب وہی تمہارے لیے محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے لئیق شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لئیق شاہ بے چین سا نظر آنے لگا۔

''مم میرا ابھی انتقام پورا نہیں ہوا ہے جب تک میں چچ... چودھری ممتاز خان کو موت کے گھاٹ نہ اتار ڈالوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

''چھیما کو تم نے ہی ہلاک کیا تھا؟'' معاً کبیل دادا نے بھویں سکیڑ کے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' لئیق شاہ نے بلا تامل جواب دیا۔ اس کے بعد کبیل دادا نے بھی شروع سے اب تک کی ساری کتھا سنا ڈالی۔ یہ بھی کہ بیگم ولا میں پولیس بھی آئی تھی، وغیرہ۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں دادا! میرا ابھی بیگم ولا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس طرح دشمنوں کو بیگم صاحبہ کے خلاف مزید سازشیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔'' لئیق شاہ نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی کوشش چاہی، جسے کبیل دادا سراسر رد کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں میں نے بتا تو دی ہے ساری بات... کہ کس طرح بیگم صاحبہ نے اپنی دانش مندی سے انسپکٹر جرار خان کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔ وہ کافی حد تک معاملہ سنبھال چکی ہیں۔ اب تک تمہارے لیے اچھے وکیل کا بندوبست اور دیگر انتظامات بھی کر چکی ہوں گی۔''

''مگر میں ممتاز خان کو زندہ...''

''او... بس کر... اب یہ رٹ...'' کبیل دادا کا دماغ گرم ہونے لگا۔ غصے سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ مگر پھر جلد ہی کچھ سوچ کر نرم لہجے میں بولا۔ ''او دیکھ یار لئیق شاہ! پولیس تیرے پیچھے پڑ چکی ہے۔ تو جتنا پولیس سے بھاگے گا، اتنا ہی بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ ممتاز خان ابھی اس سرزمین پر رہی ہے۔ اسے اس طرح دشمنوں کو تمہارے اور بیگم صاحبہ کے خلاف مزید گل کھلانے کا موقع ملتا رہے گا۔''

تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''ابھی یہاں سے خیریت سے نکل جانے کی دعا کرو اور بیگم صاحبہ پر بھروسا رکھو۔ ان کی مشکلوں میں اضافہ نہ کرو... وہ تمہاری سچی ہمدرد ہیں اور ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ذرا تم خود بھی اپنے آپ کو سنبھالو۔ زیادہ جوش اچھا نہیں ہوتا۔''

لالاں ایک طرف کھڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ لئیق شاہ کے نحیف چہرے پر کبھی جوش اور کبھی بے بسی و مایوسی کے تاثرات گڈمڈ ہونے لگتے۔ اسے کبیل دادا کی باتوں میں بھی سچائی محسوس ہوتی تو کبھی وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا کہ کہیں اس طرح وہ کسی کے ذاتی مفادات کے لیے استعمال تو نہیں کیا جا رہا؟ یوں تو اسے بیگم صاحبہ کی نیت پر شبہ نہ تھا وہ واقعی اس کے ساتھ مخلص تھیں بلکہ اسے تو بیگم صاحبہ کے بارے میں یہاں تک ادراک تھا کہ معاملہ ''اخلاص و ہمدردی'' سے بہت آگے کا تھا۔ بھلا ایسی عورت اسے اپنے ذاتی مفادات کے لیے کیسے استعمال کر سکتی تھی؟ اسے خاموش اور سوچ میں گم دیکھ کر کبیل دادا اس سے پھر بولا۔

''دیکھ لئیق شاہ! اس وقت ہم دونوں ایک سنگین اور نازک وقت سے گزر رہے ہیں، تمہارے مقابلے میں دشمن طاقتور ہیں۔ ساتھ ہم بھی تمہارا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تم اپنی ضد سے باز آ رہے ہو تو میں ذرا باہر کا چکر لگا آؤں؟'' اس کی اس بات پر بے اختیار لئیق شاہ کے پژمردہ سے ہونٹوں

پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، اور اس نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ کمیل دادا نے لالاں کی طرف دیکھا۔

''کیا میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں؟''

''کس سلسلے میں؟'' لالاں نے الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''یہی کہ تم اِدھر ہی رکو گی... جب تک میں باہر کی خیریت لے کر دوبارہ یہاں نہ لوٹ آؤں؟'' لالاں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔ کمیل دادا مطمئن ہو کر باہر جانے لگا۔ لالاں صحن تک اس کے پیچھے آئی اور کمیل دادا کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچتے ہی لالاں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

''سنو۔''

''ہوں۔'' کمیل دادا رک کر اس کی جانب گھوم کر مختصراً بولا۔

''اپنا خیال رکھنا... دشمن زیادہ تعداد میں ہیں۔''

لالاں کی آواز میں تشویش اور تفکر پایا جاتا تھا۔ کمیل دادا چند ثانیے اسے عجیب سی نظروں سے تکتا رہا پھر کوئی جواب دیے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

باہر گھور تاریکی کا پچھلا پہر گہرے سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماحول خنک تھا۔ لالاں کے گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پاس بھرے ہوئے پستول اور چند فاضل راؤنڈ کی موجودگی کا اطمینان کرلیا تھا۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ وہ تاریکی میں محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

لالاں کے ساتھ کچے ڈیرے سے واپسی کے وقت کمیل دادا حفظِ ماتقدم کے تحت سارا راستہ ذہن نشین کرتا آیا تھا۔ کیونکہ اس کی کار وہاں موجود تھی اور اسے کار کی طرف واپس لوٹنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں تاریکی کا حصہ بنا بل کھاتے ویران راستوں پر چلتا ہوا بالآخر کچے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ یہاں آتے سے اس کے دل میں یہ خدشہ جاگزیں تھا کہ کسی مقام پر ممتاز خان کے ان مسلح حواریوں سے ''ٹاکرا'' ہوسکتا تھا۔ لیکن کمیل دادا ابھی ان نازک حالات میں دشمنوں سے ٹکرانے کا متحمل نہیں تھا اس لیے وہ سارے راستے یہی دعائیں مانگتا رہا کہ ایسا کچھ نہ ہو تو اچھا ہے۔

کچے ڈیرے پہنچ کر وہ رکا۔ تاروں بھری مدھم روشنی میں اسے ڈیرے کی دیواروں کے ہیولے نظر آرہے تھے اور کسی حد تک اندر کا منظر بھی۔ اردگرد خودرو جھاڑیاں تھیں۔ اس نے ان کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ اب دبے پاؤں تھوڑا اور آگے سرکا، ڈیرے کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ احاطے کی دیوار کا اندرونی منظر... باہر سے بھی کسی حد تک دکھائی دیتا تھا۔ وہاں اب دشمنوں کی کوئی گاڑی موجود نہ تھی۔ نہ ہی کوئی ذی نفس نظر آرہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر سوچا یقیناً یہاں کا ''منظر'' دیکھنے اور قیدی (لئیق شاہ) کو غائب پا کر انہیں بہت کچھ معلوم ہوگیا ہوگا، لہٰذا اب کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ اطراف کے علاقے میں بکھر کر ان کی تلاش میں مصروف ہوں۔

کمیل دادا یہاں سے پلٹا... اب اس کا رخ اس جانب تھا، جدھر اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی، وہاں پہنچنے تک وہ دل ہی دل میں اپنی کار کی وہاں موجودگی کی دعا مانگتا رہا تھا کہ وہ دشمنوں کی نظروں میں نہ آسکی ہو یوں بھی اس نے کار کو قدِ آدم اور جھنڈ دار تنوں والے چھتنار پیڑوں کی آڑ میں کھڑا کیا تھا۔ پھر رات بھی تھی، وہ وہاں پہنچا تو یک دم اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ کار اپنی جگہ موجود تھی۔ فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کے دروازہ بند کرنے لگا تھا کہ اچانک وہ تیز روشنی میں نہا گیا اور ساتھ ہی بیک وقت کئی گنیں اس نے اپنی جانب اٹھتے دیکھیں۔

☆☆☆

''خبردار! حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔'' ایک تیز غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری، وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ چہرے پر پڑنے والی تیز روشنی کے باعث اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ دشمن نے اس کے خلاف بڑی زبردست اور ''سچل'' چال چلی تھی، کار ان کی نظروں میں آچکی تھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر دو افراد نے باہر کھینچ لیا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے اور چاروں مسلح بھی۔ ایک نے ہیوی ٹارچ تھامے رکھی تھی، دوسرے نے اس کی فوراً جامہ تلاشی لے کر اسے اکلوتے پستول سے محروم کردیا تھا۔

''ہمیں یقین تھا جس مائی کے لعل نے ہمارے دو آدمیوں پر ہاتھ ڈالا ہے، وہ اِدھر کا رخ ضرور کرے گا۔'' وہی غراہٹ ابھری۔ پھر اس کے کسی ساتھی نے اس سے بہ عجلت کہا۔

''شاکرے! دیر مت کر... اسے فوراً لے چلو تا کہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو زیادہ بھٹکنا نہ پڑے۔''

''اوئے نوازا! اسے بٹھا ڈ گڈی میں۔'' ایک تحکمانہ آواز ابھری۔ قریب چند قدموں کے فاصلے پر ان کی گاڑی موجود تھی، دوسرا بولا۔ ''بہتر یہی ہوگا کہ اسے اس کی کار میں

بٹھا کر لے چلو اور گاڑی یہ خود چلائے گا۔“

”تم اسے لے کر بیٹھو... میں اپنی گڈی اس کے آگے لگاتا ہوں۔“ وہی تحکمانہ آواز ابھری۔

ناچار کبیل کو اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنی پڑی۔ ایک آدمی اس کے برابر والی سیٹ پر جبکہ دو اس کی عقبی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ پیچھے سے ایک نے اپنی گن کی نال اس کی گدی سے لگا رکھی تھی جبکہ ان کا چوتھا ساتھی ذرا دور کھڑی اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے بھی کار اسٹارٹ کر کے مذکورہ گاڑی کے پیچھے چلنے کا حکم ملا تھا۔ کبیل دادا نے کار اسٹارٹ کر کے اس گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ وہ سوچ رہا تھا، اسے کدھر لے جایا جا رہا تھا؟ اب تک اس سے قیدی لئیق شاہ کے بارے میں نہیں پوچھا گیا تھا؟ یا شاید کسی قریبی مقام پر لے جا کر پوچھا جاتا جہاں ان کے اور ساتھی بھی موجود ہوں۔

کبیل دادا خود کو ان کے درمیان چوہے کی طرح پھنسا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا کب تھا مگر اتنی احتیاط برتنے کے باوجود کہیں اس سے غلطی ہو چکی تھی۔ جس کا اب وہ خمیازہ بھگت رہا تھا مگر ساتھ ہی اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس مشکل سے وہ کیسے نکلے...... جو اس کی ساری محنت اور اب تک کی کامیاب ہم کو سبوتاژ کرنے والی تھی۔ اچانک ایک فیصلے پر پہنچ کر کبیل دادا کے اعصاب تن گئے، اس نے سوچا جو کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گن پوائنٹ پر کہاں اور کیوں لے جا رہے ہو؟“

دشمنوں کی چال کے جواب میں جو اس کے ذہن نے جوابی چال سوچی تھی، اس کے تحت وہ بولا تو عقب سے غراتی ہوئی درشت آواز ابھری۔

”زیادہ ہوشیار کاں (کوا) بننے کی ضرورت نہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں تو... کون ہے؟“

”میرا خیال ہے مجھے سچی بات بتانا ہی پڑے گی، تم شاید جسے اپنا وہ دشمن سمجھ رہے ہو جس نے میرے یہاں آنے سے پہلے بڑا خون خرابا مچایا تھا، میں خود مرتے مرتے بچا تھا۔ اگر میں تمہارے اس دشمن کی بات نہ مانتا...“

کبیل دادا نے ہمت نہ ہاری، چال کے جواب میں چال چلتا رہا۔ اسے کچھ کچھ اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ لوگ اسے جانتے نہیں مگر حالات و واقعات کے مطابق ہی اسے اپنا مطلوبہ شکار یا دشمن سمجھ رہے تھے جو ایسا غلط بھی نہ تھا۔ وسیم عرف چھیما ہوتا تو دوسری بات تھی۔ لہٰذا اس کی بات سن کر اس بار اس کے برابر میں براجمان آدمی نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ ”کیسی سچی بات؟ کیا بتانا چاہتا ہے تو؟“

”میں، ٹھیکے دار پرویز اسلم کا منیجر ہوں۔ چودھری دلاور نام ہے میرا۔ یہاں بھٹے کے منشی اور چوکیدار کی ملی بھگت سے اینٹوں کی ڈھیریاں خرد برد کرنے آیا تھا۔ یہاں پہنچا تو پانسا ہی پلٹا ہوا تھا۔ چار پانچ مسلح افراد... جنہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے، قتل و غارت میں مصروف تھے، مجھے بھی انہوں نے چھپا لیا۔ پھر کسی لئیق شاہ نامی قیدی کو چھڑایا انہوں نے... وہ دو آدمی شاید تم لوگوں کے ساتھی ہی ہوں گے جنہوں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے ہاتھوں مقابلے میں تمہارے دشمنوں کے آدمی بھی مرے تھے، صرف ایک ہی زندہ بچ سکا تھا... وہ میری طرح خاصا لمبا چوڑا مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ لئیق شاہ نامی قیدی بھی اس کے ہمراہ تھا... قیدی پر شاید یہاں تشدد کیا جاتا رہا تھا جس کے باعث اس کی حالت خراب تھی، لمبے قد والے نے مجھے گن پوائنٹ پر اسے سنبھالنے اور کاندھے پر لاد کر کار تک لانے پر مجبور کیا۔ پھر مجھے ان دونوں کو اپنی اس کار میں لے کر قریب ایک گھر میں چھوڑ کے آنا پڑا۔“

”مگر تمہاری کار تو کافی دیر سے یہاں موجود تھی اور ہم بھی اتنی ہی دیر سے گھات لگائے یہاں بیٹھے تھے۔ تم کیا اُڑن کھٹولے پر گئے تھے انہیں؟“ عقب میں بیٹھے ایک شخص نے طنزیہ اور ترش لہجے میں کہا تو کبیل دادا کو پہلے سے ہی اس سوال کا اندازہ تھا، وہ اس کا بھی جواب سوچ کے بیٹھا تھا۔ فوراً بولا۔

”مجھے وقت کا کچھ اندازہ نہیں مگر مجھ سے یہی غلطی ہوئی تھی کہ مجھے ان دونوں کو قریبی ٹھکانے پر چھوڑ کے فوراً واپس لوٹ جانا چاہیے تھا مگر لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اس خون ریز مارا ماری کے بعد اس کچے ڈیرے اور بھٹے پر میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میں یہاں سے منشی کی کوٹھری سے فون کرنے گیا تھا اپنے ایک آدمی کو کہ وہ اپنے ساتھ ایک خالی ٹرک اور کچھ مزدور لے آئے، وہ بھی ہمارے ہی نمک خوار تھے، یہاں سے ہم نے تمام اینٹیں چوری کا منصوبہ بنایا تھا، اس سنہری موقع سے میں فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اپنی محنت اکارت جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔“

”اوئے... تو کس منشی کی بات کر رہا ہے؟ وہاں کون

سافون لگا ہوا تھا؟'' ایک درشت آواز میں پوچھا گیا مگر اس کے لہجے سے اب ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ الجھ گیا ہے جبکہ کبیل دادا جو باتیں سوچ کر ہوا میں تیر چلا رہا تھا، اس کے مطابق... ان میں سے کچھ کو بھٹے اور کچھ ڈیرے کے محل وقوع کے بارے میں پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ ہوتا بھی تو اس کی باتوں نے انہیں بہرحال مخمصے میں ضرور ڈال دیا تھا۔ کبیل دادا نے بھی پورے جھوٹ کے بجائے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا مظاہرہ کیا تھا، پورے اعتماد سے جواباً بولا۔

''لو جی، آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا تو ابھی چلو میرے ساتھ... اور سارے ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

''یہ پستول تم نے پھر کیوں اپنے پاس رکھا تھا؟'' ایک اور سوال ہوا، وہ جواباً بولا۔

''کمال کرتے ہو جی! آدمی رات کو میں پستول لے کر ہی نکلوں گا۔ بھاری گنیں تو تمہارے دشمن لائے تھے اور اپنا کام کر کے چلتے بنے۔''

بڑی چالاکی سے کبیل دادا نے انہیں یہ اشارہ بھی جتا دیا تھا کہ بھلا ایک معمولی پستول کے ذریعے وہ اتنا بڑا کارنامہ وہ بھی اکیلے کیسے انجام دے سکتا تھا۔ بات الجھ گئی تھی، یہی سبب تھا کہ ان کے ذہن میں صرف اپنے شکار کو تلاش کرنے کی دُھن سوار تھی، فوراً ہی ساتھ بیٹھے آدمی نے کبیل دادا کو کار روکنے کا حکم دیا۔

''کار اس طرف موڑ دو جس گھر میں ہمارے شکار موجود ہیں، خبردار! کوئی چالاکی نہ کرنا... ورنہ گولیوں سے بھون دیں گے۔''

''نا جی۔ میری جان چھٹ جائے... میرے لیے یہی بہت ہے۔'' کبیل دادا نے دانستہ خود کو ان پر ڈرپوک ظاہر کرنے کی کوشش چاہی۔

ان کے حکم پر کبیل دادا نے فوراً اسٹیئرنگ کاٹا... اب اس کا رخ... واقعی لالاں کے گھر کی جانب تھا۔ آگے جانے والی گاڑی انہیں پلٹتا دیکھ کر... اب وہ ان کے تعاقب میں ہوگئی تھی، بہرحال اس کے قریب پہنچنے پر انہوں نے اسے ساری بات بتادی تھی۔ وہ بھی کچھ الجھا سا گیا تھا اور یقین و غیر یقینی کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرطور ان چاروں کو یہی زعم تھا کہ ایک اکیلا اور غیر مسلح آدمی بھلا ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اس کی چال میں آ گئے۔

کبیل دادا کا ایک مقصد پورا ہو چکا تھا کہ وہ ان کے دیگر ساتھیوں کے ملنے سے پہلے ہی ان کی تعداد کو محدود کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ کار میں صرف تین افراد تھے، وہ ان پر کسی طرح قابو پانے کی سوچ رہا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ انہیں لالاں کے گھر کی طرف ہی لیے جا رہا تھا۔ ذرا دیر میں یہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ کبیل دادا کا دل اب جیسے فرطِ جوش سے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ چال اس کی اپنے لیے اور لئیق شاہ کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی کہ اگر وہ بروقت ان پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو یہی چال اس پر الٹ سکتی تھی اور دشمنوں کو ان کا شکار گویا تھالی میں پیش ہو جاتا۔

کبیل دادا نے کار دانستہ مذکورہ گھر سے کچھ فاصلے پر روکی تھی اور بڑے دھڑلے کے ساتھ نیچے اتر آیا تھا۔ دوسری گاڑی میں موجود ان کا چوتھا ساتھی بھی اپنی گن سنبھالے نیچے اتر آیا تھا۔ گھر کے دروازے کے قریب پہنچ کر کبیل دادا نے سرگوشی میں ان سے کہا۔ ''ابھی ٹھہرو! میں دستک دوں گا پہلے... اندر ایک عورت موجود ہے۔ وہی دروازہ کھولے گی۔ اس کے بعد تمہارا کام خود ہی آسان ہو جائے گا مگر خدا کے لیے مجھے جانے دینا... میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا... ورنہ بعد میں کہیں ان کے ساتھی میری جان کے دشمن نہ بن جائیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' ایک نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم اِدھر ہی ٹھہرو گے، پہلے ہم اپنے شکار کی تسلی کر لیں، تم دور ہی کھڑے رہو گے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آدمی سے کہا۔

''نوازے! اس کو لے جا کر اپنے ساتھ ذرا دور کھڑا ہو جا۔ ہم تینوں اندر داخل ہوں گے، شکار ملتے ہی تجھے دور سے اشارہ کر دیں گے تو اس کو جانے دینا بلاوجہ خون خرابے سے ہم خود بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اس کی بات پر کبیل دادا دانستہ ''معصوم'' بنتے ہوئے لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ اندر فقط تین آدمی ہیں۔ لئیق شاہ، اس کا ساتھی، جو خود بھی زخمی ہے۔ تیسری وہ عورت... اس بے چاری کو کچھ مت کہنا... تمہارا کام ویسے بھی آسان ہو گیا ہے اب اپنے شکار کو لے جانا... بے شک اس کے ساتھی کو مار ڈالنا... پر عورت کو کچھ نہیں کہنا۔''

''لگتا ہے تیرا دل آ گیا ہے اس پر؟'' ایک نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو کبیل دادا شرمانے کی سی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے جی۔''

وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ خطرناک رسک لیے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھتے کبیل دادا کو بھی نظر

نہیں آرہی تھی، تاہم وہ سردست اپنے چار موجود... دشمنوں کی طاقت کو منقسم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا جو اس کی چال کی بنیاد تھی۔ اب گھر سے ذرا فاصلے پر وہ شاکر نامی مسلح آدمی کے ساتھ کار کی آڑ لیے کھڑا تھا۔ ان کی نظریں دروازے پر تھیں۔ دستک پر لالاں نے ہی دروازہ کھولا۔ تین مسلح آدمیوں کو دروازے پر دیکھ کر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نے اس کا منہ دبوچ لیا۔ لالاں کو کبیل دادا نے خوف سے غش کھا کر ایک آدمی کے ہاتھوں میں جھولتے دیکھا۔ کبیل دادا کی ایک بات سچ ثابت ہوئی تھی، اس کے ساتھ موجود آدمی کا چہرہ فرطِ مسرت .... سے سرخ ہونے لگا اور یہی وقت تھا جب وہ کبیل دادا کی طرف سے لمحے بھر کو غافل ہو گیا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑا آدمی اس وقت ان سے بھی زیادہ خطرناک تھا جیسے ہی وہ تینوں اندر غائب ہوئے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ اپنے مضبوط بازو کی کہنی کی زبردست ٹکر دشمن کے پیٹ پر رسید کی۔ اس کے لیے یہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ نتیجتاً مار کھا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرنے تک کبیل دادا اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کا شکنجہ کس کر جھٹکے کے ساتھ منکا توڑ چکا تھا۔

اس کی لاش زمین بوس کرنے کے بعد کبیل دادا نے اس کی گن سنبھالی اور تیزی کے ساتھ دروازے پر پہنچا۔ اندر وہ دونوں اپنی مہم میں مست تھے، دروازہ ادھ بھڑا تھا۔ پہلے اس نے اپنی ایک آنکھ موٹی جھری سے لگا کر اندر جھانکا۔ دونوں لئیق شاہ کو دبوچے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے، کبیل دادا لپک کر دائیں جانب ہو گیا۔ دونوں لئیق شاہ کو لیے باہر نکلے تو عقب سے کبیل دادا قیامت بن کر ان پر ٹوٹا۔ ایک کی کمر پر لات رسید کر ڈالی دوسرے کی گردن کے پچھلے حصے میں رائفل کا کندا بڑے زور سے رسید کیا تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں کے لیے یہ حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا، جسے لات رسید کی تھی وہ بری طرح تڑپ کر کئی قدم دور تک لڑکھڑایا تھا اور زمین پر لڑھکنیاں کھاتا چلا گیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی، دوسرے کی گردن رائفل کے کندے کی ضرب نے دہری کر دی تھی، اس نے البتہ سنبھلنے میں پھرتی دکھانی چاہی تھی مگر کبیل دادا نے دوسرا وار اس کے چہرے پر کیا تھا اور اس کا جبڑا چٹخا دیا تھا۔ لئیق شاہ نڈھال ہونے کے باوجود کبیل دادا کی مدد میں حرکت میں آیا اور چلا کے پہلے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبیل دادا سے بولا۔

"اسے سنبھالو... وہ رائفل کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

اس کے بعد وہ اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا اور زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا، کبیل دادا نے پہلے والے شکار کو دیکھا جو زمین پر لیٹے لیٹے قریب پڑی رائفل کی طرف کھسک رہا تھا، قریب پہنچ کر کبیل نے اس کے چہرے کو ٹھوکروں پر رکھ لیا پھر اس کی رائفل اٹھا کر پرے پھینک دی۔ دوسرے شکار کی طرف پلٹا جس سے لئیق شاہ نبرد آزما تھا تو چونک پڑا۔ زخمی اور نحیف ہونے کے باوجود لئیق شاہ اپنے زخمی مضروب شکار کو زمین بوس کیے اس کے سینے پر چڑھا اس کا گلا دبوچ رہا تھا جب تک کبیل دادا قریب پہنچا، وہ اسے ختم کر چکا تھا۔ مگر لئیق شاہ کا غیظ کم نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر وہ پر غضب جوش بھرا تھا جو وہ اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔

"یہ ختم ہو چکا؟ چل اٹھ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ان کے دو ساتھی بھی یہاں پھیلے ہوئے ہیں۔" کبیل دادا نے کہا تو لئیق شاہ سنبھلا۔ اچانک کبیل دادا کو لالاں کا خیال آیا۔ لئیق شاہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ وہ اندر نیم بے ہوش پڑی تھی۔

"اسے ہوش آجائے گا چلو ہم نکلتے ہیں۔" کبیل نے کہا۔

لئیق شاہ بولا۔ "نہیں، دشمن اس عورت کو ہمارا ساتھی سمجھیں گے اب... وہ اسے نہیں چھوڑیں گے، اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" معاً ملگجی سی تاریکی میں عقب سے آواز ابھری۔ دونوں چونک کر مڑے ان کے عقب میں لالاں کھڑی تھی، بکھرے بالوں اور مسلے ہوئے کپڑوں کے ساتھ... لالاں کو جانے کب ہوش آچکا تھا.... وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے گھر کے دروازے سے لگی کھڑی ان کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ "میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی... یہاں میرا کون ہے بھلا۔ جو تھا وہ مر چکا۔ صبح ہونے والی ہے تم مجھے لاری اڈے پر اتار دو یا پھر مین روڈ پر... میں کسی بس میں بیٹھ کر لاہور نکل جاؤں گی۔ وہاں میرے کچھ قریبی عزیز رہتے ہیں۔"

"جلدی کر پھر کڑیے! اس تھوڑے سے وقت کو بہت جان اور اپنا ضروری سامان سمیٹ لے۔" کبیل دادا نے فوراً اس سے کہا پھر لئیق شاہ کو سنبھالے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اسے عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اپنا پستول قبضے میں کیا جو اسے ایک شکار کی تلاشی لینے کے بعد مل گیا۔ لالاں نے روانگی کی تیاری میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی، ایک ٹین کا بکس اور کپڑے کی بڑی سی گٹھڑی اس نے سنبھال رکھی تھی۔

اگلے چند منٹوں میں یہ تینوں کار میں روانہ ہو گئے۔ لالاں کو مین روڈ کے بجائے لاری اڈے پر ہی اتارنا پڑا تھا۔ ایک جوان اور بے خانماں عورت کے لیے یہی قدرے محفوظ جگہ تھی، پھر کار میں اتنی جگہ بھی نہ ہوتی کیونکہ آگے اسے اپنے زخمی ساتھی جہانگیر کو بختیار علی کے گھر سے لینا تھا۔ کبیل دادا نے چند بڑے نوٹ لالاں کو تھما دیے تھے۔ پھر کار کا رخ نئے پنڈ کی طرف موڑ دیا۔ دشمنوں سے اب بھی کسی مقام پر ٹکرا ہونے کا خطرہ ممکن تھا۔ مگر کبیل دادا اپنے ساتھی کو یہاں دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ کے جانا چاہتا تھا۔

منہ اندھیرے ہی وہ بختیار علی کے گھر جا پہنچا۔ جہانگیر کی طبیعت کچھ بہتر تھی مگر اب بھی اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ بختیار علی اپنے یار لئیق شاہ کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر دکھی ہو گیا تاہم اس نے کبیل دادا کی بہادری کی تعریف بھی کی، پھر یہ لوگ وہاں زیادہ دیر نہیں رکے، تاہم روانہ ہوتے وقت بختیار علی نے کبیل دادا کو نئے پنڈ سے بحفاظت نکلنے کا ایک نسبتاً محفوظ راستہ بھی سمجھا دیا جہاں دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ نسبتاً کم تھا۔ کبیل دادا نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔

دن کی روشنی پھیلنے تک بالآخر یہ لوگ بہ خیر و عافیت بیگم ولا پہنچ گئے۔

کبیل دادا چشم تصور میں... بیگم صاحبہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ جب وہ لئیق شاہ کو زندہ سلامت دیکھے گی تو کس قدر مسرتیں ان کے پژمردہ چہرے پر امڈ آئیں گی اور یہی ہوا۔ جب کبیل دادا نے لئیق شاہ کو وہاں لانے کا اپنا وعدہ ایفا کیا تو لئیق شاہ کو اپنی چھت کے نیچے زندہ سلامت دیکھ کر پہلے تو زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ پھر جیسے وہ لئیق شاہ کی حالتِ زار دیکھ کر ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور لئیق شاہ سمیت جہانگیر کی تیمارداری کا حکم جاری کر دیا۔

"کبیل دادا! تم واقعی دادا ہو... آج میں اپنے انتخاب پر کھل کر فخر کرتی ہوں۔ جب میں نے تمہارے باپ منشی فضل محمد کے ساتھ تمہیں دیکھا تھا اور تمہیں اپنے گروہ کی تشکیل دینے کی ابتدا میں ایک مضبوط، جی دار اور جاں نثار ساتھی کے روپ میں شامل کیا تھا، میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتی اور مجھے طیفے نے یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح تم نے یہاں سے نئے پنڈ پہنچتے ہی خلوصِ نیت اور دانش مندی کے ساتھ لئیق شاہ کا کھوج لگایا تھا۔" ایک موقع پر زہرہ بانو نے کبیل دادا کی کھلے دل سے تعریف و توصیف کر ڈالی تو کبیل دادا اپنی مسکراہٹ کی تہ میں ایک حسرت زدہ سی کسک دبائے ہوئے بولا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا اور پھر احسان کیسا، بھلا ملازم بھی مالکوں پر کوئی احسان کرتے ہیں؟"

کبیل دادا نے آخری بات نظریں جھکا کر کہی تھی اور اس میں ایک... درد چھپا ہوا تھا۔ کبیل دادا نے یہ آخری بات کچھ ایسے انداز میں کہی تھی کہ ایک محض چند ثانیوں کے لیے بیگم صاحبہ کے دل کو مزید اشارہ سا کرتی محسوس ہوئی، جس کی ان کے پاس کوئی توجیہہ کوئی تاویل نہ تھی... زہرہ بانو کے سینے میں دھڑکتے دل کی مخصوص ردھم لمحے بھر کو... چوکی ضرور تھی اور پھر سب نارمل ہو گیا۔

زہرہ بانو کی اس لمحے بھر کی سوچتی خاموشی نے کبیل دادا کو بھی تھوڑا اٹھکا دیا۔ جب اس نے نظر اٹھا کر زہرہ بانو کی طرف دیکھا تو یکلخت کبیل دادا کو اپنا دل مٹھی میں جکڑتا محسوس ہونے لگا۔ زہرہ بانو بڑی گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالے ہوئے تھی، یکایک کبیل دادا کے دل و دماغ میں بجوں جیسا ایک نامعلوم سا ازلی خوف جاگا... جیسے اب اچانک سب کچھ ختم ہونے والا ہو... وہ اس کے دل کا وہ حال جاننے لگی تھی جو وہ اب تک اس خوف اور ڈر سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا کہ اگر وہ "بیگم صاحبہ" پر آشکارا ہوا تو وہ چشم زدن میں نہ صرف اسے خود سے دور کر دیں گی بلکہ تاعمر اس کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہ کریں گی۔ یہ سوچ کر وہ لرز گیا۔ اور پھر جلدی سے بات بدلنے کی غرض سے بولا۔

"بیگم صاحبہ! اب لئیق شاہ کو قانون سے بچانے کی بھی ہمیں جلد ہی کوئی تدبیر کرنا ہوگی، ایسا نہ ہو دشمن دوسری چال چلنے کی کوشش کرے۔"

"ہاں۔" زہرہ بانو نے ایک مختصر سی مگر گہری ہمکاری بھری۔ "میں اس کا بندوبست کر چکی ہوں۔ تمہاری غیر موجودگی میں... انسپکٹر جہانزیب سے بھی رابطہ کر چکی ہوں۔ اس نے نہ صرف بھرپور تعاون کا وعدہ کیا ہے بلکہ وہ مجھے یہ بات بھی بتا چکا ہے کہ وہ سینٹرل پولیس میں چھیما کے مجھ پر قاتلانہ حملے اور اس کی گرفتاری کے بعد میں ممتاز خان کی ضمانت پر رہائی کی رپورٹ ریکارڈ کے طور پر بہت پہلے جمع کرا چکا ہے۔ اب میرا وکیل ریکارڈ کیپر سے وہ کاپی حاصل کر لے گا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے بیگم صاحبہ۔" کبیل دادا بولا۔ "اس طرح تو ممتاز خان خود ایک مقدمے کا شکار بھی ہو سکتا ہے اسے پھر یقیناً لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"ہاں، لیکن اگر ایسا ہوا تو میں شاید ممتاز خان کے کیس کو زیادہ نہ کھینچ سکوں... البتہ یہ ہوگا کہ لئیق شاہ کی جان چھوٹ جائے گی پولیس سے۔" زہرہ بانو کی بات پر کمیل دادا نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں بیگم صاحبہ! آپ ایسا کیوں کریں گی؟" پھر جیسے وہ اپنے تئیں زہرہ بانو کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور خود ہی اس کا جواب بھی دے ڈالا بولا۔ "شاید آپ ایسا اس لیے کہہ رہی ہیں کہ وہ آپ کا سوتیلا بھائی ہے؟"

"نہیں۔" زہرہ بانو نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "یہ بات نہیں۔ چودھری ممتاز تو مجھے اپنی سوتیلی بہن کا... بلکہ سرے سے بہن کا ہی درجہ نہیں دیتا ہے۔" یہ بتاتے ہوئے زہرہ بانو کے چہرے پر تلخی کے آثار ابھرے تھے۔ کمیل دادا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر کیا وجہ ہے اس کی بیگم صاحبہ... کہ آپ..." اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو زہرہ بانو نے کہا۔

"چودھری الف خان، میں انہیں بہر حال اب بھی باپ کا درجہ دیتی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بھی مجھے آج تک اپنی اولاد ہی سمجھا... مگر کب تک؟ یہ سب تب تک ہی رہا جب امی جان (ستارہ بیگم) زندہ رہیں... اس کے بعد سب پھیکا پڑ گیا۔"

"تو اس کا مطلب ہے آپ وڈے چودھری کی وجہ سے ممتاز خان کے خلاف لمبا مقدمہ نہیں کھینچ سکتیں؟"

"ہاں، کمیل دادا! تم ٹھیک سمجھے۔"

"لیکن بیگم صاحبہ! آپ یہ بھی تو دیکھیں، وہ نکا چودھری ممتاز آپ کا اس وقت جانی دشمن بنا ہوا ہے۔" کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر تشویش سے کہا۔ "وہ آپ کو خدانخواستہ جانی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ..."

"میں اپنے حصے کی زمین و جائداد اس کے نام لکھ دوں۔" زہرہ بانو نے کمیل کی جیسے بات مکمل کر ڈالی۔ "میں یہ سب کچھ کر بھی لیتی لیکن اب نہیں کروں گی۔ مجھے ایسی جائداد اور دولت سے تو اس دن ہی نفرت ہو گئی تھی، کمیل دادا... جب اس کی وجہ سے پہلے میری امی جان "سیندور سازش" کا نشانہ بنی تھیں اور بالآخر ان کی موت کا سبب بھی بنی، انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ میں مہرالنسا اور ممتاز خان کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی حاصل کر چکی تھی، مگر پھر اپنے باپ الف خان کی وجہ سے میں نے اپنی ماں کا خون ضائع جانے دیا۔ اسی سبب میرا اب نئے پنڈ سے بھی دل خراب ہو گیا ہے۔" کمیل دادا اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وقت، حالات کی گردش اور زہرہ بانو کی سنگت میں گزرے ہوئے دنوں کی سنگین و خوں ریز وارداتوں نے اسے بھی کچھ ایسی سوجھ بوجھ عطا کر ڈالی تھی۔ زہرہ بانو کی ایک بات پر ذرا الجھ سا گیا تھا۔ وہ اب اس سلسلے میں اندر ہی اندر غور کر رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگے کمیل دادا؟" معاً ہی زہرہ بانو کو بھی اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے یک دم چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس بات کا اندازہ بیگم صاحبہ کو تھا بھی کہ نہیں اور اگر نہیں تھا تو اسے انہیں احساس دلانا چاہیے تھا۔

"بیگم صاحبہ! ایک بات آپ کی میرے لیے کچھ الجھن کا باعث بن رہی ہے۔" بالآخر اس نے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"کمیل دادا... مت بھولو کہ تم اب میرے دائیں بازو کی حیثیت اختیار کر چکے ہو، گروہ میں میرے بعد تمہاری ہی حیثیت ہے اور تمہارا ہی حکم چلتا ہے۔ اس لیے اگر مجھ سے بھی تمہارے دل میں کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے تو بلاجھجک اس کا اظہار کر دیا کرو خواہ وہ بات مجھ سے متعلق ہو یا لئیق شاہ سے..."

زہرہ بانو کی اس بات نے کمیل دادا کا سیروں خون بڑھا دیا۔ سارے اختیارات ایک طرف تھے، مگر لئیق شاہ پر بیگم صاحبہ کا کمیل دادا کو اختیار دینا ایک طرف تھا۔ زہرہ بانو کی اس بات نے کمیل دادا کو ایک ایسا مان دیا تھا کہ اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اور یہ مان اسے ایسے ہی نہیں ملا تھا مگر وہ کسر نفسی سے بولا۔

"بیگم صاحبہ! آپ... آ... آپ نے تو مجھے بڑا مان دے دیا۔ میری اوقات سے بھی شاید بڑھ کر..."

"کمیل دادا! تمہاری کیا حیثیت ہے یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم سچے، وفادار اور جاں نثار ساتھیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ایسے ساتھی جو اپنے ذاتی مفادات سے ہٹ کر دوسرے کے لیے سوچتے اور کرتے ہیں... کیا کہنا چاہتے تھے تم؟" زہرہ بانو نے آخر میں اس کی طرف دیکھا۔

"بیگم صاحبہ! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اگر آپ لئیق شاہ کا کیس جیت جاتی ہیں انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا بھی... پھر چودھری ممتاز خان کو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے یعنی ان کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ لیکن آپ شاید وڈے چودھری (الف خان) کی وجہ سے ممتاز خان

کے خلاف مقدمے کو طول نہ دیں اور محض لئیق شاہ کی قانونی بریت تک اپنی لڑائی محدود رکھیں۔ تو کیا اس طرح لئیق شاہ کا آپ سے دل خراب نہیں ہو جائے گا؟ کیونکہ ممتاز خان بہرحال... اس کے بوڑھے ماں باپ کا قاتل ہے اور وہ کسی صورت یہ نہیں چاہے گا کہ ممتاز خان کو معاف کر دیا جائے۔''

کبیل دادا نے اپنی بات ختم کر کے بہ غور زہرہ بانو کے چہرے کو دیکھا جو اس کی بات پر لحہ بھر کو تاریک سا پڑ گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولی۔

''ہاں، ہمارے ذہن میں بھی یہ خدشہ آیا تھا۔ لئیق شاہ ہماری طرف سے کسی ایسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے اور ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ لیکن وقت اور حالات نے اسے بعد میں خود ہی بہت سی تلخ حقیقتوں کو زہر کا پیالہ سمجھ کر پینا سکھلا دیا تھا شاید اس بار بھی ایسا ہی ہو۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا بیگم صاحبہ؟'' کبیل دادا نے ایک مشورہ دینا چاہا۔

''کیا مطلب؟'' زہرہ بانو نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم لئیق شاہ کے لیے اتنا کچھ کر چکیں گے کہ اس کے لیے یہی کافی ہوگا۔ پھر وسیم عرف چھیما کو بھی وہ ہلاک کر چکا ہے۔ ممتاز خان کی طاقت سے وہ بھی اچھی طرح واقف ہے بقول آپ کے جب ممتاز خان پر کیس بھاری پڑنے لگے گا تو اپنا ہاتھ خود ہی ہولا کر دیں گے، وہ اپنے اثر ورسوخ اور دولت کے بل پر خود کو چھڑا لے گا۔ تو یہ ایک منطقی بات ہو گی، اس طرح آپ سے اس کا دل بھی خراب نہ ہوگا۔ مقصد یہ کہ اسے بتانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ آپ نے وڈے چودھری کی وجہ سے ممتاز خان کو معاف...

''ہرگز نہیں۔'' معاً زہرہ بانو اس کی بات کا مطلب سمجھ کر یک دم بولی۔ ''اس طرح ہم لئیق شاہ سے حقیقت چھپائیں گے تو ہماری طرف سے اس کے دل میں غلط فہمی مزید بڑھ جائے گی۔ بلکہ کوئی بعید نہیں کہ وہ ہم سے متنفر بھی ہو جائے۔'' ذرا توقف سے وہ پھر گویا ہوئی۔

''لئیق شاہ کو بھی ہماری طرح یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ آخر کو ہم نے بھی تو اپنی ماں کا خون ممتاز خان اور اس کی ماں مہرالنسا کو معاف کر رکھا ہے... وہ اپنے شوہر کی وفادار ہی تھیں ساری عمر... اپنی ذات پر ہر بھاری پتھر انہوں نے برداشت کیا تھا مگر شوہر کی عزت وآن پر آنچ تک نہیں آنے دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا جانی نے بھی امی جان کے ساتھ ہر وعدہ نبھایا تھا۔ وہ آخری وقت تک امی جان کی محبت کا دم بھرتے رہے تھے۔''

کبیل دادا چند ثانیے خاموش رہا پھر آخر میں بولا۔ ''میں تو یہی دعا کرتا ہوں کہ آگے کے معاملات بہ خیر وخوبی طے پا جائیں، ایک حقیقت میں آپ کو اور بتاتا چلوں بیگم صاحبہ کہ وہ بدنصیب اور غریب بوڑھے میاں بیوی... لئیق شاہ کے حقیقی ماں باپ نہیں تھے۔'' اس کے بعد کبیل دادا نے بختیار علی سے حاصل کردہ لئیق شاہ کے ماضی سے متعلق ایک حد تک معلومات زہرہ بیگم سے گوش گزار کر دیں۔ یہ انکشاف بلاشبہ زہرہ بانو کے لیے بھی چونکا دینے والا ہی تھا۔

بہرحال... تھوڑی دیر مزید ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد زہرہ بانو اٹھ کر لئیق شاہ کے کمرے میں آ گئی۔

زہرہ بانو کا اپنا کمرا بالائی منزل پر تھا۔

لئیق شاہ اور جہانگیر کی طبی امداد کے سلسلے میں ایک پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر کو اعتماد میں لے کر علاج معالجے کا بندوبست پہلے ہی کیا جا چکا تھا جس کے تحت لئیق شاہ کافی بہتر نظر آ رہا تھا۔ باقی طبیعت وقت کے ساتھ ساتھ ہی بہتر ہونا تھی، اس کی امید بھی مذکورہ ڈاکٹر نے زہرہ بانو کو دی تھی۔

لئیق شاہ اس وقت آرام دہ کشادہ بیڈ پر دراز تھا اور زہرہ بانو دروازے پر کھڑی یک ٹک اسے تکے جا رہی تھی۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں درد کے سائے ابھرے اور خدشات کی آندھی اسے اندر سے کھدیڑنے لگی۔ ''لئیق شاہ! میں نے بڑی مشکلوں سے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ اب ڈرتی ہوں حالات اور وقت نے تمہیں مجھ سے دور کر دیا تھا مگر تقدیر پھر تمہیں میرے پاس لے تو آئی ہے کہیں ایسا تو نہ ہوگا ایک ذرا غلط فہمی کی آندھی پھر تمہیں مجھ سے جدا نہ کر دے۔ اگر ایسا ہوا لئیق شاہ اتم مجھ سے پھر دور ہو گئے تو میں بھی خود سے دور ہو جاؤں گی اور شاید زندگی سے بھی... اس لیے کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار ہی کسی کو اپنا دل دیتی ہے اور جس کو اپنے خانہ دل کے سنگھاسن پر بٹھاتی ہے پھر اس کی جگہ دوسرا کوئی نہیں لیتا۔ کاش! تم وقت سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھ سکو... کاش!'' یہ سوچتے ہوئے زہرہ بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

مذکورہ ڈاکٹر نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ خاموشی سے واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

ایڈووکیٹ نسیم پراچہ سے صلاح مشورے کے بعد اس نے لئیق شاہ کی سب سے پہلے قبل از گرفتاری ضمانت کروالی۔ انسپکٹر جہانزیب اور پرانے داخل دفتر ریکارڈ کی خاطر خواہ

اور تھرو پراپر چینل کے ذریعے ری اوپننگ کے بعد ممتاز خان کے خلاف کیس مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عدالت نے چودھری ممتاز کی گرفتاری کے احکامات تک جاری کردیے۔ یہ ایام بڑی دوڑ دھوپ اور زبردست کشاکشی میں گزرے تھے اور جلد سے جلد کرنے کے متقاضی بھی تھے کیونکہ لئیق شاہ... اس وقت بیگم ولا میں تھا اور ممتاز خان کسی بھی وقت کوئی نیا گل کھلا سکتا تھا۔

پھر وہ نازک مرحلہ بھی آیا جب زہرہ بانو... اپنے قابل وکیل نسیم پراچہ کے ذریعے ممتاز خان اور اس کی ماں مہرالنسا کے خلاف مزید کیس کھول کر دونوں ماں بیٹے کو قانون کی چکی میں پیس کر رکھ دیتی مگر ایسے میں پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی مرحومہ ماں ستارہ بیگم کا چہرہ رقصاں ہونے لگتا۔ ”زہرہ بیٹی! الف خان نے میرے ساتھ ہر وعدہ نبھایا تھا، اس نے مجھے کوٹھے سے ایک گھر کے چراغ کی زینت بنایا تھا۔ میرے ساتھ ایک باعزت رشتہ استوار کیا تھا۔ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی حویلی لا کر ایک مقام دیا تھا۔ اپنے خاندان کے ساتھ ہمارا رشتہ جوڑا تھا۔ اور رشتے کو آخر تک برقرار بھی رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اپنے شوہر کے خاندان کی عزت اس کی آن کو اپنی شان سمجھنے لگی تھی۔ اپنی ذات پر سب کچھ سہہ لیا مگر اپنے وفادار شوہر کی آن بان پر آنچ تک نہ آنے دی۔ تو اب کیا تم میری خان جی کے ساتھ کی وفاداریوں کو گہنا دو گی؟ وہ کیا سوچیں گے؟ نہیں زہرہ بیٹی... نہیں، انہیں ایسا درد نہ دینا۔ وہ پہلے ہی میری دائمی جدائی کا درد لیے ہوئے ہیں۔“

یہ سب سوچتے ہوئے زہرہ بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے وکیل کے ذریعے ہی معافی نامہ لکھ کر عدالت میں پیش کر دیا۔ اس صلح نامے بالالفاظ دیگر راضی نامے کے سبب عدالت نے ممتاز خان کو باعزت بری کر دیا تھا۔

دوسرے دن بیگم ولا میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ جب زہرہ بانو وغیرہ کو خادموں نے بوکھلاتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ تتے پنڈ سے وڈے چودھری (الف خان) تشریف لائے ہیں۔ زہرہ بانو تڑپ اٹھی۔ وہ اس کا باپ نہیں تھا مگر سگے باپ کی طرح ہی الف خان نے اسے پیار دیا تھا۔ روبہ صحت ہونے کے بعد وہ شاید آج پہلی بار ہی حویلی سے نکلے تھے۔ ان کی آمد پر... زہرہ بانو کو کچھ خوف کا احساس بھی ہوا تھا۔ یہ خوف ایک احترام کے پیشِ نظر تھا مگر حقیقت مختلف تھی جب چودھری الف خان نے زہرہ بانو کو دیکھتے ہی آبدیدہ آنکھوں سے اسے اپنے ساتھ لگا کے محبت و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”بیٹی! تو نے خود اپنی طرف سے معافی نامہ اور صلح نامہ داخل کر کے میری عزت بچالی۔ میں تیرے دکھوں سے واقف ہوں مگر اپنی بدنصیبی اور بے بسی پر روتا بھی ہوں۔ سب جانتا ہوں میں، یہ سب تیری ماں کے ساتھ بھی ہوا کرتا تھا۔ مگر آفرین ہے اس عظیم عورت پر اس نے کبھی مجھے کسی دکھ یا پریشانی میں جتلا نہیں کیا۔ سب کچھ اپنی ذات پر سہتی رہی وہ... اور آج... آج... اس کی بیٹی بھی ایک ایسے آدمی کے لیے وہی کچھ کر رہی ہے جو اس کی اولاد بھی نہیں... مگر اللہ گواہ ہے بیٹی! میں نے تمہاری ماں ستارہ سے وعدے کے مطابق اس دن تمہیں اپنی بیٹی کا درجہ دے ڈالا تھا جب وہ میری دلہن بن کر حویلی میں آئی تھی اور تم اس کی گود میں تھیں۔“

زہرہ بانو تڑپ گئی، اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ چودھری الف خان کے پُرشفیق سینے پر رگڑتے ہوئے دردانگیز لہجے میں بولی۔

”بابا جانی! میں جانتی ہوں آپ نے کبھی مجھے سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ امی جان کی وفات کے بعد میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ ایک بیٹی کی طرح آپ کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مجھے حویلی چھوڑنا پڑی۔ اس لیے کہ میری وجہ سے آپ کے گھر آپ کے خاندان کی فضا مزید تلخ نہ ہو۔“

”مگر بیٹی! تم نے دور رہتے ہوئے بھی ہمارا خیال رکھا۔ کبھی کبھی ہمیں احساس ہوتا ہے جیسے میں تمہاری ماں کا ہی نہیں تمہارا بھی مجرم ہوں۔ ہوسکے تو ہمیں معاف کر دینا۔“ چودھری الف خان نے کہا۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ گیا۔

زہرہ بانو کو یوں لگا جیسے اس کے سر سے... اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا ہو مگر چودھری الف خان کے جاتے ہی... زہرہ بانو کو ایک پہاڑ جیسے بار نے جکڑ لیا۔ جب اس نے لئیق شاہ کو اپنے رُوبرو دیکھا۔ وہ اس کی طرف گم صم نظروں سے تکے جا رہا تھا۔ یکلخت زہرہ بانو کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک بار پھر تقدیر اسے بڑے امتحان میں ڈالنے والی ہے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

زندہ لاش

سلیم انور

ارادے کی پختگی بڑے سے بڑے کام کو سہل بنا دیتی ہے... اس کے عزم و ہمت کے سامنے ہر رکاوٹ ریت کی دیوار کے مانند تھی... عزم... ارادے اور یقین کے سہارے جیت لینے والی بازی کا عجیب و غریب قصہ...

ایک پیشہ ور مجرم کی چابک دستی اور پولیس اہلکار کی بروقت حاضر دماغی...

سراغ رساں بل کیپٹن رک گیا۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ وہ چوکنے انداز میں نیم تاریک تہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے احساس تھا کہ وہ کسی خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنے نکلا ہے۔

اس نے اپنے ساتھی سراغ رساں ریمنڈ کو اس حقیقت سے خبردار کر دیا تھا جب چوبیس گھنٹے قبل اس نے تن تنہا یہاں آنے کی ضد کی تھی کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو

جائے۔ لیکن ریمنڈ ایک تو جوان اور انجام سے بے پروا نڈر سراغ رساں تھا، حالانکہ ایک فرسٹ گریڈ ڈیٹیکٹو ہونے کے ناتے اسے احتیاط پسند ہونا چاہیے تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ مطلوب مجرم ڈارکن کی جائے پناہ ہے۔“ ریمنڈ نے کیپٹن سے کہا تھا۔ ”اگر میں وہاں داخل ہو کر اس کا جائزہ لے لوں گا تو ہوسکتا ہے میں اس بات کو ثابت کردوں۔“

”کیوں نا وہاں پر چھاپا مار لیا جائے؟“ کیپٹن نے تجویز دی تھی۔ ”ڈارکن کئی مقدمات میں مطلوب ہے۔“

”یہ بہت زیادہ رسکی ہوگا۔ کئی لوگوں کی اطراف میں موجودگی کی خبر اس تک پہلے سے پہنچ سکتی ہے اور اس سے قبل کہ اسے گھیر لیا جائے، وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بے حد اسمارٹ ہے کہ پولیس کی ٹکڑیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے وہاں ڈٹا رہے۔“ ریمنڈ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں آج رات اس جگہ کا جائزہ لینے جارہا ہوں۔“ وہ اپنے پارٹنر کی جانب دیکھتے ہوئے بچکانا انداز میں ہنس پڑا۔ ”اگر میں واپس نہ آؤں تو تم مجھے لینے کے لیے آجانا۔ کیا تم آؤ گے، کیپٹن؟“

لیکن یہ بات چوبیس گھنٹے پہلے کی تھی۔ ریمنڈ واپس نہیں آیا تھا اور اب کیپٹن اس کی تلاش میں وہاں آیا تھا جیسا کہ اس نے ریمنڈ سے وعدہ کیا تھا۔

وہ تہ خانے کی ایک کھڑکی کے راستے اس گھر میں داخل ہوا۔ اس نے پورے گھر کا جائزہ لے لیا۔ بظاہر وہ ویران دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ تہ خانے میں واپس آگیا۔

وہاں ایک دھندلا سا بلب روشن تھا۔ پھر اس کی نگاہ اس بڑے سے پیکنگ بکس پر پڑی جو دیوار کے ساتھ دروازے کے نزدیک رکھا ہوا تھا۔ وہ بکس پر نظریں جمائے اس کے نزدیک چلا گیا۔ تب اسے سیمنٹ کے فرش پر پیکنگ بکس کے نزدیک ایک سیاہ سا دھبا دکھائی دیا۔ اس نے جھک کر غور سے اس دھبے کو دیکھا۔ وہ خون کا دھبا تھا۔

کیپٹن نے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو اسے فرش پر زنبور والی بڑی سی آہنی سلاخ پڑی دکھائی دی۔ اس نے لپک کر وہ سلاخ اٹھالی اور اس کے زنبور سے پیکنگ بکس کے ڈھکن کی میخیں اکھاڑنے لگا۔ جب وہ ڈھکن کے تختے اکھاڑ رہا تھا تو میخوں کی چوں چوں تہ خانے میں گونج رہی تھی۔

اور پھر جب اس نے ڈھکن ہٹایا تو بکس کے اندر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات ابھر آئے۔ اندر کوئی سمٹا ہوا پڑا تھا۔ اس کی قمیص پر سامنے خون کا ایک بڑا سا دھبا موجود تھا۔ وہ اس کا پارٹنر سراغ رساں ریمنڈ ہارڈی تھا۔ وہ مرچکا تھا۔

کیپٹن سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر بدستور خوف کے تاثرات تھے۔ اس کے دل میں شدید نفرت اُمڈ آئی تھی۔ ”میں تمہیں آخری دم تک نہیں چھوڑوں گا۔“ کیپٹن اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

”آل رائٹ، سادہ لوح۔“ اندھیرے میں اسے ایک غراہٹ سی سنائی دی۔ ”تو پھر ابھی شروع ہوجاؤ۔“

ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور گولی اینٹوں کی دیوار سے جا ٹکرائی۔

کیپٹن نے جوابی فائر کیا اور پھر خود کو پیکنگ بکس کے عقب میں گرالیا۔ وہ ایک کمزور سی آڑ تھی۔

پھر کیپٹن نے اپنی آٹومیٹک گن بلند کی اور جلتے ہوئے بلب کا پوری احتیاط کے ساتھ نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

بلب پھٹ گیا اور کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کے حریف نے ایک اور فائر کیا تو کمرے میں ایک شعلہ سا لپک گیا۔ جواباً کیپٹن نے بھی اس شعلے کی سمت ایک فائر جھونک دیا۔

”ڈارکن؟“ اس نے اندھیرے میں پکارا۔ ”تمہارے پاس بچ نکلنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ پولیس کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والی ہے۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو۔“ ڈارکن نے ایک طنزیہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی کیپٹن کی جانب ایک فائر کردیا۔

سراغ رساں کیپٹن نے دانت پیستے ہوئے ٹریگر دبا دیا اور دباتا چلا گیا...... پھر ایک کھٹکا سنائی دیا۔

اس کی گن خالی ہوچکی تھی۔ اب وہ قاتل ڈارکن کے رحم وکرم پر تھا۔

کیپٹن کا ذہن تیزی سے حرکت میں آگیا۔ اس پر وحشت اور جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے فوری طور پر کوئی چانس لینا ہوگا۔ بغیر کسی مزاحمت کے مارے جانے سے بہتر تھا کہ ایک چانس لے لیا جائے۔

”ڈارکن۔“ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں ہار مان رہا ہوں۔ میری گن خالی ہوچکی ہے۔ مجھے ایک موقع دو...... کیا کہتے ہو؟“

”میں تمہیں موقع ضرور دوں گا۔“ ڈارکن نے کرخت آواز میں جواب دیا۔ ”اپنی گن اس طرف پھینک دو۔“

کیپٹن نے اس کے حکم کی تعمیل کردی۔

ایک دفعہ اس کا ایک نواسہ علاج معالجے کی سہولت نہ ملنے کے سبب اس کے ہاتھوں میں انتقال کر گیا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی اور موت، غریبی اور امیری صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس پر وہ پہلی دفعہ غصے میں آیا اس نے کہا۔ ”یہ سب باتیں تم ظالموں نے اپنے ظلم اور ناانصافی کے جواز کے لیے گھڑی ہوئی ہیں۔ تم لوگوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کیا ہوا ہے اور اپنی غیر منصفانہ تقسیم کو خدا کی تقسیم قرار دے کر ہم لوگوں کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہو!“

میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن بے دینی کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ میں نے ایک زوردار تھپڑ غفورے کے منہ پر رسید کیا اور کہا۔ ”آج کے بعد تم سے اس وقت تک میرا کوئی تعلق نہیں جب تک تم دوبارہ کلمہ پڑھ کر اپنے ایمان کی تجدید نہیں کرتے اب میری نظروں سے فوراً دور ہو جاؤ!“

اس پر غفورے نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ہچکیوں کے دوران میں ہولے ہولے کلمہ پڑھ رہا ہے! یہ غریب لوگ کتنے بزدل ہوتے ہیں۔ ہشت!

ولید بلال کا انتخاب، عطاءالحق قاسمی کی کتاب ”ہنسنا منع ہے“ سے اقتباس

”آپ وہیں کھڑے رہو۔ میں پہلے نیا بلب لگا دوں۔“ ڈارکن نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

کیپٹن کے کانوں میں اندھے پن سے ٹٹولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کمرے میں دوبارہ روشنی ہوگئی۔

تب سیاہ بالوں والا وہ دبلا پتلا مجرم کیپٹن کے نزدیک آگیا۔ اس نے کیپٹن کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ سراغ رساں نے بغیر کسی مزاحمت کے تلاشی دے ڈالی۔ اس کی جیبوں سے کوئی شے برآمد نہیں ہوئی۔

جب وہ تلاشی سے فارغ ہو گیا تو کیپٹن نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے سراغ رساں ریمنڈ کو پیکنگ بکس میں کیوں بند کر دیا؟“

ڈارکن نے ایک وحشیانہ قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ”اس کی دو وجوہات تھیں۔“

”وہ کیا؟“

”پہلی تو یہ کہ اگر کوئی تمہاری طرح تاک جھانک کرتا ہوا اس طرف آجاتا تو اسے آسانی کے ساتھ لاش دکھائی نہیں دیتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے سوچا اس بکس کو تمہارے ہیڈ کوارٹر بھجوا دوں گا جو تم اسمارٹ پولیس والوں کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ رہے گی۔ لیکن اب میں تمہیں بھی اسی بکس میں ڈال کر وہاں روانہ کر دوں گا۔ یہ تمہارے افسروں کے لیے ایک اسپیشل تحفہ ہوگا۔“

یہ کہہ کر ڈارکن نے اپنا ریوالور اوپر اٹھالیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک قاتل کی سی ہوس ناک چمک ابھر آئی تھی۔

کیپٹن نے اپنا دل مضبوط کر لیا۔ اچانک اس کا جسم تن گیا اور وہ منہ پھاڑے اپنے ساتھی سراغ رساں کی لاش کو تکنے لگا۔

ڈارکن کی نظریں بھی کیپٹن کی نگاہوں کا تعاقب کرتی ہوئی ریمنڈ کی لاش پر پڑیں تو اس کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔ خوف کے مارے اس کا جسم ساکت ہو گیا اور اس کی تمام تر توجہ اس حیرت انگیز منظر پر مبذول ہوگئی۔

لاش حرکت کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مردہ شخص دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔

عین اسی لمحے کیپٹن نے کسی پردار شے کے مانند برق رفتاری سے لپکتے ہوئے فرش پر موجود زنبور والی آہنی سلاخ اٹھائی اور اسے پوری قوت سے گھماتے ہوئے ڈارکن کی کھوپڑی پر ایک ضرب لگا دی۔

ڈارکن کو اپنے بچاؤ کا کوئی موقع نہیں ملا۔ ضرب اتنی کاری تھی کہ ڈارکن کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

سراغ رساں کیپٹن نے تیزی سے اس کی تلاشی لے ڈالی اور اس کی دونوں آٹومیٹک گن اپنے قبضے میں لے لیں۔ پھر اپنے ساتھی ریمنڈ ہارڈی کی لاش کو گہرے افسوس سے دیکھنے لگا۔

”سوری، مجھے اسے جھانسا دینے کے لیے تمہیں اس طریقے سے استعمال کرنا پڑا میرے دوست۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہاری قمیص کو اس بکس کی میخوں کی نوک میں اس طرح پھنسا دیا تھا کہ وہ کچھ دیر تک تمہارے جسم کو معلق رکھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ تمہارے وزن سے قمیص کا کپڑا پھٹ جائے گا۔ قمیص تمہارا وزن نہیں سہار سکے گی اور تم نیچے گر جاؤ گے۔ ڈارکن یہ سمجھے گا کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔ مجھے یہ صحیح اندازہ نہیں تھا کہ قمیص کا کپڑا کس وقت پھٹ جائے گا۔ لہٰذا میں نے اسے باتوں میں الجھائے رکھا تاکہ وہ تمہارے بارے میں سوچتا رہے۔ لیکن اب وہ کسی چیز کو سوچنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اسے برقی کرسی کی سزا مل جائے گی اور تمہاری قربانی رنگ لے آئے گی۔ اس کی گرفتاری کا سہرا تمہارے سر ہے، میرے دوست۔“

سچّا جھوٹ

جمال دستی

جھوٹ بولنے کے لیے مہارت اور اچھی یادداشت کا ہونا بے حد ضروری ہے... اکثر لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور اگلے روز بھول چکے ہوتے ہیں کہ کیا گل افشانی کی تھی... ایک معصوم سے نوجوان کی غیرارادی حرکتیں... وہ کرنے کچھ چلا تھا... اور ہوتا کچھ اور گیا... ہلکے پھلکے پیرائے میں آپ کے قرب و جوار کی ہنستی کھیلتی رلاتی کہانی...
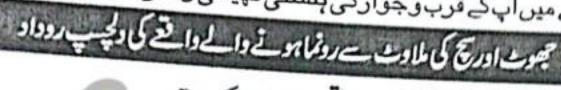
اس دن مہینے کی پانچ تاریخ تھی۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ سونیا نے سامان کی ایک لسٹ میرے سامنے رکھ دی۔ وہ جانتی تھی کہ آج تنخواہ کا دن ہے اس لیے اس نے وہ لسٹ مجھے دی تھی۔

میں خاصا فضول خرچ ہوں۔ سوچے سمجھے بغیر شاہ خرچی کا عادی ہوں۔ میری شادی کو ابھی صرف ایک ہی سال ہوا تھا لیکن سونیا میری عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی۔ وہ مجھے روزانہ صرف اتنے ہی پیسے دیتی تھی کہ میں

موٹر سائیکل میں پیٹرول ڈلوا سکوں اور ہلکا پھلکا لنچ کر سکوں۔

شروع شروع میں تو اس نے کوشش کی کہ میں لنچ گھر ہی سے لے کر جایا کروں لیکن مجھے کھانے کے ڈبے اور ٹفن سے چڑ تھی۔ اس سے پہلے امی بھی یہ کوشش کر چکی تھیں۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ میرے گھر سے آئے ہوئے کھانے میں مین میخ نکالیں یا میرا مضحکہ اڑائیں کہ بھئی آج تو وقار پالک اور آلو لے کر آیا ہے۔ یہ گھاس پھوس لوگ کیسے کھاتے ہیں؟ اس قسم کے تبصرے میں دوسروں کے کھانوں پر سُن چکا تھا۔

میں نے لسٹ سونیا کو لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کل اتوار ہے۔ اطمینان سے شاپنگ کریں گے۔''

''کل کیوں، آج کیوں نہیں؟'' سونیا نے کہا۔

''تمہاری یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''تم شاید بھول گئیں کہ آج تمہارے ابا حضور بھی ریاض سے تشریف لا رہے ہیں۔ شام کو ساڑھے سات بجے ان کی فلائٹ ہے۔ انہیں لینے ائرپورٹ بھی تو جانا ہوگا۔''

''ہاں، میں تو بھول ہی گئی۔'' سونیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ایسا کریں، آج ہاف ڈے کر لیں۔ آفس سے گھر آ جائیں، پھر ہم دونوں ائرپورٹ چلیں گے۔''

''کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے آج کل کام کا دباؤ کچھ زیادہ ہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے لینے گھر نہیں آئیں گے؟''

''یار، میں نے کہا تو ہے کہ کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''شفیق صاحب نے اگر شفقت کا مظاہرہ کیا تو وہ مجھے چھٹی دے دیں گے۔'' پھر میں اسے چھیڑنے کو بولا۔ ''ایک صورت اور بھی ہے۔''

''کیا؟'' سونیا نے تجسس سے مجھے دیکھا۔

''میں بیماری کا بہانہ بنا کر آج چھٹی ہی کر لوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی نہیں۔'' سونیا منہ بنا کر بولی۔ ''آج تو آپ کا جانا یوں بھی ضروری ہے کہ سیلری ملے گی۔ پیسے ویسے ہی ختم ہو گئے ہیں پھر ابو بھی تو آ رہے ہیں۔ پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی۔ آپ کو اگر چھٹی نہ ملے تو آفس ہی سے ابو کو لینے چلے جایئے گا۔ ان کو تو ہمارے گھر کا پتا بھی نہیں ہے۔'' سونیا نے سامان کی لسٹ واپس لے لی۔

آفس میں بہت مصروف دن گزرا۔ شام کو چار بجے کے قریب تنخواہیں ملیں۔

چھٹی کے بعد میں باہر نکل رہا تھا کہ نوید میرے پاس آیا اور بولا۔ ''یار وقار! ذرا مجھے فہد کے گھر ڈراپ کر دے۔''

فہد کا گھر سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھا اس لیے میں نے انکار نہیں کیا کیونکہ مجھے بھی وہیں جانا تھا۔

ہم فہد کے گھر پہنچے ہی تھے کہ وہاں ہمارے باس شفیق صاحب کی گاڑی آ کر رکی۔ میں انہیں وہاں دیکھ کر چونک اٹھا۔ گویا فہد دفتر کے باہر شفیق صاحب سے تعلقات بڑھا رہا تھا۔

''ہیلو وقار!'' شفیق صاحب نے کہا۔ ''یہاں کیسے؟''

''سر! میں نوید کو ڈراپ کرنے آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی وقت فہد بھی باہر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''وقار تم! اب آ ہی گئے ہو تو چائے پی کر جانا۔''

''یار! وہ مجھے...''

''وقار!'' شفیق صاحب نے کہا۔ ''ایک کپ چائے پینے میں حرج ہی کیا ہے؟''

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے۔ میں چائے پی کر بھی ائرپورٹ پہنچ سکتا تھا۔

میں نے بائیک لاک کی اور اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سرور اور علیم بھی موجود تھے۔ دو اجنبی چہرے بھی تھے۔ فہد نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک ارشد تھا اور دوسرا عمر۔

''لگتا ہے آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''سر! تابندہ تو اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی ہے، امی موجود ہیں۔'' یہ کہہ کر فہد اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آیا تو اس کے پیچھے نوعمر سی ایک ملازمہ بھی تھی۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیل کر لا رہی تھی۔

اس دوران میں وہ صوفے ایک طرف ہٹا کر فرشی نشست جما چکے تھے۔ مجبوراً مجھے بھی نیچے بیٹھنا پڑا۔

فہد نے اچانک تاش کی ایک نئی گڈی نکال لی اور پتے اچھی طرح پھینٹ کر بولا۔ ''میں بانٹوں گا۔''

''تم ہی بانٹو یار۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

فہد نے وہاں موجود افراد کے سامنے تین تین پتے پھینک دیے اور کھیل شروع ہوگیا۔

میں نوید کی پشت پر بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی فلیش کھیلا نہیں تھا لیکن میں اس کھیل کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ نوید کے پاس صرف دو غلام اور ایک دُکی تھی۔ وہ ان ہی پتوں پر کھیل رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب نے اپنے پتے پھینک دیے۔ نوید نے سارے نوٹ سمیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیے اور پتے بانٹنے لگا۔

وہ دوسری چال بھی جیت گیا۔

اچانک شفیق صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''وقار! ایک بازی ہو جائے۔''

''سر میں ابھی...''

''آؤ یار!'' انہوں نے بے تکلفی سے کہا تو مجھے بھی کھیل میں شامل ہونا پڑا۔

شروع کی دو تین بازیاں میں جیت گیا مگر میرا جوش اور ولولہ بڑھ گیا۔ چوتھی بازی میں ہار گیا۔ لیکن اب بھی میرے سامنے نوٹ پڑے تھے۔ گویا ابھی تک میری جیب سے ایک پیسا بھی نہیں گیا تھا۔ تین چار بازیاں ہارنے کے بعد میں پھر ایک بڑی بازی جیت گیا۔

میں پتے بانٹنے ہی والا تھا کہ شفیق صاحب نے کہا۔ ''اس مرتبہ جوکر کھولو۔''

نوید نے تاش کی گڈی اٹھا کر اسے پھینٹا اور ایک پتا سیدھا کر کے پھینک دیا۔ وہ حکم کی تکی تھی۔

حسبِ معمول دو چالیں میں نے بلائنڈ کھیلیں، پھر پتے اٹھا لیے۔ پتے دیکھ کر میں خوشی سے کانپنے لگا۔ میرے پاس تین اکے تھے۔ گویا یہ بازی تو میں ہر حال میں جیتنے والا تھا۔ شفیق صاحب، نوید اور فہد بھی ڈٹ گئے تھے۔ شاید ان کے پاس بھی بڑے پتے تھے۔ میں نے جوش میں آ کر چال کی رقم دگنی کر دی۔ شفیق صاحب نے ایک راؤنڈ کھیلنے کے بعد چال کی رقم مزید دگنی کر دی۔ میں یہ بازی کسی بھی قیمت پر نہیں ہار سکتا تھا اس لیے رقم لگائے جا رہا تھا۔ نوید اور فہد بھی ابھی تک کھیل رہے تھے۔ وہ بھی بڑھ چڑھ کر چالیں چل رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے ان دونوں نے پتے پھینک دیے۔ اب صرف شفیق صاحب رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بازی میں ہار ہی نہیں سکتا۔ میں بڑھ چڑھ کر داؤ لگا رہا تھا اور میری جیب کی رقم بھی تیزی سے نکل رہی تھی۔

اس وقت میں یہ بھی بھول گیا کہ مجھے اپنے سسر کو لینے ائرپورٹ جانا ہے۔ مجھے وقت کا بھی احساس نہیں تھا۔ بس میری نظریں درمیان میں جمع ہونے والے نوٹوں کے اس ڈھیر پر تھیں جو چند منٹ بعد مجھے ملنے والا تھا۔

آخری داؤ لگانے سے پہلے میں نے اپنے پرس کا جائزہ لیا۔ اب میرے پاس اتنی ہی رقم تھی کہ یا تو میں داؤ لگا دیتا یا پھر اس رقم سے شو مانگ لیتا۔ میں نے خود سے کہا۔ ''زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا وقار! نوٹوں کا وہ ڈھیر بھی دو، ڈھائی لاکھ سے کم کیا ہوگا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ میں مزید داؤ لگاؤں لیکن میرے پاس پیسے ہی نہیں تھے۔

میں نے چند لمحے سوچا، پھر رقم پھینک کر کہا۔ ''شو کریں شفیق صاحب۔''

انہوں نے اپنے پتے پھینک دیے۔ ان کے پاس تین تکیاں تھیں۔

میں نے اپنے پتے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''ان پتوں پر آپ اتنا کھیل رہے تھے؟'' اور نوٹ سمیٹنے لگا۔

''ایک منٹ۔'' شفیق صاحب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ ''میرے پتے زیادہ بڑے ہیں۔ میرے پاس جوکر کی ٹریل ہے۔'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ اس بازی میں جوکر بھی کھل چکا ہے۔ جو لوگ تین پتوں کے اس شیطانی کھیل سے واقف نہیں ہیں، میں ان کی معلومات کے لیے بتا دوں کہ اس کھیل میں سب سے بڑے پتے تین اکے ہوتے ہیں۔ جو اکوں کی ٹریل کہلاتی ہے۔ جوکر حقیقت میں جوکر نہیں ہوتا ہے بلکہ تاش کی گڈی میں سے ایک پتا نکال لیا جاتا ہے۔ وہ دُکی ہو، تکی ہو یا کوئی اور پتا، اگر اس کی ٹریل کسی کے پاس ہو تو وہ اکوں کی ٹریل سے بھی بڑی ہوتی ہے۔

میرا سر بُری طرح چکرانے لگا۔ شفیق صاحب نوٹوں کا ڈھیر سمیٹ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی ہنس کر کہیں گے۔ ''وقار! تم غلط فہمی میں کھیلتے گئے۔ اپنی ہاری ہوئی رقم اٹھا لو۔'' لیکن انہوں نے ایسا کچھ بھی نہ کہا بلکہ نوٹ سمیٹ کر دوسری بازی کی تیاری کرنے لگے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اس میں پونے نو بج رہے تھے۔ گویا میرے سسر سوا گھنٹا پہلے آ چکے ہوں گے اور مجھے ائرپورٹ پر نہ پا کر اب نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔

ہمارے گھر میں پی ٹی سی ایل نہیں تھا۔ میرے پاس اور سونیا کے پاس سیل فون تھا لیکن میرے سسر صاحب کے پاس صرف میرا سیل نمبر تھا اور میں نے اپنا سیل فون آف کر

رکھا تھا کہ سونیا بار بار مجھے تنگ نہ کرے۔ میں نے اپنا سیل فون آفس سے نکلنے سے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ائرپورٹ پہنچ کر سیل فون آن کروں گا اور سونیا کو سرپرائز دوں گا۔

میری ہمت نہ ہوئی کہ میں سیل فون آن کروں اور سونیا کے تلخ سوالات کا سامنا کروں لیکن مجھے ابو کی بھی فکر تھی۔ سونیا کی طرح میں بھی انہیں ابو ہی کہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی ائرپورٹ ہی پر ہوں گے۔ میں ان سے کوئی بھی بہانہ بنا دوں گا، کچھ بھی کہہ دوں گا لیکن پہلے ان سے بات تو کروں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے موبائل فون آن کیا اور ابو کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ میں نے دو چار دفعہ کوشش کی، پھر اپنا سیل فون آف کر دیا۔

''کیا ہوا وقار؟'' شفیق صاحب نے پوچھا۔ ''ایک بازی اور ہو جائے؟''

''نہیں سر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب تو میری جیب میں پیٹرول کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے۔''

میں وہاں سے باہر نکلا تو میری سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں ائرپورٹ جاؤں یا گھر جاؤں؟ پھر میں نے ائرپورٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں اپنی پوری تنخواہ یعنی مبلغ پچاس ہزار روپے اس لعنتی کھیل میں ہار چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے پرس کی اندرونی جیب میں پانچ سو روپے کا ایک نوٹ ایسی ہی کسی ایمرجنسی کے لیے رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی سونیا ہی کا آئیڈیا تھا۔

پھر میں نے ائرپورٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہراہِ فیصل پر اس وقت بھی ٹریفک تھا لیکن شام کے اوقات میں جو ٹریفک جام ہوتا ہے ویسا نہیں تھا۔ میں موٹر سائیکل تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں میں نے ائرپورٹ کے ایک ایک چپے کا جائزہ لیا لیکن ابو مجھے کہیں نظر نہ آئے۔

مجھے خیال آیا کہ سونیا کے پاس تو ان کا سیل نمبر تھا۔ مجھ سے مایوس ہونے کے بعد اس نے ابو کو ٹیلی فون کیا ہوگا پھر انہیں گھر کا راستہ سمجھا دیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں کچھ مطمئن ہو گیا۔ اب دوسرا مرحلہ تھا تنخواہ کا۔ میں سونیا کو کس منہ سے بتاؤں گا کہ میں پوری تنخواہ جوئے میں ہار گیا ہوں۔ پورا

مہینا کیسے گزرے گا؟ گھر میں تو ایک ایک چیز ختم ہو گئی تھی۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ سے لے کر نمک تک نہیں تھا۔ پھر مجھے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ ایسے موقع پر ابو سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ادھار لینے کا تو نہ میں قائل تھا، نہ سونیا لیکن اس خودساختہ ناگہانی سے تو نمٹنا ہی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سونیا نے اس دوران میں یقینی طور پر کچھ رقم پس انداز بھی کی ہوگی۔ سوال پھر وہی تھا کہ میں سونیا کو کیا بتاؤں گا کہ رقم کہاں گئی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ آج کل لوٹ مار کی وارداتیں عام ہیں۔ میں سونیا سے کہہ دوں گا کہ میں ائرپورٹ کے راستے میں گن پوائنٹ پر لٹ گیا۔ ایک اچکے نے گن پوائنٹ پر میرا پرس، موبائل فون سب کچھ چھین لیا۔ میں نے مزاحمت کی کوشش بھی کی لیکن وہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کوشش میں میرے کپڑے پھٹ گئے۔ ہاتھوں اور چہرے پر خراشیں آئیں لیکن لٹیرا مجھے زخمی کر کے چلتا بنا۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ موٹر سائیکل نہیں لے گیا۔

اس پر سونیا کہتی۔ ''دفع کریں، جان کا صدقہ گیا۔ آپ کو اس اچکے سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ روز ٹی وی اور اخبارات میں اس قسم کی خبریں آتی ہیں کہ مزاحمت پر ڈاکو نے گولی چلا دی اور نوجوان موقع پر ہلاک ہو گیا۔ موبائل نہ دینے پر نوجوان کا قتل۔''

اس طرح میں سونیا کی جرح سے بھی بچ جاؤں گا اور اس کی ہمدردیاں بھی سمیٹ لوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ آئندہ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کے لیے مجھے اپنی معصوم بیوی سے جھوٹ بولنا پڑے۔

اب سوال تھا خود کو زخمی کرنے کا۔ عام حالات میں شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوتا لیکن اس وقت تو سوال میری عزت کا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں سے اسکروڈرائیور نکالا، اپنی شرٹ کی آستینوں پر دل کڑا کر کے وار کیا۔ تین چار بار میں نہ صرف میری شرٹ کی آستینیں پھٹ گئیں بلکہ میری کلائیوں پر بھی گہری خراشیں آ گئیں۔ ایک دو خراشیں تو کچھ زیادہ ہی گہری تھیں۔ میں نے اپنے جوتوں کپڑوں پر بھی مٹی ڈال لی۔ میں نے چہرے پر خراشیں ڈالنے کا پروگرام منسوخ کر دیا تھا۔

اب میں پوری طرح سے سونیا کے سامنے جانے کو تیار تھا۔ اچانک مجھے اپنے پرس کا خیال آیا۔ پرس اور موبائل سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ میں نے پرس جیب سے نکالا۔ وہ بہت قیمتی پرس تھا۔ ابو نے سعودی عرب سے مجھے بھیجا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنا شناختی کارڈ اور

ڈرائیونگ لائسنس نکال لیا کہ یہ چیزیں دوبارہ بہت مشکل سے بنتی ہیں۔ میں نے اس میں سے اکلوتا پانچ سو کا نوٹ بھی نکال لیا۔ سونیا سے کہہ دوں گا کہ پانچ سو کا یہ نوٹ میں نے پیٹرول کے لیے نکال لیا تھا۔ پھر میں نے اپنے وزیٹنگ کارڈز اور دفتر کے شناختی کارڈ سمیت پرس کو جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ دوسرا مرحلہ موبائل فون پھینکنے کا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنی سم نکال لی تاکہ میرے رابطوں کے تمام نمبر محفوظ رہیں۔ سونیا بے چاری کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ پرانی سم ہے یا میں نے دوسری نکلوائی ہے۔ میں نے موبائل سے بیٹری بھی نکال لی پھر میں نے سم احتیاط سے ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھی اور موبائل فون بھی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

میں نے گھر واپس جانے کے لیے موٹر سائیکل پر کک لگائی تو مجھے خیال آیا کہ سونیا یہ ضرور پوچھے گی کہ میں نے اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرائی یا نہیں؟ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں ائرپورٹ پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے جو خراشیں لگائی تھیں اب ان میں بہت جلن ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا تو وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک سپاہی نکل کر میرے سامنے آگیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے گن پوائنٹ پر لوٹ لیا گیا ہے، میں اس کی رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

سپاہی نے غور سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”برآمدے میں بائیں طرف ہیڈ محرر صاحب کا کمرا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں۔“

ہیڈ محرر ادھیڑ عمر کا روایتی پولیس والا تھا۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔

ٹیلی فون سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”کیا بات ہے صاحب؟“ اچانک اس کی نظر میری آستینوں پر پڑی۔ اس وقت میں نے بھی اپنی آستینوں کو دیکھا۔ ایک آستین پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ تشویش سے بولا۔ ”یہ آپ زخمی کیسے ہوگئے؟“

میں نے اسے فرضی ڈکیتی کی داستان سنائی کہ کیسے ایک ڈاکو نے میرا راستہ روک کر مجھے گن پوائنٹ پر لوٹنے کی کوشش کی۔ میری مزاحمت پر اس نے نہ جانے کس چیز سے مجھ پر حملہ کیا۔ شاید اس کے ہاتھ میں کوئی نکیلی انگوٹھی یا اور کوئی چیز تھی۔

”صاحب! آپ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لگتے ہو، اس ڈاکو سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ اس نے فائر نہیں کیا ورنہ اس وقت آپ کے بجائے آپ کی لاش یہاں رکھی ہوتی۔“

اس وقت ایک چاق وچوبند سب انسپکٹر بھی وہاں آگیا۔ میں نے اسے بھی وہی داستان سنا دی۔

”کتنی رقم تھی، آپ کے پرس میں؟“ اس نے پوچھا۔

”پچاس ہزار۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے دو چار سو روپے زیادہ ہی ہوں آج میری تنخواہ ملی تھی۔“

”آپ اس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”وہ درمیانے قد کا صحت مند آدمی تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں تھیں اور اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔“

”اس کی بات چیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس علاقے کا ہے؟“

”نہیں جناب۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے مجھ سے اتنی بات ہی نہیں کی۔“

”آپ کا پرس کیسا تھا اور اس میں رقم کے علاوہ اور کیا تھا؟“

”امپورٹڈ پرس تھا، لیدر کا۔ اٹلی کا بنا ہوا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لائٹ براؤن رنگ تھا۔ وہ پرس میرے فادر ان لا نے مجھے سعودیہ سے بھیجا تھا۔ اس میں میرا ڈرائیونگ لائسنس، قومی شناختی کارڈ، میرا آفس کا شناختی کارڈ اور بہت سے وزیٹنگ کارڈز تھے۔“

ہیڈ محرر نے رائٹنگ پیڈ سنبھال لیا۔ ”قومی شناختی کارڈ کا نمبر یاد ہے آپ کو؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے شناختی کارڈ کا نمبر بتا دیا۔ پھر میں نے اسے ڈرائیونگ لائسنس نمبر بھی بتا دیا۔

”موبائل فون کون سا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”کیو سکس موبائل تھا۔“ میں نے بتایا۔ پھر میں نے اپنا سیل نمبر بھی بتا دیا۔

وہ سب باتیں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھ سے لٹیرے کا حلیہ تفصیل سے پوچھا اور اسے بھی لکھ لیا۔ سب انسپکٹر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آکر بتایا کہ میں نے وائرلیس پر پولیس پارٹی کو اطلاع دے دی ہے۔ آپ کی ایف آئی آر درج ہو رہی

ہے۔اس کی ایک کاپی ابھی آپ کو مل جائے گی۔

مجھے اس کی شرافت پر حیرت ہوئی۔ پولیس اسٹیشن میں اتنی آسانی سے ایف آئی آر کب درج ہوتی ہے؟

ہیڈ محرر نے بھاری بھر کم رجسٹر پر رپورٹ درج کی اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی دے دی۔

سب انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔ ''آپ پہلی فرصت میں اپنے زخموں پر توجہ دیں۔ ویسے آپ فکر مت کریں۔ وہ ''وارداتیا'' جیسے ہی پکڑا جائے گا، آپ کو اطلاع کر دیں گے۔ آپ اپنا سیل نمبر... میرا مطلب کوئی دوسرا سیل نمبر یا لینڈ لائن نمبر یہاں لکھوا دیں۔''

میں نے سونیا کا نمبر لکھواتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری وائف کا نمبر ہے، کل تک میں اپنا نمبر بھی لے لوں گا۔''

میں جانتا تھا کہ اس اچکے کا کوئی وجود ہی نہیں ہے تو وہ کہاں سے پکڑا جائے گا۔

میں نے ایف آئی آر کی نقل جیب میں رکھی اور ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک سپاہی اندر آ گیا اور سب انسپکٹر سے بولا۔ ''سر! ہم نے پرانے ائرپورٹ کے پاس ایک مشتبہ شخص کو پکڑا ہے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔''

''کہاں ہے وہ شخص؟'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''اسے یہاں لے آؤ۔''

سپاہی آ گیا اور ہتھکڑی لگے ہوئے ایک شخص کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کا حلیہ ہو بہو وہی تھا جو میں نے لکھوایا تھا۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ ''ذرا غور سے دیکھیں، کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جس نے آپ کو لوٹا ہے؟''

''لگتا تو وہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں اندھیرا تھا اس لیے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی شخص ہے۔''

''تلاشی لو اس کی۔'' سب انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔

اس کی تلاشی پر مجھے دوسرا دھچکا لگا۔ اس کی جیب سے ایک ٹی ٹی، چاقو اور میرا پرس برآمد ہوا، جی ہاں میرا وہ پرس جسے میں جھاڑیوں میں پھینک چکا تھا۔

سب انسپکٹر نے بہت غور سے پرس کا جائزہ لیا۔ پھر اسے کھول کر دیکھا اور بولا۔ ''جناب! یہ آپ ہی کا پرس ہے۔ اندر کی طرف ''میڈ ان اٹلی'' کے الفاظ بھی ہیں۔ اس نے پرس کی تہیں کھولیں تو چونک اٹھا۔ ''اس میں تو پاکستانی کرنسی کے ساتھ ساتھ ریال اور ڈالرز بھی ہیں۔ اس کا مطلب ہے اس نے کوئی اور واردات بھی کی ہے۔'' پھر وہ ڈپٹ کر بولا۔ ''تو نے ان صاحب کو تو لوٹا ہی ہے اور کہاں واردات کی ہے؟''

''میں نے ان صاحب کو نہیں لوٹا ہے۔'' اچکے نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو یہ پرس کیا تیرے باپ کا ہے؟'' سب انسپکٹر دہاڑا۔

پھر اس نے پرس کی تفصیلی تلاشی لی۔ اس میں سے ایک ڈرائیونگ لائسنس اور کئی وزیٹنگ کارڈز برآمد ہوئے۔

''یہ ڈرائیونگ لائسنس سعودی عرب کا ہے۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''اس پر کسی اقبال حسین کا نام لکھا ہے۔''

''اقبال حسین۔'' میں چونک کر بولا۔ ''ذرا مجھے دکھایئے۔'' اقبال حسین ابو کا نام تھا۔

ڈرائیونگ لائسنس پر چسپاں تصویر دیکھ کر میرا سر چکرا گیا۔ وہ واقعی ابو کا ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''یہ میرے فادر اِن لا کا پرس ہے۔ میں انہیں ہی لینے ائرپورٹ آیا تھا۔ اس سے پوچھیں کہ وہ اب کہاں ہیں؟''

پولیس والوں نے اسے دو چار لاتیں اور گھونسے مارے تو اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے کسی پرواز سے آنے والے ایک مسافر کو لوٹا ہے اور اسے زخمی کر کے پھینک دیا ہے۔

''تو نے انہیں کہاں پھینکا ہے؟'' سب انسپکٹر نے اس کی گردن پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ پھر وہ دوسرے پولیس والوں سے بولا۔ ''اس کے ساتھ جاؤ، یہ جگہ کی نشاندہی کرے گا، ہوسکتا ہے وہ صاحب ابھی زندہ ہوں۔''

مجھے بری طرح چکر آ گیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی پولیس پارٹی کے ساتھ چلا جاؤں؟''

سب انسپکٹر نے مجھے اجازت دے دی۔

پولیس کی موبائل وین تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی اور جناح ٹرمینل کے باہر ویران علاقے کے ایک برساتی نالے تک پہنچی۔ نالے میں کوئی پڑا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے ٹارچ کی روشنی میں نیچے دیکھا۔ وہ ابو ہی تھے اور آہستہ آہستہ کراہ رہے تھے۔

''یہ ابھی زندہ ہیں۔'' پولیس والے نے کہا اور نالے میں اتر گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی نالے میں اتر گیا۔ ابو کے پاس ہی ان کا سوٹ کیس اور ایک بریف کیس بھی پڑا

تھا۔ گویا اس اچکے کو صرف کیش رقم کی ضرورت تھی۔ باقی سامان اس نے یونہی چھوڑ دیا تھا۔

ابو کے دائیں شانے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پولیس والوں نے انہیں وہاں سے نکالا اور فوری طور پر ایمبولینس کو فون کر دیا۔ فوراً ہی ایمبولینس وہاں پہنچ گئی اور میں ابو کو لے کر لیاقت نیشنل اسپتال روانہ ہو گیا۔

ابو کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ انہیں خون لگا دیا گیا۔ وہ اس وقت آئی سی یو میں تھے۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اب ابو کی حالت خطرے سے باہر ہے اور آپ ان سے مل سکتے ہیں۔

میں ابو کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ آنکھیں موندے لیٹے تھے لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ان کی حالت اب خاصی بہتر تھی۔ میں نے انہیں آواز دی تو انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔

''آپ پے شنٹ کو ڈسٹرب مت کریں پلیز۔'' ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے سر ہلایا اور مطمئن انداز میں باہر نکل آیا۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ سونیا کو یہ اطلاع کیسے دوں؟

پہلے میں نے سوچا کہ اسے ٹیلی فون کر دوں پھر یہ سوچ کر نہیں کیا کہ ایک تو وہ میری وجہ سے پہلے ہی پریشان ہو گی۔ یہ خبر سن کر تقریباً پاگل ہی ہو جائے گی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ خود گھر جا کر سونیا کو اس واقعے کی اطلاع دوں۔

میری موٹر سائیکل ابھی ائرپورٹ پولیس اسٹیشن ہی پر کھڑی تھی۔ اسپتال سے باہر نکل کر میں نے ایک رکشا پکڑا اور ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔

موٹر سائیکل لینے سے پہلے میں نے اس سب انسپکٹر سے ملنا ضروری سمجھا جس نے میری مدد کی تھی اور میں نے اس کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔

تھانے میں ہیڈ محرر موجود تھا لیکن وہ سو رہا تھا۔ سب انسپکٹر وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل لی اور گلشن اقبال کی طرف روانہ ہو گیا۔

سونیا اضطراب کے عالم میں برآمدے ہی میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھٹ پڑی۔ ''آپ کو میرا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ حد ہوتی ہے غیر ذمے داری کی۔ آپ تو ائرپورٹ گئے تھے، پھر ابو...'' اچانک اس کی نظر میری زخمی کلائیوں اور آستینوں پر پڑی۔ وہ گھبرا کر بولی۔

امتحان

اپنے ہاتھ سے کی ہوئی نیکی اور دوسرے سے سرزد ہونے والے گناہ کا تذکرہ کسی سے نہ کرو، کیونکہ اپنی نیکی کو چھپانا تمہاری سوچ کا امتحان ہے اور دوسرے کے گناہ کو چھپانا تمہارے کردار کا امتحان ہے۔

استاد کی عزت

کسی شخص نے امام ابوحنیفہ سے سوال کیا کہ آپ کے ہاں استاد کا کیا مقام ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ ''اگر مجھے میرے استاد اپنے جوتے میں پانی پینے کا کہیں تو یہ بھی میرے لیے فخر اور اعزاز کی بات ہوگی۔

عبدالجبار رومی انصاری لاہور سے

''یہ... یہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کا سیل فون کیوں بند تھا بلکہ اب بھی بند ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لو گی؟'' میں نے کہا۔

اندر آ کر میں نے شرٹ اتار دی۔ سونیا کچھ کہے بغیر پانی گرم کر لائی اور اس میں ڈیٹول ملا کر میرے زخم صاف کرنے لگی۔ مجھے اس کی معصومیت پر ترس آ گیا۔ مجھے ذرا سا زخمی دیکھا تو سب کچھ بھول کر میری خدمت میں لگ گئی۔ اس نے میرے زخم صاف کر کے دوا لگائی اور مجھ سے بولی۔ ''آپ واش بیسن کے پاس چلیں، میں آپ کا منہ بھی دھلا دوں۔''

''اب میں ایسا زخمی بھی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم جلدی سے کھانا نکالو۔ میں منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر آتا ہوں۔''

میں کھانا کھا چکا تو اس نے پوچھا۔ ''اب بتایئے یہ سب کیا ہے؟''

اس سے اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے مجھے شرمندگی ہو رہی تھی لیکن اب وہ جھوٹ بولنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں نے اسے فرضی لٹیرے کی کہانی سنا دی۔ ''مجھے تو یہ فکر ہے کہ یہ مہینا کیسے گزرے گا۔ آج کل تو کوئی کسی کو اتنا قرض بھی نہیں دیتا ہے۔''

''آپ کو قرض لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے گھر کے خرچ میں سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ

پیسے بچائے ہیں۔ وہ ہمارے کام آئیں گے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''لیکن ابو... آپ تو ابو کو لینے گئے تھے؟''

میں نے اسے پھر پولیس اسٹیشن کی کہانی سنا دی۔ اس مرتبہ مجھے شرمندگی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ وہ کہانی بالکل سچی تھی۔

وہ بُری طرح رونے لگی۔ ''اب ابو کیسے ہیں؟''

''ابو اب بالکل ٹھیک ہیں۔ اس لیے تو مجھے اتنی دیر لگی۔ جب تک ڈاکٹرز نے مجھے اطمینان نہیں دلا دیا اور میں نے ابو کو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا، میں وہاں سے نہیں ہلا۔'' پھر میں نے کہا۔ ''تم تیار ہو جاؤ، ہم ابھی اسپتال جائیں گے۔''

رات کا بقیہ حصہ ہم نے اسپتال کے وزیٹر روم میں گزارہ۔

صبح سات بجے کے قریب نرس نے مجھے بتایا۔ ''آپ کے پے شنٹ کو اب آئی سی یو سے وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں۔ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

ابو تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ وہ اس وقت بہت اچھی حالت میں تھے۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ''وقار! تم کہاں رہ گئے تھے بیٹا؟ اگر تم وقت پر آجاتے تو اس لٹیرے سے میرا سابقہ نہ پڑتا۔''

''یہ تو خود لٹ گئے ابو۔'' سونیا نے کہا، پھر انہیں تفصیل سے پوری کہانی سنا دی۔

''ابو!'' میں نے کہا۔ ''آپ بتایئے، آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

''بیٹا! میری فلائٹ بالکل صحیح وقت پر کراچی پہنچ گئی تھی۔ میرے پاس سامان ہی کیا تھا، صرف ایک سوٹ کیس اور بریف کیس۔ میں ائرپورٹ سے باہر آکر تمہیں ڈھونڈتا رہا لیکن تم وہاں موجود ہوتے تو ملتے۔ میں نے کئی دفعہ تمہیں کال کرنے کی کوشش کی لیکن تمہارا سیل فون بند تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تم آخر آئے کیوں نہیں اور تمہارا سیل فون آف کیوں ہے؟

میرے پاس سونیا کا سیل نمبر بھی نہیں تھا ورنہ میں اسے فون کر لیتا۔ نہ میرے پاس تمہارا ایڈریس تھا۔ بس سونیا نے اتنا بتایا تھا کہ تم لوگ گلشن اقبال میں رہتے ہو۔ گلشن اقبال کوئی چھوٹا علاقہ تو ہے نہیں کہ میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا چل پڑتا۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ٹی اسٹال سے چائے پی اور بسکٹ کھائے، پھر میں وہاں بیٹھا دیر تک اخبار پڑھتا رہا۔

جب ایک گھنٹے سے بھی زیادہ گزر گیا تو میں نے سوچا کہ میں فوری طور پر ائرپورٹ کے نزدیک ہی کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں، صبح وقار کے آفس کے نمبر پر فون کر کے اسے وہاں بلا لوں گا۔ وہاں کوئی ٹیکسی بھی نہیں تھی۔ میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور پیدل ہی وہاں سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔

اچانک ایک آدمی میرے سامنے آگیا اور بولا۔ ''بڑے صاحب! کیا آپ کو ٹیکسی چاہیے؟''

''ہاں میاں ٹیکسی کی ضرورت تو ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کہاں جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو مجھے ائرپورٹ کے نزدیک ہی کسی ہوٹل میں لے چلو۔''

''ٹھیک ہے بڑے صاحب، میں آپ کو ہوٹل ان لے چلتا ہوں۔ وہ اچھا اور صاف ستھرا ہوٹل ہے۔'' اس نے میرا سوٹ کیس اٹھالیا اور بولا۔ ''بڑے صاحب! آپ کو باہر تک پیدل چلنا پڑے گا۔ میری ٹیکسی ائرپورٹ کے باہر کھڑی ہے۔ پولیس والے ٹیکسیوں کو اندر نہیں آنے دیتے۔''

''چلو میاں! میں کچھ دور تو پیدل چل لوں گا۔''

وہ مجھے لے کر ائرپورٹ سے باہر نکلا اور ایک طرف چل دیا۔ وہاں سے کافی فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ شاید وہی اس کی ٹیکسی تھی۔

ویران علاقے میں آکر اس نے بائیں طرف کے نالے میں جھانکا اور بولا۔ ''بڑے صاحب! ہوشیار ہو جائیں، نالے میں سانپ ہے۔''

''سانپ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کہاں ہے؟''

''وہ رہا۔'' اس نے اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا۔ ''بہت لمبا سانپ ہے۔''

میں نے پھر غور سے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔

اس نے اچانک پیچھے سے مجھے اس خشک برساتی نالے میں دھکا دے دیا۔ گرنے سے میرا سر نالے کی پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اوپر سے میرا سوٹ کیس بھی مجھ پر پھینک دیا، پھر خود بھی نالے میں کود گیا۔

''یہ... یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''زیادہ بک بک مت کر بڈھے۔ اپنا پرس نکال۔''

''میرے پاس پرس نہیں ہے۔ میرے کوٹ کی جیب میں کچھ پیسے پڑے ہیں۔ وہ تم لے لو مگر مجھے ہوٹل تک ضرور چھوڑ دو۔''

"بکواس مت کر بڈھے۔" وہ چیخ کر بولا اور جیب سے چاقو نکال لیا۔ "پرس دیتا ہے یا اس سے تجھے ذبح کردوں؟"

"میرے پاس کوئی پرس نہیں ہے۔" میں نے بپھر کر کہا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

اس نے اچانک چاقو سے میرے شانے پر وار کیا۔ اس کا چاقو اتنا تیز تھا کہ میرا کوٹ کاٹتا ہوا شانے تک پہنچ گیا۔ اس نے میرا سر پکڑ کر زور سے نالے کی پختہ دیوار سے ٹکرا دیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔"

"ابو! ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے آپ کے سیل فون پر کال کرنا چاہی تھی لیکن آپ کا فون بند تھا۔"

"یار! میرا سیل فون میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ائرپورٹ کے پختہ فرش پر گر گیا تھا۔ پھر ایسا بند ہوا کہ آن ہی نہیں ہوا۔ میں نے اسے بریف کیس میں ڈال لیا۔"

"مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ میرا پرس اس کے پاس کہاں سے آیا؟" مجھے واقعی اس بات پر حیرت تھی۔ میرا پرس تو ائرپورٹ کی جھاڑیوں میں کہیں پڑا ہوگا۔

میری بات سن کر ابو مسکرائے اور بولے۔ "یہ بھی عجیب اتفاق ہے۔ میں اپنے لیے پرس خرید رہا تھا، وہ پرس مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے ویسا ہی ایک دوسرا پرس تمہارے لیے خرید لیا۔"

اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ پرس میرا نہیں تھا بلکہ ابو کا تھا جسے میں اپنا پرس سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے ابو کا پرس دیکھا بھی نہیں تھا۔ میرا پرس انہوں نے اپنے ایک جاننے والے کے ہاتھ بھجوایا تھا۔

"لیکن وقار بیٹا!" ابو نے کہا۔ "وہ پرس ہے کہاں؟ اس میں دو لاکھ سے زیادہ کی رقم تھی۔ پاکستانی کرنسی تو کم تھی ہاں سعودی ریال اور ڈالرز زیادہ تھے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔

"جی آیئے۔"

دروازہ کھلا اور وہ فرشتہ صفت سب انسپکٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے وہ پرس ابو کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لیں، اپنی امانت سنبھالیں۔ میں نے ابھی تک اس لٹیرے کا پرچہ نہیں کاٹا ہے ورنہ یہ پرس آپ کو عدالت سے ملتا۔"

"ابو نے اس میں سے تمام کرنسی نوٹ، اپنا لائسنس اور قومی شناختی کارڈ نکالا اور سب انسپکٹر سے بولے۔ "آپ یہ پرس لے سکتے ہیں آفیسر! اس بدمعاش کو سزا ضرور ملنا چاہیے ورنہ وہ پھر یہی حرکت کسی اور کے ساتھ کرے گا۔"

"لایئے، یہ پرس مجھے دے دیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "میں اس اچکے کا پرچہ کاٹ رہا ہوں۔ اس میں جتنی رقم تھی وہ سب اس نے نکال لی ہے۔ میں ابھی آپ کی میڈیکل رپورٹ بھی یہاں سے لے لوں گا۔ اسے تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔"

پھر سب انسپکٹر نے ابو کا باضابطہ بیان لیا، ان سے پورے واقعے کی تفصیل پوچھی اور پرس لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے دفتر سے ایک دن کی چھٹی لے لی تھی۔ شام تک ہم ابو کو گھر لے آئے۔

سونیا نے مجھے موبائل کے لیے پیسے دیے تو مجھے پھر شرمندگی ہوئی۔ اس نے کتنی معصومیت سے میرے جھوٹ پر یقین کر لیا تھا۔ میں اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دوں لیکن سچ بولنا بھی بعض اوقات انسان کو بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔

شام کو شفیق صاحب، نوید اور فہد اچانک گھر آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ ان میں سے کوئی سونیا کو یہ نہ بتا دے کہ میں ائرپورٹ جانے کے بجائے ان کے ساتھ جوا کھیل رہا تھا اور وہ رقم میں نے جوئے میں ہاری ہے۔

سونیا ان لوگوں کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ شفیق صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے پیسے نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولے۔ "وقار! مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے تمہیں اتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔ یہ تمہاری تنخواہ کی رقم ہے۔ یہ رکھ لو۔"

"سر! مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "غلطی میری ہی ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"بات یہ نہیں ہے وقار!" شفیق صاحب نے نظریں جھکا کر کہا۔ "ہم لوگوں نے تمہیں کھیلنے پر مجبور کیا تھا... اور... وہ پتے بعد میں نوید ہی نے مجھے دیے تھے۔"

"سوری یار!" نوید نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔"

میں نے شفیق صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رقم جیب میں رکھ لی۔

بعض اوقات انسان کا جھوٹ ہی اس کی سب سے بڑی سچائی ہوتا ہے لیکن ایسا صرف ایک آدھ بار ہی ہو سکتا ہے۔

تلاش

محمد فاروق انجم

محبوب کی پہلی نظر... یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جو زندگی کی مدہوشی کو بیداری سے الگ کرتا ہے... وہ پہلا شعلہ جو دل کے اندر کی سرزمین کو جگمگا دیتا ہے... یہ پہلا سحر انگیز نغمہ ہے جو دل کے نقرئی تاروں پر چھیڑا جاتا ہے... پہلی نگاہ وہ بیج ہے جسے محبت کی دیوی دل کی کھیتی میں بوتی ہے... محبت اور محبوب کی تلاش میں سرگرداں ایک ایسی ہی لڑکی کا فسانۂ زیست... جو مدت سے ماضی کی گہرائیوں میں خوابیدہ تھی... چاہت... محبت اور محبوب کی دل نشیں و سحر انگیز شخصیت اس کے خوابوں کے نگر کو آباد رکھتی تھی۔ حقیقی دنیا میں اس کی متلاشی نگاہیں ہر چہرے میں اس شخص کا چہرہ کھوجتی پھرتی تھیں...

جذبات کے تلاطم میں آتش عشق کی چنگاری کے بھڑکنے کا دل سوز قصہ

دروازہ کھلتے ہی اس نے خوشگوار حیرت سے دائیں سے بائیں نظر پھیر کر دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ اسی زمین پر ہے کہ کسی اور دنیا میں چلی گئی ہے۔ اس کمرے میں ایسی نفاست اور قرینہ اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ سامنے کوئی کھڑا تھا۔ جس کا لباس انتہائی نفیس تھا۔ کوٹ، پینٹ اور ٹائی کا رنگ ایسا تھا کہ پہننے والے کے ذوق کو داد دیے بغیر رہنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے خمار آلود خالی نگاہوں سے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ایسا خواب وہ پہلی بار نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ خواب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ بند اور کھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی اور سوچتی تھی اور حقیقت کی دنیا میں اسے تلاش کرتی تھی۔

ٹرین کی رفتار آہستہ ہوئی اور پھر رینگتی ہوئی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ٹرین کو اس چھوٹے سے اسٹیشن پر پانچ منٹ کے لیے رکنا تھا۔ عائزہ نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ اس کا خواب ٹرین کے جھٹکے نے توڑ دیا تھا۔ عائزہ نے اپنا چاند سا چہرہ ٹرین کی کھڑکی سے نکال کر باہر جھانکا تو اس کی نظر سامنے کھانے پینے کے اسٹال پر پڑی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ عائزہ کو پانی کی بوتل خریدنی تھی۔ اس کے پاس جو پانی کی آخری بوتل تھی، وہ بہت پہلے ختم ہوچکی تھی اور اسے پیاس محسوس ہورہی تھی۔

جونہی عائزہ نے ٹرین سے باہر قدم رکھا تو اس نے اپنے بالوں کی لٹ جو اس کے گال کو چھو رہی تھی، ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹانے کے بہانے ایک نظر اپنے عقب میں دیکھا تو اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے معدوم ہوگئی۔

عائزہ کو یقین تھا کہ وہ نوجوان جو اس کے ساتھ اسی ڈبے میں سفر کررہا تھا، وہ ضرور اس کے پیچھے آئے گا۔ جب عائزہ نے سفر کے لئے اپنی سیٹ سنبھالی تھی وہ نوجوان بھی اسی اسٹیشن سے سوار ہوا تھا۔ اس کی سیٹ سامنے والی تھی لیکن وہ نوجوان عائزہ کے عین سامنے نہیں بیٹھا تھا۔ پہلے تو عائزہ کو کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن اچانک عائزہ کو لگا کہ وہ نوجوان اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ جونہی عائزہ نے اس کی طرف دیکھا تو نوجوان نے فوراً اپنی نظریں دوسری طرف کرلی تھیں۔ یہ آنکھ مچولی اس اسٹیشن تک جاری تھی۔ اور عائزہ کو

اس کھیل میں لطف آنے لگا۔

عائزہ پندرہ، بیس دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہی تھی۔ وہ جس کمپنی میں کام کرتی تھی، اس کمپنی کا ہیڈ آفس اس شہر میں تھا اور کمپنی نے عائزہ کو ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس شہر میں عائزہ کی کزن ایک عرصے سے رہائش پذیر تھی۔ اس کا نام عفت تھا اور پچھلے سال اس کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ عفت اپنی مرضی کی مالک تھی اور اپنی زندگی کے وہ خود فیصلے کرتی تھی۔ اور اس فلیٹ میں وہ اکیلی رہتی تھی۔ عفت کے علاوہ اس شہر میں عائزہ کے لیے جو خاص تھا وہ یہ تھا کہ اس کا منگیتر بھی اسی شہر میں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

عائزہ نے قریبی اسٹال سے پانی کی بوتل خریدی اور جونہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی اس کے پیچھے وہ نوجوان کھڑا تھا .... عائزہ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ نوجوان گڑبڑا گیا اور فوراً اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف کرلیں۔ پھر جلدی سے کچھ خریدنے کے لیے چپس وغیرہ اُٹھانے لگا۔ عائزہ مسکرائی اور دھیرے دھیرے ٹرین کی طرف چل پڑی۔

اسی دوران ٹرین نے وسل دی اور جو مسافر ٹرین سے اتر کر باہر نکلے ہوئے تھے وہ ٹرین میں سوار ہونے کے لیے بھاگے۔ عائزہ کی رفتار بھی کچھ تیز ہوگئی تھی۔ کچھ ثانیے کے بعد نوجوان کے قدم بھی ٹرین کی طرف اُٹھ گئے۔

عائزہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ وہ پُراعتماد تھی اور اس کے دل میں عام لڑکیوں کی طرح کوئی ڈر اور خوف براجمان نہیں رہتا تھا۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا جانتی تھی۔ گھومنا، کھانا پینا اسے بہت پسند تھا۔ وہ کالج میں بھی لڑکوں کے ساتھ دوستی کر کے انہیں بے وقوف بنا کر اپنی دوستوں کے ساتھ خوب ہنستی تھی۔ اس کی شوخ و چنچل عادت نے اسے نڈر بنا دیا تھا۔

عائزہ ٹرین میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی لیکن اس کے لبوں

پر کئی بار مسکراہٹ آئی تھی۔ جبکہ نوجوان نے اب عائزہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی کوشش تھی کہ وہ عائزہ کو پتا نہ چلنے دے کہ وہ اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

سفر کم رہ گیا تھا۔ پلیٹ فارم دوڑتا ہوا قریب آرہا تھا۔ مسافروں نے اُترنے کی پہلے ہی تیاری شروع کر دی تھی۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر رکی مسافر اُترنے کے لیے اُمنڈ پڑے۔ عائزہ اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ جب سارے مسافر اتر گئے تو اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور ڈبے سے باہر نکل گئی۔ عائزہ خارجی دروازے کی طرف جارہی تھی لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نوجوان اس کے پیچھے آرہا ہے۔ وہ یکدم گھوم کر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ عائزہ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا کیونکہ وہ نوجوان اس کے پیچھے ہی تھا۔

عائزہ باہر نکلی اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے سے قبل یکدم وہ گھومی اور اس کے پیچھے آتا ہوا نوجوان یکدم ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ حواس باختہ سا ہو کر سوچنے لگا کہ وہ اب کیا کرے ؟

''اب آپ مجھے بتا ہی دیں کہ مجھے اس قدر دیکھنے کی آخر کیا خاص وجہ ہے ؟'' عائزہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دراصل مجھے لگ رہا ہے کہ ہم ایک ساتھ کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ سارے راستے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' لڑکے کے چہرے پر بے چارگی تھی۔

''ہم ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں ؟'' عائزہ کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ لڑکی سے بات کرنے کا یہ پرانا طریقہ ہے۔

''میرا نام عاطف ہے، اور اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ کا نام عائزہ ہے۔'' اس نے کہا۔

عائزہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔ ''تم عاطف ہو۔ تمہاری تو مونچھیں ہوتی تھیں اور تم پہلے سے زیادہ صحت مند بھی ہو گئے ہو۔''

''شکر ہے آپ نے مجھے پہچان تو لیا۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''اس خوشی میں مجھے ایک کپ چائے کا پلاؤ۔'' عائزہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ عاطف کا چہرہ بھی کھل گیا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی۔

دونوں قریبی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ عائزہ کو یاد آیا کہ عاطف کالج کے دنوں میں اسے متاثر کرنے کی کوشش میں رہتا تھا اور ایک بار کالج کے آخری دنوں میں عاطف نے دبے دبے الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار بھی اس انداز میں کیا تھا کہ عائزہ سمجھ جانے کے باوجود کچھ نہ سمجھنے کا کہہ کر بے پروائی سے چلی گئی تھی، اور اب چند سالوں کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

چائے آنے سے پہلے دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ عاطف نے بتایا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ بزنس کرتا ہے اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔ عائزہ نے بتایا کہ وہ تین ماہ قبل اس شہر میں منتقل ہوئے ہیں۔ دراصل عائزہ نے باتوں کے دوران سوچ لیا تھا کہ کالج کے دنوں میں عاطف اسے پسند کرتا تھا اور اب بھی اس کے دل میں وہی جذبات دکھائی دیتے ہیں۔ ان جذبات کا فائدہ وہ یہ اُٹھائے گی کہ جتنے دن وہ اس شہر میں ہے وہ عاطف کو خوب بے وقوف بنا کر اس کے ساتھ کھائے پیے گی اور خوب گھوم پھر کر واپس چلی جائے گی اور عاطف اس کی راہ تکتا رہ جائے گا، اس طرح خوب لطف رہے گا۔

''اچھا وہ ایک لڑکا ہوتا تھا جس کی تمہارے ساتھ بڑی دوستی ہوتی تھی اور وہ مجھے دیکھ کر اسٹائل بنایا کرتا تھا، کیا نام تھا اس کا ؟'' اچانک یاد آنے پر عائزہ نے پوچھا۔

''تم شاید سہیل کی بات کر رہی ہو۔'' عاطف بولا۔

''ہاں سہیل... کہاں ہوتا ہے وہ ؟'' عائزہ نے کہا۔

''عائزہ تمہارا موبائل نمبر کیا ہے ؟'' اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عاطف نے اس کا موبائل نمبر مانگ لیا۔ عائزہ نے بھی فوراً اپنی اس سم کا نمبر بتا دیا جو اس نے اس شہر میں آنے سے پہلے خریدی تھی تاکہ وہ نئے بننے والے دوستوں کو یہ نیا نمبر دے کیونکہ اس سم کو وہ فون سے نکال کر کبھی بھی ان سے ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم کر سکتی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے نمبر دیے اور عاطف اسے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ عاطف کی باتوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ اب بھی عائزہ کو پسند کرتا ہے۔ عائزہ دل ہی دل میں مسکرا اور سوچ رہی تھی کہ وہ جتنے دن اس شہر میں ہے خوب مزہ کرے گی۔ پرانا کلاس فیلو مل گیا تھا اور ایک بار پھر اسے بے وقوف بنانے میں مزہ آئے گا۔

☆☆☆

عائزہ اپنی کزن عفت کے فلیٹ میں پہنچ چکی تھی۔

عفت آفس سے جلدی آگئی تھی اور آتے ہوئے اس نے کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ عائزہ کو بھوک لگ رہی

تھی اس لیے منہ ہاتھ دھونے کے بعد دونوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے تھے۔ عائزہ لطف اندوز ہوتی ہوئی سارا قصہ عفت کو سنا رہی تھی کہ کس طرح اچانک اس کا پرانا کلاس فیلو مل گیا اور آج بھی وہ اسے پسند کرتا ہے۔ عفت اس کی طرف دیکھتی ہوئی ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اور جب عائزہ چپ ہوئی تو عفت نے کہا۔

''تم بالکل نہیں بدلیں کالج کے دنوں میں بھی تم ایسی ہی تھیں تمہاری شرارتوں سے ہر کوئی تنگ تھا اور تم نے کالج میں بھی کئی لڑکوں کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔''

''اب میں کیا کروں۔ مجھے بور زندگی گزارنا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ جب تک زندگی میں ایکشن نہ ہو مزہ ہی نہیں آتا۔'' عائزہ بولی۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ مجھے بھی پابندیوں کی زنجیر میں بندھ کر رہنا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ میری شادی ہوئی، شوہر نے اپنی مردانگی دکھانا شروع کر دی۔ بات بات پر ٹوکنا تو جیسے اس کی عادت تھی۔ یہ کرو، وہ نہیں کرو، ایسے رہو، ویسے نہیں رہو، میں تو کہتی ہوں کہ اچھا ہوا میری جان چھوٹ گئی اُس سے۔'' عفت نے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''تم اکیلی بور نہیں ہوتیں؟'' عائزہ نے پوچھا۔

''بوریت کو میں نے اپنے پاس آنے کی جگہ ہی نہیں دی۔ صبح آفس اور کام کے دوران میں بہترین وقت گزرتا ہے، پھر آفس ٹائم کے بعد اپنی دوستوں کے ساتھ گپ شپ، کبھی میں ان کی طرف چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ میری طرف آجاتی ہیں۔ رات کو تھک اتنا جاتی ہوں کہ سیدھی بستر پر اور مزے کی نیند۔ اپنی نیند سوتی ہوں اور اپنی نیند جاگتی ہوں۔'' عفت نے مسکرا کر بتایا۔

''ویسے تم نے دوبارہ شادی کے بارے میں سوچا ہے؟'' عائزہ نے سلاد کی پلیٹ اپنی طرف کرتے ہوئے سوال کیا۔

''امی کہتی ہیں کہ واپس آجاؤ۔ پھر سے تمہاری شادی کر دیتی ہوں۔ میں نے امی کو صاف کہہ دیا ہے اب مجھے واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔'' عفت نے کہا۔

''تو تم دوبارہ شادی نہیں کرو گی؟'' عائزہ بولی۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں دوبارہ شادی نہیں کروں گی۔'' عفت نے اس کی طرف دیکھا۔

''کوئی ہے نظر میں؟'' عائزہ شرارت سے مسکرائی۔

''میری چھوڑو۔ جس کی نظر میں تم ہو، اس کی بات کرو۔ تمہارا منگیتر اس شہر میں پولیس کی نوکری کر رہا ہے۔ صبح سے تین بار تمہارا پوچھ چکا ہے کہ تم کب آرہی ہو۔'' عفت ہنسی۔

''یہ کیا تم نے ذکر کر دیا ہے۔'' عائزہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

''تمہارا منہ کیوں بن گیا ہے۔ کوئی کڑوی چیز منہ میں آگئی ہے؟'' عفت اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''عدنان میرا آئیڈیل نہیں ہے۔ میرے خواب کچھ اور ہیں۔ مجھے ایسا شوہر چاہیے جو نفاست میں اپنی مثال آپ ہو، جو خوش لباس ہو، چاہئے مجھ سے وہ عمر میں بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص مجھے مل جائے تو میں اسے شادی کی پیشکش کرنے میں ذرا دیر نہ لگاؤں گی۔''

''تم پاگل اپنے خوابوں کے حصار میں رہنے والی لڑکی ہو۔ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔ تمہاری منگنی عدنان کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اور تم صرف اسی کے بارے میں سوچا کرو۔'' عفت نے مسکراتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے عدنان کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' عائزہ نے بے پروائی سے ہاتھ جھٹکا۔

''تم بہت کمینی ہو۔'' عفت نے کہا۔ ''اپنے خوابوں سے نکل کے حقیقت کی دنیا میں واپس آجاؤ۔ زندگی آسان ہو جائے گی۔''

☆☆☆

رات کو عائزہ کے منگیتر عدنان نیازی کی کال عفت کے فون پر آگئی۔ عفت نے نمبر دیکھ کر ایک نظر عائزہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''عدنان کا فون ہے۔''

''کیا کروں؟'' عائزہ کے چہرے پر اکتاہٹ سی آگئی۔

''بات کرلو۔''

''کیا بات کروں۔ وہی خشک باتیں، کیا حال ہے، کیا کر رہی ہو، وغیرہ وغیرہ، مجھے نہیں بات کرنی۔'' عائزہ نے ہاتھ مارا۔

''پھر بھی بات کرلو۔'' عفت نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ عائزہ نے طوعاً کرہاً فون لیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بیس منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس نے فون عفت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اتنی بور باتیں... میرا تو سر دکھنے لگا ہے۔ میں نے فون کی بیٹری ہی نکال دی ہے۔ وہ بار بار کوشش کر رہا ہوگا' خود ہی سمجھ جائے گا کہ فون کی بیٹری ختم ہوگئی ہوگی۔''

''وہ تمہارے فون پر کال کرلے گا۔''

''تمہارے فون پر اسی لیے تو اس کی کال آرہی تھی کیونکہ جو نمبر اس کے پاس تھا، وہ سم میں لے کر ہی نہیں آئی۔'' عائزہ نے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' عفت نے پوچھا۔

''کہہ رہا تھا کہ چلو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی ساتھ کھائیں گے۔ میں نے کہہ دیا کہ میں کھانا کھا چکی ہوں اور سفر کی وجہ سے تھک چکی ہوں اس لیے آج نہیں۔'' عائزہ نے بتایا۔

''تم چلی جاتیں۔'' عفت نے کہا۔

''اس کے ساتھ جانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

عائزہ نے ابھی اتنا کہا ہی تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھ کر عفت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''عاطف کا فون ہے۔'' عائزہ فون کان سے لگاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد عائزہ باہر آگئی۔

''کیا ہوا...؟'' عفت نے پوچھا۔

''عاطف نے مجھے ڈنر کی دعوت دی ہے اور میں جا رہی ہوں۔'' عائزہ پُرجوش تھی۔

''اکیلی جاؤ گی؟''

''ڈرپوک نہیں ہوں۔'' عائزہ نے اپنے سر کے بال باندھتے ہوئے جواب دیا۔

''تم ایسا کیوں کرتی ہو؟''

''کیونکہ میں سائیکو ہوں۔'' عائزہ کہہ کر دانت نکالنے لگی۔

''چلو پھر میں بھی اپنی کسی دوست کی طرف ہو آتی ہوں۔'' عفت بھی اپنی جگہ سے اُٹھی۔ ''تم مجھ سے فلیٹ کی دوسری چابی لے لینا۔ جب بھی آؤ گی تو بیل نہیں دینی پڑے گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' عائزہ نے کہا۔ وہ جلدی سے تیار ہونے لگی۔ اس دوران عفت بھی تیار ہو چکی تھی۔ دونوں ایک ساتھ فلیٹ سے باہر نکلیں اور اپنے اپنے راستے جانے کے لیے الگ الگ ٹیکسی کی طرف چلی گئیں۔

☆☆☆

خوبصورت رات اور شہر کے بہترین ریسٹورنٹ میں عائزہ اور عاطف ڈائننگ ہال میں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔ ہلکی ہلکی موسیقی چل رہی تھی اور ڈائننگ ہال میں جیسے پیار و محبت کی پریاں اُتر رہی تھیں۔ عاطف نے پُرتکلف کھانے کا آرڈر دے دیا تھا اور ابھی ویٹر ان کا آرڈر لے کر نہیں آیا تھا۔ عاطف اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مجھے کبھی کسی لڑکی نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ تم کو دیکھ کر میں آج تک متاثر ہوا ہوں۔ پہلی ہی نظر نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا اور میرا دل بے چین ہوگیا کہ کسی طرح تم سے بات ہو جائے۔ ایک ساتھ پڑھتے رہے لیکن کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ تم سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں۔''

عائزہ نے عاطف کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ ''کہہ لو جو کہنا چاہتے ہو۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اچانک عاطف نے سوال کر کے عائزہ کو چونکا دیا۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا اس کے بجائے اس کے منہ سے جھوٹ الفاظ بن کر نکلے۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ ہم کالج کے بعد پھر مل گئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ تم ابھی تک ویسا ہی میرے بارے میں سوچتے ہو جیسا کالج کے دنوں میں سوچا کرتے تھے۔''

''اس سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں آج بھی تمہارے ....انتظار میں ہوں۔'' عاطف کو بھی جلدی سے اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

''سونڈ بونڈ اُلو۔'' عائزہ کے دل سے آواز نکلی اور وہ زیرِ لب مسکرائی۔

''تم نے کچھ کہا؟'' عاطف نے پوچھا۔

عائزہ چونکی۔ ''تم نے کچھ سنا؟'' عائزہ کو لگا کہ جیسے اس کے دل میں اُٹھنے والی آواز عاطف نے سن لی ہو۔

''نہیں مجھے لگا کہ شاید تم نے کچھ کہا ہے۔'' عاطف نے کہا تو عائزہ نے اطمینان کی سانس لی کہ اس کے دل کی آواز عاطف نے نہیں سنی۔ اس دوران میں ویٹر کھانے پینے کا سامان لے کر آگیا۔ اس نے کھانے پینے کا سامان میز پر سجایا اور چلا گیا۔ عائزہ کے سامنے جو کچھ بھی تھا وہ اس کی پسند کا تھا۔ مزیدار کھانا اس کی کمزوری تھی۔ حالانکہ عفت نے اسے بازار سے لایا ہوا فاسٹ فوڈ بھی کھلایا تھا لیکن اتنا کچھ دیکھ کر اس کی بھوک پھر جاگ گئی تھی۔

دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ کھانے میں بھی

معروف ہو گئے۔ عاطف بتا رہا تھا کہ وہ اپنا ذاتی بزنس کرتا ہے اور گھر کی طرف سے بہت خوشحال ہے۔ اس کے گھر والے اس کی شادی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے لیکن اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں مل رہی تھی لیکن آج تم پھر سے ملیں تو مجھے لگا جیسے میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔

عائزہ اپنے بارے میں کچھ بھی سچ نہیں بتا رہی تھی۔ عائزہ نے اپنے والدین کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بیرونِ ملک مقیم ہیں اور وہ یہاں اکیلی رہتی ہے اور تین، چار ماہ کے بعد اپنے والدین کے پاس ملنے چلی جاتی ہے۔ جب دل بھر جاتا ہے تو پھر اپنے شہر اور اپنے دوستوں میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہے۔

ان کے درمیان ابھی باتیں جاری تھیں کہ اچانک کسی نے قریب آکر اپنا گلا صاف کیا تو عاطف نے چونک کر اس جانب دیکھا اور مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

ان کے پاس ایک خوش پوش، وجیہہ نوجوان کھڑا تھا۔ دونوں خوش دلی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور جب عاطف اس سے الگ ہوا تو اس نے عائزہ سے تعارف کرایا۔

''تم نے پہچانا اسے... یہ سہیل ہے۔''

''ارے سہیل تم؟'' عائزہ اس کی طرف دیکھ کر خوشی سے بولی۔

''تم عائزہ ہو؟'' سہیل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ عائزہ ہے جو ہمارے ساتھ پڑھتی تھی۔ آج اچانک ملاقات ہوئی ہے۔ سہیل ڈاکٹر ہے بلکہ یہ اکیلا ہی ڈاکٹر نہیں اس کی پوری فیملی میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ڈاکٹر نہیں ہے۔'' عاطف نے مزید بتایا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے ہم پھر کالج دور میں لوٹ گئے ہیں۔'' عائزہ کو اس سے مل کر خوشی ہو رہی تھی۔

''تم اِدھر کہاں؟'' عاطف نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے سوال کر دیا۔

''میں یہاں آپریشن کرنے کے لیے آیا تھا۔'' سہیل نے متانت سے کہا۔

''آپریشن...؟ اور اس ریسٹورنٹ میں؟'' عاطف کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''ریسٹورنٹ میں کوئی کھانے پینے کے لیے ہی آتا ہے اور میں یہاں کیا کرنے آؤں گا۔'' سہیل نے جلدی سے کہا۔

عاطف پھر ہنسا۔ ''آؤ پھر ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاؤ۔''

''شکریہ، میں کھا چکا ہوں۔'' سہیل نے کہتے ہوئے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور عائزہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرے کلینک کا کارڈ ہے۔ سر میں درد بھی ہو تو ضرور تشریف لانا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ سر میں درد ہو تو تمہارے کلینک میں آؤں؟'' عائزہ زیرِلب مسکرائی۔

''سر میں درد ہونا ضروری نہیں ہے۔ تم جب چاہو آجاؤ۔'' سہیل نے جلدی سے کہہ کر سر کو تھوڑا سا خم کیا اور مسکرا کر چل دیا۔ عاطف کے سینے میں چھری چل رہی تھی۔ وہ سہیل کی عادت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ دل پھینک تھا اور اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ دوسرے کے تعلق کو بھی نہیں دیکھتا تھا۔ عائزہ سوچ رہی تھی کہ ایک اور بے وقوف مل گیا۔ یہ تو ڈاکٹر ہے۔ عاطف سے بھی اچھی گپ شپ اس سے رہے گی۔

عاطف نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''پندرہ بیس دن کے بعد اس کی شادی ہو رہی ہے۔ تم کھانا کھاؤ۔''

عاطف کی بات سن کر عائزہ دل میں مسکرائی۔ عاطف نے اس کی شادی کے بارے میں اسے ایسے بتایا جیسے وہ اس کی کوئی شکایت کر رہا ہو۔

☆☆☆

عائزہ جب فلیٹ میں پہنچی تو عفت ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی کچھ دیر قبل ہی فلیٹ میں واپس آئی تھی۔ وہ عائزہ کو دیکھتے ہی بولی۔ ''دس منٹ پہلے آجاتیں تو تمہاری ملاقات عدنان سے ہو جاتی۔''

''وہ آیا تھا؟'' عائزہ کے قدم اسی جگہ رک گئے۔

''ہاں ابھی گیا ہے۔''

''تم نے کیا کہا اُسے؟''

''میں نے کہا کہ اس کا موبائل فون سفر میں کہیں گر گیا تھا اور وہ نئی سم لینے کے لیے گئی ہے۔'' عفت نے بتایا۔

عائزہ خوش ہو گئی۔ ''یہ تو نے اچھی بات کہی۔''

''میری بات پر اسے یقین نہیں آیا، وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس وقت وہ اکیلی سم لینے گئی ہے۔ بہرحال میں نے سنبھال لیا تھا۔ عدنان ہم دونوں کا کزن ہے۔ تمہارا تو وہ منگیتر بھی ہے، کیوں تم اسے تنگ کر رہی ہو؟''

''بور آدمی ہے۔'' اس نے برا سامنہ بنایا۔

''شادی کے بعد کیا کرو گی؟''

''گزارہ کروں گی، لیکن خوش اپنے خوابوں کے ساتھ رہوں گی۔'' عائزہ کہتی ہوئی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

''پھر تو تمہیں اپنی زندگی بہت بور اور بے رنگ لگے گی۔ تم نے منگنی سے پہلے اپنی امی سے کیوں بات نہیں کی۔'' عفت نے کہا۔

''میری کسی نے سنی ہی نہیں۔ میں نے ہزار بار امی سے کہا کہ مجھے ایسا شوہر نہیں چاہیے۔ مجھے ایسا شخص چاہیے جس کی کوئی شخصیت ہو، جسے پہننے کا سلیقہ ہو، جو سوبر ہو اور جس کی باتیں متاثر کن ہوں۔'' عائزہ کے چہرے پر متانت آ گئی۔ ''عدنان خوبصورت ہے۔ لیکن اس کی شخصیت میں وہ بات نہیں ہے جو میں چاہتی ہوں۔ چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹے تو یہ اپنی وردی میں رہا کرے گا، مجھے اس کے تن پر کوئی اور لباس نظر کب آئے گا۔''

''پھر اب کیا کرو گی۔ منگنی ہو چکی ہے۔ شادی کی آمد آمد ہے؟'' عفت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجبور ہوں، کیا کر سکتی ہوں۔ اس لیے شادی کے بعد اس سے گزارہ کروں گی اور شادی سے پہلے عاطف جیسے بے وقوف لڑکوں کے ساتھ جھوٹی دوستی کر کے انجوائے کروں گی۔''

''یہ سوال اچانک میرے ذہن میں آیا ہے... فرض کرو کہ جیسا لڑکا تم چاہتی ہو اور وہ تمہیں مل جائے تو؟'' عفت نے سوال کر کے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تو پھر میں عدنان کی پہنائی ہوئی انگوٹھی اتار کر پھینک دوں گی۔ پھر مجھے اپنے گھر والے اس ایک کے لیے چھوڑنے ہی کیوں نہ پڑیں میں چھوڑ دوں گی۔'' عائزہ کے لہجے میں بڑی مضبوطی تھی اور اس کے الفاظ میں ایسا تاثر تھا کہ ایک لمحے کے لیے تو عفت بھی دنگ رہ گئی۔ عائزہ اٹھ کر چلی گئی اور عفت اپنی جگہ بیٹھی بہت دیر تک سوچتی رہی۔ انجانی سی سوچوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن عائزہ اپنے آفس چلی گئی۔ کام کے دوران عاطف کا دو بار فون آیا لیکن وہ اس سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری بار فون کان سے لگا کر عائزہ نے اتنا کہا۔

''شام کو بات ہو گی۔''

عائزہ کے لیے دن بھر مصروفیت رہی اور وہ تھک سی گئی۔ واپس جانے کے لیے وہ بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی کہ ایک بڑی کار اس کے سامنے رکی، اندر سہیل بیٹھا ہوا تھا۔

''آپ کو ڈراپ کرنے کا اعزاز اس ناچیز کو مل سکتا ہے کیا؟'' سہیل نے کہا تو عائزہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ارے تم؟'' عائزہ اس کی کار کے پاس چلی آئی۔

''آ جاؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' سہیل نے کہا تو عائزہ اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سہیل نے کار آگے بڑھا دی۔

''کہاں سے آ رہی ہو اور کہاں جا رہی ہو؟'' سہیل نے پوچھا۔

''اپنی دوست کی طرف سے آ رہی ہوں اور ایک اور دوست کی طرف جانا چاہتی ہوں۔'' عائزہ نے جواب دیا۔

''آج سارا دن کیا دوستوں کے لیے مخصوص ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' عائزہ مسکرائی۔

''پھر تو میں ٹھیک وقت پر یہاں آیا ہوں۔ تم کو اس دوستی کے دن پر ایک اور دوست مل گیا۔'' چرب زبان سہیل کہہ کر مسکرایا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔'' عائزہ مسکرائی۔

''میرا کلینک اسی روڈ پر ہے۔ ویسے میں یہ بتا دوں کہ میں غیر شادی شدہ ہوں اور ایک اچھے جیون ساتھی کی تلاش میں ہوں۔'' سہیل نے کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

''یہ تم نے مجھے کیوں بتایا کہ تم غیر شادی شدہ ہو اور جیون ساتھی کی تلاش میں ہو؟'' عائزہ نے پوچھا۔

''شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔'' سہیل کہہ کر ہنسا۔

''لیکن تمہاری تو شادی ہونے والی ہے۔'' عائزہ بولی۔

''یہ بات یقیناً تم کو عاطف نے میرے جانے کے ٹھیک ایک منٹ کے بعد کہی ہو گی۔ اسے ہمیشہ سے مجھ سے ڈر رہتا ہے۔ کالج کے زمانے میں وہ کینٹین میں جا کر لنچ بھی مجھ سے چھپ کر کیا کرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اس کا لنچ چھین نہ لوں۔''

''تو کیا تم کو اس سے چھین لینے کی عادت ہے؟''

''نہیں... بلکہ میرا نصیب ہی ایسا ہے کہ چیزیں میری طرف خود بخود آ جاتی ہیں۔ ایک مثال یہ دیکھ لو کہ اتنے سالوں کے بعد تم اسے ملی ہو لیکن اس وقت تم میری کار میں بیٹھی ہو۔'' سہیل نے کہا۔

"تم ویسے کے ویسے ہی ہو جیسے کالج کے دنوں میں تھے۔" عائزہ نے اس کی تعریف کی۔
"شکریہ... کیا تم میرے کلینک چلنا پسند کرو گی؟"
"وہاں کیا چائے اچھی ملتی ہے۔"
"وہاں دوائی اچھی مل سکتی ہے تم کو۔"
"لیکن مجھے چائے کی طلب ہے۔"
"پھر میں تم کو اچھی سی چائے پلاتا ہوں۔"
"آپ کو کلینک سے دیر ہو جائے گی۔"
"مجھے اس کی پروا نہیں ہے کیونکہ جتنے مریض بھی اس وقت وہاں میرا انتظار کر رہے ہوں گے، وہ میری فیس ادا کر کے ہاتھ میں ٹوکن کی زنجیر باندھے کہیں ہل نہیں سکتے۔" سہیل نے کہا تو عائزہ کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی آگئی اور سہیل اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ بہت خوبصورت نظارہ کر رہا ہو۔

☆☆☆

عائزہ واپس اپنے فلیٹ... پہنچ چکی تھی۔ عفت ابھی نہیں آئی تھی۔ عائزہ سوچ رہی تھی کہ سہیل ایک دلچسپ انسان ہے۔ اس کی باتوں میں لطف ہے۔ اور اس کے بولنے کا انداز ایسا ہے کہ سننے والا چاہتا ہے کہ وہ بولتا رہے۔ اس کی حسِ مزاح بہت تیز ہے۔ اس کے برعکس عاطف کی شخصیت میں ایسی بات نہیں ہے۔
عائزہ سوچنے لگی کہ وہ عاطف کو... اپنی دوستی کے پلّو میں باندھنے کے بجائے ڈاکٹر سہیل سے ہی دوستی رکھے گی۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور بوریت دور کرنے کے لیے وہ معقول نوجوان ہے۔ عائزہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ دروازے کی دستک نے اسے چونکا دیا۔
عائزہ نے اُٹھ کر جونہی دروازہ کھولا، وہ چونک گئی۔ سامنے عدنان اپنی یونیفارم میں کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے عہدے کی سنجیدگی اور اس سنجیدگی میں عائزہ کے لیے زبردستی لائی ہوئی مسکراہٹ تھی۔
"زہے نصیب کہ تم مل گئیں۔ ادھر سے گزر رہا تو سوچا کہ دیکھتا جاؤں۔ شاید ملاقات ہو جائے۔ اور ملاقات ہو ہی گئی۔" عدنان بولا۔
"میں ابھی آئی تھی۔ اندر آجائیے۔" عائزہ نے دروازہ چھوڑ دیا۔ عدنان نے جیسے ہی اندر قدم رکھے، عائزہ نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ عدنان آگے تھا اور عائزہ اس کے عقب میں ہاتھ جھٹک کر اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ یہ اس وقت کہاں سے آگیا۔

"عفت نہیں آئی کیا؟" عدنان نے پوچھا۔
"وہ بھی بس آنے ہی والی ہے۔" عائزہ نے جواب دیا۔ عدنان صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے اسٹاف کے سامنے بیٹھا ہو۔ وہی افسری اور تکلف عیاں تھا۔
"عفت بتا رہی تھی کہ تمہارا فون کہیں گر گیا۔" عدنان بولا۔
"ہاں راستے میں کہیں گر گیا تھا۔" عائزہ نے جواب دیا۔
"نیا فون لیا؟" عدنان نے پوچھا۔
"کل لوں گی۔ آپ کے لیے چائے بناؤں؟"
"نہیں میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا۔ دیکھو عائزہ ہم دونوں کا ایک رشتہ اور بھی ہے۔ اور وہ رشتہ یہ ہے کہ ہم آپس میں کزن ہیں۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے بات کرنے سے ڈرتی ہو۔" عدنان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عائزہ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔
عدنان محکمۂ پولیس میں ایماندار اور اپنے فرض سے مخلص پولیس افسر کی پہچان رکھتا تھا۔ وہ خاموش طبع لیکن انتہائی ذہین اور زیرک تھا۔ اسے بہت سی باتیں کرنی نہیں آتی تھیں، اس کے برعکس عائزہ کو خاموشی ڈسنے لگتی تھی اور ہنسی مذاق نہ ہو تو اسے لگتا تھا جیسے اسے کسی نے باندھ دیا ہو، یا کسی ایسے کمرے میں بند کر دیا ہو جہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہو۔ اسی لیے عائزہ اپنی زندگی کو پُرلطف بنانے کے لیے اپنی شوخ طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہنسی مذاق کے راستے تلاش کرتی رہتی تھی۔
عدنان اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "میں چلتا ہوں۔ ڈیوٹی کے بعد فارغ وقت میں تم سے ملوں گا۔ کل مجھے فراغت ہے، کیا خیال ہے لنچ ایک ساتھ نہ کریں۔"
"دوپہر کو تو میں آفس میں مصروف ہوں گی۔"
"ڈنر ایک ساتھ کر لیتے ہیں۔" عدنان نے دوسری پیشکش کی۔
"میں کل آپ کو فون کروں گی۔"
"میں انتظار کروں گا۔" عدنان نے کہا اور اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ جونہی عائزہ نے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اس نے ایسی سکون کی سانس لی جیسے اس کے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو اور وہ یکدم ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔

''خشک بندہ...'' عائزہ نے اس پر تبصرہ کیا اور کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

عائزہ کی ملاقاتیں عاطف اور سہیل کے ساتھ جاری تھیں۔ وہ کبھی عاطف کے ساتھ گھومنے چلی جاتی تھی اور کبھی وہ سہیل کے ساتھ ڈنر پر نکل جاتی تھی۔ ان دونوں کی وجہ سے عائزہ کو اس شہر میں دن بھر کام کرنے کی وجہ سے ہونے والی تھکاوٹ کا احساس نہیں رہتا تھا اور وہ خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ عائزہ کی دانست میں سہیل، عاطف سے زیادہ دلچسپ لڑکا تھا۔ اس کی باتوں میں مزاح اور حاضر دماغی تھی جو اسے کھل کر ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

اس رات عائزہ اپنے بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ وہ عاطف سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم کر کے صرف سہیل کے ساتھ تعلق رکھے۔ ویسے بھی اس کی ٹریننگ مکمل ہونے والی تھی اور وہ چند دنوں کے بعد واپس جانے والی تھی۔ عدنان کے ساتھ تو اس نے کوئی خاص ملاقات نہیں رکھی تھی۔ جب کبھی اس کا فون آجاتا تو وہ کچھ دیر کے لیے اس سے بات کر لیتی تھی۔

اچانک عائزہ کے کمرے میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ عائزہ کا فون جو وائبریشن پر تھا وہ آواز دے رہا تھا۔ عائزہ نے فون اٹھا کر دیکھا اسکرین پر عاطف کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ عائزہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے۔ اس سے بات کر لے، یا پھر فون کاٹ دے۔ جب تک فون میں سرسراہٹ ہوتی رہی وہ اسی سوچ میں ڈوبی رہی۔ اور پھر فون خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فون میں پھر حرکت پیدا ہو گئی۔ عائزہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عاطف سے بات نہیں کرے گی، دو کے بجائے ایک سے دوستی بہتر رہے گی اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سہیل سے ہی تعلق رکھے گی۔

عاطف اس کے فون پر مسلسل کوشش کرتا رہا لیکن عائزہ نے فون آن نہیں کیا۔ دوسری طرف عاطف بار بار کوشش کرنے سے الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، ابھی رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اتنی رات نہیں ہوئی تھی کہ وہ سو جاتی۔

عاطف پھر کوشش کرنے لگا لیکن اس بار بھی جواب نہیں ملا۔ عاطف اس کے لیے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ عائزہ کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اس کی محبت میں جنون کو چھونے لگا تھا۔ وہ دن رات اسی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اور اب جبکہ عائزہ کے ساتھ رابطہ نہیں ہو رہا تھا تو عاطف کو غصہ آنے لگا۔

عاطف بیس منٹ تک مضطرب رہا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس بار موبائل فون اسے یہ اطلاع دے رہا تھا کہ وہ موبائل نمبر مصروف ہے۔ عاطف نے فون بند کیا اور انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ حوصلہ تو ہوا تھا کہ عائزہ ابھی جاگ رہی ہے اور کسی سے فون پر بات کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر فون کیا تو نمبر پھر مصروف تھا۔ اچانک عاطف کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ اس نے فوراً سہیل کا نمبر ملایا۔ عاطف کا دل زور سے دھڑکا کیونکہ سہیل کا نمبر بھی مصروف تھا۔

عاطف وقفے وقفے سے دونوں نمبرز پر کوشش کرتا رہا۔ دونوں فون نمبر مصروف تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب پھر عاطف نے عائزہ کا نمبر ملایا تو بیل چلی گئی۔ عاطف نے فون بند کیا اور سہیل کا نمبر ملایا تو وہاں بھی بیل چلی گئی۔ عاطف نے فون بند کر دیا۔ اس کی دانست میں یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ عاطف اور عائزہ آپس میں بات کر رہے تھے۔

عاطف کو پہلے ہی اس بات کا ڈر تھا کہ اچانک اس کی ملاقات عائزہ سے ہو گئی ہے، اب وہ عائزہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ سہیل اپنی باتوں سے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن بخوبی جانتا تھا۔ کالج کے دنوں میں سہیل نے ایک بار اس سے ... کہا تھا کہ وہ عائزہ کو پسند کرتا ہے۔

عاطف ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ عائزہ کو وہ کالج چھوڑنے کے بعد بھی نہیں بھولا تھا اب اگر وہ ملی تو سہیل جانے کہاں سے بیچ میں آگیا تھا۔ وہ اس بات پر افسوس کرنے لگا کہ کاش اس رات ڈنر کرتے ہوئے سہیل اس جگہ نہ آتا اور عائزہ سے اس کی ملاقات ہی نہ ہوتی۔ عاطف کسی قیمت پر عائزہ کو اب کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار پھر عاطف نے عائزہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بیل ہونے کے باوجود اس نے بات نہیں کی۔

عاطف کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ وہ اسی وقت باہر نکلا اور اپنی گاڑی کو پوری رفتار سے دوڑاتا ہوا سہیل کے پاس پہنچ گیا۔

سہیل ابھی اپنے کلینک میں ہی تھا اور اپنے آخری مریض کو دیکھ کر فارغ ہوا تھا۔ اچانک عاطف کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔

''کیا بات ہے خیر تو ہے؟''

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' عاطف کا چہرہ ایسا تھا جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں مکمل ناکام ہو چکا ہو۔

''ہاں کرو کیا بات کرنی ہے۔'' سہیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور جس لڑکی کی مجھے تلاش تھی، وہ تلاش عائزہ کے ملنے پر ختم ہو چکی ہے۔'' عاطف نے تیزی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

اس کی بات سن کر وہ اپنی تھوڑی کھجانے لگا۔ ''تم نے اپنی شادی کی بات عائزہ سے کی ہے؟''

''میں اپنی فیملی کے ساتھ بات کر چکا ہوں اور کل میں عائزہ سے بات کرنے والا ہوں۔'' عاطف نے بتایا۔ حالانکہ اس نے ابھی اپنی فیملی میں کسی سے عائزہ کی بات نہیں کی تھی۔

''تم عائزہ کے بارے میں فیصلہ کرنے میں نے جلدبازی سے کام نہیں لے رہے ہو؟'' سہیل نے کہا۔

''عائزہ کے لیے محبت کئی سالوں سے میرے دل میں ہے۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی میں اس کی تلاش میں رہا تھا۔ ہم اس شہر میں منتقل ہو گئے تھے اس لیے عائزہ کی تلاش میرے لیے مشکل ہو گئی۔ اچانک وہ ملی تو میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی تھی۔'' عاطف بولا۔

''ٹھیک ہے تم عائزہ سے بات کر کے دیکھ لو، وہ کیا کہتی ہے۔'' سہیل کے چہرے پر گہری متانت تھی اور وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ عائزہ اس کی بات سن کر انکار کر دے گی۔ سہیل کا لہجہ اور چہرے پر بھی سنجیدگی عاطف کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

''میں تمہاری اس بات کا مطلب نہیں سمجھا؟'' عاطف نے گہری نظروں سے سہیل کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے ایک عام بات کی ہے کہ تم اس سے بات کر کے دیکھ لو، وہ کیا کہتی ہے۔ بعض اوقات انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے کہ وہ انکار کر دے گی؟''

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''تم کیا یہ سوچ رہے ہو کہ تم اس کے ساتھ گھنٹا گھنٹا فون پر بات کرو گے اور وہ مجھے نظر انداز کر دے گی؟'' عاطف کا لہجہ کچھ درشت ہو گیا۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم فون پر

بات ہی نہیں کرتے بلکہ ہم نے تو ایک ساتھ چائے بھی پی ہے۔'' سہیل کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا۔

''تم جانتے ہو کہ وہ میری دوست ہے پھر بھی تم نے اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی کوشش کی ہے۔'' عاطف کا غصہ اور بڑھنے لگا۔

''دوستی کا کیا ہے، وہ تو کبھی بھی کسی کے ساتھ ختم ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے کے ساتھ شروع ہو سکتی ہے۔ یہ بات تمہارے علم میں بھی ہے کہ وہ میرے ساتھ بھی پڑھتی رہی ہے۔ اس کی دوستی مجھ سے بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تمہارے ساتھ۔'' سہیل نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن تم یہ بات اچھی طرح سے یاد رکھ لو کہ عائزہ میرے دل میں بس چکی ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اگر تم نے کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو پھر میں عائزہ کو تمہارے قابل بھی نہیں رہنے دوں گا۔'' عاطف کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''تم کیا کرو گے؟'' سہیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ بھی۔'' عاطف نے ایک ایک لفظ زور دے کر ادا کیا۔

''جان سے مار دو گے؟'' سہیل بدستور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔'' عاطف کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔

''تم بھی سن لو اگر اس نے تمہارے ساتھ شادی کی ہاں کر دی تو مجھ سے بھی رحم کی اُمید نہ رکھنا۔'' سہیل کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو چکا تھا، وہ بھی عائزہ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ دونوں کی پرانی دوستی ایک لڑکی کی خاطر دوراہے پر آ گئی تھی۔ عاطف نے نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے دھم دھم کرتا چلا گیا۔

☆☆☆

عاطف کے جانے کے بعد کچھ دیر تو سہیل یونہی بیٹھا رہا اور پھر اس نے عائزہ کو فون کیا۔ جونہی اس کا رابطہ عائزہ سے ہوا اس نے عاطف کے ساتھ ہونے والی گفتگو اس کے گوش گزار کر دی۔ عائزہ کے لیے یہ بات کچھ زیادہ پریشانی کا باعث نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ عاطف سے تعلق منقطع کر دے گی اور وقت گزاری کے لیے وہ ڈاکٹر سہیل کے ساتھ گپ شپ رکھے گی۔ البتہ دونوں کی اس کے لیے سنجیدگی اس کے لطف کا باعث تھی۔ اب ان دونوں کو بے وقوف بنانے میں اور بھی مزہ آئے گا۔ عائزہ نے سوچا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ چند دنوں کی ملاقات میں اس نے اتنی بڑی بات سوچ کیسے لی۔'' عائزہ نے بے پروائی سے کہا۔

''تم ایک کام کرو۔'' سہیل بولا۔

''کیا؟'' عائزہ نے پوچھا۔

''کل، پرسوں جب بھی تم اس سے ملاقات کرو اور وہ تم سے یہ بات کرے تو اسے صاف انکار کر دینا۔ انکار کی گولی کھا کر وہ لمبی نیند سو جائے گا۔'' سہیل نے گویا عائزہ کو مشورہ دیا۔

''مجھے ایسا کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔'' ایک لمحہ سوچنے کے بعد عائزہ نے کہا۔ ''ایک ہفتے میں ایسی کایا پلٹ جائے گی مجھے اس کی امید نہیں تھی۔''

''کل کہیں گھومنے چلیں؟'' سہیل نے ساتھ ہی سیر و تفریح کی پیشکش کر دی۔

''کل کا کل سوچیں گے فی الحال مجھے نیند آ رہی ہے اور میں سونا چاہتی ہوں۔'' عائزہ نے کہہ کر فون بند کیا اور لیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔

''بہتر ہے کہ دونوں سے جان چھڑا لوں، کہیں یہ میرے گلے ہی نہ پڑ جائیں۔''

☆☆☆

عائزہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس دوران میں عاطف اور سہیل کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ اسی اثنا میں عاطف کا فون آ گیا تو اس سے بات کرنے کے بجائے عائزہ نے اسے میسج کر دیا کہ وہ شام کو ملاقات کرے گی۔

دوپہر کے بعد عدنان کا فون آ گیا۔ اس کا نمبر اسکرین پر دیکھ کر عائزہ نے بُرا سا منہ بنایا اور دل ہی دل میں عفت کو چند کڑوی باتیں بھی سنا دیں کہ یقیناً اسی نے اس کا نمبر دیا ہو گا۔

''ہیلو۔'' عائزہ نے فون آن کرنے کے بعد کہا۔

''کیسی ہو عائزہ؟'' عدنان نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' عائزہ نے جواب دیا۔

''تمہارا نمبر ابھی مجھے عفت نے دیا ہے۔ اچھا آج ڈنر کا کیا ارادہ ہے؟'' عدنان نے کہا۔

''آج...؟'' عائزہ آنکھیں گھما کر سوچنے لگی۔ ''کیا کل کا پروگرام نہ کر لیں۔''

''آج کیوں نہیں؟ آج میں فری ہوں۔'' عدنان

نے کہا۔

''آج کام کی وجہ سے میں بہت تھک گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ بخار سا ہو گیا ہے۔'' عائزہ نے بہانہ کیا۔

''میں آتا ہوں اور تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔'' عدنان نے جلدی سے کہا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی بھی طبیعت خراب نہیں ہے کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے۔ آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' عائزہ کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں عدنان سچ مچ ہی نہ آ جائے۔

''ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔'' عدنان نے کہا۔

''او کے۔'' عائزہ نے فون بند کر دیا۔

آفس ٹائم ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اس دوران عائزہ نے اپنا کام جلدی سے ختم کیا اور جونہی آفس ٹائم ختم ہوا اس نے اپنی فائلیں بند کرنے کے بعد انہیں دراز میں رکھا اور اپنی کرسی چھوڑ دی۔

عائزہ سیدھی اس ریسٹورنٹ گئی جہاں اس نے عاطف کو ملنے کا میسج کیا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ ایک ہی میز پر عاطف اور سہیل براجمان تھے۔ عائزہ ان کے پاس چلی آئی۔ اس نے دونوں کو سلام کیا اور درمیان والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ دونوں ایک ساتھ؟''

''سہیل کو میں نے بلایا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں آج جو تم سے کہنے جا رہا ہوں، وہ سہیل بھی سن لے۔'' عاطف نے ایک نظر سہیل کی طرف دیکھا۔ عاطف کے اندر خود اعتمادی کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ جب کچھ کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو خود ہی یہ سوچ لیتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔ عائزہ کے بارے میں بھی اس کا یہی خیال تھا کہ وہ اس کی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتی۔ اس نے سہیل کو اسی لیے بلایا تھا کہ اس کے اقرار کے بعد وہ ان کے درمیان سے اُٹھ کر خود ہی چلا جائے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ کئی بار منہ کی کھا چکا تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر کی خود اعتمادی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''تم مجھ سے کیا کہنے جا رہے ہو؟'' عائزہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے کچھ کھانے پینے کے لیے تو منگوا لو۔'' سہیل نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''پہلے بات ہوگی اور پھر اگر تم بیٹھنا چاہو تو کچھ کھا پی لینا ورنہ کھائے پیے بغیر چلے جانا۔'' عاطف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

سہیل اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری پرانی دوستی میں کچھ گڑبڑ سی ہو رہی ہے اور یہ دوستی ختم ہونے والی ہے۔''

''اس کی وجہ تم ہو۔'' عاطف نے بلا تامل کہہ دیا۔

''اگر تم ایسا سوچتے ہو تو پھر مجھے بھی دوستی کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔'' سہیل بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''تم نے تو پہلے ہی دوستی کو ایک طرف رکھا ہوا ہے۔'' عاطف کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر آپ کو آپس میں اسی طرح بحث کرنی ہے تو مجھے پلیز جانے دیں۔'' ان کی گفتگو میں عائزہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ عائزہ کی بات سن کر دونوں ہی چپ ہو گئے۔ دونوں کی پرانی دوستی ایک لڑکی کی وجہ سے دراڑ کی زد میں آ گئی تھی۔ دونوں کے چہرے اس بات کی صاف غمازی کر رہے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتے ہیں۔

عاطف نے اپنی نگاہوں کو عائزہ کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ ''عائزہ میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔'' عاطف نے کہہ کر کچھ دیر خاموشی اختیار کی اور پھر بولا۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟'' عائزہ یکدم چونکی۔ اس کی خیرہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ عائزہ نے اس کی بات سن کر حیران ہونے کی پوری اداکاری کی تھی۔

''میں سنجیدہ ہوں اور تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔'' عاطف نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''پیار...؟'' اس بات پر عائزہ نے اور بھی زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں... اور یہ محبت کالج کے زمانے سے ہے۔ قدرت نے ہمیں ایک بار پھر ملا دیا اور مجھے تم سے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔''

عائزہ ابھی عاطف کی بات سن کر حیرت کی اداکاری سے باہر نہیں نکلی تھی کہ سہیل نے یہ کہہ کر اسے سچ مچ حیرت میں مبتلا کر دیا۔

''کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا عائزہ کہ میرے دل میں تمہارے لیے بے انتہا محبت ہے اور میں

تمہیں پانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں... کچھ بھی۔" سہیل نے 'کچھ بھی' کہنے میں عجیب سا خوف تھا جسے سن کر عائزہ کے ساتھ ساتھ عاطف بھی ایک لمحے کے لیے ششدر سا رہ گیا۔

"عائزہ تم مجھ سے ایسی اُمید نہ رکھنا کہ میں تمہیں پانے کے لیے کچھ بھی کرسکنے کی بات کروں گا بلکہ میں تمہیں پانے کے لیے آخری حد تک گزر بھی جاؤں گا، کسی دوسرے کی طرح محض بات نہیں کروں گا۔" عاطف نے جب یہ دیکھا کہ سہیل نے ایسی بات کہہ کر اسے بھی ششدر کردیا ہے تو اس نے بھی فوراً جوابی حملہ کردیا۔

عائزہ واقعی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ دونوں اس کی محبت میں اس حد تک جاسکتے ہیں، اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے پانے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔

"تم دونوں نے مجھے حیران کردیا ہے۔" عائزہ کو دونوں کے لہجے خطرناک لگے تھے۔ کسی بھی بات میں نہ گھبرانے والی عائزہ اس وقت واقعی کچھ خوفزدہ ہوگئی تھی۔

"میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں عائزہ۔" عاطف نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور عائزہ کو لگ رہا تھا جیسے ہی وہ انکار کی صورت میں فیصلہ سنائے گی تو عاطف اس کا گلا دبادے گا۔ کچھ ایسے ہی تاثرات سہیل کے چہرے پر بھی تھا۔ عائزہ کے لیے ایسی مشکل کھڑی ہوجائے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"میں ابھی اپنا فیصلہ نہیں سنا سکتی۔" جب عائزہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کی۔

دونوں کے بیک وقت منہ سے ایک ہی سوال نکلا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ تم دونوں نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے کہ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی ہے اس لیے میں جارہی ہوں۔" عائزہ نے اُٹھنا چاہا۔

"تمہیں اپنا فیصلہ سنانا ہوگا۔" عاطف یکدم بولا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور وہ ابھی فیصلہ سننا چاہتا تھا۔

عائزہ نے رک کر دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر ایک دم سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے، میں فیصلہ سناؤں گی اور ضرور سناؤں گی۔ مجھے سات دن کا وقت چاہیے۔"

"سات دن...؟ اتنا وقت؟" سہیل بولا۔

"نہیں یہ بہت زیادہ دن ہیں۔" عاطف نے ماننے سے انکار کردیا۔

"ٹھیک ہے جب تم دونوں مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے تو میں پھر کوئی فیصلہ ہی نہیں کرتی اور یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" عائزہ نے کہا۔

"اوکے... سات دن، اس سے زیادہ ایک دن بھی زیادہ نہیں ہوگا۔" عاطف نے کہہ دیا۔

"ہم آج سے سات دن کے بعد یعنی کے آٹھویں دن اسی وقت اسی ریسٹورنٹ میں ملیں گے۔" سہیل کو بھی اس کی بات ماننی پڑی۔

"اتوار کا دن ہوگا...." عاطف نے فوراً حساب لگا کر کہا۔

"ہاں اتوار کو ہم اسی وقت اسی ریسٹورنٹ میں ملیں گے۔ لیکن تم دونوں کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ تم دونوں مجھے ان سات دنوں میں فون کال نہیں کروگے۔ میں اطمینان سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گی اور جو بھی فیصلہ کروں گی، دوسرے کو ماننے پڑے گا۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں۔" دونوں یک زبان ہوکر بولے۔

"میں جو بھی فیصلہ کروں گی تم دونوں کو منظور کرنا پڑے گا۔" ایک بار پھر عائزہ نے کہا۔

"منظور ہے۔" دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلادیا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"ہم اتوار کا انتظار کریں گے۔" دونوں کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔ عائزہ نے ریسٹورنٹ سے باہر جانے کے لیے اپنے قدم تیز تیز بڑھادیے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ان دونوں سے آخری ملاقات کرکے جارہی ہے۔

اس میز پر عاطف اور سہیل ابھی تک براجمان تھے۔ اچانک سہیل بولا۔ "اگر عائزہ میری نہ ہوئی تو میں اسے کسی اور کی بھی نہیں ہونے دوں گا۔"

"اس سے بھی خطرناک ارادہ میرا ہے ......" عاطف کے لہجے میں بھی زہر تھا۔

"اور اگر عائزہ نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا تو پھر مجھ سے ایسی امید نہ رکھنا کہ میں اس کی حفاظت میں کسی کی شہ رگ کاٹنے سے بھی دریغ کروں گا۔"

عاطف اس کی بات سن کر تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔

☆☆☆

عائزہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دونوں اس کے لیے

اتنے سنجیدہ ہو جائیں گے کہ اسے پانے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ ایسی صورتِ حال دیکھ کر ہی عائزہ نے فوراً یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں سے سوچنے کا سات دن کا وقت لے کر فی الحال ان سے جان چھڑا لے۔ اس شہر میں مزید چھ دن تھے۔ اس کا کام ختم ہو رہا تھا اور ساتویں دن وہ شہر چھوڑنے والی تھی۔ اپنی دانست میں اس نے دونوں کو پابند کر دیا تھا کہ وہ اس سے رابطہ نہیں کریں گے، اس دوران وہ اپنا کام کرتی رہے گی اور جس دن وہ اس کا ریسٹورنٹ میں انتظار کریں گے تب وہ اس شہر کو چھوڑ کر جا بھی چکی ہو گی۔ یوں ان دونوں کا جنون اور محبت کی کہانی دم توڑ دے گی۔

یہ باتیں جب لطف اندوز ہوتے ہوئے عائزہ نے عفت کو سنائیں تو اس نے کہا۔ ''تم بہت ظالم ہو۔''

''تو پھر کیا کروں؟''

''صاف انکار کر دو اور بتا دو کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔'' عفت نے مشورہ دیا۔

''اس طرح ایک جنگ چھڑ جائے گی۔ چھ دن اس شہر میں گزارنا میرے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ ان کی محبت کا وائنڈ اپ یہی ٹھیک ہے جو میں نے سوچا ہے۔'' عائزہ بے پروائی سے بولی۔

''عائزہ تجھے ڈر نہیں لگتا؟''

''سچی بات ہے کہ آج پہلی بار اُن کی باتیں سن کر مجھے ڈر لگا۔ لیکن اب میرے دل میں کوئی ڈر نہیں ہے۔'' عائزہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور عفت اس کے بارے میں سوچنے لگی کہ یہ کیسی لڑکی ہے؟

☆☆☆

دوسرے دن آفس میں پھر ایک مصروف دن تھا۔ شام کو جب آفس ٹائم ختم ہو گیا اور وہ اپنے کاغذات سمیٹ رہی تھی تو ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''معاف کیجیے گا، مجھے انور صاحب سے ملنا ہے۔''

لہجہ ایسا شائستہ تھا کہ عائزہ نے چونک کر اپنا سر اُٹھایا اور جونہی اس نے اپنے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔

وہ پینتالیس سال کی عمر کے لگ بھگ کا شخص تھا۔ اس کے سر کے بالوں کی بہترین تراش خراش تھی، شیو بنی ہوئی اور مونچھیں چھوٹی تھیں، جن میں کہیں کہیں سفید بال بھی جھانک رہے تھے اور جو اس کی شخصیت کو اور بھی جاذب نظر بنا رہے تھے، اس کے چہرے کا رنگ صاف تھا اور اس نے بہترین شرٹ، ٹائی اور کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ایسی سحر انگیز شخصیت دیکھ کر عائزہ اسے جواب دینا ہی بھول گئی۔

''جی مجھے انور صاحب سے ملنا ہے۔'' جب عائزہ کی خاموشی نے کچھ طوالت اختیار کر لی تو اس شخص نے ایک بار پھر اسی متاثر کن لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر عائزہ چونکی اور اس نے اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی تو اسے پتا چلا کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے میں کچھ ایسی منہمک تھی کہ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس کے کولیگز اپنی اپنی کرسی چھوڑ کر جا چکے ہیں اور ہال نما کمرے میں وہ شاید اس وقت اکیلی ہی تھی۔ اس نے انور صاحب کے کمرے کی طرف دیکھا۔

''ان کا وہ کمرا ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ شخص کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ عائزہ اپنا کام بھول کر اس شخص کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس شخص کی شخصیت ہی سحر انگیز نہیں تھی بلکہ اس کے چلنے کے انداز میں بھی وقار تھا۔ عائزہ نے حیران ہو کر سوچا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو اس کے خوابوں میں بسا ہوا ہے، یہ اچانک حقیقت بن کر کیسے اس کے سامنے آ گیا؟

اس شخص نے اس کمرے کے پاس جا کر دروازہ کھولا، اندر جھانکا اور پھر واپس عائزہ کے پاس آ گیا۔ تب تک عائزہ اپنے کاغذات سمیٹ چکی تھی۔

''وہ تو کمرے میں نہیں ہیں۔''

''شاید چلے گئے ہوں گے۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا ہے۔''

''مجھے انہوں نے یہی وقت دیا تھا۔ خیر میں کل آؤں گا۔'' وہ شخص کہہ کر چلتا ہوا باہر نکل گیا اور عائزہ اس کی شخصیت میں کھوئی ہوئی خود بھی کچھ دیر بعد باہر نکل گئی۔

اس عمارت سے ابھی عائزہ نے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ وہ چونک گئی۔ باہر ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کی آمد آمد تھی۔ عائزہ کو اندر بیٹھے یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ باہر کا موسم کیسا ہے؟

عائزہ نے اس طرف دیکھا جہاں رکشا وغیرہ کھڑے ہوتے تھے، اس وقت وہاں کوئی سواری موجود نہیں تھی۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے عائزہ کے جسم میں سردی بھر دی تھی۔ اچانک اس کی سماعت سے ہلکی سی ہارن کی آواز ٹکرائی۔ عائزہ نے ہارن کی آواز کی سمت دیکھا تو وہ چونک سی گئی۔

کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہی شخص براجمان اس کی طرف دیکھ رہا

تھا جو ابھی کچھ دیر قبل اس کے سامنے کھڑا انور صاحب کا پوچھ رہا تھا۔

''موسم خراب ہے اور سواری بھی موجود نہیں ہے۔ آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے اپنی پُروقار آواز میں کہا۔

ایک اجنبی جس نے شخص اس کے آفس میں انور صاحب کا پوچھا تھا جو عائزہ کا سینئر تھا، اس کی اس پیشکش کو شکریہ کے ساتھ منظور نہ کرنے کے بجائے عائزہ خود بخود اس کی گاڑی کی طرف چل دی، کیونکہ وہ شخص اس کے خوابوں کی وجہ سے اس سے پرانی شناسائی رکھتا تھا۔ اس نے اس کی برابر والی سیٹ سنبھال لی۔

''میرا نام شکیل احمد ہے اور انور میرا دوست ہے۔ میری گارمنٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔'' گاڑی چلانے سے پہلے اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''مجھے عائزہ کہتے ہیں۔'' عائزہ نے بھی اپنا نام بتایا۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی... جی نائن...'' عائزہ نے جواب دیتے ہوئے سوچا کہ یہ تو بولتا بھی اسی طرح ہے جس طرح اس کے خوابوں میں آنے والا بولتا تھا، اس کا لباس بھی ویسا ہی ہے اور اس کی شخصیت میں سحر بھی بالکل اسی سے ملتا ہے۔ عائزہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ حقیقت میں ہے، یا ابھی بھی اپنے خواب میں محو ہے۔

''جی نائن میرے راستے میں ہی آتا ہے۔ میری رہائش جی تین میں ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں عائزہ چور نگاہوں سے شکیل کی طرف دیکھتی رہی۔ اتنا نفیس اور نفاست پسند شخص اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا البتہ ایسے شخص کے بارے میں اس نے بے شمار بار سوچا ضرور تھا۔ شکیل کے لباس پر ایک بھی سلوٹ نہیں تھی۔

اس خاموشی اور چور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جی نائن آ گیا۔ شکیل نے گاڑی آہستہ کر کے ایک طرف روک دی۔ ''کس گلی میں جانا ہے؟''

''جی شکریہ بس مجھے یہیں اتار دیں۔''

''کوئی پرابلم نہیں ہے آپ مجھے بتائیں میں اس گلی تک لے جاتا ہوں۔''

''جی نہیں بس شکریہ۔'' عائزہ کہہ کر گاڑی سے نیچے اتر گئی اور ایک طرف چل دی۔ شکیل نے کار آگے بڑھا دی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ عائزہ کسی کے سامنے اتنا نہیں بولی تھی۔ وہ شکیل کی شخصیت کے سحر کی گرفت سے ہی باہر نہیں نکلی تھی۔

فلیٹ... پہنچ کر عائزہ منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ عفت آ چکی تھی اور وہ کھانا تیار کر رہی تھی۔ عائزہ چپ چاپ ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بظاہر ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی لیکن اس کے خیالوں میں شکیل کی شخصیت تھی اور وہ اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

عفت نے کچن سے جھانک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے اتنی چپ کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں... تھک گئی ہوں۔'' عائزہ اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ رات عائزہ نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی شکیل کی صورت کو اپنی آنکھوں سے باہر نہیں نکال سکی۔ وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان سوچوں اور کروٹوں کی تبدیلیوں میں دن کا آغاز ہو گیا۔

عائزہ اپنے آفس پہنچی تو چونک گئی۔ شکیل ایک طرف بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ عائزہ کے قدم اسی جگہ رک گئے اور وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ شکیل کے جسم پر نیا لباس تھا اور اس کی شخصیت میں کل سے بھی زیادہ نکھار تھا۔ اچانک اخبار کا صفحہ اُلٹتے ہوئے شکیل کی نظر عائزہ پر پڑی تو اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ عائزہ بھی چونک سی گئی۔

''میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''جی فرمایئے۔'' عائزہ نے اسی جگہ کھڑے کھڑے پوچھا۔

''انور صاحب کے ساتھ مجھے ایک کام تھا اور ان سے ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا کام آپ ہی کر سکتی ہیں۔''

''جی میں سمجھی نہیں۔''

''آپ کے پاس ایک فائل ہے جو انور صاحب نے پرسوں آپ کو دی تھی۔ دراصل وہ فائل میری ہے، میں وہ فائل لینے آیا ہوں۔''

''ہاں فائل دی تو تھی۔ میں انور صاحب سے پوچھ لوں۔ آپ میرے ساتھ آ جایئے۔'' عائزہ اپنی کرسی تک گئی اور اس نے انٹرکام پر ایک نمبر دبا کر انور صاحب سے رابطہ کیا اور پوچھنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھے شکیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں ابھی وہ فائل دیتی ہوں۔''

عائزہ نے یہ کہہ کر دراز سے ایک فائل نکالی اور شکیل کی طرف بڑھا دی۔ شکیل نے وہ فائل لی، اسے کھول کر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''شکریہ۔''

''چائے پئیں گے آپ؟'' اچانک عائزہ نے پیشکش کردی۔

''اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' شکیل نے فائل ایک طرف رکھ دی۔ ''لیکن اگر یہی چائے آپ میرے آفس میں پئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''آپ کے آفس میں؟'' عائزہ سوچ میں پڑ گئی۔

''جی ہاں... یہاں سے دوگلیاں چھوڑ کر میرا آفس ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شکیل نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر عائزہ کے سامنے رکھ دیا۔ ''اس بہانے آپ میرا آفس بھی دیکھ لیں گی۔''

''ابھی جانا تو ممکن نہیں ہے۔''

''آپ آفس ٹائم کے بعد آجایئے گا۔ میں انتظار کروں گا۔'' شکیل اجازت لے کر چلا گیا۔ عائزہ اس کے جانے کے بعد اپنا کام بھول گئی۔ وہ اسی کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔

☆☆☆

عائزہ کے لیے وقت کاٹنا بہت مشکل ہو گیا... خدا خدا کر کے آفس ٹائم ختم ہوا تو وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس عمارت میں چلی گئی جہاں دوسرے فلور پر شکیل کا آفس تھا۔ جونہی عائزہ نے شکیل کے آفس میں قدم رکھا، اس کی خیرہ نگاہوں کو ایسا لگا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آگئی ہو۔ ایسا قرینہ اور نفاست اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

جس کمرے میں شکیل بیٹھتا تھا، وہ کمرا خوبصورتی اور نفاست کا ایسا امتزاج تھا کہ عائزہ کے لیے ایک ایک چیز دیکھ کر اس کی تعریف کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ شکیل نے عائزہ کو بٹھایا اور اس کے لیے کافی کا آرڈر دے دیا۔

عائزہ نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی نفاست! مجھے تو حیرت ہو رہی ہے... آپ کا گھر تو جنت کا نمونہ ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ میرا گھر بھی نفاست سے بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ میں نفاست پسند ہوں، لیکن وہ ابھی جنت کا نمونہ نہیں بنا۔''

''جنت کا نمونہ کیسے نہیں بنا۔''

''کیونکہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی، جنت تو گھر والی سے بنتی ہے۔''

''ابھی آپ کی شادی نہیں ہوئی؟'' عائزہ کا دل اُچھلا۔

''بس اب جلدی ہو جائے گی۔''

ملازم کافی لے کر آ گیا۔ عائزہ کافی پیتے ہوئے ایک عجیب سی کشمکش میں تھی۔ جیسے وہ اپنے اندر جنگ لڑ رہی ہو۔ اچانک شکیل بولا۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں نے آپ کو چائے پر کیوں بلایا اپنے آفس میں؟''

''میں یہ تو نہیں جانتی لیکن مجھے یہ پتا ہے کہ میں نے آپ کی دعوت اتنی جلدی کیوں قبول کرلی تھی کیونکہ آپ جیسا نفیس شخص میرے خوابوں میں ہمیشہ سے آباد ہے اور میں آپ جیسے شخص سے شادی کی خواہش مند ہوں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟''

عائزہ کی اس بات نے کمرے میں سکوت طاری کردیا۔ شکیل دم بخود اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ عائزہ کو بھی پتا نہیں چلا کہ اس کے اندر تلاطم مچاتے ہوئے الفاظ کب آواز کا روپ دھار کر شکیل کی سماعت سے ٹکرا گئے کہ وہ کچھ بھی ضبط نہیں کر سکی۔ جب عائزہ کی بات ختم ہوگئی تو جیسے اسے ہوش آگیا ہو۔ اور وہ اپنی آدھی کافی چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے تیز تیز چلتے قدم اور مضطرب دل کی دھڑکن اسے کھینچ کر دروازے کی طرف لے جارہی تھی۔ وہ اتنی بے خود ہوگئی تھی کہ اپنے جذبات اور الفاظ پر اس کا اختیار ہی ختم ہوگیا اور جو اس کے دل میں آیا فوراً زبان کے راستے شکیل کی سماعت سے ٹکرا گیا۔

☆☆☆

عفت دم بخود عائزہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور عائزہ اس کے سامنے گم صم آلتی پالتی مارے چند لمحے قبل ساری بات اس کے گوش گزار کر کے چپ ہوئی تھی۔

کمرے میں چھائے ہوئے گہرے سکوت کو عفت نے توڑا۔ ''تم پاگل ہو۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ تم نے دوسری ہی ملاقات میں اسے شادی کی پیشکش کردی؟''

''میں نے تمہیں ایک دن کہا تھا کہ جس دن مجھے میرا آئیڈیل مل گیا میں فوراً اسے شادی کی پیشکش کردوں گی۔'' عائزہ نے کہا۔

''تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔'' عفت نے زور دیا۔

''انگوٹھی ہی پہنی ہے۔ اس کا کیا ہے ابھی انگلی سے

نکال کر پھینک دوں گی۔" عائزہ بے پروائی سے بولی۔

"تمہارے اس فیصلے سے تمہارے گھر والوں اور عدنان پر کیا گزرے گی؟"

"تم جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی کی پروا کی ہے، یہ میری زندگی ہے، اپنی زندگی کا میں بہتر فیصلہ کرسکتی ہوں۔ مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"تم اپنی عمر سے کم از کم پندرہ سال بڑے شخص کو اپنانا چاہتی ہو۔"

"وہ میرے خوابوں کا ہیرو ہے۔ وہ خواب جو میں بند اور کھلی آنکھوں سے دیکھتی تھی وہ ان کی تعبیر ہے۔" عائزہ نے کہا۔

"ویسے اس کا نام کیا ہے اور وہ کرتا کیا ہے، کون ہے۔؟"

"اس کا نام شکیل ہے اور وہ ایس، ایچ گارمنٹس کمپنی کا مالک ہے۔" عائزہ نے بتایا۔

عفت کی نگاہیں عائزہ کے چہرے پر جم گئیں اور وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے اوپر جم چکے تھے اور الفاظ کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"اگر تم مجھے کچھ کہنا چاہتی ہو تو پلیز مت کہنا۔ کوئی نصیحت کے بارے میں سوچ رہی ہو تو پلیز میں تمہاری کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگر اس نے مجھے کوئی جواب دیا تو میں تمہیں سب سے پہلے آگاہ کروں گی اور منگنی کی انگوٹھی اتار کر اس میز پر رکھ دوں گی، اور اگر اس نے انکار کردیا تو میں پھر بھی اس کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔" عائزہ اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

رفعت نے کبھی عائزہ کو کسی معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ رفعت گم صم اسی جگہ بیٹھی رہی اور جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ وہ کیا کرے، عائزہ کو کیسے سمجھائے، کس سے بات کرے، یا پھر انتظار کرے کہ جس کو اچانک وہ اتنی بڑی بات کہہ آئی ہے اس کی ہاں اور ناں کا انتظار کرے اور اس کے بعد وہ کوئی فیصلہ کرے کہ اسے کیا کرنا چاہیے ؟ رفعت بیٹھی سوچتی رہی۔

☆☆☆

دوسرے دن آفس میں سارا دن کام کے دوران عائزہ کی متلاشی نگاہیں اس انتظار میں رہیں کہ شاید شکیل آجائے۔ وہ اپنے موبائل فون کی گھنٹی پر بھی چونک جاتی لیکن شکیل کی طرف سے کوئی فون نہیں آیا۔ آفس ٹائم ختم ہونے سے قبل اس کے چہرے پر مایوسی سی آگئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کسی کو کوئی بھی اتنی جلدی دو ملاقاتوں کے بعد شادی کی پیشکش نہیں کرتا۔ اس کی بے وقوفی پر وہ کیسے فوراً جواب دے سکتا تھا۔ عائزہ نے سوچتے ہوئے اپنے کاغذات سمیٹے۔

عائزہ بوجھل انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آفس سے باہر نکل گئی۔ جیسے ہی اس نے عمارت سے باہر قدم رکھا وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے کار کھڑی تھی اور کار کے ساتھ ٹیک لگائے شکیل کھڑا اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ عائزہ کو دیکھ کر اس نے کار کا دروازہ کھول دیا اور عائزہ کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ اس کے لئے یہ ایک خوشگوار حیرت تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی شکیل کار اس جگہ سے دور لے گیا۔

ان کی کار کچھ دیر کے بعد ایک خوبصورت مقام پر کھڑی تھی اور شکیل کہہ رہا تھا۔ "جب آپ نے شادی کی بات کی تو میں حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ کوئی لڑکی دو ملاقاتوں کے بعد کیسے اتنی بڑی بات کہہ سکتی ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ جب دل سے بات نکلے تو پھر دو ملاقاتیں تو دور کی بات چند لمحوں کی ملاقات میں بھی وہ دل کی بات نہیں رکتی۔ یقین کریں کہ میں سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ حالانکہ میں شادی کرنے والا تھا۔ لیکن آپ کی بات نے میری سوچ کا رخ ہی موڑ دیا۔ اور میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ اب شادی ہوگی تو آپ سے ہوگی۔ آپ جیسی لڑکی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ آپ بہت پُر اعتماد ہیں۔ اور یہی ادا مجھے اس فیصلے پر لے آئی ہے کہ ہم ایک ہوسکتے ہیں۔"

شکیل کی بات سن کر عائزہ کا چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے اچانک اس کے خوابوں کا راجا مل گیا ہے۔ اسے اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو فضا میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد جانے کیا کیا باتیں ہوئیں، کب تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہے، عائزہ خوشی میں مخمور تھی۔

☆☆☆

عفت کے سامنے میز پر وہ انگوٹھی پڑی تھی جو ابھی عائزہ نے اپنی انگلی سے اتار کر رکھی تھی اور یہ بتا دیا تھا کہ وہ شکیل سے شادی کرنے والی ہے، شکیل نے ہاں کردی ہے۔ شکیل کے ساتھ ہونے والی بات چیت اس نے خوشی میں بتا دی تھی۔

عفت حیران پریشان بیٹھی تھی۔ جب عائزہ چپ ہوئی تو عفت نے کہا۔ "تم اتنا بڑا فیصلہ بغیر اس کے بارے

میں جانے کیسے کر سکتی ہو؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ رہی بات جاننے کی تو میں اسے بہت سالوں سے جانتی ہوں۔ اس وقت سے جانتی ہوں جب میں چھوٹی تھی۔ کیونکہ وہ میرے خوابوں میں اس وقت سے آ رہا ہے۔ میری اس کے ساتھ دوستی اس وقت سے ہے۔"

"پاگل مت بنو۔ تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے۔"

"مجھے گھر والوں کی پروا نہیں ہے۔ میں شادی کر کے شکیل کے ساتھ واپس جاؤں گی۔ میرے اس فیصلے کے بعد وہ مجھے قبول کرتے ہیں یا نہیں، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ یہ انگوٹھی میں نے اتار دی ہے۔ عدنان آئے تو اسے واپس کر دینا۔" عائزہ جھومتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ عفت کچھ دیر بیٹھی رہی اور پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عائزہ ابھی اپنے کمرے میں گئی ہی تھی کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ بادلِ نخواستہ اس نے فون اُٹھا لیا۔

"ہیلو... کون؟"

"میں بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے غیر مانوس آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کی آواز بھاری تھی اور عائزہ یہ آواز پہلی بار سن رہی تھی۔

"میں کون ہوں۔" عائزہ نے وضاحت چاہی۔

"میں عاطف بول رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تمہاری آواز تو عاطف جیسی نہیں ہے۔" عائزہ نے کہا۔

"میں سہیل بول رہا ہوں۔" اس نے فوراً اپنا نام بدلا۔

"لیکن تم سہیل بھی نہیں بول رہے۔" عائزہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سہیل کی آواز کیسی ہے۔

"میں نے آواز بدلی ہوئی ہے۔ تم ان باتوں کو چھوڑو اور یہ سنو۔ تم نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ تم اتوار کو ریسٹورنٹ میں ہم دونوں میں سے ایک کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرو گی۔ لیکن تم تو ایک اور کے ساتھ پھر رہی ہو۔ اس کے ساتھ اس کی کار میں گھومتی ہو۔ اس کے ساتھ گھنٹوں خوبصورت مقام پر گزار رہی ہو۔ تم ہم دونوں کو دھوکا دے رہی ہو۔" اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔

"تم کیسے جانتے ہو اور تم کون ہو؟" عائزہ اس کی آواز پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں نے بتایا کہ میں عاطف بول رہا ہوں بلکہ ڈاکٹر سہیل بات کر رہا ہوں۔ میں تمہارا... بلکہ ہم تمہارا گھر دیکھ چکے ہیں۔ تمہیں اس دھوکے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔" اس کی آواز میں خوف بھر گیا۔

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ عائزہ متحیر کھڑی سوچ رہی تھی کہ یہ کیا مذاق ہے؟ یہ کون تھا۔ عاطف، یا سہیل...؟ آواز کیوں بدلی تھی؟ اگر عاطف تھا تو اس نے اپنے آپ کو سہیل کیوں کہا اور اگر سہیل تھا تو وہ اپنے آپ کو عاطف بھی کیوں کہہ رہا تھا؟ کیا وہ اسے کوئی چکما دینے کی کوشش کر رہا تھا؟

عائزہ کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس الجھن کا شکار رہی اور بہت دیر تک کمرے میں بند رہی۔ بھوک لگی تو وہ کمرے سے باہر نکلی۔ کچن میں جانے سے پہلے اس نے عفت کے بند کمرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ابھی رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ اس وقت عفت ٹیلی وژن دیکھ رہی ہوتی تھی۔ وہ دیر تک جاگنے اور فون پر جانے کس کے ساتھ باتیں کرنے کی عادی تھی۔ عائزہ نے پہلے دروازے پر دستک دی اور پھر جیسے ہی دروازہ کھولا، وہ کھل گیا۔ کمرا خالی تھا۔

عائزہ نے پورے فلیٹ کا جائزہ لے لیا۔ کوئی بھی نہیں تھا، اس کا مطلب ہے عفت کہیں چلی گئی تھی۔ عائزہ واپس کچن میں چلی گئی۔ اس نے فریج سے کھانا نکالا اور گرم کیا اور ابھی پہلا لقمہ ہی کھایا تھا کہ اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے کچن سے ذرا سا جھانک کر باہر دیکھا۔ عفت آئی تھی۔

عفت کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ عائزہ نے اسے مخاطب کیا۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم؟"

عفت نے رک کر عائزہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اپنی ایک دوست کی طرف گئی تھی۔"

"کھانا گرم کروں؟"

"میں کھا کر آئی ہوں۔ لگتا ہے مجھے بخار ہو رہا ہے۔ میں میڈیسن کھا کر سونے لگی ہوں۔ صبح ملاقات ہو گی۔" عفت نے آخری جملہ مسکرا کر کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ عائزہ اپنے کمرے میں بیڈ پر چت لیٹی سو رہی تھی۔ شکیل کے خیالوں کی وجہ سے اسے بڑی مشکل سے نیند آئی تھی۔ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ کسی نے جھانک کر اندر دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر وہ اندر چلا آیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور آنے والا بھی اس اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا۔

آنے والے نے عائزہ کے بیڈ سے دوسرا تکیہ اُٹھایا اور عائزہ کے منہ پر رکھ کر پوری قوت سے دبا دیا۔ عائزہ کے جسم میں یکدم حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنے چہرے سے تکیہ ہٹانے کی مزاحمت کرنے لگی۔ جس نے اس کے منہ پر تکیہ رکھا ہوا تھا، اس کے ہاتھوں میں طاقت زیادہ تھی اس لیے کوشش کے باوجود عائزہ اپنے چہرے سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکی اور کچھ دیر کے بعد عائزہ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ پھر اس کا جسم بے جان ہوگیا۔ تب بھی اس نے تکیہ اس کے چہرے سے نہیں ہٹایا۔ کچھ دیر کے بعد جب اسے تسلی ہوگئی کہ عائزہ مرچکی ہے تو اس نے تکیہ چہرے پر ہی چھوڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ اس دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جو فلیٹ کا مین دروازہ تھا۔ ہلکی روشنی میں نظر آرہا تھا کہ کسی سخت چیز کو دروازے میں پھنسا کر لاک توڑ کر دروازہ کھولا گیا تھا۔ اس نے ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر دائیں بائیں جھانکا۔

☆☆☆

صبح اپنے وقت پر عفت نے اُٹھ کر اپنے کمرے کا لاک کھولا اور باہر نکل کر سیدھی کچن میں چلی آئی۔ اس نے پانی پیا اور پھر کمرے کی طرف جانے لگی تو وہ چونک کر رک گئی۔ اس نے فوراً دروازے کی طرف دیکھا تو اس کی خوف سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے فلیٹ کا مین دروازے کا لاک ٹوٹا ہوا تھا۔

عفت جلدی سے دروازے کے پاس گئی۔ کسی نے کسی سخت چیز کو کسی طرح سے اندر داخل کر کے لاک توڑا تھا۔ عفت نے اندر آکر جائزہ لیا اور عائزہ کے کمرے کا دروازہ بجانے لگی۔

''عائزہ... عائزہ...'' پھر اسے یاد آیا کہ عائزہ کو کمرا اندر سے لاک کر کے سونے کی عادت نہیں ہے۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی عائزہ کو آوازیں دینے لگی۔

''عائزہ... عائزہ اُٹھو ہمارے فلیٹ میں کوئی آیا تھا۔ دیکھو تمہارا سامان تو غائب نہیں ہے... عائزہ...''

عفت نے رک کر عائزہ کی طرف دیکھا اور جب کوئی آواز نہ آئی تو اس نے آگے بڑھ کر تکیہ اس کے منہ سے ہٹا دیا۔ عائزہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کا جسم بے جان تھا۔ عفت کی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

عفت نے عدنان کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا اور اس کے فلیٹ میں پولیس آچکی تھی۔ عدنان، عائزہ کا جائزہ لے چکا تھا۔ عائزہ کی موت نے عدنان کو غمزدہ کردیا تھا لیکن وہ اس وقت ایک فرض شناس پولیس انسپکٹر تھا جسے ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا تھا۔ اس لیے وہ اور اس کے آدمی اپنا کام کررہے تھے۔ فنگر پرنٹ لینے کی کوشش کی جارہی تھی۔ جس نے بھی عائزہ کو قتل کیا تھا، اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے جس کی وجہ سے انہیں فنگر پرنٹ نہیں مل رہے تھے۔ دروازہ اس خاموشی سے توڑا گیا تھا کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔

عدنان نے پہلے پوری توجہ سے اس کمرے کا جائزہ لیا تھا جہاں عائزہ کا قتل ہوا تھا اور پھر اس کے بعد وہ دیر تک دروازے کو دیکھتا رہا۔ دروازے کے لاک والی جگہ پر کسی چیز کو پھنسایا گیا تھا اور اس کے بعد پوری قوت سے لاک کو ٹیڑھا کر کے رخنہ بنایا گیا تھا اور اس کے بعد مزید توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ عدنان نے اچھی طرح سے جائزہ لینے بعد عفت کی طرف رخ کیا جو ایک طرف خوفزدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

عفت ایک ایک بات عدنان کو بتا چکی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ شاید وہ اس لیے بچ گئی کیونکہ وہ دروازہ اندر سے لاک کر کے سونے کی عادی ہے، جبکہ عائزہ کبھی بھی اندر سے دروازہ لاک نہیں کرتی تھی۔ یہ اس کی بچپن سے ہی عادت تھی جس کے بارے میں بھی جانتے تھے۔

عدنان اور عفت کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ فلیٹ سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ آنے والے نے صرف عائزہ کو قتل کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عائزہ کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی؟ یہ سوال عدنان کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔

عائزہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ عدنان افسردہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ رفعت اس کے پاس چلی گئی۔ عدنان نے اپنے ایک ساتھی کو بلا لیا جس کے ہاتھ میں کاغذات اور پنسل تھی۔

''رفعت میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ عائزہ اس شہر میں اپنی کمپنی کی طرف سے ٹریننگ پر آئی تھی۔ اس کی اس شہر میں کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہوگی سوائے اپنی کمپنی کے لوگوں کے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ اس فلیٹ میں چوری بھی نہیں ہوئی، دروازہ توڑ کر کوئی اندر آیا اور عائزہ کو مار کر چلا گیا۔'' بات کرنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے عدنان نے عفت کی طرف دیکھا۔

''مجھے خود حیرت ہورہی ہے۔ میں کیونکہ شروع دن

سے اندر سے لاک لگا کر سونے کی عادی ہوں اس لیے شاید بچ گئی۔ عائزہ کو اندر سے لاک لگا کر سونے کی بالکل بھی عادت نہیں تھی۔ عدنان میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ شاید قاتل تک پہنچنے میں تمہیں مدد مل سکے۔''

''ہاں بتاؤ۔'' عدنان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

رفعت نے ایک نظر اس اہلکار کی طرف دیکھا جو بیانات لکھنے پر مامور تھا۔ عدنان نے اسے کچھ دیر کے لیے ایک طرف بھیج دیا۔ رفعت بولی۔ ''عائزہ دراصل تمہیں پسند نہیں کرتی تھی۔''

''یہ بات میں جانتا ہوں۔'' عدنان نے فوراً متانت سے تائید کی۔ ایک عجیب سا دکھ اس کے چہرے سے عیاں ہوا تھا۔

''آپ کیسے جانتے تھے؟'' رفعت کو حیرت ہوئی۔

''میں پولیس میں ہوں۔ اس کا مجھ سے نہ ملنا، میرے ساتھ بچ پر نہ جانا کوئی نہ کوئی بہانہ کرنا، یہ سب باتیں مجھے اس شک میں مبتلا کر رہی تھیں کہ مجھے ناپسند کرتی ہے اور ہمارے بزرگوں کی طرف سے طے کیے ہوئے اس رشتے کو وہ بوجھ سمجھتی ہے۔''

''عائزہ کی پسند کچھ اور تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے اور انہیں بے وقوف بنانے میں لطف محسوس کرتی تھی۔ عائزہ کو ان لڑکوں کے ساتھ گپ شپ لگانا، ان کے ساتھ گھومنے جانا، ان کی جیب سے کھانا پینا اچھا لگتا تھا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہی ایسی تھی۔ اس نے اس شہر کے دو لڑکوں کے ساتھ دوستی کی ہوئی تھی جو اتفاق سے اس کے کلاس فیلو تھے اور اس شہر میں رہائش پذیر ہیں۔ عائزہ نے دونوں کو شادی کا جھانسا دیا ہوا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ دونوں سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لڑکی ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے اور ان دونوں میں سے ایک، یا پھر دونوں اس قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں۔''

عدنان اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اس پر پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی تھی۔ عائزہ کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی لڑکی ہو سکتی ہے جو دوسروں کے جذبات سے کھیلتی تھی۔

''تم ان لڑکوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔''

''عائزہ کا فون تمہارے پاس ہے، تم اس میں سے نمبر ٹریس کر سکتے ہو۔ عائزہ نے ان دونوں کو چھوڑ کر اچانک ایک تیسرے لڑکے کے ساتھ بھی دوستی کر لی تھی۔'' رفعت نے کہا۔ سائڈ ٹیبل پر پڑا عائزہ کا فون جب اُٹھا کر عدنان نے پلاسٹک کی تھیلی میں رکھا تھا تو اس وقت رفعت قریب ہی کھڑی تھی۔

''وہ کون تھا؟'' عدنان نے پوچھا۔

''میں زیادہ نہیں جانتی۔ اس کا نام... مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ کیونکہ جب اس نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تو وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور تمہاری انگوٹھی بھی اس نے اتار دی تھی۔''

یہ سن کر عدنان کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کے بعد اس نے کچھ اور سوال کیے اور پھر بیان کی صورت میں اہلکار نے سب کچھ قلم بند کر لیا۔ اس کے بعد عدنان وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

عائزہ کا فون پلاسٹک کی ایک تھیلی میں بند تھا۔ پولیس اسٹیشن جا کر اس نے وہ فون نکالا اور اسے آن کر دیا۔ فون میں عائزہ کی فیملی کے نمبر محفوظ تھے اور ان کے علاوہ دو نمبر اور تھے جو عاطف اور ڈاکٹر سہیل کے نام پر محفوظ تھے۔ عاطف اور سہیل کی طرف سے پیغام بھی موجود تھے جن میں دونوں نے اپنی اپنی محبت کا اظہار کیا ہوا تھا، اور اس کے علاوہ بھی دونوں کی طرف سے میسج تھے۔ ایک نمبر کسی کے نام سے محفوظ نہیں تھا۔ اس نمبر سے عائزہ کو رات کو کال موصول ہوئی تھی۔

انسپکٹر عدنان نے اپنے اہلکار کو ہدایت کی کہ وہ ان نمبر کی مدد سے پتا معلوم کرے۔ ایک گھنٹے کے بعد عاطف اور سہیل کا مکمل پتا اور اس نمبر کے بارے میں معلومات ایک کاغذ پر لکھی اس کی میز پر رکھی تھیں۔ انسپکٹر عدنان نے دونوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

ایک گھنٹے کے اندر عاطف اور سہیل پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ دونوں کو اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے دونوں ہی پریشان تھے کہ انہیں اس جگہ کیوں لایا گیا ہے۔ انسپکٹر عدنان کے کمرے میں عاطف اور سہیل کے علاوہ دو اہلکار موجود تھے۔

دونوں کا نام پوچھنے کے بعد عدنان نے کہا۔ ''تم دونوں کا عائزہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟''

یہ سوال سنتے ہی دونوں دل ہی دل میں چونکے۔ عاطف نے جواب دیا۔ ''عائزہ ہمارے ساتھ لاہور یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔''

''اس کے علاوہ میں جاننا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر عدنان نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

''بس یہی تعلق تھا۔ اتفاق سے ہم اس شہر میں منتقل ہوگئے تھے اور وہ کئی سالوں کے بعد اچانک مل گئی تھی۔'' سہیل نے کہا۔

''عائزہ کے موبائل فون میں موجود تم دونوں کے میسج تو کچھ اور ظاہر کررہے ہیں۔'' اس بات نے دونوں کو لاجواب بھی کردیا اور وہ تذبذب کا شکار ہوگئے کہ وہ اس بات کا کیا جواب دیں۔ پھر انسپکٹر عدنان نے کہا۔ ''عائزہ کو قتل کردیا گیا ہے۔''

''کیا...؟؟'' دونوں بیک وقت حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور چہرہ دم بخود رہ گیا۔

''تم دونوں کے چہروں سے تو لگتا ہے جیسے تم دونوں اس حقیقت کو اب جان رہے ہو۔ عائزہ کے موبائل فون میں عاطف نے ایک میسج یہ بھی بھیجا تھا کہ اگر تم میری نہ ہوئیں تو میں تمہیں کسی اور کی بھی نہیں ہونے دوں گا، اور کچھ ایسا ہی میسج سہیل کی طرف سے بھی موجود ہے۔''

سہیل اور عاطف کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ انہوں نے وہ میسج کرتو دیے تھے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان پر ایسی آفت آنے والی ہے۔

''تم دونوں کوئی جواب نہیں دے پاؤ گے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں سے عائزہ کا خون کس نے کیا ہے؟'' انسپکٹر عدنان نے پوچھا۔

''میں نے اس کا خون نہیں کیا۔'' دونوں بیک وقت پھر بولے۔ دونوں کے جسم کانپ رہے تھے اور خوف سے چہروں کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

''میں تو ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' سہیل کی گھبراہٹ بھری آواز حلق سے بمشکل نکلی۔

''یہ تو ہر مجرم کہتا ہے۔'' انسپکٹر عدنان بولا۔

''یقین کیجیے میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ پیغام میں نے ضرور بھیجا تھا لیکن میرا ایسا کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے محض ڈرایا تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجائے۔'' عاطف گڑگڑانے لگا۔

''میں نے تو کبھی مچھر بھی نہیں مارا... عائزہ کو مارنا... تو بہت دور کی بات ہے۔'' سہیل نے کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد انسپکٹر عدنان نے کہا۔ ''ابھی تم دونوں جاؤ۔ لیکن اگر تم دونوں میں سے کوئی شہر چھوڑ کر کہیں روپوش ہوا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔'' انسپکٹر عدنان کا لہجہ درشت ہوگیا اور دونوں گھبرائے، ڈرے اور سہمے پولیس اسٹیشن سے چلے گئے۔

انسپکٹر عدنان اب اس نمبر اور پتے کو دیکھ رہا تھا جس نمبر سے عائزہ کو رات کال آئی تھی، وہ وہی نمبر تھا جس سے عائزہ کو کسی نے آواز بدل کر فون کیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو کبھی عاطف اور کبھی سہیل ظاہر کیا تھا۔

انسپکٹر عدنان... اپنے دو اہلکاروں کے ساتھ اس پتے پر پہنچ گیا۔ وہ شہر سے کچھ فاصلے پر سڑک کنارے چائے کا ایک ہوٹل تھا۔ ایک چالیس سال عمر کا شخص چائے بنا رہا تھا اور اس جگہ بہت سے لوگ چائے پینے کے لیے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر عدنان سیدھا چائے بنانے والے کے پاس چلا گیا۔

''مجھے اسلم سے ملنا ہے۔''

''جی میں ہی اسلم ہوں، حکم کیجیے۔'' اس کا ہاتھ چائے بناتے ہوئے رک گیا اور وہ پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔

''ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔'' انسپکٹر عدنان نے کہا تو اس نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دے کر اپنی جگہ کھڑا کیا اور خود ان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا آیا جہاں ایک بستر لگا ہوا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا۔

انسپکٹر عدنان نے کاغذ پر لکھا موبائل نمبر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نمبر تمہارا ہے۔''

اسلم نے غور سے نمبر کو دو، چار بار پڑھا اور پھر کہا۔

''یہ نمبر تو میرا نہیں ہے۔ میرے پاس ایک ہی موبائل نمبر ہے جو میں سالوں سے استعمال کررہا ہوں۔''

''ہماری معلومات کے مطابق یہ نمبر تمہارے نام پر ہے اور اس نمبر سے رات ایک لڑکی کو فون کال گئی اور اسی رات اس کو قتل کردیا گیا۔'' انسپکٹر عدنان نے کہا۔

یہ سن کر اسلم اور بھی گھبرا گیا۔ ''نو سال سے اس جگہ چائے کا کھوکھا لگائے بیٹھا ہوں۔ اس کمرے میں رہتا ہوں، یقین کیجیے یہ نمبر میرا نہیں ہے۔'' اسلم کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

''یاد کرو یہ سم بھی تم نے لی ہو اور پھر کہیں گم ہوگئی ہو۔'' انسپکٹر عدنان اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسلم یاد کرنے لگا اور پھر بولا۔

''نہیں جناب، یہ نمبر کبھی بھی میں نے استعمال نہیں کیا۔'' اسلم کا لہجہ ٹھوس اور پُراعتماد تھا۔ انسپکٹر عدنان نے کچھ دیر اس کا جائزہ لیا اور پھر کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔'' وہ اپنے اہلکار کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسلم نے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے آگے لٹکے ہوئے میلے سے پردے کو تھوڑا

سا سر کا کر باہر دیکھا، انسپکٹر عدنان اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا اور جلدی سے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر ایک نمبر ملایا اور دوسری طرف سے بولنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ بیل ہوتی رہی کسی نے فون نہیں اُٹھایا۔ اسلم نے پھر نمبر ملایا اور مضطرب سا انتظار کرنے لگا۔ اس بار اس کی سماعت سے آواز ٹکرائی۔

اسلم جلدی سے بولا۔ ''کہاں ہو نواز؟''

''میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں۔ کیوں کیا بات ہے، گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو؟''

''یاد ہے تمہارے پاس ایک سم تھی جو کچھ عرصہ میں نے استعمال کی تھی اور پھر تم نے لے لی تھی، وہ نمبر تم اب بھی استعمال کر رہے ہو؟''

''وہ نمبر تو میں کبھی کبھار ہی استعمال کرتا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟''

''وہ سم کیا تمہارے پاس ہی ہے؟''

''ہاں میرے پاس ہی ہوتی ہے، میرے پرس میں ہوگی۔ بات کیا ہے؟''

اسلم اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ کیونکہ اچانک اسلم کی نظر دروازے پر چلی گئی اور وہ ٹھٹک کر چپ ہو گیا۔ دروازے پر انسپکٹر عدنان کھڑا تھا۔ وہ کمرے سے چلا گیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ کمرے سے اسلم باہر نہیں نکلا تو وہ واپس۔۔۔ آکر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

اسلم کا بھائی نواز اس وقت پولیس اسٹیشن میں تھا اور وہ اپنے بھائی اسلم کی طرح گھبرایا ہوا تھا۔ انسپکٹر عدنان نے اسی وقت اسلم سے کہہ کر۔۔۔۔۔ نواز کو پولیس اسٹیشن میں بلا لیا تھا۔

''اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ سم تمہارے پرس میں ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت تم استعمال کرتے تھے، اب وہ سم تمہارے پرس میں نہیں ہے۔'' انسپکٹر عدنان نے کہا۔

''میرا پرس اور اس کے اندر موجود جو کچھ بھی تھا، وہ آپ کی میز پر ہے۔ یقین کیجیے مجھے بھی اب پتا چلا ہے کہ وہ سم میرے پرس سے غائب ہے۔'' نواز شدید گھبرایا اور ڈرا ہوا تھا۔

''کیا کام کرتے ہو تم؟'' انسپکٹر عدنان نے پوچھا۔

''جی میں ڈرائیور کی نوکری کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کس کے پاس نوکری کرتے ہو؟''

''جی کمال احمد صاحب کے پاس میں دس سال سے نوکری کر رہا ہوں۔'' اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

''اس گھر کا پتا لکھو جہاں تم نوکری کرتے ہو۔'' انسپکٹر عدنان نے ایک کاغذ اور پنسل اس کے سامنے رکھ دیا۔ کانپتے ہاتھوں سے نواز نے اس گھر کا مکمل پتا لکھا اور کاغذ انسپکٹر عدنان کی طرف بڑھا دیا۔ انسپکٹر عدنان نے دو، چار بار وہ لکھا ہوا پتا پڑھا، پھر دراز سے فائل نکال کر کھولی اور ایک کاغذ پلٹ کر اس پر نگاہیں جما دیں۔ وہ پتا جو نواز نے لکھا تھا، وہ فائل میں لکھے ہوئے پتے سے ملتا تھا۔

''جس گھر میں تم کام کرتے ہو وہاں اور کون کون رہتا ہے۔؟'' انسپکٹر عدنان نے سوال کیا۔

''کمال احمد، ان کی بیوی، تین بیٹے اور ان کی بہوئیں اور پوتے پوتیاں۔'' نواز نے جواب دیا۔

''بیٹوں کے نام کیا کیا ہیں؟'' انسپکٹر عدنان نے اگلا سوال کیا۔

''سب سے بڑے بیٹے کا نام اظہر ہے پھر ناصر اور تیسرے بیٹے کا نام عاطف ہے۔۔۔'' نواز نے بتایا۔

''عاطف۔۔۔'' انسپکٹر عدنان نے دو بار عاطف کا نام دہرایا اور پھر بولا۔ ''کہیں تمہاری سم عاطف کے پاس تو نہیں ہے؟''

''ان کے پاس۔۔۔؟ انہوں نے مجھ سے لی تو نہیں تھی۔'' وہ چونکا۔

انسپکٹر عدنان نے اپنے اہلکار کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اسی وقت عاطف کو فون کر کے فوراً پولیس اسٹیشن آنے کا کہے۔

☆☆☆

عاطف کو جیسے ہی اہلکار کا فون موصول ہوا، وہ بھاگا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اور اس وقت اس کے پیروں کے تلے سے زمین نکل گئی جب اس نے اپنے گھر کا ڈرائیور وہاں کھڑا دیکھا۔

''اسے جانتے ہو؟'' انسپکٹر عدنان نے نواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عاطف سے پوچھا۔

''جی یہ ہمارا ڈرائیور ہے نواز۔'' عاطف نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''عائزہ کے فون پر جو ایک نامعلوم نمبر سے کال کی گئی تھی وہ سم اس کے بھائی اسلم کے نام پر ہے، اس سم کو نواز استعمال کیا کرتا تھا لیکن وہ سم گم ہو گئی، میرا شک ہے کہ وہ سم تم نے کسی طرح سے اس کے پرس سے نکال کر عائزہ کو فون کیا تھا۔'' انسپکٹر عدنان نے کہا۔

''مم... میں نے...'' عاطف بری طرح سے گھبرایا ہوا تھا۔

''دیکھو اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہیں لاک اپ میں بند کردوں گا۔'' انسپکٹر عدنان کا لہجہ درشت ہوگیا تھا اور عاطف کانپ کر رہ گیا۔

عاطف نے کچھ دیر تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر کہنے لگا۔ ''میں نے نواز کی سم اس کے پرس سے نکالی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی وہ سم کئی بار میرے سامنے پرس سے نکال کر استعمال کی تھی۔ میں نے اس کے علم میں لائے بغیر سم نکالی اور محض عائزہ کو ڈرانے کے لیے اسے دھمکی دی تھی کیونکہ میں نے عائزہ کو ایک اور شخص کے ساتھ دیکھا تھا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے انکار نہ کردے۔ میرا یقین کیجیے میں نے عائزہ کو صرف ڈرانے کے لیے آواز بدل کر فون کیا تھا کہ وہ مغالطے میں رہے کہ اسے کس نے کال کی تھی۔''

''عائزہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھا تھا؟'' انسپکٹر عدنان نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ مجھے اچانک وہ دونوں دکھائی دے گئے تھے۔ وہ گاڑی میں گھوم رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور ان دونوں کو گھنٹوں ایک ساتھ دیکھا۔ مجھے شک ہوا کہ عائزہ ہم دونوں کو نظر انداز کر کے اس شخص کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔ تب میں نے عائزہ کو دھمکی دی تھی۔''

''وہ کون تھا؟ کہاں رہتا ہے اور کیا جانتے ہو تم اس کے بارے میں؟'' انسپکٹر عدنان نے پوچھا۔

''میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں وہ عائزہ سے کم از کم دس سال بڑی عمر کا شخص تھا اور اس کی گاڑی کا نمبر گیارہ آئی ڈی ایف تھا۔''

انسپکٹر عدنان نے نواز اور اسلم کو جانے کی اجازت دے دی۔ اور اس شخص کے حلیے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ پھر اس نے عاطف کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ اور اپنے اہلکار کو گاڑی کا نمبر لکھ کر دے دیا کہ وہ پتا کرے... یہ گاڑی کس کے نام پر ہے اور پتا کیا ہے۔ وہ اہلکار جانے سے پہلے بولا۔

''سر ایک سوال کروں۔''

''ہاں کرو۔''

''آپ نے عاطف کو گرفتار کیوں نہیں کیا، لاک اپ میں یہ دس منٹ میں اپنا جرم مان جائے گا۔''

''میرا تجربہ کہتا ہے کہ عائزہ کا قاتل کوئی اور ہے اور میں یہ اس قاتل تک پہنچنے کے لیے تفتیش کر رہا ہوں۔ تفتیش ان کی ہو رہی ہے اور ثبوت اس قاتل کے جمع ہو رہے ہیں۔'' عدنان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

☆☆☆

وہ گاڑی شکیل احمد کے نام پر تھی۔ انسپکٹر عدنان نے شکیل کو اپنی تفتیش میں شامل کرنے کے بجائے اس کے بارے میں اپنے دو اہلکار کی مدد سے معلومات جمع کرنا شروع کردی۔ انسپکٹر عدنان کے دونوں اہلکار اپنے کام میں بہت ماہر تھے۔ انہوں نے شکیل احمد کے بارے میں بہت سی معلومات انسپکٹر عدنان کو فراہم کردی۔ ساری معلومات لینے کے بعد انسپکٹر عدنان نے ایک منصوبہ بندی کی اور اس کے دونوں اہلکار نگرانی پر مامور ہوگئے۔ اس نگرانی میں انسپکٹر عدنان کے سامنے ایک نئی چونکا دینے والی حقیقت منکشف ہوئی تو اس کی سوچوں کا رخ ہی بدل گیا۔

☆☆☆

عائزہ کی موت کو دس دن ہوگئے تھے۔ ان دس دنوں میں انسپکٹر عدنان، قاتل کو سامنے نہیں لا سکا تھا۔ انسپکٹر عدنان کو عائزہ سے محبت تھی، وہ اس کے قاتل کو ہر حال میں منظرِ عام پر لانا چاہتا تھا۔ اس کی تفتیش پہلے دن کی طرح متحرک تھی۔

اس شام انسپکٹر عدنان تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس وقت اس سڑک پر دھیرے دھیرے گاڑی چلاتا آگے بڑھ رہا تھا جہاں عفت کا فلیٹ تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور اوپر جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لفٹ نیچے آرہی تھی، عدنان انتظار کرنے لگا۔ اچانک لفٹ رکی اور دروازہ کھلا اور اندر سے چار افراد باہر نکلے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے انسپکٹر عدنان کو رکنے پر مجبور کردیا۔ وہ اسی جگہ رک کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا عمارت سے باہر نکل گیا۔

انسپکٹر عدنان بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس دوران وہ اپنے اہلکار کا نمبر بھی ملا چکا تھا اور رابطہ بھی ہوگیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اپنے اہلکار سے بات کرنے کے بعد انسپکٹر عدنان لفٹ کی طرف چل پڑا۔

بیل دینے پر دروازہ عفت نے کھولا۔ یکدم وہ انسپکٹر عدنان کو دیکھ کر چونکی اور پھر دروازہ چھوڑ دیا۔ وہ اندر چلا گیا اور ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے تم بہت تھکے ہوئے ہو۔'' عفت نے پوچھا۔

''جب سے عائزہ کا قتل ہوا ہے، میں ایک پل کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھا۔ میں اس کیس کو حل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ عائزہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں کہ عائزہ کا قاتل تلاش کر کے سرخرو ہوسکوں۔'' انسپکٹر عدنان بہت سنجیدہ تھا۔

''وہ دونوں ہی عائزہ کے قاتل ہیں۔'' عفت نے زور دے کر کہا۔

''وہ دونوں مل کر عائزہ کو قتل نہیں کر سکتے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''تو ان میں سے ایک قاتل ہوگا۔ تم ان کو گرفتار کیوں نہیں کرتے ہو۔''

''میری تفتیش جاری ہے۔''

''تم عجیب پولیس والے ہو۔ ان سے تفتیش ہی کرتے جا رہے ہو اور انہیں آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ تم نے پولیس والے ہاتھ ان کو کیوں نہیں دکھائے۔ ذرا انہیں لاک اَپ کا منہ دکھاؤ ان پر تھرڈ ڈگری آزماؤ تو ایک پل میں بول پڑیں گے اور عائزہ کا قاتل سامنے آجائے گا۔'' عفت کی آواز تیز ہوگئی تھی اور وہ زور دے رہی تھی کہ وہ ان دونوں کو ابھی گرفتار کر کے لاک اَپ میں ڈال دے۔

''وہ دونوں قاتل نہیں ہیں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ مجھے یقین ہے اور میری تفتیش کہتی ہے۔'' انسپکٹر عدنان پُر یقین لہجے میں بولا۔

''غلط سوچ رہے ہو تم۔ وہ دونوں ہی قاتل ہیں۔'' عفت اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''پلیز میں اس موضوع پر بات کرنے نہیں آیا۔ میں تھک چکا ہوں.... اس جگہ سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا... کہ تمہارے پاس جا کر چائے پیوں اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کروں تاکہ مجھے کچھ سکون مل سکے۔'' عدنان نے ہاتھ اُٹھا کر اسے اس موضوع پر مزید بولنے سے روک دیا۔

''ٹھیک ہے میں بات نہیں کرتی۔ چائے بناتی ہوں۔''

''شکریہ۔''

عفت کچن میں چلی گئی اور عدنان میز پر پڑا رسالہ اُٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس دوران اس نے پوچھا۔

''دروازے کا لاک تم نے خود ٹھیک کروایا ہے۔''

''اور کون کراتا؟'' وہ کچن سے جھانک کر مسکرائی۔

''تم پھر سے گھر کیوں نہیں بسا لیتیں؟ اکیلی زندگی گزارتے ہوئے تمہیں بوجھ سا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' عدنان نے کہا۔ اس نے اپنا موبائل فون جیب سے نکال لیا تھا اور باتوں کے دوران اس کی نگاہ موبائل فون کی اسکرین پر بھی چلی جاتی تھی۔

''میں بھی سوچ رہی ہوں۔ اب گھر بسا ہی لوں۔'' وہ مسکرائی۔

''سوچ رہی ہو یا تم بہت پہلے اس بارے میں سوچ چکی تھیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم شادی کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکی ہو۔ اور میرا خیال ہے کہ تم کسی کو پسند بھی کرتی ہو۔'' عدنان نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔

عفت دو کپ چائے کے اُٹھائے اندر آگئی۔ اسے عدنان کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ ''یہ بات تم کس بنیاد پر کر رہے ہو؟''

''میں جانتا ہوں کہ تم کسی کو بہت ہی زیادہ پسند کرتی ہو۔ اور تم دونوں شادی کرنے والے بھی تھے۔ مگر پھر اچانک عائزہ بیچ میں آگئی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا قتل ہوگیا۔'' عدنان نے ایک گھونٹ بھرا۔ عفت اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ عدنان بولا۔ ''چائے بہت اچھی بنائی ہے۔''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو۔'' عفت ابھی تک اسی بات پر رکی ہوئی تھی۔

''میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ جس کو تم پسند کرتی تھی، اسے عائزہ بھی پسند کرنے لگی تھی اور وہ شخص عائزہ کے معاملے میں بھی سیریس ہوگیا تھا۔''

اس بات نے عفت کے چہرے پر گہری متانت چھوڑ دی تھی۔ وہ نظریں جمائے عدنان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''تم عائزہ کے کیس کی تفتیش کر رہے ہو کہ میری جاسوسی کر رہے ہو، میں کس سے شادی کرنا چاہ رہی ہوں اور کب کر رہی ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد عفت نے کہا۔

''عفت... تم میری کزن ہو۔ جس دن میں اس فلیٹ میں آیا تھا اور اس فلیٹ میں عائزہ کی لاش پڑی تھی تو میں نے دیکھا کہ جس نے بھی کسی سخت نوک دار چیز کو پھنسا کر اس دروازے کا لاک توڑا، اس نے ایک بے وقوفی کر دی تھی۔''

''کیسی بے وقوفی؟'' عفت یکدم گھبرا گئی۔

''اس نے اس سخت نوک دار چیز کو باہر کے بجائے اندر سے پھنسا کر لاک توڑا تھا۔ پھر اس نے باہر کی طرف سے بھی لاک کو توڑا کہ یہ ظاہر ہو کہ لاک باہر سے توڑا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ قاتل اس فلیٹ کے اندر تھا۔ اور اس نے اندر سے لاک توڑا۔ اندر سے لاک توڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اندر سے تو وہ دروازہ کھول کر جا سکتا تھا۔'' عدنان نے کہا۔

عفت کا دھیان فوراً غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف چلا گیا اور پھر اس نے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''دراصل وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ کوئی دروازے کا لاک توڑ کر اندر آیا ہے۔ اس نے اپنی طرف سے کوشش کی کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ لاک اندر سے توڑا ہے لیکن میری نگاہ سے اس کی یہ بے وقوفی نہیں بچ سکی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ قاتل اندر تھا؟''

عدنان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ ''عفت جس سے تم شادی کرنا چاہتی تھی، اس کا نام شکیل ہے ناں؟''

ایک منٹ کے لیے عفت کو چپ لگ گئی اور وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''ہاں۔''

''دیکھو وہ کتنا بے وفا ہے کہ تمہاری دوستی کو چھوڑ کر وہ فوراً عائزہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اور عائزہ کی خاطر اس نے تمہیں بھی ٹھکرا دیا۔ حالانکہ تم اس سے ملی تھیں اور اپنے پرانے تعلق کا واسطہ بھی دیا تھا۔''

''عائزہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تمہیں کس نے کہہ دیا۔ شکیل کے ساتھ تو میری اب بھی دوستی ہے۔ وہ ابھی بھی میرے فلیٹ سے گیا ہے۔''

''ہاں میں نے اسے جاتا ہوا دیکھا تھا۔ اچھی بات ہے کہ تمہاری اور شکیل کی پھر صلح ہو گئی۔ صلح اس کی مجبوری تھی کیونکہ عائزہ دنیا میں نہیں رہی اور اسے لوٹ کر تمہارے پاس آنا ہی پڑا....'' عدنان نے کہا۔

''عدنان مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' عفت کو الجھن ہونے لگی تھی۔

''تو پھر میں صاف بات کرتا ہوں۔ جب عائزہ اور شکیل ایک دوسرے کے لیے اچانک سیریس ہو گئے اور تمہارے علم میں یہ بات آئی تو تمہارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تم نے شکیل کے پاس جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن شکیل نے تو عائزہ کی خاطر تمہاری ایک بھی نہیں سنی اور جب تم نے دیکھا کہ تمہاری محبت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور عائزہ اس کی خاطر تمہیں بھی نظر انداز کر چکی ہے تو تم نے ایک منصوبہ بنایا اور عائزہ کو قتل کر دیا۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' عفت اُٹھ کر چیخی۔

''یہ حقیقت ہے۔ اگر تم باہر سے دروازہ توڑتیں تو باہر سے دروازہ توڑتے ہوئے تمہیں کوئی دیکھ لیتا اور کسی نہ کسی کو پتا چل جاتا۔ اس لیے تم نے دروازہ اندر سے توڑا۔ اور پھر کھول کر اسے باہر کی طرف توڑنے لگیں۔ یہ کام تم نے بڑی احتیاط سے کیا اور میں تم تک شاید پہنچ ہی نہ پاتا اگر میں یہ غور نہ کرتا کہ دروازہ پہلے اندر سے توڑا گیا ہے۔ اسی دن سے میں نے تمہاری نگرانی پر اپنا ایک آدمی لگا دیا۔ تم شکیل سے بھی ملیں، تمہاری بات چیت میرے آدمی نے بھی سنی کہ کس طرح تم دونوں میں صلح ہوئی .... اس وقت شکیل میرے آدمیوں کے پاس ہے اور اس سے تفتیش جاری ہے۔ اس نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ اس کی عائزہ سے کیسے ملاقات ہوئی، کیسے وہ اس سے شادی کے لیے رضامند ہوا اور اس کے قتل کے بعد اس نے کیسے تم سے صلح کی۔ اس وقت جو کچھ شکیل بتا رہا ہے، وہ میسج کی صورت میں میرا اہلکار مجھے پہنچا رہا ہے۔''

عدنان نے اپنا موبائل فون اس کے آگے کر دیا جہاں کئی میسج اسے موصول ہو رہے تھے۔ عفت کے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ حقیقت کھل چکی تھی۔ پھر یکدم وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے عدنان پر تان کر کہا۔

''تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں نے عائزہ کو قتل کیا ہے۔ کیونکہ وہ میرا شکیل مجھ سے چھین رہی تھی۔ اب میں تمہیں بھی مار کر ایک نیا ڈراما رچا دوں گی لیکن اس بار کوئی غلطی نہیں کروں گی۔''

انسپکٹر عدنان اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا اور بولا۔ ''جب میں عائزہ کی لاش کا جائزہ لے رہا تھا تو بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پڑی فلیٹ کے مین دروازے کی چابی میں نے چپکے سے اُٹھا لی تھی۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں تین بار اس فلیٹ میں آ چکا ہوں۔ جس نوکدار سریے سے تم نے دروازے کا لاک توڑا تھا وہ بھی لے گیا تھا اور اس ریوالور کی گولیاں بھی میرے پاس ہیں۔ یہ ریوالور خالی ہے۔''

عفت نے ریوالور کا میگزین کھولا اور خالی دیکھ کر اس نے ریوالور اور میگزین ایک طرف پھینک دیا اور فرش پر ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حقِ زندگی

مریم کے خان

زندگی جینا ہے یا موت کو قبول کرنا ہے... اس فیصلے کے درمیان لمحہ بھر کا فاصلہ حائل ہوتا ہے... پل بھر کی ساعت گویا مانند پلِ صراط ہوتی ہے... وہ زندہ رہنا چاہتی تھی... اپنے پیاروں کے لیے جو اس کے بغیر ادھورے اور بے سہارا تھے... وہ ان کا سہارا تھی مگر خود بے آسرا تھی... تقدیر نے اسے عجب دوراہے پر پہنچا دیا تھا... جس کے ایک جانب موت اور دوسری جانب بھی موت تھی... جو کرنا تھا... اسے خود ہی کرنا تھا... مسلسل کشمکش اور ذہنی خلفشار کا شکار... ایک تھکا دینے والی فیصلے کی گھڑی...

روشنیوں سے دور تاریکیوں کے قریب تر شہر میں پھیلی خوف و دہشت پر مبنی پُرسوچ تحریر...

سومی نے اپنا کوٹ اتارا اور پرس سے برش نکال کر بال ٹھیک کیے۔ پھر اس نے عبایا پہنا تھا کہ ریحانہ نے اندر جھانکا اور سوالیہ انداز میں بولی۔ ”چھٹی کی تیاری؟“

”ظاہر ہے۔“ سومی نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”آج کام ویسے ہی زیادہ تھا۔“

سومی شہر کے ایک نجی اسپتال میں ڈاکٹر تھی۔ دو سال پہلے وہ ہاؤس جاب مکمل کر کے اس اسپتال میں ملازم ہوئی تھی۔ یہاں تنخواہ تو اچھی تھی مگر کام بہت زیادہ تھا۔ شہر کے

وسط میں اس بڑے ٹاؤن میں یہ واحد اچھا اسپتال تھا جہاں تمام سہولتیں اور ایمرجنسی کا انتظام تھا۔ سومیہ اظفر جنرل فزیشن تھی اور اس کی ڈیوٹی عام طور سے ایمرجنسی میں ہوتی تھی۔ آج بھی علاقے میں فائرنگ کے دو واقعات میں چار زخمی لائے گئے تھے جن میں سے ایک تو آتے ہی چل بسا تھا اور دو شدید زخمی تھے مگر ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ انہیں ابتدائی طبی امداد کے بعد پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک زخمی جس کی حالت خطرے سے باہر تھی اُسے ابتدائی طبی امداد کے بعد اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

سومی اس ٹیم میں شامل تھی جس نے ان زخمیوں کو دیکھا تھا۔ ڈاکٹر کریم انصاری اس ٹیم کا سربراہ تھا کیونکہ وہ ایمرجنسی کا سربراہ تھا۔ دو جو شدید زخمی تھے انہیں ڈاکٹر کریم ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے آپریٹ کر کے گولیاں نکالیں، پھر باقی کام سومی اور ڈاکٹر شارق کے سپرد کر دیا۔ کئی گھنٹے تک وہ ان کے ساتھ لگے رہے۔ چوتھے زخمی کی رپورٹ تیار کر کے اور باقیوں کو وارڈ میں شفٹ کر کے سومی اور دوسرے فارغ ہوئے تو شفٹ ختم ہونے والی تھی۔ ان دنوں سومی ایوننگ شفٹ میں تھی جو بارہ بجے ختم ہوتی تھی۔ سومی کی رہائش اسپتال سے کچھ ہی دور ایک فلیٹ میں تھی۔ جب اس نے یہاں ملازمت کی تو اس نے رہائش بھی یہیں لے لی۔ اس کے ساتھ اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی ثاقب تھا جو اس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔

سومی کا باپ اس وقت دنیا سے گزر گیا تھا جب وہ ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں تھی اور اس نے آخری کے تین سال بہت مشکل سے گزارے۔ مگر یہ مشکل وقت کسی نہ کسی طرح گزر گیا اور اب وہ اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

وہ چھٹی کر کے باہر آئی تو سوا بارہ بج جاتے، اس نے پہلے ہی ثاقب کو کال کر دی تھی۔ وہ اسپتال سے باہر آئی تو ثاقب موجود تھا۔ ''حالات خراب ہیں امی تو ٹی وی پر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں اور آپ کو کال کر رہی تھیں۔''

''میں نے دیکھ لیا تھا جس وجہ سے حالات خراب ہیں وہ مجھے ہی دیکھنا پڑ رہی تھی۔''

سومی جانتی تھی کہ زخمی ہو کر آنے والے ایک سیاسی پارٹی کے کارکن تھے اور ان پر مخالف پارٹی نے فائرنگ کی تھی۔ اس پارٹی کے مسلح بدمعاش بھی بلاتکلف ایمرجنسی میں دندناتے پھر رہے تھے مگر کسی کی جرأت نہیں تھی کہ انہیں باہر جانے کو کہتا۔ وہ بلاتکلف اپنے عزائم کا بھی اعلان کر رہے تھے کہ جلد وہ مخالفوں کو دیکھ لیں گے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا اس سے پہلے بھی سومی کئی بار ایسے حالات دیکھ چکی تھی۔ ان حالات میں پورا اسپتال ایک قسم کی ٹینشن میں آجاتا تھا کہ اگر اتفاق سے بھی دوسری پارٹی کا کوئی فرد یہاں آگیا تو اسپتال میں ہی مارا ماری شروع ہو جائے گی اور ایسا اس علاقے میں بارہا ہو چکا تھا۔

مگر ان کا اسپتال ابھی تک محفوظ تھا۔ اس کے باوجود دھڑکا لگا رہتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کیس لینے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دو بار ایسے واقعات ہوئے تو مشتعل افراد نے اسپتال میں ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی تھی۔ اس مسئلے سے قطع نظر سومی اس جگہ اور ملازمت سے بالکل مطمئن تھی۔ تنخواہ اچھی تھی اور دوسری سہولیات بھی تھیں۔

وہ فلیٹ پہنچی تو ماں کے ساتھ اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ تھکی ہوئی ہونے کے باوجود اسے سوتے سوتے دو بج گئے۔ پھر اس کی آنکھ فائرنگ کی آواز سے کھلی اور وہ چونک کر اٹھی تھی۔ رضیہ صبح سویرے اٹھ جاتی تھیں کیونکہ ثاقب کو اسکول بھیجنا ہوتا تھا۔ اس وقت وہ اس کے لیے ناشتا بنا رہی تھیں۔ ان کا فلیٹ دوسرے فلور پر تھا۔ ثاقب نے بالکونی سے جھانک کر دیکھا۔

''باہر دکانیں بند ہو رہی ہیں۔''

اتنی صبح بیکری، دودھ دہی اور اسی قسم کے آئٹم رکھنے والی دکانیں کھلتی تھیں... اگر وہ بند ہو رہی تھیں تو اس کا مطلب تھا کہ حالات خراب تھے۔ سومی نے کہا۔ ''ثاقب آج اسکول مت جاؤ۔''

''باجی میرا ایک ٹیسٹ ہے۔''

''کوئی بات نہیں ٹیسٹ جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔'' رضیہ نے بھی تائید کی۔ ''پھر دے سکتے ہو۔ فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہو؟''

واقعی فائرنگ کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ نزدیک سے آرہی ہیں۔ سومی نے ٹی وی کھولا اور واش روم میں آگئی۔ برش کرتے اور منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے خبریں سنیں۔ فائرنگ کی خبر آدھے گھنٹے بعد آئی اور وجہ بھی پتا چل گئی۔ گزشتہ شام فائرنگ سے مرنے والے سیاسی پارٹی کے کارکن کا جنازہ تھا اور وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ علاقے میں کشیدگی پھیل گئی تھی اور نامعلوم افراد نے شدید فائرنگ کر کے سارا علاقہ بند کرا دیا تھا۔ سومی ناشتے کے بعد چائے کا مگ لیے ٹی وی کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ ثاقب کا کمرا الگ تھا اور وہ اپنے کمرے میں گیا تو رضیہ نے موقع غنیمت جان کر سومی سے کہا۔ ''تو نے کیا سوچا ہے؟''

سومی نے گہری سانس لی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب وہ کیا کہیں گی۔ وہ کچھ عرصے سے اس پر زور دے رہی تھیں کہ وہ شادی کے لیے مان جائے۔ اس نے کہا۔ ''امی میں کہہ چکی ہوں کہ ابھی میں اپنا کیریئر بنا رہی ہوں اور مجھے ثاقب کا کیریئر بھی بنانا ہے۔ میں شادی نہیں کرسکتی۔''

''یہ سب شادی کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔''

''امی میں شادی کے بعد یہ سب نہیں کرسکوں گی۔''

''بیٹا، صفیہ اور نبیل کوئی غیر نہیں ہیں۔ تمہاری سگی اور اکلوتی خالہ ہے۔ تم جانتی ہو صفیہ کا گھر بڑا ہے اور کل دو افراد ہیں۔ وہ تو چاہتی ہے کہ ہم اسی کے پاس رہیں۔''

''پلیز امی، میں اسے مناسب نہیں سمجھتی، خاص طور سے میں نہیں چاہتی کہ ثاقب خود کو بہن کے گھر میں پڑا ہوا محسوس کرے۔''

رضیہ نے گہری سانس لی۔ ''میں تو تمہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ اب صفیہ ہی تم سے بات کرے گی۔''

''مجھے خالہ سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' سومی نے جلدی سے کہا۔ ''میں انکار نہیں کر رہی بس کچھ عرصے رکنے کو کہہ رہی ہوں۔''

سومیہ کی خالہ صفیہ اور ان کا اکلوتا بیٹا نبیل وفاقی دارالحکومت میں رہتے تھے۔ اتنی دوری کی وجہ سے دو تین سال میں ان کی میل ملاقات ہوتی تھی۔ صفیہ اور نبیل دو دن بعد آرہے تھے۔ نبیل نے انجینئرنگ کی تھی اور جاب کر رہا تھا۔ سومی کو خالہ سے محبت تھی اور اسے نبیل بھی اچھا لگتا تھا مگر وہ ابھی امی اور خالہ کی خواہش پوری نہیں کرسکتی تھی۔

شام تک حالات بہتر ہوگئے تھے۔ دکانیں کھل گئی تھیں اور ٹریفک چلنے لگا تھا اس لیے وہ بھی نکل آئی۔ وہ اسپتال میں داخل ہوئی تو اسے وہاں کا ماحول عجیب سا لگا۔ اول تو وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ مین گیٹ بند تھا اور گاڑیاں باہر رک رہی تھیں۔ پھر اسے اندر آتے ہوئے کئی جگہ پر مشکوک افراد نظر آئے جو آنے جانے والے ہر فرد کو بہ غور دیکھ رہے اور بعض کو روک بھی رہے تھے۔ ایک آدمی نے اسے بھی دیکھا مگر روکا نہیں۔ وہ حیران پریشان اندر آئی اور ایڈمن ڈاکٹر ندیم سے پوچھا۔

''یہ لوگ کون ہیں، ان کا اسپتال سے کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''تعلق تو ہے۔'' ڈاکٹر ندیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ کل یہاں آنے والے افراد کی وجہ سے آئے ہیں۔''

اسپتال کا عملہ سہا ہوا تھا۔ یہاں موجود مسلح افراد کی تعداد نصف درجن سے زیادہ تھی۔ انہوں نے ایک طرح سے اسپتال کو یرغمال بنالیا تھا، کوئی ان کی مرضی کے بغیر نہ یہاں آسکتا تھا اور نہ جاسکتا تھا۔ زیادہ تر عملہ اپنے اپنے شعبوں تک محدود تھا اور چہل پہل بھی مفقود تھی۔ سومی ایمرجنسی میں آئی تو ڈاکٹر کریم اور ڈاکٹر شارق بھی آگئے.... مگر آج مریض نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو بھی آئے تھے وہ انتہائی مجبور تھے ورنہ اکثر تو باہر سے ہی لوٹ گئے تھے۔ ڈاکٹرز اور دوسرے اسٹاف کے مطابق گزشتہ رات کچھ مشکوک افراد اسپتال میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہاں موجود زخمیوں کے ساتھ لگے مسلح افراد نے مزاحمت کی اور ان کو للکارا تو وہ فرار ہوگئے۔ اس کے بعد یہاں مزید مسلح افراد آگئے اور انہوں نے ایک طرح سے اسپتال کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اسپتال کے مالک سرجن شایان احمد تھے مگر وہ یہاں کم ہی آتے تھے۔ ڈاکٹر ندیم ان کے نائب تھے اور اسپتال کے تمام انتظامی امور وہی دیکھتے تھے۔ سومی کو موقع ملا تو اس نے کچھ دیر بعد ان کے دفتر کا چکر لگایا اور ان سے پوچھا۔

''سر یہ کب تک چلے گا؟ ایسے ماحول میں تو ہم کام نہیں کرسکتے۔''

''خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہمارے کسی معاملے میں دخل دے رہے ہیں۔'' ڈاکٹر ندیم نے اسے تسلی دی۔

''سر، ان لوگوں کی موجودگی سے لگ رہا ہے کہ ان کو اپنے مخالفوں سے خطرہ ہے اور اگر یہ خطرہ سچ مچ یہاں آگیا تو ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔''

''ایسا ہوگا نہیں۔'' ڈاکٹر ندیم نے پھر تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''ویسے میں نے ان سے بات کی تھی کہ بیشتر عملے کو چھٹی دے دی جائے مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔''

سومی سہم گئی۔ ''کیوں سر؟''

ڈاکٹر ندیم نے بے بسی سے شانے اچکا دیے۔ ''تم اپنی ڈیوٹی جاؤ اور اطمینان رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔''

سومی واپس آئی تو ڈاکٹر کریم زخمیوں کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اس نے سومی سے کہا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' اس نے منمنا کر کہا۔

''کم آن، وہ تمہیں یا کسی کو بھی کھا نہیں جائیں گے ویسے بھی وہ زخمی ہیں۔''

سومی بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ زخمیوں کے کمرے

تک آئی۔ انہیں ایک بڑے سے پرائیویٹ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان میں سے ایک سو رہا تھا، تکلیف سے بچانے کے لیے اسے مارفین کے زیرِ اثر رکھا گیا تھا دوسرا ہوش میں تھا۔ یہ بڑھی ہوئی شیو اور سرخ آنکھوں والا نوجوان مرد تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ نقوش اچھے تھے لیکن بڑھے ہوئے بالوں اور زخموں کی وجہ سے وہ اچھا تاثر نہیں دے رہا تھا۔ جب تک ڈاکٹر کریم اسے دیکھتا رہا وہ سوی کو دیکھتا رہا اور جب ڈاکٹر کریم نے اپنا کام کرلیا تو اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر اب تم نہیں، یہ آئے گی۔''

ڈاکٹر کریم چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب مت پوچھ۔'' اس کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔ ''تجھے بول دیا نا، اب ہمیں دیکھنے یہ لڑکی آئے گی۔''

''یہ جونیئر ہے اور تمہارا آپریشن میں نے...'' ڈاکٹر کریم کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ زخمی نے اچانک اس کی ٹائی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کی ناک سے ناک ملا کر بولا۔

''لگتا ہے تجھے اس طرح سمجھ میں نہیں آئے گا، کسی اور طریقے سے سمجھانا پڑے گا۔''

''یہ... یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' سوی نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''پلیز چھوڑ دیں۔''

اس نے سوی کی طرف دیکھا اور چھوڑ دیا۔ ''تو کہہ رہی ہے تو چھوڑ رہا ہوں ورنہ اپنی جگہ لٹا دیتا، مجھے ایک بات دو بار کہنے کی عادت نہیں ہے۔ اب اپنی منحوس صورت لے کر دفع ہو جانا دوبارہ ادھر مت آنا۔''

ڈاکٹر کریم کا چہرہ ذلت سے زرد نہیں ہوا تھا بلکہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔ وہ باہر آئے تو سوی نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''اس نے بدمعاشی کی حد کر دی ہے، آپ ڈاکٹر ندیم سے شکایت کریں۔''

''نہیں، نہیں۔'' ڈاکٹر کریم نے گھبرا کر کہا۔ ''تم ان کو نہیں جانتی ہو خاص طور سے اس شخص آصف کو...'' ڈاکٹر کریم نے اسے سرگوشی میں بتایا کہ مذکورہ شخص سیاسی پارٹی کا نامی گرامی کلر ہے اور اس پر قتل کے درجنوں مقدمات فائل تھے مگر وہ آزادی سے دندناتا پھر رہا تھا۔ ایسے شخص سے تو بندے کو سانپ بچھو سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ سوی بھی ڈر گئی۔

''میرے خدا!! اتنا خطرناک ہے، دیکھنے میں تو عام سا شخص لگتا ہے۔''

''پکا بدمعاش ہے، دیکھو آصف نے صرف تمہیں بلایا ہے۔''

سوی کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی اس لیے جب ڈاکٹر کریم نے یاد دلایا تو اس کی جان نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔''

''یہ بات تم اس سے کہو۔'' ڈاکٹر کریم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''چاہو تو ڈاکٹر ندیم سے بات کر کے دیکھ لو۔''

سوی نے ڈاکٹر ندیم کو صورتِ حال بتائی۔ ڈاکٹر ندیم فکر مند تھا، اس نے کہا۔ ''ابھی ان کا آدمی آیا تھا اور وہ کہہ گیا ہے کہ ان دو زخمیوں کو تم ہی دیکھو گی۔''

''ان کو گولیوں کے زخم آئے ہیں اور مجھے ان کے بارے میں اتنا علم نہیں ہے۔''

''میں نے بتایا تھا مگر وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

سوی کی جان پر بن گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج وہ جیسے تیسے بھگتا لے گی مگر کل سے طبیعت خرابی کا کہہ کر اسپتال نہیں آئے گی جب تک یہ دونوں یہاں داخل ہیں۔ ان دونوں کو چھ چھ گھنٹے کے وقفے سے چیک کیا جا رہا تھا۔ سوی نے رات گیارہ بجے وزٹ کیا۔ ڈاکٹر کریم نے منع کیا تھا مگر وہ ایک نرس کو ساتھ لے آئی۔ آصف کا ساتھی مقصود بھی ہوش میں آ گیا تھا اور دونوں کی حالت بہتر تھی، ان کے زخم بھر رہے تھے۔ آصف خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر سہمی جا رہی تھی۔ اسے اس شخص کی آنکھیں اپنے لیے گندے عزائم کا عکس لیے محسوس ہوئی تھیں۔ یہ بات محسوس کر کے وہ اور بھی سہم گئی۔ وہ ایک کمزور سی لڑکی تھی جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی ماں اور بھائی کا سہارا تھی۔ جب وہ اس کے کمرے سے نکلی تو اس نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ بارہ بجے اس نے چھٹی کی اور باہر آنے لگی تو اس نے دیکھا کہ ایک شخص بھی اس کے ساتھ باہر آیا تھا اور یہ ان ہی افراد میں سے تھا جو صبح سے اسپتال کو اپنے قبضے میں کیے ہوئے تھے۔ ثاقب باہر اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

''باجی کیا ہوا، آپ پریشان لگ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں تھک گئی ہوں۔'' اس نے بہانہ کیا اور گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے کئی بار مڑ کر دیکھا تو اسے وہ شخص فاصلے سے پیچھا کرتا نظر آیا۔ وہ اپارٹمنٹ تک آیا تھا۔ گویا اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ سوی کوشش کر رہی تھی کہ ثاقب کو نہ پتا چلے۔ وہ بچہ تھا اور سہم جاتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کل اسپتال نہیں جائے گی اور طبیعت

خرابی کا کہہ دے گی۔ مصیبت یہ تھی کہ کل سے شفٹ بدل جاتی اور اسے اب صبح جانا تھا۔ اپنی طبیعت کی خرابی اس نے گھر میں آتے ہی واضح کر دی تھی اور چائے کے ساتھ دوائی لینے کا ڈراما کیا۔ اس نے رضیہ سے کہا۔ ''شاید میں کل صبح اسپتال نہ جاؤں۔''

''ہاں اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو آرام کرنا۔''

وہ چاہتی تھی کہ سب معمول کے مطابق لگے۔ رضیہ نے اسی وجہ سے اٹھایا نہیں اور اس کی آنکھ موبائل کی بیل پر کھلی تھی۔ کال اسپتال کی طرف سے تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کال ڈاکٹر ندیم کی ہوگی مگر جب اس نے آصف کی آواز سنی تو اسے جھٹکا لگا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ''تم اسپتال کیوں نہیں آئیں؟''

''آپ۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔ ''وہ... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تب بھی اسپتال آجاؤ یہاں تمہارا علاج بھی ہو جائے گا۔''

''پلیز، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے خاموش رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن صرف آج کی چھٹی ہے، کل تم لازمی آؤ گی اور ہاں تمہارا بھائی بہت چھوٹا اور پیارا سا ہے، اس کا خیال رکھنا۔'' اس نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور سومی دھڑکتے دل اور خشک ہونٹوں کے ساتھ موبائل کان سے لگائے بیٹھی رہ گئی۔ آصف کی دھمکی واضح تھی۔ اتنے میں رضیہ کمرے میں آئی۔

''کیا ہوا، کس کی کال تھی؟''

''اسپتال سے کال تھی۔'' اس نے جلدی سے موبائل رکھ دیا۔ ''میں نے کہہ دیا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں آج نہیں آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے ابھی آرام کرو۔ جب بھوک لگے تو بتا دینا، میں ناشتا بنا دوں گی۔''

''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ ثاقب چلا گیا؟''

''ہاں، اسے گئے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔''

وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے آصف کی کسی بات سے انکار کیا تو اس کے بھائی کو نقصان ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کریم نے بتایا تھا کہ وہ کتنا خطرناک شخص ہے اور درجنوں قتل کر چکا ہے۔ جو شخص اتنا سفاک ہو اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ نہ سوچے مگر سوچیں خود اس کے دماغ میں آرہی تھیں۔ تنگ آکر وہ اٹھ گئی۔ شاور لے کر اس نے ناشتا کیا اور پھر سر درد کی دوا لی۔ جب تک ثاقب اسکول سے نہیں آیا وہ بے چین رہی تھی۔ اتفاق سے ثاقب کو آنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ آتے ہی اس پر برس پڑی۔ ''تم جلدی نہیں آسکتے، پتا بھی ہے آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''کیا ہو گیا ہے باجی، آج تو سب ٹھیک ہے۔'' ثاقب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ بلا وجہ ٹینشن لے رہی ہیں۔''

''نہیں، تم اسکول سے سیدھے گھر آیا کرو۔'' سومی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''امی پریشان ہو جاتی ہیں۔''

''امی تو بالکل پریشان نہیں ہیں۔'' ثاقب نے رضیہ کی طرف دیکھا۔

اس دن وہ زیادہ تر کمرے میں رہی اور اگر رضیہ یا ثاقب کمرے میں آتے تو وہ یوں بن جاتی جیسے آرام کر رہی ہو۔ جیسے جیسے رات آرہی تھی اگلے دن کے خیال سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کی پریشانی میں اس ایس ایم ایس نے اضافہ کر دیا جو کسی نامعلوم نمبر سے آیا تھا اور اس نے میں لکھا تھا۔

''تم کل لازمی آؤ گی۔''

رات سونے کے لیے لیٹی تو اس نے سوچا کہ وہ ہمت ہار رہی ہے۔ اسے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ انسان چاہے تو ہر مشکل کا سامنا کر سکتا ہے اگر وہ ہمت اور اللہ پر بھروسا نہ ہارے تو۔ اس سوچ نے اسے سچ مچ حوصلہ دیا۔ صبح حسب معمول اس کی آنکھ سات بجے الارم سے کھلی۔ اس نے تیار ہو کر ناشتا کیا اور اسپتال جانے کے لیے باہر آئی۔ جیسے ہی وہ اپارٹمنٹ سے باہر آئی اس نے فٹ پاتھ پر دوسری طرف اسی آدمی کو دیکھا جس نے اسپتال سے فلیٹ تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آدمی نے موبائل نکالا اور کسی کو کال کرنے لگا۔ سومی تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ آدمی بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے آیا اور اسپتال تک اس کے ساتھ رہا۔ اس نے اپنی آمد کا وقت نوٹ کرایا۔ وہ ڈیوٹی پر آئی تو ڈاکٹر کریم پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سومی سے کہا۔ ''یہ نئی مصیبت ہے، آج اسے ڈسچارج کرنا تھا مگر اب وہ اسپتال سے جانے کے لیے راضی نہیں ہے۔''

سومی کو لگا جیسے وہ اسے سنا رہا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ خطرناک شخص اسپتال میں رہنے پر مصر تھا۔ سومی نے کہا۔

''ڈاکٹر ندیم کو چاہیے کسی بہانے اسے چلتا کریں۔''

''کوئی ان سے کچھ کہہ سکتا ہے۔'' ڈاکٹر کریم نے تلخی سے کہا۔''یہاں ڈاکٹروں کی پہلے ہی شامت آئی رہتی ہے اگر یہی حالات رہے تو میں استعفادے دوں گا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' سومی نے کہا۔

''ابھی تو جا کر اسے بھگتو، صبح سے چار بار پوچھ چکا ہے۔''

سومی نرس کے ساتھ کمرے میں آئی تو آصف نے نرس کی طرف دیکھا۔''تو جا اور باہر رہ۔''

وہ بلا چون و چرا باہر چلی گئی۔ سومی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔''آپ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

''لیڈی ڈاکٹر ہزار ہیں۔ لیکن کوئی تمہارے جیسی حسین نہیں ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ اس کا ساتھی مقصود مسکرارہا تھا۔ اس نے اکسانے والے انداز میں کہا۔

''صرف زبانی کلامی تعریف کرے گا یا عملی طور پر بھی کچھ...''

''تو چپ کر۔'' آصف نے اسے جھڑک دیا۔''یہ میرا معاملہ ہے، اس میں دخل نہ دے۔'' وہ کہتے ہوئے سومی کی طرف مڑا۔''آج مجھے یہاں سے ڈسچارج کیا جانا تھا مگر تمہاری خاطر رک گیا۔''

''اب آپ کو اسپتال میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سومی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''یہ میں جانتا ہوں کہ کب کیا کرنا ہے۔'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ سومی نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔

''اب میں جاؤں۔''

''ہاں لیکن جلد میں تم سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔''

اس نے اجازت دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔''دکم سے کم ایک بار۔''

سومی کو لگا کہ اس کا سارا خون چہرے پر آگیا ہے۔ آصف کا انداز اور لہجہ چیخ چیخ اس کی خواہش کی عکاسی کررہا تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور اپنی سیٹ پر آنے کے بجائے واش روم چلی آئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور واش بیسن کا نل کھول کر رونے لگی۔ اس کا دل ہلکا ہوا تو اس نے منہ دھویا اور باہر نکل آئی۔ اس دن بھی اسپتال میں مریض اور دوسرے لوگ معمول سے کم تھے۔ وہ زیادہ تر فارغ بیٹھی رہی۔ شام کو چھٹی سے پہلے وہ ایک بار پھر آصف کو دیکھنے گئی۔ وہ کمرے میں جانے والی تھی کہ اسے اندر سے آواز آئی۔''ہاں وہ چار بجے آف کر جائے گی... تم دیکھنا... خیال رکھنا اور ہاں اب تک کچھ ہوا نہیں ہے... ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''

وہ کچھ دیر بعد اندر گئی۔ اس نے نارمل سے انداز میں آصف اور مقصود کا معائنہ کیا اور آصف سے بولی۔''آپ دونوں ٹھیک ہیں۔ معمولی سے زخم رہ گئے ہیں جو دو تین دن میں بھر سکتے ہیں اگر آپ دوائیں باقاعدگی سے لیتے رہیں۔''

''اب تو مجھے بھی شدت سے انتظار ہے کہ میرے زخم کب بھرتے ہیں۔'' آصف بولا۔ اس کا لہجہ پھر معنی خیز ہوگیا۔

''یہ دو تین دن ہم یہیں گزاریں گے۔'' مقصود بولا۔

سومی وہاں سے نکلی اور چینجنگ روم میں آئی۔ اس کی چھٹی کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آصف کس کو اس کے بارے میں بتا رہا تھا اور کیوں بتا رہا تھا؟ ابھی وہ چینج کرکے نکلی تھی کہ اسپتال کے باہر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ اسپتال میں افراتفری کی کیفیت نظر آئی۔ لوگ باہر سے بھاگ کر اندر آئے اور اسپتال کا گیٹ بند کردیا گیا۔ فائرنگ کوئی پندرہ بیس منٹ جاری رہی اور اس کے بعد باہر سب بند ہوگیا۔ سومی پریشان تھی کہ اب وہ گھر کیسے جائے گی۔ رضیہ کی کال آئی تو سومی نے انہیں منع کیا کہ وہ ثاقب کو نہ بھیجیں۔ رضیہ فکرمند تھی کہ وہ کیسے آئے گی۔ اس نے تسلی دی کہ وہ دیکھ بھال کر کسی کے ساتھ آجائے گی۔ مگر یہ اس نے صرف امی کو تسلی دینے کے لیے کہا تھا ورنہ یہاں کون تھا جس کے ساتھ وہ جاتی۔ اس کی واقف کار چند ایک لڑکیاں تھیں اور وہ سب دوسری جگہوں پر جاتی تھیں۔ کسی مرد کے ساتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر گھر بھی جانا تھا۔

ساڑھے چار بجے اس نے ہمت کی اور باہر آئی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اس کا فلیٹ مزید اندر کی طرف تھا اور راستے پر زیادہ چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت تو ویسے ہی سناٹا تھا۔ صرف روشنی تھی اس لیے وہ سر جھکا کر چلتی رہی۔ معاً اسے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے کوئی نظر نہیں آیا مگر آواز برابر آرہی تھی۔ شاید کوئی گاڑیوں کے پیچھے تھا یہاں لائن سے گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے قدم بھی نہیں اٹھ رہے تھے وہ بس چل رہی تھی۔ ابھی وہ نصف راستے تک پہنچی تھی کہ اچانک عقب سے کسی گاڑی کا انجن غرایا اور پھر پہیوں کے چرچرانے کی آواز آئی۔ کار اس کے بالکل پاس رکی تھی اور فرنٹ سیٹ سے ایک آدمی اتر کر تیزی سے اس کے سامنے آیا۔ سومی نے

خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور واپس پلٹی تھی کہ اس کے عقب میں پہلے سے موجود شخص نے اسے بازو سے پکڑ کر کار کے کھلے عقبی دروازے سے اندر دھکیل دیا۔ اس سے پہلے وہ پھر چیخ مارتی ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا اور کسی نے غرا کر کہا۔

"آواز نہ نکلے۔"

وہ اس کے ہاتھوں میں دبی کسی کمزور چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بولنے والے کی طرف دیکھ لیتی۔ اسے خیال آیا کہ آصف نے یہ سب کرایا تھا اور وہ اسی لیے کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ کار چل پڑی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ کچھ دیر بعد آدمی نے کہا۔ "تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تمہیں ابھی چھوڑ دیں گے لیکن پہلے ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔"

اس نے ہمت کر کے سر ہلایا تو آدمی نے وارننگ دے کر اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا کہ وہ چیخنے چلانے کی کوشش نہ کرے۔ "کک... کیسا کام... کون ہو تم؟"

"تمہارے اسپتال میں دو بندے داخل ہیں۔ آصف اور مقصود، جانتی ہو ان کو؟"

اسے تعجب ہوا۔ "ہاں جانتی ہوں، تم انہی کے آدمی ہو؟"

اس کی بات پر کار میں موجود تینوں افراد زور سے ہنسے۔ پھر آدمی نے کہا۔ "ہم ان کی جان کے دشمن ہیں اور وہ ہم سے چھپ کر اسپتال میں بیٹھے ہیں۔ خاص طور سے آصف کو ہم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے، اس نے ہمارے بہت ساتھی مارے ہیں۔"

سوی حیران ہوئی۔ "تم اس کے دشمن ہو تو مجھے کیوں پکڑا ہے؟"

"اسپتال میں ہمارے بھی بندے ہیں اور ہمیں پتا ہے کہ ان کے کمرے میں تم جاتی ہو اور آصف کی نیت تم پر خراب ہے۔ وہ اسی قسم کا آدمی ہے، جہاں کوئی خوب صورت لڑکی نظر آتی ہے جب تک اس کی عزت برباد نہیں کر لیتا اسے سکون نہیں ملتا ہے۔"

سوی لرز گئی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

"اگر اس سے بچنا چاہتی ہو اور اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں ہمارا کام کرنا ہوگا۔"

"کیسا کام؟"

سوی اب تک اس آدمی کی صورت نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر سوی کو یوں پکڑا ہوا تھا کہ وہ اسے دیکھ نہ پائے۔ اس نے ایک چھوٹی سی شیشی اسے پکڑائی۔ "اس میں دوا ہے، اسے انجکشن یا ڈرپ میں دے دو تو وہ خاموشی سے مر جائے گا۔"

"نہیں، اس سے میں پکڑی جاؤں گی۔"

"نہیں پکڑی جاؤ گی، اس دوا کا پتا نہیں چلتا ہے اور تم انکار نہیں کر سکتیں۔" آدمی کی آواز درشت ہوگئی۔ "جس طرح آج تمہیں اٹھایا ہے اسی طرح کسی دن بھی اٹھا سکتے ہیں اور اس بار تم باعزت واپس نہیں جاؤ گی۔"

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ ایسی کوئی دوا نہیں ہے جس کا پوسٹ مارٹم میں پتا نہ چلے۔ وہ لازمی پکڑی جائے گی۔ پہلے اسے آصف سے خطرہ تھا اور اب یہ بھی خطرہ بن کر آئے تھے۔ ان کا تعلق یقیناً مخالف پارٹی سے تھا۔ شیشی اس کی مٹھی میں دبی تھی۔ کار رک گئی اور آدمی نے دروازہ کھولا۔ "نیچے اتر جاؤ مگر یاد رکھنا اگر وہ زندہ رہا تو تم باعزت زندہ نہیں رہو گی۔"

وہ لرزتی ٹانگوں سے نیچے اتری۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ جب کار وہاں سے چلی گئی تب اسے یقین آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے فلیٹ والی سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ بے ساختہ گیٹ کی طرف لپکی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ گارڈ نے اسے دیکھ کر جلدی سے بیریئر اٹھا دیا اور بولا۔ "خیریت بی بی۔"

"راستہ... سنسان بہت ہے... اس لیے میں ڈر گئی۔" اس نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ فلیٹ تک آتے آتے اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا تھا مگر جب رضیہ نے دروازہ کھولا تو وہ اس کی صورت دیکھ کر تاڑ گئی۔ وہ اور ثاقب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس کا موبائل آف تھا۔ رضیہ نے خفگی سے کہا۔

"اپنا موبائل تو دیکھتیں، یہاں جان نکل گئی تھی۔"

"خیال ہی نہیں آیا، ڈرتے ڈرتے آئی ہوں۔" اس نے کہا۔ رضیہ اور ثاقب دونوں فکر مند ہوگئے۔ ثاقب نے کہا۔

"آئندہ حالات کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں، آپ مجھے آنے سے منع نہیں کریں گی۔"

"بس تو اکیلے نہیں آئے گی، میں اور ثاقب لینے آجائیں گے۔" رضیہ نے بھی کہا۔ اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

"میں تو سوچ رہی ہوں کہ ایسے حالات میں اسپتال میں رک جایا کروں گی۔ باہر آنے کا خطرہ کیوں مول لوں۔"

وہ دہرے چکر میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف اس کی

عزت خطرے میں تھی اور دوسری طرف عزت کے ساتھ جان کا خطرہ بھی تھا۔ گھر آتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ اس بارے میں ماں کو نہیں بتائے گی۔ وہ پریشان ہوں گی اور اسے گھر بٹھالیں گی۔ مگر گھر بیٹھنا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اسے نہ سہی ثاقب کو تو باہر جانا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خود اس خطرے سے کیسے نمٹے۔ بہت دیر تک وہ جاگتی اور سوچتی رہی پھر اس نے نیند کی گولی لی تب جاکر اسے نیند آئی۔ اسی وجہ سے صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس کا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور منہ دھو کر باہر آئی۔ رضیہ نے پوچھا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے، میں صبح آواز دے رہی تھی مگر تم اٹھی نہیں۔''

''رات دیر سے نیند آئی تھی۔ مجھے بس ایک کپ چائے دے دیں دیر ہو رہی ہے۔''

رضیہ نے ناشتے پر اصرار کیا مگر وہ نہیں مانی۔ چائے پی کر وہ باہر نکل آئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر جانا تو تھا۔ اسپتال جاتے ہوئے وہ دیکھ رہی تھی کہ کوئی اس کی طرف متوجہ تو نہیں ہے یا اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے؟ مگر راستے میں اسے ایسا کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ البتہ کوئی کار یا گاڑی آنے لگتی تو وہ سہم کر فٹ پاتھ پر ہو جاتی۔ خدا خدا کر کے وہ اسپتال میں داخل ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ٹائم ریکارڈ کرا کے وہ چینجنگ روم میں آئی اور اپنا عبایا اور پرس لاکر میں رکھا۔ اسے خیال آیا کہ شیشی پرس میں تھی۔ کوٹ پہن کر وہ ایمرجنسی میں آئی تو ڈاکٹر کریم ایک زخمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سومی کو دیکھا اور بولا۔

''شکر ہے تم آگئیں کیونکہ آج صبح سے رش ہے۔''

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر آگئی۔'' اس نے کہا اور کام میں لگ گئی۔ ڈاکٹر کریم ٹھیک کہہ رہا تھا وہاں صبح سے خاصے لوگ آئے تھے اور ان میں خاصی تعداد عورتوں کی تھی۔ وہ انہیں دیکھنے لگی۔ ایک گھنٹے بعد اسے کچھ فرصت ملی تھی۔ اسے آصف کا خیال آیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ڈاکٹر کریم سے پوچھا۔ ''وہ دونوں ہیں یا چلے گئے۔''

ڈاکٹر کریم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، وہ اتنی آسانی سے جاسکتے ہیں۔''

''پلیز کیا آپ جا کر نہیں دیکھ سکتے؟'' اس نے التجا کی۔

ڈاکٹر کریم نے صاف انکار کر دیا۔ ''اول تو انہیں اب ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے اور دوسرے مجھے مرنا نہیں وہاں جا کر، تمہیں یاد نہیں ہے اس نے کیا دھمکی دی تھی۔''

ابھی وہ بات کر رہے تھے کہ ایک نرس نے آکر سومی سے کہا۔ ''ڈاکٹر آپ کو بارہ نمبر والا پیشنٹ بلا رہا ہے۔''

اس کے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ بارہ نمبر کمرے میں وہی دونوں تھے۔ اس کا دل چاہا انکار کر دے مگر نہ کر سکی۔ اس نے نرس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں جاتی ہوں۔''

''وہ کہہ رہا ہے کہ آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔'' نرس نے سہمے لہجے میں کہا۔ ''پلیز ڈاکٹر چلیں، مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''

''اچھا چلتی ہوں۔'' اس نے مرے انداز میں کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رفتہ رفتہ سارے اسپتال کو صورت حال کا علم ہو جائے گا۔ اگر وہ آصف سے بچ بھی گئی تب بھی لوگ اس کے کردار پر شک کرتے رہیں گے۔ مگر وہ کیا کرتی بری طرح پھنس گئی تھی۔ اتفاق سے آصف کمرے میں اکیلا تھا یا اس نے مقصود کو کہیں بھیج دیا تھا۔ مقصود بھی خاصا زخمی ہوا تھا مگر اسے گولیاں ایسی جگہ نہیں لگی تھیں جس سے اس کے چلنے پھرنے میں رکاوٹ پیش آتی۔ آصف کو ایک گولی پاؤں میں بھی لگی تھی ہڈی بچ گئی تھی لیکن جب تک زخم ایک حد تک نہیں بھر جاتا وہ پاؤں پر زور ڈال کر نہیں چل سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر آصف کی نظروں میں جو چمک آئی تھی، وہ اندر سے کٹ کر گئی۔ اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے بلایا ہے۔''

''ہاں ڈارلنگ! آج صبح سے تمہارا دیدار نہیں ہوا۔'' وہ بے باکانہ انداز میں بولا۔ ''سمجھو لو میری صبح...''

''پلیز میں ایک شریف لڑکی ہوں۔'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔

''میں بھی کوئی بدمعاش نہیں ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔'' وہ رو دینے والی ہو گئی۔

''چھوڑ دوں گا۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''بس ایک بار میں جو کہوں، وہ مان لو۔''

''نہیں...'' وہ اس کا مطلب سمجھ کر لرز اٹھی۔

مگر آصف نے اس کا انکار سنا ہی نہیں۔ ''جہاں میں کہوں وہاں ایک دن کے لیے آجاؤ۔ اس کے بعد تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔''

سومی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد کیا میں خود کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گی؟''

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا، تمہارے گھر والوں کو بھی نہیں معلوم ہوگا۔ البتہ تم نہ مانیں تو سارا زمانہ دیکھے گا۔ جو تمہارے ساتھ ہوگا وہ انٹرنیٹ پر آجائے گا۔" آصف نے دھمکی دی۔ سومی کو لگ رہا تھا کہ اس کا سر گھوم رہا ہے۔

"پلیز..."

"تمہارے پاس کل شام تک کا وقت ہے۔ میں یہاں سے نکلوں گا اور تم میرے ساتھ چلوگی۔ خاموشی سے جاؤ گی اور خاموشی سے واپس آجاؤ گی۔ اگر ساتھ نہیں گئیں تو بعد میں آؤ گی اور پھر میں اکیلا نہیں ہوں گا میرے ساتھ بہت سے ہوں گے اور تمہاری رسوائی کا تماشا دیکھنے والے لاتعداد ہوں گے۔"

سومی باہر آئی تو سچ مچ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ ایک طرف بینچ پر بیٹھ گئی۔ کوئی اس کے پاس سے گزرا اور پھر واپس آیا۔ "ڈاکٹر سومیہ آر یو رائٹ؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ ڈاکٹر ندیم تھا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "نو سر، میرا سر چکرا رہا ہے۔"

ڈاکٹر ندیم فکرمند ہوگیا۔ اس نے فوری طور پر اس کا بلڈ پریشر چیک کیا جو خاصا لو ہو رہا تھا۔ اس نے اسے فوری طور پر گلوکوز میں او آر ایس ڈال کر دیا۔ اس سے اس کا بلڈ پریشر بہتر ہوا تھا۔ پھر اس نے زبردستی اسے کینٹین بھیج دیا کہ وہ کچھ کھائے۔ ڈاکٹر ندیم اس کی کیفیت کی وجہ ناشتا نہ کرنے کو قرار دے رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کس مشکل میں تھی اور اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ شاید اس کے پاس بھی نہ پھٹکتا۔ وہ تو اس پر خوش تھا کہ آج اسپتال ذرا معمول پر آیا تھا ورنہ دو دن سے اسپتال کا بہت نقصان ہو رہا تھا۔ یہاں نظر آنے والے بدمعاشوں کی تعداد بھی کم ہوگئی تھی اور اب دو تین تھے جو کونے کھدروں میں تھے اور وہیں سے آنے جانے والوں کو دیکھتے تھے۔ سومی کی طبیعت سنبھلی تو وہ کام پر آگئی۔ ڈاکٹر کریم اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اتنی دیر کہاں رہیں؟"

"کینٹین میں تھی۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"آج ناشتا کیے بغیر آگئی۔"

ڈاکٹر کریم کا منہ بن گیا۔ "یہاں اتنے پیشنٹ آئے ہیں اور تم کینٹین میں بیٹھی تھیں۔"

سومی جواب دیے بغیر اپنی سیٹ پر آئی۔ دوپہر تک وہ مصروف رہی۔ شام کے قریب اس نے ڈاکٹر شارق سے

کہا۔ ''میں تھک گئی ہوں اب جاؤں گی۔''
''ٹھیک ہے باقی میں دیکھ لوں گا۔'' شارق نے سر ہلایا۔ ''تم چلی جاؤ۔''
''شکریہ۔'' سوی نے کہا اور اٹھ کر پہلے دواؤں کے اسٹور تک آئی۔ وہاں سے اس نے ایک سرنج لی اور پھر چینجنگ روم میں آئی۔ اس نے پرس کھول کر اس میں سے شیشی نکالی جس میں زرد سیال بھرا ہوا تھا۔ شیشی پر کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے اس کی ربر سیل سے سرنج کی سوئی اندر ڈالی اور سیال اس میں بھر لیا۔ پھر سرنج پر کیپ لگا کر اسے پرس میں رکھ لیا۔ خالی ہونے والی شیشی اس نے توڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دی۔ وہ چینجنگ روم سے آصف کے کمرے تک آئی اور اندر جھانکا۔ اتفاق سے اس وقت بھی وہ اکیلا تھا۔ اسے دیکھ کر آصف خوش ہوا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ اب شاید تم نہ آؤ۔''
''ایک بار اور دیکھنا ہے۔'' سوی نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے زخم تقریباً بھر گئے تھے۔ وہ چاہتا تو چل پھر بھی سکتا تھا مگر سوی نے اسے لیٹے ہی دیکھا تھا۔
''میرا خیال ہے اب دواؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کل ڈسچارج ہونے سے پہلے ایک انجکشن دینا ہوگا اس کے بعد تمہیں پھر کسی دوا کی ضرورت نہیں رہے گی۔''
''مجھے تو لگ رہا ہے کہ مجھے اب کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بس تمہاری ضرورت ہے۔''
سوی نے اس کی بات نظرانداز کی۔ ''میں شاید کل صبح نہ آؤں لیکن شام کو آؤں گی۔''
وہ باہر نکلی۔ اسپتال سے باہر آئی اور جب اپنے فلیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر آئی تو اس نے دور سے ہی اس کار کو دیکھ لیا جس میں اسے زبردستی بٹھایا گیا تھا اور یقیناً کار میں موجود لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے قدم سست ہو گئے۔ مگر وہ کتنا ہی سست چلتی اسے وہاں تک پہنچنا ہی تھا۔ وہ کار کے نزدیک آئی تو اس کا عقبی شیشہ نیچے ہوا اور وہ رک گئی۔ عقبی نشست پر وہی شخص تھا۔ آج بھی اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے کام کیا؟''
''نہیں، آج موقع نہیں ملا لیکن کل لازمی ہو جائے گا۔''
''اگر کل تک کام نہیں ہوا تو......''
''نہیں کل لازمی ہو جائے گا۔'' وہ بولی۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے، مجھے اپنا بچاؤ بھی کرنا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا، کل تک وہ زندہ رہا تو تمہارے ساتھ بہت برا ہوگا۔'' کہتے ہوئے آدمی کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔
سوی کانپ اٹھی۔ اس کے آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی۔ اگر وہ آصف کو انجکشن لگا دیتی تب بھی اس کا بچنا مشکل تھا، یہ بات کھل جاتی اور پھر آصف کے ساتھی اسے کہاں چھوڑتے؟ اگر نہ لگاتی تو یہ نہ چھوڑتے۔ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی۔ پولیس کے پاس جانے کا فائدہ نہیں تھا۔ پولیس اگر چاہتی تب بھی اس کی مسلسل حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ اس شہر میں تو اچھے اچھے صاحب حیثیت محفوظ نہیں تھے۔ اس کی کیا اوقات تھی۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے آگے چلی گئی۔ پہلی بار وہ پچھتائی کہ کاش ماں کی بات مان لیتی اور وہ اس شہر سے چلے جاتے جہاں درندے اتنے بے لگام تھے کہ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر گھر آتے آتے اس نے خود پر قابو پالیا۔ ورنہ رضیہ اس کے چہرے سے بھانپ جاتی اور پوچھتی تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے خود پر قابو رکھنا تھا۔
گھر آ کر اسے خیال آیا کہ وہ جتنی بار آصف کے پاس گئی وہ اکیلا ہی ہوتا تھا اور اس کے پاس موقع تھا کہ وہ اسے انجکشن لگا دیتی۔ مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اسے پچھتاوا ہوا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ پتا نہیں وہ کل بھی یہ کام کر پائے گی یا نہیں۔ ثاقب کا کوئی ٹیسٹ تھا وہ اس کی تیاری میں لگا رہا۔ رضیہ پڑوس کے گھر ہونے والی دعوت کے سلسلے میں اس کی مدد کرنے گئی تھیں اس لیے وہ ان کی توجہ سے بچ گئی۔ رات کو اسے نیند بہت دیر سے آئی۔ بہت سی سوچیں اس کے دماغ میں چکراتی رہیں۔ اگلی صبح وہ جلدی اٹھ گئی۔ اسے روز نہانے کی عادت تھی۔ اس نے رات شاور نہیں لیا تھا اس لیے صبح نہانے کے لیے جلدی اٹھی۔ وہ باہر آئی تو ثاقب اسکول جانے کے لیے نکل رہا تھا۔ سوی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ وہ ہنسا۔
''خیریت، آج صبح ہی صبح پیار آ رہا ہے۔''
''میرا بھائی ہے ہی اتنا پیارا۔'' اس نے اسے نظروں میں بھر کر دیکھا۔ ثاقب کے جانے کے بعد وہ ماں کے ساتھ لگی رہی۔ ناشتے کے دوران ان سے باتیں کرتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ آج کے بعد ان کو نہیں دیکھ سکے گی۔ اس نے رات کو سوچ لیا تھا کہ اگر اس مسئلے کا کوئی آبرومندانہ حل نہ نکلا تو وہ بے آبرو ہونے پر موت کو ترجیح دے گی۔ دوسری صورت میں بے آبرو ہو گی اور بات اس

کی ماں اور بھائی تک بھی آئے گی۔ وہ انہیں محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ ان کا جھکا ہوا سر بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بھائی اور ماں سے یوں مل رہی تھی جیسے آخری بار مل رہی ہو۔ اسپتال جانے کا وقت آیا تو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکلے۔ مگر آج تو اسے لازمی جانا تھا۔ ہاں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ سلامت آسکے گی یا نہیں۔ اس نے اچانک ماں سے پوچھا۔

''فرض کریں آپ کو پتا ہو کہ اس شہر میں میری یا ثاقب کی جان کو خطرہ ہے تو آپ کیا کریں گی؟''

رضیہ دہل گئیں۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہے، منہ سے خیر کا کلمہ نکالا کر۔''

''نہیں فرض کرنے کو کہہ رہی ہوں۔''

''تو میں تجھے اور ثاقب کو لے کر فوراً اس شہر سے چلی جاؤں گی۔''

سومی نے حیرت سے کہا۔ ''چلی جائیں گی، جبکہ آپ یہیں پیدا ہوئیں اور یہاں رہی ہیں۔''

''ہاں کیونکہ میرے لیے تم دونوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔''

''یہ گھر اور اس کا سامان بھی چھوڑ جائیں گی؟''

''وہ محل ہو اور اس میں دنیا جہاں کا سامان ہو تب بھی چھوڑ جاؤں گی۔''

''میں سوچتی ہوں تو یہ سب چھوڑنا بہت مشکل لگتا ہے۔''

''انسان کے لیے جان اور عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے اگر یہ دونوں خطرے میں ہوں تو انسان ان کے بدلے سب چھوڑ سکتا ہے۔''

وہ اسپتال جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ واقعی ان دو چیزوں سے بڑھ کر تو کچھ قیمتی نہیں ہے۔ راستے میں اس نے دیکھا وہی کار اسپتال کے نزدیک موجود تھی اور اس میں تین افراد بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ سومی نے کار کو غور سے دیکھا اور اس کے پاس سے گزر کر اسپتال پہنچی۔ اس نے عبایا اور نقاب لیا ہوا تھا۔ وہ اندر آئی اور فنگر پرنٹ مشین پر اپنا ہاتھ لگانے جا رہی تھی کہ اسے ایک خیال آیا۔ وہ رک گئی اور اندر آئی۔ ویٹنگ لاؤنج میں بے شمار مریض اور ان کے ساتھ آئے لوگ بیٹھے تھے۔ وہ عورتوں والے حصے میں جا کر بیٹھ گئی اس نے اپنا موبائل پھر آف کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ ڈیوٹی پر نہیں آئے گی تو ڈاکٹر ندیم اسے کال کریں گی۔ کچھ دیر سکون سے بیٹھ کر وہ سوچتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ میں ایک تصویر واضح ہونے لگی۔ وہ پندرہ منٹ بعد اٹھی اور اسپتال کے سرجیکل والے حصے میں آئی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ اسے معلوم تھا کہ کس حصے میں آپریشن روم تھے۔ اس نے دیکھا اور ایک آپریشن روم خالی نظر آیا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور تیزی سے اندر گئی۔ ایک منٹ بعد وہ باہر نکل رہی تھی کہ ایک پیرامیڈک اندر آیا اور اس نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

''کون ہو تم، یہاں کیوں آئی ہو؟''

''وہ جی میرے چاچا کا آپریشن ہے، میں سمجھی ادھر ہو رہا ہے۔'' اس نے آواز اور لہجہ بدل کر کہا۔

''ادھر کوئی آپریشن نہیں ہے اور ہو بھی تو کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''مجھے کیا پتا جی۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ اب دوبارہ ویٹنگ لاؤنج کی طرف تھا۔ مگر وہ لاؤنج میں آنے کے بجائے واش روم میں آئی اور ایک ٹوائلٹ میں آکر اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔ اتفاق سے اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے وہ نمبر ملایا جس سے آصف نے اسے کال کی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ سومی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں بات کر رہی ہوں۔''

''تم... زہے نصیب، آج تم نے کال کی۔'' اس کی آواز پہچان کر وہ کھل اٹھا تھا۔

''سنو، تمہارے پاس شاید وقت کم ہے۔ میں نے اسپتال کے باہر ایک گاڑی میں مسلح افراد کو دیکھا ہے جن کا تعلق تمہاری مخالف پارٹی سے ہے۔''

آصف کی شوخی ہوا ہو گئی اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں یہاں ڈاکٹر ہوں اور دونوں پارٹی کے لوگوں کو جانتی ہوں۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں، میں نے اسی اسپتال میں انہیں مسلح حالت میں بھی دیکھا ہے۔''

''کار کیسی ہے؟''

سومی نے اسے کار کا رنگ اور ماڈل بتایا اور یہ بھی کہ وہ کہاں موجود تھی۔ اس نے بتاتے ہی کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا اور واش روم سے باہر آئی۔ اس کا رخ اب وارڈ کی طرف تھا۔ وہ راہداری میں داخل ہوئی تھی کہ مقصود تیزی سے نکلتا نظر آیا۔ وہ عبایا اور نقاب میں تھی اس لیے وہ پہچانے بغیر اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی سومی کچھ دیر راہداری میں کھڑی رہی اور پھر کمرا نمبر بارہ تک آئی۔ اس نے اندر جانے سے پہلے کان لگا کر سنا، آصف کسی سے موبائل

پر بات کر رہا تھا۔ وہ بات نہیں کر رہا تھا بلکہ کسی پر گرج برس رہا تھا۔ ”کہاں مرے ہوئے تم سب... وہ تمہارے باپ یہاں موجود ہیں... کس لیے آئیں گے... میرے لیے آئے ہیں... میں نے مقصود کو بھیجا ہے لیکن فوری اور لڑکے بھیجو، پتا نہیں وہ کتنے ہیں۔“

سومی اندر آئی۔ آصف کا منہ دوسری طرف تھا۔ سومی نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور دبے قدموں آگے آئی تھی کہ آصف نے موبائل بند کر کے رکھا اور اسے دیکھ کر چونکا۔ ”تم کون ہو؟“

آصف کا ہاتھ تکیے کے نیچے جا رہا تھا کہ سومی نے جلدی سے کہا۔ ”یہ میں ہوں، تمہیں کچھ دکھانے آئی ہوں۔“

آصف کا ہاتھ رک گیا اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا لگ رہا تھا اور سومی کو تعجب ہوا کہ اتنے انسانوں کے قاتل کی جب اپنی جان پر بن آئی تو وہ بالکل عام آدمی کی طرح گھبرا گیا تھا۔ اس وقت سومی کو لگا کہ وہ عام آدمی سے بھی گیا گزرا تھا۔ عام آدمی کسی پر ایسا ظلم نہیں کرتا جیسا وہ دوسرے انسانوں پر کرتا تھا۔ اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ”تم... میں سمجھا پتا نہیں کون ہے لیکن تم نے یہ کیوں پہنا ہے؟“

وہ آگے آتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں ان لوگوں سے چھپ کر آئی ہوں جو باہر موجود ہیں۔“

اس سے پہلے آصف کوئی سوال کرتا اس کے موبائل کی بیل بجی اور وہ موبائل اٹھانے کے لیے سائڈ دراز کی طرف مڑا تھا کہ سومی کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہ اس کے بالکل پاس آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبے ریزر سے زیادہ تیز دھار سرجیکل چاقو نے پلک جھپکنے میں آصف کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے گلے سے خون کا فوارہ اچھلا تھا اور وہ خرخراتے ہوئے اپنا گلا پکڑ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے باہر سے فائرنگ کی مدھم لیکن مسلسل آواز آئی اور پھر اس میں اضافہ ہونے لگا جیسے بیک وقت کئی ہتھیار چل رہے ہوں۔ سومی وار کرتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گئی تھی تاکہ خون کے چھینٹے اس کے عبایا تک نہ آئیں۔ اس نے چاقو واپس پرس میں رکھ لیا اور آصف کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔ ”بعض اوقات پاؤں تلے آنے والی چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔“

وہ باہر آئی اور دوبارہ ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ مریض اور ان کے ساتھ آنے والے باہر ہونے والی تیز فائرنگ سے ہراساں ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اسپتال میں آنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ مرنے کا کیوں سوچ رہی ہے ان لوگوں کو کیوں نہیں مار سکتی جو اس کی عزت اور زندگی کے دشمن ہو رہے تھے۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا تو اسے انجکشن کا استعمال خطرناک محسوس ہوا کیونکہ اس سے خیال اسی کی طرف جاتا اور اس نے چاقو استعمال کرنے کا سوچا۔ خوش قسمتی سے اس نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا کہ اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ اسے اپنی حفاظت کا حق تھا اور اس نے یہی حق استعمال کیا۔ آصف یا جو بھی مرتا وہ اس زمین کے بوجھ اور مجرم تھے۔ ان کا مر جانا ہی اس کے اور دوسروں کے لیے بہتر تھا۔

آدھے گھنٹے بعد قانون کے محافظ آئے، تب باہر فائرنگ سے زخمی اور مرنے والوں کو اسپتال لایا گیا۔ سومی نے دیکھا ایک اسٹریچر پر مقصود بھی تھا اس کے سینے میں کئی گولیاں اتر گئی تھیں اور وہ کچھ دیر کا مہمان نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ کل چار لاشیں اور چار ہی زخمی آئے تھے۔ کار میں موجود افراد میں سے کوئی نہیں بچا تھا اور انہوں نے مرتے مرتے بھی مقصود اور اس کے ساتھیوں کو بھی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ زخمی سارے آصف اور مقصود کے لڑکے تھے اور ان میں سے بھی دو کی حالت نازک تھی۔ پولیس کے آنے کے بعد جب باہر کے حالات ٹھیک ہوئے تو وہ خاموشی سے نکل آئی اور گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے سرجیکل چاقو اور سرنج ایک کھلے مین ہول میں ڈال دیے۔ وہ گھر آئی تو رضیہ نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”شکر ہے تو آ گئی ورنہ میں خود نکلنے والی تھی، تیرا موبائل پھر بند جا رہا تھا۔“

”اسپتال کے پاس ہی فائرنگ ہوئی ہے اسی وجہ سے میں جانے کے بجائے واپس آ گئی۔“ اس نے کہا اور اندر آ گئی۔ اس نے موبائل آن نہیں کیا تھا کیونکہ اسپتال کی طرف سے کال آ جاتی تو اسے جھوٹ بولنا پڑتا۔ اس نے سوچ لیا کہ حالات ٹھیک رہے تو وہ یہ جھوٹ کل خود جا کر بول دے گی۔ اس کے لیے خطرہ بننے والے تمام افراد دنیا سے جا چکے تھے اور اسے امید تھی کہ اب اسے کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ اب ماں نے خالہ کے پاس چلنے کو کہا تو وہ ان کی بات مان لے گی۔

بوجھ

منظر امام

وطن دوستی اور انسان دوستی کی راہ پر گامزن ہو جانا آسان نہیں... اس راستے پر ہزار آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جسم و جان کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جو انسان اور انسانیت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا... اس نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا، پیش کردی... مگر یہ راہ تھی کہ طویل بھی اور کٹھن بھی... چلتے چلتے قدموں میں لغزش اور تھکن نمودار ہونے لگی تھی...

اربابِ سیاست کے پیچیدہ رموز سمجھانے کی
ایک انوکھی ادا..... دلچسپ و پر مزاح انداز و تکلم میں

ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کہانی پر یقین نہ آئے۔ آپ میرا مذاق اُڑائیں۔ جھوٹ سمجھیں کہ اس دور میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ یقین کریں کہ اس دور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے یہاں، ہمارے ملک میں۔

ابتدا اس دن سے ہوئی جب میں نے ایک بوڑھے کو ایک کھمبے کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ اس دن سے ایک رات پہلے میں نے حاتم طائی کی کہانیاں پڑھی تھیں اور اس آدمی پر رشک آنے لگا کہ اس نے کس طرح انسان دوست کی مثالیں قائم کی ہیں۔ وہ کتنا بڑا آدمی تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تانہ بخشند خدائے بخشندہ۔ یعنی جب تک توفیق نہ ملے۔ آپ اس قسم کی نیکی کر ہی نہیں سکتے۔
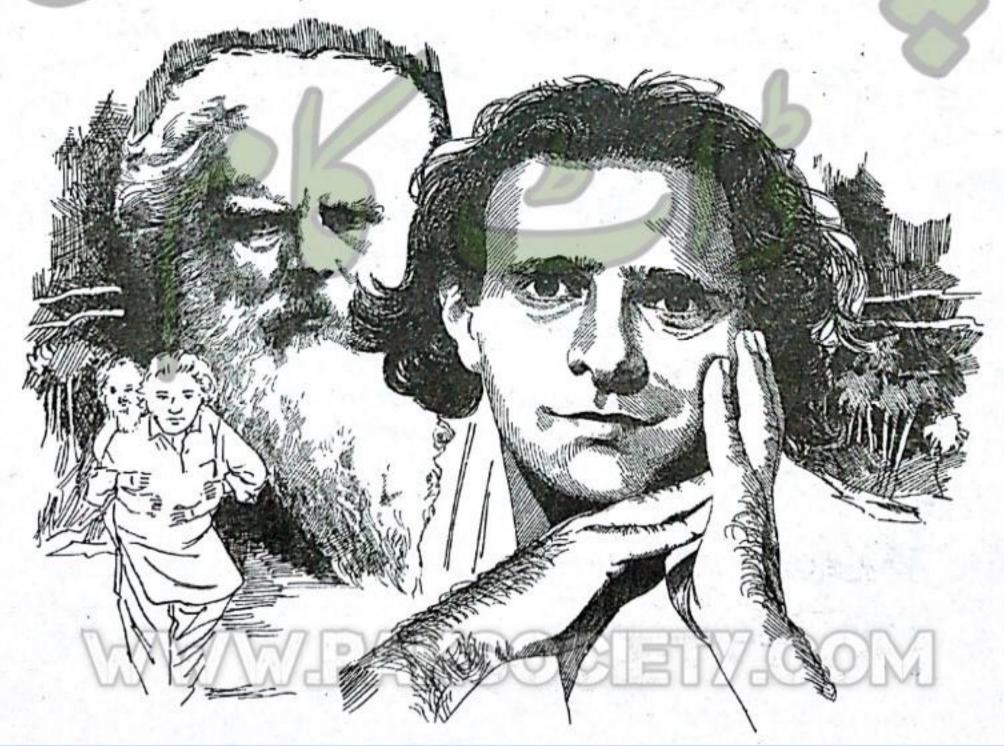
اور حاتم طائی کو قدرت نے توفیق ہی توفیق دے رکھی تھی۔ بہر حال اس دن میں حاتم طائی والے موڈ میں تھا۔ جب وہ بوڑھا مجھے مل گیا۔

وہ ایک شریف صورت انسان تھا۔ سفید داڑھی، سفید بال اور سفید کرتہ پاجامہ۔ دیکھنے ہی سے انتہائی معقول دکھائی دے رہا تھا۔

میں روڈ کراس کر کے دوسری طرف جارہا تھا کہ اس نے میری ایک ٹانگ پکڑ لی۔ ''بھائی! تمہارا بھلا ہو۔ مجھ غریب لاچار کی بات سنتے جاؤ۔''

میں بتا چکا ہوں کہ میں اس وقت حاتم طائی والے موڈ میں تھا۔ اس لیے میں نے اپنی جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔ ''یہ لیں بابا۔''

''ارے نہیں۔'' اس نے میرا ہاتھ ایک طرف ہٹادیا۔ ''بھائی، میں بھکاری نہیں ہوں۔ مجبور ہوں، ساتھ دینے کی بات کررہا ہوں، تم سے بھیک نہیں مانگ رہا۔''

''بتائیں بزرگو، میں کس طرح آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا! بس ایک مہربانی کرو۔ مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر سامنے والے ہوٹل تک لے چلو۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری مہربانی ہوگی۔''

''کاندھوں پر بٹھا کر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، اس میں تمہاری عزت نہیں جائے گی بلکہ تمہاری عزت میں اضافہ ہوجائے گا۔ لوگ تمہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھیں گے کہ تم نے کس طرح کسی معذور کا ساتھ دیا ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اسے کاندھوں پر بٹھا کر لے جاتا تو سچویشن کچھ عجیب ہوجاتی۔ اگر میرا کوئی جاننے والا اس حال میں مجھے دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ حاتم طائی جیسا بننے کا خواب دیکھنا تو اور بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بن کر دکھایا جائے۔ ہوسکتا تھا کہ میرا یہ عمل اخباروں اور ٹی وی کی خبروں کی زینت بن جاتا۔ میری تعریف میں کالم لکھے جاتے کہ انسان ہو تو ایسا ہو...

اس کام میں تو کوئی خامی نہیں تھی۔

بس اس بے چارے کو کاندھوں پر بٹھا کر روڈ کراس کر کے سامنے والے ہوٹل میں لے جا کر بٹھا دیتا۔ اس کے بعد اپنے راستے ہولیتا۔ قدرت مجھے ایک عظیم الشان نیکی کا موقع فراہم کررہی تھی۔ مجھے اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''ٹھیک ہے محترم۔'' میں نے اپنے کندھے جھکائے۔ ''آئیں بیٹھ جائیں۔''

''خوش رہو۔'' وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا کسی طرح کھڑا ہوگیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ میرے کندھوں پر بیٹھ گیا۔ ''بس بیٹا! اب سامنے والے ہوٹل تک۔''

اس کا بوجھ لے کر کھڑے ہونے کی کوشش میں چکرا کر رہ گیا۔ اچھا خاصا وزن تھا اس کا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح کھڑا ہو ہی گیا تھا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ رک رک کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔

میں ان کی پروا کیے بغیر سڑک پر آگیا۔ گاڑیاں آجارہی تھیں لیکن جب انہوں نے یہ تماشا دیکھا کہ ایک شخص ایک بوڑھے کو کندھوں پر بٹھا کر روڈ کراس کروا رہا ہے تو انہوں نے اپنی گاڑیاں روک دیں اور اس دن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ اس قوم میں ابھی انسانیت باقی ہے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی، وغیرہ۔ سامنے والا ہوٹل ایک عام سا ہوٹل تھا۔ جس میں بیٹھنے کے لیے کرسیوں کی جگہ لکڑیوں کی بینچیں بچھی ہوئی تھیں۔

''چلیں قبلہ اتر جائیں۔'' میں نے ایک بینچ کے پاس آکر کہا۔

''نہیں بیٹا، اب ایسا مت کرو۔'' وہ گڑگڑا کر بولا۔ ''اتنا ساتھ دیا ہے تو تھوڑا سا اور ساتھ دو۔''

''کیا مطلب؟'' اب میں کچھ بوکھلا گیا۔ ''اب کیسا ساتھ چاہیے؟''

''بیٹا! پہلے تم بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''اور آپ؟''

''میں تو تمہارے کندھوں پر رہوں گا نا۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اسی طرح بیٹھے بیٹھے چائے پی لیں گے۔''

''کیا بکواس ہے جناب۔'' اب میں اکھڑنے لگا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے بیٹے، شرماؤ نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم کو شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ میرے دل سے تمہارے لیے کتنی دعائیں نکل رہی ہیں۔''

''نکل رہی ہوں گی۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''لیکن میں اب مزید تماشا نہیں بننا چاہتا۔''

''وہ تو بننا ہی پڑے گا۔'' اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہوگیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم اگر مجھے اپنے کندھوں سے اتار سکتے ہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔'' اس نے کہا۔

ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ ہم دونوں کو کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ یہ ان کے لیے بالکل نیا تماشا تھا۔ اچانک مجھے غصہ آ گیا۔

''محترم، آپ اترتے ہیں یا میں یہیں پھینک دوں آپ کو؟'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ کوشش کر کے دیکھ لو۔''

اب تو بات برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ لوگ چاہے مجھے کچھ بھی کہیں۔ اسے کندھوں سے اتارنا ہی تھا۔ میں نے ایک جھٹکا دے کر اسے بینچ پر گرانے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے مجھے کسی آکٹوپس نے جکڑ لیا ہو، اس نے اپنے دونوں گھٹنوں کو میرے گرد اس طرح پھنسا لیا تھا کہ میں کوشش کے باوجود اسے گرا نہیں پا رہا تھا۔ میری سانسیں پھولنے لگی تھیں جبکہ وہ کم بخت کسی بندر کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔

''ارے بابا، اتر جاؤ میرے کندھوں سے۔'' میں نے کہا۔

''پہلے چائے منگواؤ چائے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے بعد سوچوں گا۔''

میں نے بڑی بے بسی سے ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا۔ پھر ایک چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس پر وہ پھر بول پڑا۔ ''نہیں .... یہ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا نہیں ہو سکتا؟''

''یہی کہ میں چائے پیتا رہوں اور تم بیٹھے رہو۔ ایسا نہیں ہو گا۔ تم کو بھی چائے میرے ساتھ پینی ہو گی۔''

کچھ دیر بعد کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ ایک پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور دوسری پیالی میرے کندھے پر بیٹھے ہوئے اس کم بخت بوڑھے کے ہاتھ میں تھی۔

لوگ ہمیں ہنس ہنس کر دیکھ رہے تھے اور دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اس کم بخت کو کیا دیکھتے سب مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بے عزتی ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے جب چائے ختم ہوئی اور میں نے چائے کے پیسے ادا کر دیے تو پھر اس سے التجا کی۔ ''محترم! اب تو کندھوں سے اتر جائیں۔ اب تو چائے بھی پی چکے ہیں۔''

''واہ میاں واہ! بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔''

''کیا مطلب؟ اب میں کیا کروں؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''کم از کم مجھے گھر تک تو پہنچا دو۔'' اس نے کہا۔

''کیا بکواس ہے۔'' میں بھڑک اٹھا۔

''دیکھو، یہ ہوٹل ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''یہاں تماشا بن جاؤ گے۔ تم مجھے باہر لے چلو۔ وہاں جو کچھ کہنا ہو، کہہ دینا۔''

اس کی بات معقول لگی اس لیے میں اسے کندھوں پر اٹھائے ہوٹل سے باہر آ گیا۔ کچھ فاصلے پر آ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ۔ تم کیا بکواس کر رہے تھے؟''

''بری بات۔ اس طرح نہیں بولتے۔'' اس نے کہا۔

''میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ تم مجھے گھر پہنچا دو۔''

''کہاں ہے تمہارا گھر؟''

''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تم چلتے رہو۔ میں تمہیں راستہ بتاتا جاؤں گا۔''

''خدا کے بندے، کیا میں اسی طرح تمہیں کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتا رہوں؟'' میں نے کہا۔

''یہ تو مجبوری ہے تمہاری۔'' وہ ہنس پڑا۔

''کیسی مجبوری؟ میں ابھی تمہیں پھینک رہا ہوں۔''

''دیکھو، پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرو گے تو لوگ کیا کہیں گے کہ ایک مجبور بوڑھے کے ساتھ ایسا ظلم ہو رہا ہے... دوسری بات یہ ہے کہ تم مجھے پھینک نہیں سکتے اور نہ ہی اپنے کندھوں سے اتار سکتے ہو۔ یہ میرا چیلنج ہے۔''

''اب دیکھتا ہوں تجھے بھی اور تیرے چیلنج کو بھی۔''

میں نے جھٹکا دے کر اسے اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ کم بخت تو کسی بلا کی طرح چمٹ گیا تھا۔ اس کے گھٹنوں کے دباؤ سے میری سانسیں بھی بند ہونے لگی تھیں۔

''ارے کم بخت، میری گردن تو چھوڑ۔''

''تو پھر وعدہ کرو کہ مجھے گھر تک پہنچا دو گے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، ہاں...... پہنچا دوں گا، پہنچا دوں گا۔''

میری گردن سے اس کے گھٹنوں کی گرفت ہلکی ہو گئی۔ میری سانسیں بحال ہونے لگیں۔ اپنی ایسی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔

''بس میاں، اب سیدھے سیدھے چلتے رہو۔'' اس نے ہدایت دی۔ ''آگے ایک اسکول آئے گا۔ اس کے ساتھ ایک گلی اندر جاتی ہے۔ بس اسی گلی میں لے لینا۔''

''لیکن وہ اسکول تو یہاں سے بہت دور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں تک جاتے جاتے میری تو حالت خراب ہو جائے گی۔''

''اب کیا، کیا جائے مجبوری ہے۔ میں اپنا گھر قریب تو نہیں لا سکتا۔''

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کروں۔ اس کو تو کندھوں سے پھینکنا بھی میرے لیے محال ہو گیا تھا۔ وہ تو کسی جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔

بہرحال خدا خدا کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ دعا بس یہی تھی کہ میرا کوئی جاننے والا مجھے نہ مل جائے۔ میرا محلہ تو گرچہ یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ محلے کے لوگ باہر بھی تو نکلا کرتے تھے۔

لیکن میری دعائیں کام نہیں آئیں، محلے کا ایک آدمی مل ہی گیا۔

وہ کسی دکان سے نکل کر اچانک اس طرح سامنے آگیا تھا کہ میں اس سے کترا کر نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اور میرے کندھوں پر براجمان ایک بلا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑی تھیں۔

''فہیم بھائی، خیریت تو ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ آپ کے کندھوں پر کون بیٹھا ہے؟''

اس وقت میرے لیے کٹ مرنے اور ڈوب مرنے کا مقام تھا لیکن اس کے بجائے میں نے اسے بتایا۔ ''بھائی! یہ میرے چچا ہیں۔ معذور آدمی ہیں۔ ایک عرصے سے بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ آج ان کا دل چاہا کہ باہر بازار کی سیر کریں تو میں ان کو کندھوں پر بٹھا کر باہر لے آیا ہوں۔''

''واہ فہیم بھائی، آپ نے تو فرمانبرداری اور سعادت مندی کی مثال قائم کر دی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن آج کل تو وہیل چیئر آسانی سے مل جاتی ہے۔ آپ نے اس پر کیوں نہیں بٹھایا؟''

وہ کم بخت تو بال کی کھال نکالنے پر تل گیا تھا اور اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دے پاتا۔ وہ بوڑھا بول پڑا۔ ''... میں تو فہیم سے کہہ رہا تھا کہ وہیل چیئر گھر پر پڑی ہے۔ مجھے اس پر لے چلو۔ اس طرح بازار میں نکلو گے تو تماشا بن جائے گا۔ لیکن یہ کہاں سننے والا ہے۔ کہنے لگا نہیں چاچا، وہیل چیئر پر تو آپ روزانہ بیٹھتے ہیں۔ آج میرے کندھوں پر سواری کریں۔ بس میاں میں بھی مجبور ہو گیا۔''

اس وقت تو دل یہی چاہ رہا تھا کہ کم بخت کی گردن دبا کر ماردوں لیکن کیا کر سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

جبکہ محلے کا وہ آدمی میری ہمت اور سعادت مندی کو سراہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''دیکھا، کس طرح تمہاری جان بچالی۔'' اس نے کہا۔

''خاموش۔'' میں زور سے دہاڑا۔ ''ابے تو کب میری جان چھوڑے گا؟''

''لینگویج پلیز۔'' اس نے کہا۔ ''اس طرح آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ یہ شریفوں کی شان کے خلاف ہے۔''

''اچھا بابا، یہ بتاؤ کہاں ہے تمہارا گھر؟'' میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔

''بس چلتے جاؤ، اسکول آئے گا۔ اس کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو جانا۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔ اس بوجھ کو اٹھائے چلنا ہی پڑا۔ اب تو میں بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کم بخت کا گھر جلدی سے آجائے تاکہ میں اس بوجھ کو اتار پھینکوں۔

اسکول آگیا۔ اس کے ساتھ والی گلی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ثابت ہوئی تھی۔ کم بخت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا مکان گلی کے آخر میں ہے۔

اب میرا یہ حال تھا کہ میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ سانسیں پھول رہی تھیں اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ اسی حالت میں اس کو اتار پھینکنے کا جنون مجھے آگے لیے چلا جا رہا تھا۔

بالآخر ایک مکان کے دروازے پر آکر اس نے کہا۔ ''بس رک جاؤ، میرا گھر آگیا ہے۔''

''خدایا تیرا شکر ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''لیکن میرے گھر پر تو تالا لگا ہوا ہے۔'' اس کی منحوس آواز سنائی دی۔

''تو کیا ہوا گھر تو تمہارا ہے نا۔'' میں نے کہا۔ ''اب جان چھوڑ دو میری، تمہارے پاس گھر کی چابی تو ہوگی؟''

''یہی تو مصیبت ہے کہ میں چابی نہیں رکھتا۔ میری بیوی رکھتی ہے۔ صبح اس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ لگتا ہے وہ ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔''

میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ ''خدا کے بندے، کہاں ہے اس کا میکا؟''

''نہیں، تم وہاں تک مجھے نہیں لے جا سکو گے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا میکا حیدرآباد میں ہے۔''

''اوہ خدا۔'' میں بے ہوش ہونے لگا۔ ''تو پھر کیا کروں تمہارا؟ اپنے کسی پڑوسی کے یہاں چلے جاؤ، میری جان چھوڑو۔''

''یہی تو پرابلم ہے کہ پڑوسیوں سے میرا جھگڑا رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی مجھے ذرا سی دیر کے لیے بھی نہیں رکھے گا۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟ کیا کروں۔'' میں چیخنے لگا۔

''دیکھو، شور مت کرو۔'' اس نے کہا۔ ''ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔''

''تو پھر جلدی بتاؤ۔''

''تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔''

''کیا؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''تو کیا ہوا، تم کہیں نہ کہیں تو رہتے ہی ہو گے۔'' اس نے کہا۔

''ابے کیا بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے۔'' میں بھنا اٹھا۔ ''میں تجھے اپنے گھر، اپنی بیوی بچوں کے سامنے اس حالت میں لے کر جاؤں گا؟''

''تو کیا ہوا۔ اب تو تم مجھے اپنے ہی بدن کا ایک حصہ سمجھ لو۔''

''دیکھو بھائی، تم کیوں میرے لیے عذاب ہو گئے ہو۔ میں نے تو تمہارے ساتھ نیکی کی تھی۔ تم اس نیکی کا کیا صلہ دے رہے ہو۔ خدا کے لیے اتر جاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

''تم چاہے کچھ بھی کہتے رہو۔ میرا اترنا ناممکن ہے۔''

''ابے کیا زندگی بھر کسی کے کندھے پر بیٹھا رہا ہے۔ میری بدبختی سے پہلے بھی تو زندگی گزار ہی رہا ہو گا۔''

''کیوں نہیں، بہت آرام سے تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''پہلے بھی ایک بندے کے کندھے پر تھا۔''

''پھر اس کا پیچھا کیسے چھوڑ دیا؟''

''اس کی موت کے بعد اس کے کندھوں سے اترنا ہی پڑا۔''

''دیکھو بھائی، خدا کے لیے میری پوزیشن کو سمجھو۔'' میں اب باقاعدہ رونے لگا تھا۔ ''میری بیوی ایک پردہ دار عورت ہے۔ میں اس کے سامنے تمہیں کیسے لے جا سکتا ہوں؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میں کسی طرح اسے قائل کر ہی لوں گا۔ بلکہ ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا، جلدی بتاؤ۔''

''میں تمہاری پوزیشن سمجھ رہا ہوں۔ تمہیں اپنے کام کے لیے باہر بھی جانا پڑتا ہو گا۔ آفس بھی جاتے ہو گے۔''

''ہاں، ہاں۔'' میں جلدی جلدی اپنی گردن ہلانے لگا۔

''سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اتنا بے رحم اور پاگل نہیں ہوں کہ کسی کی مجبوری نہ سمجھ سکوں۔''

''تو پھر اتر جاؤ خدا کے لیے۔''

''پہلے میری پوری بات تو سن لو۔''

''اب کیا رہ گیا ہے۔ کیا کہنا ہے؟''
''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم واش روم بھی جاتے ہو گے۔ نہاتے بھی ہو گے اور میں اس وقت تمہارے ساتھ تو نہیں جا سکتا نا۔''
''ہاں، ہاں۔ بالکل، بالکل یہی بات ہے۔''
''تو اس وقت اور گھر سے باہر جاتے ہوئے تم مجھے اپنی بیوی کے کندھوں پر بٹھا دینا۔'' اس نے کہا۔
''کیا؟ ذلیل انسان۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ شرم نہیں آتی ایسی بکواس کرتے ہوئے؟''
''دیکھو میری بات سنو۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔''
''لعنت ہو تجھ پر اور تیرے ایسے مشورے پر۔'' میں نے کہا۔
''تو پھر بتاؤ، کیا کرو گے۔ کیونکہ میں تو اترنے والا ہوں نہیں۔''
''میں تیرا مرڈر کروا دوں گا۔'' میں غصے سے بولا۔ ''میرے کئی جاننے والے ہیں جن کا یہی کام ہے۔ میں انہیں صرف بیس ہزار دوں گا اور وہ تیرا خون کر دیں گے۔''
''چلو، یہ بھی کر کے دیکھ لو۔'' وہ ہنس رہا تھا۔ ''جانتے ہو اس کے بعد کیا ہو گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں مر گیا تو تمہاری گردن مجھ سے چھوٹ جائے گی۔ نہیں، میں اگر مر بھی گیا تو بھی میری لاش تمہارے کندھوں سے چپکی رہے گی۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی میں الگ نہیں ہوں گا اور اس کے بعد جانتے ہو کیا ہو گا؟''
''چل تو ہی بتا دے۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟''
''سامنے کی بات ہے۔ اس کے بعد میری لاش کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی زندہ دفن کر دیا جائے گا۔ یہ مجبوری ہو گی۔ نہ تو قانون کچھ کر سکے گا اور نہ ہی معاشرہ اس بات کی اجازت دے گا کہ تم ایک لاش کو کندھوں پر بٹھائے گھومتے رہو۔ لوگ تمہیں ویسے ہی دفن کر دیں گے۔ کیونکہ میری لاش کی بُو ہر طرف پھیلتی چلی جائے گی، سمجھے۔''
''سمجھ گیا بھائی، سمجھ گیا۔'' میں تقریباً رونے لگا تھا۔ ''خدا کے لیے صرف اتنا بتا دو کہ میں کس طرح تم سے چھٹکارا پا سکتا ہوں۔''
''صرف ایک صورت ہے۔'' اس نے کہا۔
میں اسے دیکھ تو نہیں پا رہا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت مسکرا رہا ہو گا۔ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا ہو گا۔ اس کے مکروہ اور منحوس چہرے پر چمک آ گئی ہو گی۔
''تو پھر بتاؤ، وہ کیا صورت ہو گی؟''

''اوہو بہت جلدی ہے کندھوں سے اتارنے کی؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔
''ہاں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح مجھے بخش دو۔''
''تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں بیماری کی حالت میں مر جاؤں؟'' اس نے کہا۔ ''طبعی موت۔''
''پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟''
''دیکھو، میں اب ساری بات اتنی جلدی تو نہیں بتا سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''اس وقت مجھے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہاری بیوی نے کچھ نہ کچھ پکایا ہو گا۔ پہلے کچھ کھاؤں گا۔ اس کے بعد آرام سے باتیں ہوں گی۔''
''دیکھ بھائی، میرے اوپر رحم کر۔ اس طرح کندھوں پر اٹھائے اٹھائے کیسے جا سکتا ہوں؟''
''میں نے کہا نا کہ اب میں تمہاری مجبوری بن چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''
جی چاہا کہ اس موذی کو کسی درخت کسی کھمبے کسی دیوار سے رگڑ کر رکھ دوں۔
''ایک بات بتاؤ، کیا تم زندگی بھر اسی طرح مجھ پر سوار رہو گے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، جب تک تم مر نہیں جاتے۔ میں اسی طرح رہوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ تو تم نے جان ہی لیا ہے کہ اگر میں مر گیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری لاش تم سے چمٹی رہے گی۔''
''یا خدا، رحم کر مجھ پر۔''
اس کے ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔
''اب چلو، یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔'' اس نے کہا۔ ''اپنے گھر کی طرف چلو۔ بھوک لگ رہی ہے۔''
میں اسے لیے ہوئے کچھ آگے بڑھا اور اسی وقت اس سے نجات کا ایک راستہ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک عوامی استنجا خانہ تھا۔ جیسا عام طور پر شہروں میں ہوا کرتا ہے۔
''سنو، اب تم اتر جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے استنجا کرنا ہے۔''
''تو کیا ہوا؟ مجھے کیوں اتار رہے ہو؟''
''بے شرم انسان۔'' میں غصے سے بھڑک اٹھا۔ ''کیا مطلب ہے تیرا، کیا میں تجھے اٹھا کر استنجا کرنے گھس جاؤں؟''
''تو کیا ہوا۔ اصل میں یہ ساری پرابلم اس لیے ہو رہی ہے کہ تم مجھے خود سے الگ سمجھ رہے ہو۔ اگر تم مجھے اپنے ہی

وجود کا ایک حصہ سمجھ لو۔ تو پھر تمہاری جھجک وغیرہ سب ختم ہو جائے گی۔"

"ایک بات بتا۔ اگر تجھے اس قسم کی کوئی ضرورت پیش آئی تو پھر تو کیا کرے گا؟" میں نے پوچھا۔ "کیا مجھے اپنی غلاظت میں لتھیڑ دے گا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" وہ بہت اطمینان سے بولا۔ "میرے بدن کا سسٹم ہی ایسا ہے کہ اس قسم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ایسا ہی ہے۔ تم نے دیکھ لیا۔ میں اتنی دیر سے تمہارے کندھوں پر سوار ہوں۔ تم نے مجھ سے اس قسم کی کوئی بات سنی۔"

میرے خدا، تو کیا تم انسان نہیں ہو؟"

"انسان ہی ہوں بھائی، لیکن ذرا دوسری قسم کا انسان ہوں۔" اس نے کہا۔ "اب باتیں مت بناؤ، اپنے گھر چلو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اس قسم کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔"

"ہاں، بھوک کی حاجت رہتی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ میری بھوک کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ دل چاہتا ہے کہ ہر وقت کھاتا ہی رہوں۔"

"پھر تو میں تمہیں زہر دے کر مار دوں گا۔" میں جل کر بولا۔

"لگتا ہے تم واقعی مجھ سے اکتا چکے ہو۔" اس بار اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم سے بہت خوش ہوں؟"

"اچھا تو پھر ایسا کرو، تم مجھے اپنا موبائل فون دو۔" اس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"میں اپنے بیٹے کو بلا لیتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس کے آنے کے بعد تمہاری جان مجھ سے چھوٹ جائے گی۔"

"اوہ، یہ بات ہے۔" میں خوش ہوگیا تھا۔ "یہ لو۔" میں نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس کے حوالے کردیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ حالانکہ وہ میرے کندھوں پر سوار تھا۔ اس کے باوجود اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے فون واپس کرتے ہوئے بتایا۔ "میں نے اپنے بیٹے کو یہیں بلا لیا ہے۔ کچھ دیر میں وہ آنے ہی والا ہوگا۔"

میں نے زندگی میں اتنی خوشی محسوس نہیں کی ہوگی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ خوشی اور تشکر کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کا بیٹا وہاں پہنچ گیا۔ اس کا بیٹا اچھا خاصا تگڑا نوجوان تھا۔ "بھائی! اب تم اپنے ابا کو لے جاؤ۔ میں تھک چکا ہوں۔ صبح سے انہیں اٹھائے اٹھائے گھوم رہا ہوں۔"

"ہاں، میں تمہیں ایک بات بتانی تو بھول گیا۔" اس بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میرے بعد میرا یہ بیٹا تمہارے کندھوں پر سوار ہوجائے گا۔" اس نے کہا۔

"کیا بکواس ہے؟ کیا پاگل ہوگئے ہو؟ اب میں اس کو سوار کرالوں؟"

"وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"بیٹے، تم ذرا اس نوجوان کو سمجھا دو کہ معاملہ کیا ہے۔" بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"دیکھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیا چکر ہے۔" اس کے بیٹے نے کہا۔

"چل تو ہی بتادے یہ کیا چکر ہے؟ کیسا خاندان ہے تم لوگوں کا۔ تم میرے کندھوں سے اترنے کا نام کیوں نہیں لے رہے۔"

"چلو بتاؤ۔"

"کیا آپ نے کبھی اپنے سیاست دانوں اور حکمرانوں سے کہا ہے کہ وہ آپ کے کندھوں سے اتر جائیں؟" اس نے پوچھا۔

میں خاموش ہوکر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے پھر کہا۔ "کیا آپ نے کبھی اس بات پر ہنگامہ کیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا کیوں قوم کے کاندھوں پر سوار ہوگیا ہے۔ کیا آپ نے کبھی ان کو اتار پھینکنے کی کوشش کی ہے؟ نہیں کی ہے نا؟ تو پھر میرے بابا کو بھی برداشت کریں اور ان کے بعد مجھے برداشت کریں۔ کیونکہ یہی آپ کا مقدر ہے۔"

وہ بولتا رہا اور میں سوچتا چلا گیا۔ سوچتا چلا گیا۔ آج بھی سوچ رہا ہوں۔ اور آپ بھی سوچیں کیا ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو رہا ہے...(ماخوذ)

کرٹس فیری کی لاش اس جھونپڑی کے دروازے پر پڑی ہوئی تھی جسے وہ اپنا گھر کہا کرتا تھا۔ یہ خستہ حال جگہ گندگی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس کا دروازہ ایک قبضے پر لٹکا ہوا تھا جس کی جالی میں ایک چار فٹ چوڑا شگاف تھا جس کے ذریعے مکان کا اندرونی منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ شیرف میلونی نے اپنے نائبین جنھیں ڈپٹی کہا جاتا ہے، کے ساتھ کھڑے ہو کر جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ یہ لوگ اطلاع ملنے پر ہی وہاں پہنچے تھے اور اب خاموشی سے

ناٹک

بابر نعیم

غیر ضروری گفتگو بعض اوقات بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دیتی ہے... خاموشی... گم صم کیفیت اور متحمل مزاجی اس کے بچائو کا مؤثر ہتھیار تھے... گوروں کے دیس میں بہت کچھ اچھا ہونے کے ساتھ تھوڑا کچھ خراب بھی ہے... چالاک مجرم اور دیانت داری کے دعوے داروں کے درمیان اپنی نوعیت کا منفرد امتحان اور سنسنی خیز ٹکراؤ...

سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ بچاؤ کے نئے رخ دکھلاتی ایک ڈرامے باز کہانی

کھڑے شیرف کے احکامات کا انتظار کر رہے تھے۔ متوفی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بالکل عیاں تھا۔ فیری کو پہلے تشدد کا نشانہ بنایا گیا پھر اس کے چہرے پر دو گولیاں ماری گئیں۔ مقتول کے سر سے بہنے والے خون پر قدموں کے نشانات تھے جو ایک خاص قسم کے جوتے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ میلونی نے اس نمونے کو پہچان لیا۔ یہ ان جوتوں کے تلے سے ملتا جلتا تھا جو اس کے دفتر سے دیے گئے تھے گویا قاتل ایک ایسا شخص تھا جس کا تعلق اس کے دفتر سے ہوسکتا ہے یا پھر ممکن ہے کہ کسی اور کے ہاتھ یہ جوتے لگ گئے ہوں اور اس نے پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے انہیں استعمال کیا ہو۔ اس نے کم روشنی اور فاصلے کے باوجود یہ جان لیا کہ یہ نشانات ساڑھے بارہ نمبر جوتے کے تھے جبکہ وہ خود نو نمبر کا جوتا استعمال کرتا تھا۔

میلونی کافی دیر تک جائے واردات کو دیکھتا رہا۔ جوتوں کے نشانات نے اسے مضطرب کر دیا تھا لیکن وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ابتدائی تفتیش کرنا چاہ رہا تھا لہٰذا وہ اپنے ڈپٹی جیک ہیرس کی جانب متوجہ ہوا جو سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ ہیرس ایک ایسے شخص کی طرح گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جو کسی ناخوشگوار سچ کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔ میلونی نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے اس قابل نفرت شخص کی موت پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا جس کی لاش دروازے میں پڑی تھی بلکہ اس گھبراہٹ کی وجہ کچھ اور تھی۔

''قاتل کوئی بھی ہوسکتا ہے۔'' ہیرس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اسے خود بھی اس پر یقین نہیں ہے۔ ''فیری اتنا برا آدمی تھا کہ بہت سے لوگ اسے مردہ دیکھنا چاہتے ہوں گے۔''

میلونی نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے تفتیشی عملے کو فون کر دیا ہے؟''

''ہاں، میں نے تمہیں اطلاع دینے کے بعد ہی انہیں فون کر دیا تھا۔ وہ چند منٹوں میں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''

''جب وہ آجائیں تو انہیں اس وقت تک روکے رکھنا جب تک میں نہ کہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ہیرس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ بے تکی بات کیوں کر رہا ہے۔ تحقیقاتی ٹیم کیا پکنک منانے کے لیے آرہی تھی لیکن وہ اپنے باس سے بحث نہیں کرسکتا تھا لہٰذا خاموش رہا۔

''تفتیشی افسر کون ہے؟'' میلونی نے پوچھا۔

''گارزا۔ میں نے پہلے ہی اسے فون کر دیا ہے۔''

''نہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس قتل کی تحقیقات ہمارے آدمیوں کے بجائے سی آئی ڈی والے کریں۔ تم ابھی انہیں فون کرو۔''

ہیرس اس عجیب و غریب حکم پر حیران رہ گیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ اس قسم کے کیسز کی ابتدائی تحقیقات شیرف کے دفتر کا تفتیشی عملہ ہی کیا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیرف قواعد و ضوابط سے ہٹ کر ایسے احکامات کیوں جاری کر رہا ہے۔ اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن شیرف کے گھورنے پر اپنا ارادہ بدل دیا۔ شیرف نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کیا پھر رک کر بولا۔

''تمہاری گاڑی میں ثبوت جمع کرنے کا مکمل سامان ہے؟''

''یس۔'' ہیرس نے جواب دیا۔

''اس میں سے ویڈیو کیمرا نکال کر اسے کسی مناسب جگہ پر نصب کر دو اور اسے آن رکھو۔ میں مکمل بصری ریکارڈ چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میلونی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اب اس کا رخ شہر کے مضافات کی جانب تھا جہاں اس کا چیف ڈپٹی رائے ڈاؤنی رہتا تھا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر رائے کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ وہ دعا مانگنے لگا کہ رائے فون اٹھا لے۔ تیسری گھنٹی کے بعد اس نے رائے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''چیف! مجھے اندازہ تھا کہ تم فون کرو گے۔''

''میری تم سے صرف ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔ اگلے دس منٹ تک خودکشی مت کرنا۔''

جواب میں خاموشی رہی۔ میلونی نے کہا۔ ''تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ میں تمہیں ذاتی حیثیت میں فون کر رہا ہوں۔ کم از کم آج رات تم اپنے آپ کو نہیں مار سکتے۔ ہوسکتا ہے میں کوئی راستہ نکال لوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' رائے نے آہستہ سے کہا۔

میلونی نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور بولا۔ ''اور تم مجھے بھی مت مارنا۔ میں تمہاری سڑک پر پہنچ چکا ہوں اور چند لمحوں بعد تمہارے دروازے پر ہوں گا۔''

''میرا سروس ریوالور کچن ٹیبل پر ملے گا۔'' رائے نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میلونی اس کے گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بے دھڑک

اندر چلا گیا۔ رائے میز پر اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا جیسے اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ میز پر اس کا اعشاریہ تین/آٹھ کا پولیس ریوالور اور بیج رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں البتہ کچن کیبنٹ میں لگی ہوئی لائٹ روشن تھی جس کی وجہ سے کمرے کی فضا کچھ پُراسرار ہو گئی تھی۔ میلونی کی نظر دیوار پر لگی تصویر پر گئی۔ جس میں رائے کے ساتھ اس کی جڑواں بہن رینا نظر آ رہی تھی۔ یہ تصویر غالباً کسی کانووکیشن کے موقع پر لی گئی تھی جس میں وہ دونوں گاؤن اور ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں روشن مستقبل کی امید جھلک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میلونی کے ذہن میں وہ تصویریں گردش کرنے لگیں جو رینا کے ساتھ پیش ہونے والے حادثے کے بعد کھینچی گئی تھیں۔

تقریباً تین سال پہلے رینا کا قتل ہوا تھا اور اس کے الزام میں کرٹس فیری کو چند ہی گھنٹوں بعد گرفتار کر لیا گیا جو ادنیٰ درجے کی زندگی گزار رہا تھا اور اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور اس کے پاس سے آلۂ قتل بھی برآمد ہو گیا۔ یہ چاقو رینا کے گھر میں رکھے ہوئے سیٹ جیسا تھا۔ یہ ایک سیدھا سادہ کیس تھا جس میں مزید تفتیش کی ضرورت نہیں تھی۔ فیری کئی ہفتوں سے موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک دن وہ چوری کی غرض سے رینا کے مکان میں داخل ہوا حالانکہ گھر کی روشنیاں جل رہی تھیں اور اسٹیریو پر میوزک چل رہا تھا۔ جس سے گھر میں لوگوں کی موجودگی ظاہر ہوتی تھی۔ اس نے رینا کا پرس چھین لیا جو بعد میں برآمد ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے رینا کو اس بری طرح مارا کہ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا اور لاش کی شناخت کے لیے دانتوں کے ریکارڈ کا سہارا لینا پڑ گیا۔ فیری کو پرس میں سے تیس ڈالر مل سکے۔ جس کے لیے اس نے ایک انسان کی جان لے لی۔ رائے سے یہ دہشت و بربریت برداشت نہ ہو سکی اور وہ شدتِ غم سے تقریباً پاگل ہو گیا۔

بظاہر یہ ایک سیدھا سادہ کیس تھا اور سب یہی سمجھ رہے تھے کہ فیری کو یقینی طور پر موت کی سزا سنائی جائے گی لیکن حیرت انگیز طور پر اس موقع کی نوعیت بدل گئی اور جب جیوری نے سماعت شروع کی تو ملزم کے اعترافی بیان کو قطعی طور پر اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ جج کا خیال تھا کہ وہ ایک کم عقل اور آزاد منش شخص ہے جو اس لڑکی سے ملنے کی خاطر گزشتہ ایک سو پچیس گھنٹوں سے اس کے گھر کے گرد منڈلا رہا تھا۔ ایسے شخص کی ذہنی حالت پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور اس کیفیت میں دیا گیا بیان کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ اسی طرح اس آلۂ قتل کو بھی نظر انداز کر دیا گیا جس کا اس نے اعترافی بیان میں ذکر کیا تھا۔

اس کے باوجود اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی شواہد موجود تھے لیکن اس کے بعد ایک اور دھماکا ہوا۔ پتا چلا کہ ڈی این اے ٹیسٹ کے دوران لیبارٹری میں جراثیم کی موجودگی پائی گئی جس کی وجہ سے تمام نمونوں میں انفیکشن پھیل گیا اور انہیں ناقابلِ قبول قرار دے دیا گیا۔ اس مقدمے کی تین پیشیاں ہوئیں اور تینوں مواقع پر جیوری تقسیم ہو گئی جس کی وجہ سے فیری پر فردِ جرم عائد نہ ہو سکی۔ چنانچہ فیری کو رہا کر دیا گیا۔ اس موقع پر مطالبہ کیا گیا کہ اس مقدمے کی دوبارہ سماعت کی جائے۔ انصاف میں تاخیر کا مطلب یہ نہیں کہ انصاف ہی نہ کیا جائے۔ فیری سزا سے نہیں بچ سکتا لیکن سب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ زیادہ تر لوگوں کو یہی شکایت تھی کہ فیری نے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر ایک خوب صورت لڑکی کو قتل کر دیا اور مقدمے کی ٹیکنیکی خامیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بری ہو گیا۔

☆☆☆

میلونی نے میز پر پڑے ریوالور کی طرف دیکھا اور تائیدی انداز میں بولا۔ ''کیا یہی ہتھیار استعمال کیا گیا تھا؟''

''ہاں اور مجھے اپنے اس فعل پر خوشی ہے۔''

شیرف نے افسوس کرتے ہوئے سوچا کہ یہ تو ایک سیدھا سادہ کیس ہے۔ اس نے رائے کو بغور دیکھا اور آگے بڑھ کر پہلے دایاں اور پھر بایاں ہاتھ تھام لیا۔ دونوں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کی پشت پر سوجن آگئی تھی میلونی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور پوچھا۔ ''کیا تم نے کوئی کند آلہ استعمال کیا تھا؟''

''نہیں، میں نے صرف ان ہاتھوں سے ہی کام لیا۔'' رائے نے جواب دیا اور دونوں ہاتھ ران پر رکھ لیے۔

میلونی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کچن کے برابر میں واقع لانڈری روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس نے رائے سے کہا۔ ''یہاں آؤ؟''

اس نے سنک میں پانی بھرا، اور اس میں اچھی طرح بلیچ ملا دیا اور رائے سے کہا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال دو۔''

''چیف! اس سے کچھ نہیں ہو گا۔'' رائے نے کہا۔ ''ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس پر پردہ نہیں ڈالا

جاسکتا۔"

"تم وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

جب رائے نے بلیچ کے محلول میں اپنے ہاتھ دھو لیے تو میلونی نے پوچھا۔ "کیا اس نے تمہیں نوچا تھا۔ ایسی صورت میں ناخنوں میں کچھ پھنس گیا ہوگا۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے البتہ وہ مجھے ایک پنچ لگانے میں ضرور کامیاب ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے زمین پر گراتا۔"

"تمہارے کپڑوں پر خون کا کوئی دھبا تو نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میلونی نے کچن کی لائٹ جلا دی اور رائے کی وردی کا معائنہ کرنے لگا۔ قمیص کی جیب کے قریب دو سرخ دھبے نظر آرہے تھے۔

"میرے پاس ایک اور قمیص بھی ہے۔" رائے نے کہا۔

"تمہاری وردیاں دفتر سے ایشو ہوتی ہیں۔ اور تم نے ان کے لیے درخواست فارم بھرا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہاں۔"

"تم اس قمیص کو پہنے رہو کیونکہ اسے چھپا نہیں سکتے۔" یہ کہہ کر میلونی نے لحہ بھر کے لیے کچن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اپنا ریوالور اٹھالو۔ ہمیں جانا ہے۔"

شیرف نے اپنی کار کی چھت پر لگی ہوئی فلیش لائٹ آن کیں اور واپس جائے واردات کی طرف روانہ ہوگیا لیکن فیری کے مکان سے ایک میل پہلے اس نے یہ لائٹس بند کردیں اور گاڑی کا رخ ایک نالے کی طرف موڑ لیا۔ اس پر ایک پرانا ساپل بنا ہوا تھا اور گرمیوں میں اس نالے میں پانی کی روانی آہستہ ہوتی تھی۔ آدھا پل طے کرنے کے بعد شیرف نے گاڑی روکی اور رائے سے کہا۔ "ریلنگ کے پاس جا کر یہ ریوالور نالے میں گرا دو۔ یاد رکھو میں نے پھینکنے کے لیے نہیں بلکہ گرانے کے لیے کہا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر انہوں نے اسے برآمد کرلیا تو میری جانب سے گمشدگی کی رپورٹ جھوٹی سمجھی جائے گی اور اس سے مقدمہ مزید خراب ہوجائے گا۔"

"میں نے جو کہا ہے، وہی کرو۔"

رائے کچھ ہچکچاتے ہوئے گاڑی سے اترا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور لحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔ میلونی کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا جب اس نے دیکھا کہ رائے نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی سے لگالی ہے۔ اس کا جی چاہا... رائے کو کسی احمقانہ حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ رائے نے ریوالور نالے میں گرا دیا ہے۔ پانی کی سطح پر ایک چھپا کا ہوا اور ریوالور پانی کی تہ میں چلا گیا۔

رائے گاڑی کی طرف واپس آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ کر نالے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت عجیب بات ہے لیکن جب میں نے فیری کے دروازے پر دستک دی اور وہ باہر آیا تو اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیا کررہا ہوں۔ اگر میں نے اسے ماردیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں نے بالکل بھی اس کے نتائج کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھ میں اور ان کم عقل لوگوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا جنہیں ہم برسوں سے گرفتار کرتے آرہے ہیں۔"

"نہیں، تم ان لوگوں سے مختلف ہو۔ بہت زیادہ مختلف۔" میلونی نے کہا۔

"جب میں نے رینا کے بارے میں سنا اور اس کے بعد قبرستان میں جس دکھ اور تکلیف سے گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آگئی ہے اور میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میلونی نے کہا۔ "میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں، اسے غور سے سنو۔ اب تمہیں اسی پر عمل کرنا ہے۔"

وہ اسے دھیمی آواز میں سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنی گاڑی میں فیری کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے اس نے گاڑی کی چھت پر لگی ہوئی لائٹس دوبارہ آن کردی تھیں اور گاڑی سے اترنے کے بعد بھی انہیں آف نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ انہیں جلتے رہنا چاہیے۔

گاڑی سے اتر کر وہ رائے کے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف بڑھا جس کے چاروں طرف زرد رنگ کا پولیس ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے عملے کی وین اور کرائم سین ٹیکنیشنز نے اسے دیکھ کر دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن میلونی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

ویڈیو کیمرے کے پاس کھڑا ہوا ڈپٹی ہیرس، شیرف کے ساتھ رائے کو دیکھ کر گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ میلونی نے اس سے

پوچھا۔ ''کیا کیمرا اب بھی کام کر رہا ہے؟''

''ہاں۔'' ہیرس نے غیر یقینی انداز میں جواب دیا۔

''کیا یہ مزید آدھا گھنٹے کام کر سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس میں اتنا ٹیپ ہے؟''

''ہاں، یہ کافی دیر کے لیے کافی ہے۔''

''تفتیشی افسر کتنی دیر میں آئیں گے؟''

''انہیں آنے میں مزید ایک گھنٹا لگ سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ انہیں کتنی لمبی مسافت طے کرنا ہوگی۔''

شیرف اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ''رائے اور میں ابتدائی تحقیقات کے لیے اندر جا رہے ہیں۔''

شیرف اور رائے سر جھکا کر ٹیپ کے نیچے سے گزرتے ہوئے لاش کے پاس پہنچے۔ میلونی کو امید تھی کہ ویڈیو کیمرا رائے کے چہرے سے جھلکتی نفرت، خوف اور دہشت کو ریکارڈ نہیں کر سکے گا۔ رائے نے لاش کے پاس پہنچ کر اس کی کروٹ بدلی۔ تاکہ اچھی طرح اس کے چہرے پر لگے ہوئے زخموں کو... دیکھ سکے۔ اسے گولیوں کے خالی خول کی بھی تلاش تھی پھر اس نے لاش کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تاکہ ان زخموں کا معائنہ کر سکے جو مقتول کو اپنے دفاع کے دوران میں لگے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے دروازے کو پہنچنے والے نقصان کا جائزہ لیا اور ایسا کرتے وقت اس کے قدم فرش پر پھیلے ہوئے خون پر پڑے اور اس کے قدموں کے نشانات کنکریٹ کی ڈیوڑھی پر ثبت ہو گئے۔

چند منٹ بعد رائے باہر آیا اور اس نے تصدیق کر دی کہ مرنے والے کو قتل کیا گیا ہے۔ میلونی نے ہیرس کی طرف دیکھا جو مشتبہ انداز میں یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے ڈر رہا ہو کہ اسے بھی کہیں جراثیم نہ لگ جائیں۔ میلونی اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس لاش کی شناخت ہو گئی ہے؟''

ہیرس نے حیران نظروں سے شیرف کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا شیرف نہیں جانتا کہ یہ کون ہے پھر اسے یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کرٹس فیری کی لاش ہے جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔''

''یہ کرٹس فیری ہے؟'' میلونی چلاتے ہوئے بولا۔

ہیرس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں یہ فیری ہی ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''میں پہلی بار یہ بات سن رہا ہوں۔'' میلونی نے غصے سے رائے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نگاہیں دوسرے ڈپٹی کی جانب کر لیں۔ ''تم ڈپٹی رائے سے اس کا سروس ریوالور لے کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دو۔''

ہیرس حکم کی تعمیل میں آگے بڑھا پھر بولا۔ ''اس کے پاس ریوالور نہیں ہے۔''

''تمہارا سروس ریوالور کہاں ہے رائے؟'' میلونی نے پوچھا۔

رائے خاموش کھڑا رہا۔ میلونی نے ہیرس کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال کر میری گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھا دو اور سی آئی ڈی کے آنے تک یہیں ٹھہرے رہو۔''

یہ کہہ کر میلونی اپنے قیدی کو شیرف کے دفتر لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈپارٹمنٹ کے سراغ رساں جون گارزا، اور پال ہوبرن بھی وہاں پہنچ گئے۔ رائے کو ایک تفتیشی کمرے میں بٹھایا گیا اور اس کی ہتھکڑی لوہے کی میز سے باندھ دی گئی۔ دونوں سراغ رساں شیرف کے ساتھ ہی شیشے کی دیوار کے پیچھے بیٹھ گئے اور رائے کو بغور دیکھنے لگے۔

''تم رائے کو کتنی دیر سوچ بچار کا موقع دینا چاہتے ہو؟'' گارزا نے میلونی سے پوچھا۔

یہ ایک معمول کی بات تھی کہ تفتیشی افسر مشتبہ شخص کو سوالات کرنے سے پہلے ایک دو گھنٹے کے لیے تنہا چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ غور کر سکیں کہ ان سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے اور یہ کہ اب ان کا مستقبل کیا ہے۔ ملزم عام طور پر جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور یقیناً شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھے ہوئے کو بھی یہ بات معلوم ہو گی لیکن اس کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ہم فی الحال کچھ کر سکیں گے۔'' ہوبرن نے کہا۔ ''ہمارے درمیان آپس میں جو تعلق ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ مفادات کا ٹکراؤ ہو جائے۔ سی آئی ڈی والے آنے والے ہیں۔ ہمیں یہ کیس ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میلونی نے کہا۔ ''لیکن میں رائے سے چند ابتدائی سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے سچ سچ سب بتا دے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ایک بڑی غلطی کرو گے۔'' گارزا نے کہا۔

''میں نے تمہاری بات نوٹ کر لی۔'' میلونی نے جواب دیا اور چند منٹوں کے لیے وہاں سے غائب ہو گیا۔

جس غلطی کے بارے میں گارزا نے سوچا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی سامنے آگئی جب اس نے میلونی کو تفتیشی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ربر کا پائپ تھا۔ دونوں سراغ رسانوں نے ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھا پھر ہوبرن بولا۔ ''اس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی حال میں اندر نہیں جائے گا۔ انہوں نے دیکھا کہ میلونی نے ویڈیو کیمرا اور آڈیو ریکارڈر آن کر دیے ہیں اور اس میں وقت، تاریخ اور نام بھی درج کر دیے۔

اس کے بعد میلونی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ربر کا پائپ میز پر رکھ دیا۔ رائے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ہنسنے کے لیے مجبور نہ کرو۔''

''تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟''

''نہیں، ہرگز نہیں کارلوس۔''

''تم گزشتہ شب کہاں تھے؟'' میلونی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں اپنے وکیل سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیا تم گزشتہ شب کرٹس فیری کے مکان پر گئے تھے؟''

''تم جانتے ہو کہ میں وہاں تمہارے ساتھ ہی گیا تھا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اپنے وکیل سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں وکیل سے بات کیے بغیر اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالوں گا۔''

''تمہارا سروس ریوالور کہاں ہے؟''

رائے نے نفی میں سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ شیرف کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔

''میں نے تم سے ایک سوال پوچھا ہے۔ تم آن ڈیوٹی ہو پھر تمہارے پاس ریوالور کیوں نہیں ہے؟''

رائے خاموش بیٹھا رہا۔ اچانک ہی میلونی نے ربر پائپ اٹھا کر زور سے میز پر مارا جو رائے کے ہتھکڑی والے ہاتھ سے چند انچ کے فاصلے پر میز سے ٹکرایا۔

''تمہارا ریوالور کہاں ہے؟'' شیرف چلاتے ہوئے بولا۔

شیشے کی دوسری جانب دونوں سراغ رساں مضطرب ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

''میں وکیل سے ملنا چاہتا ہوں۔'' رائے نے ایک مرتبہ پھر اصرار کیا۔

غصے میں مشتعل ہو کر شیرف نے ربر کا پائپ رائے کے ہاتھوں پر مارا۔ اچانک ہی وہ میز پر چڑھ گیا اور بار بار پائپ کو فضا میں لہرانے لگا۔ ''تمہارا ریوالور کہاں ہے؟'' میلونی ربر کا پائپ اس کے کندھوں کے پاس لاتے ہوئے چلایا۔ رائے نے اپنے دفاع میں اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے کچھ مکے لگائے جو شیرف کے جبڑے پر لگے لیکن وہ اس پر غالب آگیا۔ ان دونوں نے دروازے کی ناب پر زور آزمائی کی آواز سنی۔ وہ دونوں سراغ رساں دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میلونی ایک بار پھر پائپ کو نیچے لے کر آیا۔ اس بار رائے نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے بیکن روڈ کے پل پر سے نالے میں پھینک دیا تھا۔''

جیسے ہی گارزا اور ہوبرن اس کے پاس پہنچے تو میلونی نے مارنا بند کر دیا بلکہ اس نے تب بھی کوئی مزاحمت نہیں کی جب ان دونوں نے رائے کو کھینچا اور کمرے سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ گارزا اور ہوبرن گہرے گہرے سانس لے رہے تھے جبکہ میلونی اپنا غصہ نکالنے کے بعد حیرت انگیز طور پر پُرسکون نظر آرہا تھا جبکہ رائے میز پر جھکا ہوا تھا اور اس نے دونوں بازوؤں سے اپنا سر ڈھانپا ہوا تھا۔ میلونی نے سراغ رسانوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ وہاں کیا ہوا تھا؟''

گارزا اور ہوبرن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر گارزا نے کہا۔ ''نہیں، میں نے کسی بات پر غور نہیں کیا۔''

ہوبرن نے شاکی نظروں سے گارزا کو دیکھا۔ اسے اس جھوٹ پر سخت تعجب ہو رہا تھا۔

''تم نے کچھ نہیں دیکھا۔'' شیرف چلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ شیشہ انتہائی شفاف ہے اور اس سے آر پار کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ تم نے قانون کی پاسداری کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟''

''میں نے دیکھا کہ تم ملزم کو مار رہے تھے۔'' گارزا نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ملزم، تمہارا مطلب ہے کہ تمہارا ساتھی افسر رائے ڈاؤنی۔''

''ہاں، میں نے دیکھا کہ تم نے رائے کو مارا۔''

''اور تم نے رائے کو کیا کہتے ہوئے سنا؟''

''اس کا کہنا تھا کہ اس نے ریوالور نالے میں پھینک دیا۔'' گارزا نے جواب دیا اور ہوبرن نے سر ہلا کر اس کی

تائید کی۔

”مجھے بھروسا ہے کہ ہمارے آڈیو ویڈیو آلات اچھی حالت میں ہیں اور اسی طرح کام کرتے رہیں گے۔“

ہوبرن نے ایک بار پھر سر ہلا کر اس کی تائید کی تو میلونی بولا۔ ”سی آئی ڈی افسروں کو فون کر کے بتا دو کہ انہیں ایک غوطہ خور ٹیم کی بھی ضرورت ہوگی جو بیکن روڈ کے پل کے نیچے نالے میں ریوالور تلاش کر سکے۔“ یہ کہہ کر شیرف کمرے سے باہر نکلا اور گھر چلا گیا۔

ٹیکساس اٹارنی جنرل کے دفتر سے تعلق رکھنے والا راجر پوپ وچ، ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، وہ جان گیا تھا کہ اس کیس میں جیتنے کا بہت کم امکان ہے۔ اسی لیے ڈسٹرکٹ اٹارنی نے اسے ریاست کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیبارٹری سے موصول ہونے والی رپورٹ کے مطابق رائے کا اعشاریہ تین/آٹھ کا ریوالور ہی آلۂ قتل کے طور پر شناخت کرلیا گیا تھا۔ جو نالے سے برآمد کرلیا گیا۔ بہرحال اب یہ رپورٹ مکمل طور پر غیر اہم تھی۔ اگر مقامی افسران میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ بتا سکتے تھے کہ یہ رپورٹ کس قدر بے معنی تھی اور اس کو پڑھ کر یوں لگتا تھا کہ آپ چاند کی روشنی خریدنے جا رہے ہیں۔

بیلاسٹک رپورٹ کے علاوہ دوسری اہم چیز وہ ویڈیو تھی جس میں شیرف کو ملزم اور اپنے چیف ڈپٹی کو ربر کے پائپ سے مارتے ہوئے دکھایا گیا۔ اسے دیکھ کر راجر کے رونگٹے کھڑے ہوئے اور اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہت ہی بری فلم دیکھ رہا ہے۔ پوپ وچ نے اٹھارہ سال شکاگو کے اٹارنی آفس میں گزارے تھے اور ایسے کئی کیسز سے واسطہ پڑا تھا جس میں پولیس تشدد کے واقعات سامنے آئے تھے لیکن اس نے کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی شخص پر ربر کا پائپ استعمال کرنے کا الزام لگایا ہو۔

”مجھے تجسس ہے۔“ راجر نے ایک میٹنگ کے دوران شیرف سے کہا تھا۔ ”تمہیں وہ ربر کا پائپ کہاں سے ملا؟ میرا مطلب ہے کہ وہ وہیں کسی کی میز کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس صورت میں تم کسی اور کا نام بھی اعترافی بیان میں شامل کر سکتے ہو۔“

”میں وہ پائپ گیراج سے لے کر آیا تھا۔ اور وہ ریڈی ایٹر کا پائپ بدلنے میں استعمال ہوتا ہے۔“

راجر اٹھ کر گیراج میں گیا اور وہاں سے ایک ویسا ہی ریڈی ایٹر کا پائپ لے کر آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر اس کی چند زوردار ضربیں لگائیں اور محسوس کیا کہ اس سے کافی

استادیاں — ناٹک

ٹیچر۔ اے، بی، سی سناؤ۔“

سردار۔ ”اے، بی، سی۔“

ٹیچر: اور سناؤ۔“

سردار۔ اور اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں۔“

☆☆☆

رزلٹ والے دن ایک دوست، دوسرے سے۔

”یار! میرے والد میرے ساتھ ہیں، تم جا کر میرا رزلٹ پتا کر آؤ، اگر میں ایک مضمون میں فیل ہوا تو آ کر کہنا کہ ایک مسلمان بھائی تمہیں سلام کہہ رہا ہے، اور اگر دو میں فیل ہوا تو کہنا کہ دو مسلمان بھائی تمہیں سلام کہہ رہے ہیں، اس طرح مجھے نتیجہ پتا چل جائے گا۔“

دوست یہ سن کر رزلٹ معلوم کرنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنے دوست سے کہا۔ ”یار! پوری اُمتِ مسلمہ تمہیں سلام کہہ رہی ہے۔“

کبیر والہ سے ماریہ جہانگیر کی سوغات

تکلیف ہوتی ہے۔ پائپ سے لگنے والی ضربیں تکلیف دہ ضرور تھیں لیکن اتنی بھی نہیں کہ ملزم کو قتل کا اعتراف کرنے پر مجبور کر سکیں۔

اچانک ہی انٹرکام کی گھنٹی بجی اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کو بتایا گیا کہ رائے اور اس کا وکیل باہر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ راجر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا رخ اختیار کرتا ہے۔“

رائے نے گہرے زرد رنگ کا قیدیوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی وکیل ویرونیکا روجاس قدرے بھاری بھرکم لیکن خوب صورت چہرے کی مالک تھی اور سبز آنکھوں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، ابتدائی رسمی کلمات کے بعد راجر نے کہنا شروع کیا۔ ”ہمارے پاس تمہارے لیے ایک پیشکش ہے۔ تم جانتے ہو کہ سیکنڈ ڈگری کا قتل ایک ناقابلِ معافی جرم ہے اور اس میں بارہ سال سے لے کر عمر قید تک کی سزا ہو سکتی ہے لیکن ہم سے تعاون کرنے کی صورت میں تمہارے موکل کو بمشکل آٹھ سال جیل میں گزارنا ہوں گے۔ تم آپس میں صلاح مشورہ کر سکتے ہو۔“

”ہمیں مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ویرونیکا نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”ہم یہ پیشکش مسترد کرتے ہیں۔“

''ایسی صورت میں ہم ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ قتل عمد کا کیس ہے اور عدالت سے درخواست کی جائے گی کہ ملزم کو سزائے موت دی جائے۔''

ویرونیکا نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک بے جان مقدمہ ہے۔''

راجر نے میز پر پڑی فائلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس ثبوتوں کا انبار ہے۔''

''مثلاً'' ویرونیکا نے طنزیہ کہا۔

''مقتول کے ساتھ تمہارے موکل کے ذاتی تعلقات کی نوعیت۔ کیا قتل کے لیے یہ وجہ کافی نہیں کہ مقتول نے تمہارے موکل کی بہن کو قتل کیا تھا اور تب سے ہی وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ ہمارے سامنے قتل کا واضح محرک ہے۔''

ویرونیکا نے فیری کے بُرے کردار کا حوالہ دیا تو راجر کو کافی حیرت ہوئی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ویرونیکا نے بڑے مستحکم انداز میں کہا۔ اس قصبے میں درجنوں ایسے لوگ ہوں گے جو فیری کو قتل کرنا چاہتے ہوں۔''

''ممکن ہے لیکن ان کا ڈی این اے، بال اور کپڑوں کے دھاگے لاش پر نہیں پائے گئے اور نہ ہی ان کے خون آلود قدموں کے نشان جائے وقوعہ پر نظر آئے۔''

''ڈپٹی رائے ڈاؤنی اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں شیرف کے ہمراہ وہاں گیا تھا۔ اس نے مقتول کی لاش کو چھوا جس کی وجہ سے اس کے جسم سے جراثیم اور بال وغیرہ لاش پر منتقل ہو گئے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اسے مزید احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ ہاں، اس کے جوتے خون آلود تھے کیونکہ وہ مقتول کے خون پر چلتا ہوا وہاں سے باہر آیا تم اس کی ویڈیو دیکھ سکتے ہو۔''

''ہمارے پاس لیبارٹری رپورٹ بھی ہے۔'' راجر جانتا تھا کہ اس کا ذکر لاحاصل ہے لیکن وہ مخالف وکیل کو دباؤ میں لانا چاہ رہا تھا۔ ''اس رپورٹ کے مطابق تمہارے موکل کا ریوالور ہی آلۂ قتل ہے۔''

''پلیز۔'' ویرونیکا ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

ویرونیکا منہ بند کر کے ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں بتاتی ہوں کہ رائے کے ساتھ کیا ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے اس کے حق سے محروم رکھا گیا۔ سی آئی ڈی ٹیم کے آنے سے پہلے اس سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ رائے بار بار وکیل سے ملاقات پر اصرار کرتا رہا جس کے بعد شیرف پر لازم تھا کہ وہ پوچھ گچھ کا سلسلہ منقطع کر دیتا۔ سب سے اہم اور آخری بات یہ کہ میرے موکل کو ربر کے پائپ سے مارا گیا اور اس سے جبراً بیان لیا گیا جسے رضاکارانہ نہیں کہا جا سکتا جس کا مطلب ہے کہ اس کی گن اور بیان دونوں ہی ثبوت کے زمرے میں نہیں آتے۔ اسے کہتے ہیں زہریلے درخت کا پھل۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی آلۂ قتل نہیں ہے۔''

راجر نے رائے کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کہتے ہو۔ مہلک انجکشن کے مقابلے میں آٹھ سال کی قید ایک اچھا سودا نہیں ہے۔''

''تم مجھ سے بات کرو کونسلر۔'' ویرونیکا نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک بحث کرتے رہے پھر راجر نے آخری پتا پھینکا۔ ''تمہارے پاس کوئی متبادل پیشکش ہے جس کے ذریعے غیر ارادی قتل کا اعتراف کر لیا جائے۔''

''نہیں۔'' ویرونیکا نے فوراً ہی جواب دیا۔ ''مقدمہ واپس لیا جائے ورنہ ہم اس کی فوری سماعت کا مطالبہ کریں گے۔''

اس کے بعد وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور روانہ ہو گئے۔ جس پر قتل کا الزام تھا، اس نے اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ان کے جانے کے بعد راجر نے اپنے سامنے میز پر پھیلی ہوئی فائلوں، ویڈیوز کو دیکھا۔ ویرونیکا روجاس ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ ایک بے جان مقدمہ تھا۔ اس کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا جسے وہ عدالت میں پیش کر سکے۔ یہ سب ناکافی اور ناقابلِ قبول تھا۔ مثلاً ڈی این اے، بال اور خون وغیرہ کیونکہ ملزم بطور آن ڈیوٹی ڈپٹی، جائے وقوعہ پر تفتیش کر رہا تھا اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے منظر کو آلودہ کر دیا۔ رائے کے ہاتھوں پر موجود خراشوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے کسی کو مارا ہے اور ویڈیو میں دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے دفاع میں شیرف کو مکے مار رہا ہے۔ اسی طرح اس کے ہاتھوں پر بارود کے ذرّے بھی نہیں پائے گئے البتہ بلیچ کے نشانات موجود تھے۔ اگر مقدمہ شروع ہو جاتا تو راجر کے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں تھی جس سے وہ ثابت کر سکتا کہ رائے نے صبح سویرے ہی بلیچ سے اپنے ہاتھ دھو لیے تھے۔

جہاں تک آلۂ قتل کا تعلق ہے تو یہ ان میں سب سے

زیادہ پریشان کن تھا۔ ویرونیکا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس ریوالور کو کسی طرح بھی ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ غیر قانونی تفتیش اور تشدد کے ذریعے ملزم سے کہلوایا گیا تھا کہ اس نے اسی ریوالور سے کرٹس فیری کو قتل کیا ہے جبکہ اس میں بالکل بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ رائے نے فیری کو قتل کیا ہے کیونکہ وہ اس کی جڑواں بہن کا قاتل تھا اور اس طرح گویا اس نے اپنے انتقام کی آگ بجھائی لیکن ٹیکنیکلی طور پر اسے ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ راجر نے سوچا۔ ”کسی نہ کسی کو تو جیل جانا ہوگا۔ رائے نہیں تو کوئی اور۔“

”تم بہت ہوشیار نکلے۔“ راجر پوپ وچ نے تین دن بعد شیرف کارلوس میلونی سے کہا۔ ”تمہاری عقل مندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اس کی سزا بھی ملتی ہے لیکن تم نے ایک مختلف طریقہ اختیار کیا اور بڑی ہوشیاری سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ یہ کیس خود ہی اپنی موت آپ مر جائے۔“

کارلوس میلونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راجر سے اس کی ملاقات اتفاقیہ طور پر عدالت میں ہو گئی تھی۔ شیرف کے خلاف الزامات اس وقت تک عدالت میں پیش نہیں کیے گئے تھے لیکن بہت جلد اس کی توقع تھی۔ میلونی نے سادہ لباس یعنی جینز اور کاؤبوائے شرٹ پہن رکھی تھی جو عموماً آوارہ گرد اور لوفر پہنا کرتے ہیں۔

”اور تم نے جس طرح ریوالور پانی میں پھینکا، وہ بھی......“

”سنو، میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جس کا میرے کیس سے کوئی تعلق ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرے خلاف مقدمہ درج ہونے والا ہے۔“

”ہاں، تمہارے خلاف ایک مقدمہ تو بنتا ہے بلکہ ایک سے زائد یعنی انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا، اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے تشدد کرنا اور حقائق جاننے کے بعد سازش کرنا وغیرہ وغیرہ۔ تمہیں لمبے عرصے کے لیے جیل میں رہنا ہوگا۔“

میلونی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ پر صرف ایک الزام عائد کر سکتے ہو اور وہ ہے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے تشدد کرنا اور شاید تم اسے ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ اور جہاں تک دوسرے الزامات کا تعلق ہے تو انہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ اگر سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ مجھے چھ یا آٹھ مہینے کی سزا ہوگی اور ممکن ہے کہ مجھے اس عرصے کے لیے گھر میں ہی نظر بند کر دیا جائے اور میری نقل و حرکت کی نگرانی ایک مانیٹر کے ذریعے ہو اور کیونکہ میرے پاس ایک سو بیس ایکڑ زمین ہے۔ اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہو گی لیکن اس سلسلے میں تمہیں میرے وکیل سے مشورہ کرنا ہوگا اور ویسے بھی میں استعفیٰ دے چکا ہوں۔ اس لیے میری پنشن محفوظ ہے۔“

راجر نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اسے اس شخص کی باتوں کی زیادہ پروا نہیں تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے اور اس کے مقاصد کو سمجھ چکا ہے، تاہم وہ بولا۔ ”تم نے جو کچھ کیا، اس پر تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

شیرف نے لمحہ بھر کے لیے اس سوال پر غور کیا اور بولا۔ ”میں تیس سال سے قانون نافذ کرنے والا افسر ہوں اور اس دوران کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب مجھے اپنے عمل پر پریشانی نہ ہوئی ہو۔ یہ دنیا بڑی ظالم اور سنگ دل ہے اور گو کہ ہم اپنے آپ کو اس سے مختلف سمجھتے ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو ایسا بنانے کے لیے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا۔“

یہ کہہ کر اس نے راجر کی طرف لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن مصلحت کے تحت خاموش رہا۔ اس نے اب تک اپنے پتے بڑی ہوشیاری سے کھیلے تھے اور اب آخری لمحات میں غیر ضروری گفتگو کر کے بنا بنایا کھیل نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ ورنہ وہ راجر کو یہ ضرور بتاتا کہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ قصبے کے تمام لوگ رائے کے احسان مند ہیں کہ اس نے فیری جیسے بدکردار شخص کو جہنم رسید کر کے قصبے کے لوگوں کو اس کی بداعمالیوں سے نجات دلائی ورنہ وہ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے زیادتی کرتا۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارتا اور پھر کسی بھی قانونی سسٹم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بری ہو جاتا۔ میلونی نے یہ ناٹک اسی لیے رچایا تھا کہ اس پر رائے کو بچانے کا الزام نہ آئے لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے منظر نامہ ترتیب دیا۔ ایک طرف اس نے رائے کو گرفتار کر کے اپنا فرض پورا کیا تو دوسری جانب ایسے حالات پیدا کر دیے کہ رائے کے اعترافی بیان کی کوئی اہمیت نہ رہی اور وہ بری ہو گیا۔ اس طرح اس نے رائے کی بالواسطہ مدد کر کے ایک طرح سے اس کا قرض اتار دیا اور اب اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

سودا

سیریناراض

بعض افراد کچھ نہ کچھ کرنے کے عادی ہوتے ہیں... کہیں بھی گئے... کچھ بھی اٹھالیا... اس میں کسی لالچ کا دخل نہیں ہوتا... بلکه وہ اپنی اس عادت سے مجبور ہوتے ہیں... جو بعض اوقات بہت مہنگی پڑجاتی ہے... مظلوم شخص کی اچانک گرفتاری ... خوف ودہشت کی فضا... قیدِ تنہائی... عجیب گومگو کیفیت کا عالم تھا... مقدمے کی سنگینی نے اسے بے طرح مضمحل اور بدحال کررکھا تھا...

ایک معصوم و بے قصور شخص کا المیہ...... اس نے اپنی رہائی کا توڑ ڈھونڈ لیا تھا......
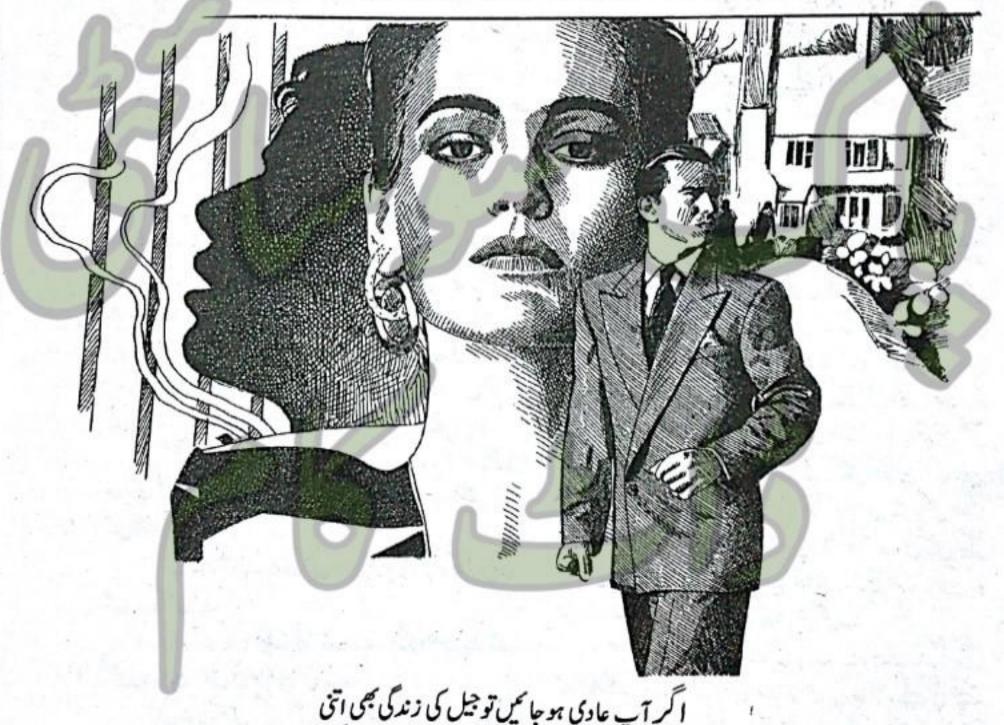
اگر آپ عادی ہو جائیں تو جیل کی زندگی بھی اتنی بُری نہیں ہوتی۔ میری کوٹھڑی میں ایک دوسرا قاتل بھی ہے۔ وہ اپنے حلیے اور لب و لہجے سے خاصا معقول اور شریف نظر آتا ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ جان نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہوگا۔ وہ جیل کی لائبریری میں کام کرتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے تفصیل سے اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اس نے اپنی بیوی کو

قتل کیوں کیا۔ میں اس کی بات سمجھ سکتا ہوں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ اس کی بیوی بوڑھی گھوڑی کے مانند تھی۔ بلکہ وہ مجھے گلوریا جیسی ہی لگی۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ جان نے اپنی مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی محفوظ راستہ اختیار کیوں نہیں کیا لیکن ایسی صورت میں وہ میرے مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے جیل میں موجود نہ ہوتا کیونکہ صرف جان ہی ایک ایسا شخص ہے جو مجھے اس مصیبت سے نکال رہا ہے جس میں ان لوگوں نے مجھے پھنسایا تھا۔

اس دن عدالت میں پیشی کے بعد میں جان گیا تھا کہ انہوں نے یہ سب کیسے کیا اور کس طرح مجھے اس جال میں پھنسایا گیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے اپنی صفائی میں جی پارکر سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جو میرے حساب سے بے کار لیکن مہنگا وکیل تھا۔ وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوتا اور کہتا کہ میرا یہ بیان جیوری کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں۔ وہ اسے ایک خیالی داستان قرار دیتا۔

پہلی ملاقات میں اس نے مجھے سچ بولنے اور انکارِ جرم کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے خلاف تمام ثبوت واقعاتی شہادتوں پر مبنی ہیں۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ قسمت ہمارا ساتھ دے۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو ہمیں پلان بی پر عمل کرنا ہوگا جس کے مطابق اقرارِ جرم کرنے کی صورت میں سزا میں تخفیف کا جواز پیدا کیا جا سکتا تھا اور اس طرح میری سزا آدھی ہو جاتی۔ ”کیسا جواز؟“ میں نے پوچھا۔

”تم عدالت کے روبرو کہو گے کہ تم سے یہ جرم نشے کی حالت میں سرزد ہوا ہے کیونکہ تم اس وقت شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا تھے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس جرم کا اقرار کرلوں جو میں نے نہیں کیا۔“

”صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں سات سال کی سزا ہو سکتی ہے۔“

میں وہ منحوس صبح کبھی نہیں بُھلا سکتا جب میلانی مارگریٹ میری دکان میں داخل ہوئی۔ اس نے نیلے رنگ کا بزنس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے چمکیلے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ باہر ایک بی ایم ڈبلیو کار کھڑی ہوئی تھی جو یقیناً اسی کی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے وہ کار وہاں نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ گزشتہ شب ہی گلوریا سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان طلاق کا مسئلہ چل رہا تھا اور اس سلسلے میں میرا پلڑا بھاری تھا۔ وہ بھی یہ بات جانتی تھی اور اسی لیے اس نے فون پر مجھے گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس کی ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ میرے کاروبار کی مالیت اور اس سے ہونے والی آمدنی اس کی توقع سے بہت کم تھی اور طلاق لینے کی صورت میں اسے خاطر خواہ حصہ نہیں ملتا۔

جب سے میرے قابلِ بھروسا ساتھی اور اکاؤنٹنٹ بینی نے اکاؤنٹس کی تفصیل بھیجی تھی، وہ اسے دیکھ کر ہی چراغ پا ہوگئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے کاروبار کے آدھے حصے کے عوض ایک بڑی نقد رقم اور تاحیات ماہانہ وظیفہ ملتا رہے گا لیکن ان تفصیلات کو دیکھ کر وہ شدید مایوسی کا شکار ہوگئی۔ وہ اپنے اکاؤنٹنٹ کے ساتھ مل کر مجھے دھمکیاں دے رہی تھی لیکن بینی جانتا تھا کہ وہ ان اکاؤنٹس کو کہیں بھی چیلنج نہیں کر سکتی۔ اسی لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم بالکل محفوظ ہیں۔ بس تم اپنے بینک کی کتابیں چھپا کر رکھو۔

گلوریا نے ہمیشہ میری دکان کا مذاق اڑایا۔ وہ اسے کباڑیے کی دکان کہا کرتی تھی جبکہ ایسا نہیں تھا البتہ یہاں اچھی حالت میں پرانی اشیا مناسب قیمتوں پر دستیاب تھیں جن سے شریف اور معزز گھرانوں کا بھرم قائم تھا۔ لیکن گلوریا اور اس کے گھمنڈی دوستوں نے اسے ہمیشہ ہماری پرانے سامان کی دکان کہا۔ نہ جانے وہ کس استحقاق کی بنا پر اسے ہماری دکان کہا کرتی تھی جبکہ اس نے کبھی دکان چلانے میں میری مدد نہیں کی۔ وہ صرف اس وقت وہاں قدم رکھتی جب اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی۔ میں دکان کے اوپر بنے ہوئے جس فلیٹ میں رہ رہا تھا، وہ اس میں بھی حصہ مانگ رہی تھی۔ اسے صرف ایک پاؤنڈ گوشت ہی نہیں بلکہ ایک یا دو بوتل خون بھی چاہیے تھا اور اپنے طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مجھے نچوڑ رہی تھی۔

بہرحال یہ کئی ماہ پہلے کی بات ہے جب مارگریٹ میری دکان میں داخل ہوئی اور اس طرح جائزہ لینے لگی جیسے اس نے یہ جگہ خرید لی ہو۔ میں اسے دیکھ کر دفتر سے باہر آگیا۔ میرے ساتھ دکان پر کام کرنے والا اٹھارہ سالہ لڑکا للی بھی تیزی سے آگے بڑھا لیکن میں نے اسے اشارے سے روک دیا اور اس عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں اسی لیے یہاں آئی ہوں کہ شاید تم میری مدد کر سکو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے ایک بزنس کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا میلانی مارگریٹ،

سالیسٹر اور اوتھ کمشنر اور اس پر لندن وال کا پتا درج تھا۔

”میں ایسے مؤکلوں کے لیے کام کرتی ہوں جو ایک خاص عمر کو پہنچ چکے ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا مکان بیچنے اور نرسنگ ہوم میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں اس کی بہتر نگہداشت ہو سکے گی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے البتہ ایک لے پالک لڑکا ضرور ہے۔ وہ اداکار ہے اور زیادہ وقت بیرونِ ملک گزارتا ہے۔ وہ مکان اس تنہا عورت کے لیے بہت بڑا ہے اور اس نے اپنے آپ کو وہاں غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم برائے فروخت مکانات اور ان کے سامان کی قیمت کا تعین کرتے ہو؟“

”کبھی کبھی۔“ میں نے کہا حالانکہ یہ میرا مستقل ذریعۂ آمدنی تھا۔ اس کام کے دوران مجھے بعض ایسی چیزیں مل جاتیں جن پر کسی کی نظر نہیں جاتی تھی جیسے کوڑے کے ڈھیر میں کوئی قیمتی چیز ہاتھ آ جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا لیکن اکثر اوقات مجھے کامیابی نصیب ہوتی تھی۔ گلوریا کہا کرتی تھی کہ اس طرح کا خطرہ لینا حماقت ہے اور اس کی وجہ سے کسی دن میں بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

”تمہیں میرے بارے میں کیسے علم ہوا؟“

”میں ایک وکیل ہوں اور میرے کافی لوگوں سے تعلقات ہیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ویسے بھی اس کام کے حوالے سے تم کافی مشہور ہو۔ اس لیے مجھے تم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں مشہور تو ہوں لیکن لوگ مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ اس طرح کے کاموں میں ایسا ہوتا ہے۔ آپ ہر ایک کو دوست نہیں بنا سکتے۔

”کیا تم میری مؤکلہ کی جائداد کا سروے کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو؟“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں جائداد کی مالیت کا تخمینہ لگانے کے ساتھ ساتھ اس سامان کو ان نیلام گھروں میں منتقل کرنے کا انتظام بھی کرنا ہو گا جنہیں ہم منتخب کریں۔“

”ٹھیک ہے لیکن کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا کیونکہ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا کہ میں نے ایسے مکان کو خالی کرانے کا معاہدہ کر لیا جہاں سارا سامان بے کار اور ناقابلِ فروخت تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری مؤکلہ کا مکان کہاں ہے؟“

”رچمنڈ میں۔“

”یہ تمہیں مہنگا پڑے گا۔ میں کسی کام کے بغیر رچمنڈ نہیں جاتا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب وہاں جا کر معلوم ہو کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے ناک پُھلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا کہ تمہارا آنا کتنا فائدہ مند ثابت ہوا۔ فرض کرو اگر تمہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا تب بھی ایک معقول فیس کی امید تو ضرور رکھ سکتے ہو۔“

میں نے سر ہلا دیا تو وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے، تم تاریخ بتاؤ؟“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ جلدی سے بولی۔ ”میں اگلے منگل سے پہلے فارغ نہیں ہوں۔“

میں نے کچھ دیر کے لیے سوچا جیسے دل ہی دل میں اپنی مصروفیات کا جائزہ لے رہا ہوں جبکہ میرے پاس فرصت ہی فرصت تھی پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں منگل کو پہنچ جاؤں گا۔ تم بتاؤ کون سا وقت مناسب رہے گا؟“

”شام ساڑھے پانچ بجے۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈائری میں کچھ لکھا اور وہ صفحہ پھاڑ کر میرے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ پتا لکھا ہوا تھا جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ ’مسز وکٹوریہ ہنٹلے، بشپ لاج۔‘

”ہنٹلے۔“ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ”اس کا تعلق بسکٹ بنانے والی فیکٹری سے تو نہیں؟“

اس نے مجھے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے اس طرح کی حماقت جاری رکھی تو ہمارا ساتھ چلنا مشکل ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ناگواری سے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا جسے میں نے جلدی سے تھام لیا اور یہ دیکھ کر خاصا اطمینان ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔

منگل والے روز میں نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا۔ اس کے ساتھ کافی کلر کی قمیص اور سرخ ٹائی خوب میچ کر رہی تھی۔ اپنے ملاقاتیوں کو متاثر کرنے کے لیے کوٹ کی اوپر والی جیب میں سرخ سلک کا رومال بھی اڑس لیا۔ للی حیرت سے مجھے تیار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے متجسس چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک کلائنٹ سے ملنے جا رہا ہوں۔ واپسی آٹھ بجے ہو گی۔“

رچمنڈ جانے والے راستے پر بہت زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ اس وقت عام طور پر وہی لوگ اس سڑک پر سفر کرتے تھے جنہیں شام کو گھر جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا

کہ ایک گھنٹے بعد یہ سڑک سنسان ہو جائے گی۔ مجھے مطلوبہ مکان تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ڈرائیو وے میں مارگریٹ کی بی ایم ڈبلیو دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہوں۔ وہ ایک دو منزلہ مکان تھا جس پر زرد رنگ کیا گیا تھا۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سودے میں مجھے اچھا منافع ہو جائے۔

میں نے اپنی گاڑی ڈرائیو وے کے دوسری جانب کھڑی کی اور فرنٹ ڈور کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وہاں دو چیزیں دیکھیں۔ ان میں مکان کی ایک جانب لگا ہوا الارم جیسا کہ عموماً بینکوں اور شاپنگ مال وغیرہ میں ہوتا ہے اور دوسرا دروازے کے اوپر لگا ہوا ایک ویڈیو کیمرا جس کا رخ عین میری جانب تھا۔ میں فوراً ہی محتاط ہو گیا۔ اب مجھے بہت ہوشیاری سے اپنی کارروائی کرنا تھی۔

میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو مجھے وہاں مارگریٹ کھڑی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا اور نہ ہی وہ میرے سلکی رومال سے متاثر ہوئی، بلکہ رعونت سے بولی۔

''تمہیں آنے میں دیر ہو گئی۔''

میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔ ''گڈ ایوننگ۔''

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ جھنّاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے شہر واپس جانا ہے۔ اندر آجاؤ۔ میں تمہیں اپنی مؤکلہ سے ملواتی ہوں۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے ہال کی جانب بڑھ گیا۔ اندر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن چپے چپے سے دولت کی خوشبو آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گھر میں رہنے والوں کو وراثت میں ٹھیک ٹھاک دولت ملی ہے۔ ہال میں مہاگنی کا بنا ہوا گول زینہ دوسری منزل تک جا رہا تھا اور اس سیڑھی کے نیچے ایک عمر رسیدہ عورت چھڑی پکڑے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ ویلوٹ کا لباس پہن رکھا تھا جس کے کالر پر لیس لگی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں بھی پہن رکھی تھیں جن میں قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ مارگریٹ نے آگے بڑھ کر کہا۔

''مسز ہنٹلے! یہ مسٹر ہوپ کرافٹ ہیں جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔''

''اچھا۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''یہی وہ شخص ہے جو ہمارے معاملات دیکھے گا۔ خوش آمدید مسٹر ہوپ کرافٹ۔''

ہم دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ دوسری بوڑھی عورتوں کی طرح اس کی گرفت بھی بہت مضبوط تھی لیکن ان کے برعکس اس کا ہاتھ خاصا نرم تھا۔ اسے خوب صورت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کا چہرہ بہت متناسب تھا۔

''تمہارے آنے کا بہت شکریہ۔'' اس نے کہا۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔

''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے انکساری سے کہا۔ ''یہ تو میرا کام ہے۔''

مارگریٹ اس دوران بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ بولی۔ ''مسز ہنٹلے! میں مسٹر ہوپ کرافٹ کو بتا چکی ہوں کہ میری شہر میں ایک ضروری میٹنگ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مسٹر ہوپ کرافٹ کو گھر اور سامان کی تفصیلات سے آگاہ کر سکو گی۔''

''ہاں ڈیئر، تم جا سکتی ہو۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میں اور ہوپ کرافٹ آسانی سے بے تکلف ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد مارگریٹ وہاں نہیں رکی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کی کار اسٹارٹ ہونے اور پہیوں کی چرچراہٹ کی آواز سنی۔ اس کے جانے کے بعد میں اور بڑھیا اس گھر میں اکیلے رہ گئے۔

''ڈرائنگ روم میں آجاؤ مسٹر ہوپ کرافٹ! میں اپنی روزمرہ کی خوراک شیری کا ایک گلاس لوں گی اور تم میرا ساتھ دو گے۔ اس کے بعد تم اپنا کام کرنا اور مجھے بتانا کہ تم نے کیا سوچا۔''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ہم ڈرائنگ روم میں چلے گئے جہاں میز پر ایک چاندی کی ٹرے میں مشروب کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''تمہیں ہی تکلیف کرنا ہو گی۔ میرے ہاتھوں میں اب پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔''

''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔'' میں نے کہا اور گلاسوں میں سیال انڈیلنے لگا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور میں نے اس کا گلاس برابر میں رکھی ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

''شکریہ۔'' وہ بولی۔ ''میرے ڈاکٹرز... کا کہنا ہے کہ مجھے نہیں پینا چاہیے لیکن مجھے ایک چھوٹا شیری کا گلاس لے کر خاصی فرحت محسوس ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا اور ہلکے ہلکے چسکیاں لینے لگی۔

''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' اس نے ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

میں نے اسے جو کچھ بتایا اس کا بڑا حصہ جھوٹ اور مبالغہ آرائی پر مبنی تھا اور ایسا کرنا میری مجبوری تھی کیونکہ میں سچ نہیں بول سکتا تھا ورنہ ایک شاندار موقع میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چور نظروں سے کمرے کا جائزہ بھی لینا شروع کر دیا جو قیمتی اشیا سے آراستہ تھا۔ سب سے پہلے میری نظر مینٹل پیس کے اوپر لگے ہوئے وال کلاک پر گئی اور میری ماہرانہ آنکھوں نے دیکھ لیا کہ اس کا شمار انتہائی قیمتی اور قدیم نوادرات میں کیا جا سکتا ہے۔ میں ٹھیک طرح سے تو اندازہ نہیں لگا سکا لیکن وہ غالباً چودھویں یا پندرھویں صدی کا تھا۔ کمرے میں رکھا ہوا فرنیچر بھی لاجواب تھا اور وہاں کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

گو کہ میں نے بہت محتاط رہنے کی کوشش کی تھی لیکن مسز ہنٹلے کی نظروں سے میری یہ حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ چھوٹا سا ذخیرہ پسند آیا ہے لیکن میں تھوڑی سی بے پروا ہوں۔ اسی لیے ان چیزوں کی کوئی فہرست نہیں بنا سکی۔ دراصل یہ سب کچھ میرے والد نے جمع کیا ہے۔ وہ جہاز پر کام کرتے تھے اور اسی وجہ سے میرے والدین نے بہت سفر کیا۔ میں خود بھی سیلون میں پیدا ہوئی تھی جسے اب سری لنکا کہتے ہیں۔ بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن ہمیں ان تبدیلیوں کو قبول کر لینا چاہیے۔"

اس نے شیری کا آخری گھونٹ لیا اور بولی۔ "جانتی ہوں کہ تم ایک مصروف شخص ہو اور مجھے اس طرح کی فضول باتیں کر کے تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تم سارے سامان کی فہرست بنا لو۔"

"یہ ایک معمول کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ ان میں سے بہت کچھ سیدھا نیلام میں چلا جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ بون ہیم اس سامان کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

"کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟ کتنی دلچسپ بات ہے۔"

"جن چیزوں کی انہیں ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے لیے میں خریدار تلاش کر لوں گا۔ تم پریشان مت ہو۔"

"تم سے مل کر مجھے تسلی ہوگئی مسٹر ہوپ کرافٹ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم گھر کا بقیہ حصہ بھی دیکھنا چاہو گے۔"

مجھے پورا مکان دیکھنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ تمام کمرے سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں پورسلین، چاندی اور ہیرے کے زیورات اور تصویریں وغیرہ شامل تھیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہاں تک کہ بیڈ روم میں بھی چھوٹی موٹی کئی قیمتی چیزیں موجود تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور یہ سب کچھ ایک پلیٹ میں رکھ کر میرے حوالے کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اوپر کی منزل پر کچھ کمرے تھے لیکن اس نے مجھے وہ نہیں دکھائے۔ مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی جو کچھ دیکھا وہی میرے لیے بہت تھا۔

جب ہم اپنا کام ختم کر کے ڈرائنگ روم میں واپس آئے تو میری نوٹ بک مکمل طور پر بھر چکی تھی۔ اس نے مجھے گہری نظر سے دیکھا اور بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ایک گلاس شیری کا اور لے لوں۔ کیا تم اسکاچ وہسکی لینا پسند کرو گے۔ میں اسے پسند نہیں کرتی لیکن میرا بیٹا اس کا شوقین ہے۔ اس کے لیے منگوا کر رکھتی ہوں۔"

میں نے گلاسوں میں مشروب ڈالا اور کہا۔ "میں تمہیں سچ بتانا چاہتا ہوں مسز ہنٹلے! آج میں نے جو کچھ کیا وہ صرف سطحی کھرچنے کے برابر ہے۔ مجھے کیمرا لے کر دوبارہ آنا ہوگا تاکہ تمہارے گھر اور سامان کی تصویریں اتار سکوں۔"

"کیمرا!" اس نے تعجب سے پوچھا۔ عین اس وقت کھڑکی سے روشنی کی ایک شعاع اندر آئی اور اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ سورج کی روشنی میں وہ اتنی زیادہ عمر رسیدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے ساتھ وہ شخص بھی آئے گا جو تخمینہ لگانے کا ماہر ہے۔"

"میں سمجھ گئی اور یہ کب ہوگا؟"

"آئندہ دو روز میں۔ اگر تم چاہو تو میں مس مارگریٹ سے وقت طے کر سکتا ہوں۔"

"بہت خوب، مجھے اس وقت خوشی ہوگی جب یہ افسوسناک مرحلہ مکمل ہو جائے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اٹھنا چاہا تو وہ مجھے روکتے ہوئے بولی۔ "براہ مہربانی تھوڑی دیر اور رک جاؤ، ان دنوں بہت کم لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ اس لیے تم سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔"

میں نے اس کی بات مان لی اور ہم دوبارہ بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے لیے شیری اور اپنے لیے اسکاچ کا گلاس تیار کیا اور پھر اس نے اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا جو مر چکا تھا۔ انہوں نے ایک

بیٹا گود لیا کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن وہ بدمعاش نکلا۔ اسے اداکاری کا شوق ہے لیکن وہ ایک کامیاب ایکٹر نہیں بن سکا بس اِدھر اُدھر پھر کر چھوٹے موٹے کردار کرتا رہتا ہے اور جب اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ دوسرے ایکٹرز کے ساتھ دوسرے ملکوں میں چلا جاتا ہے جو اس کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

''میرے لیے اس سے زیادہ مایوسی کی بات کیا ہو گی۔'' وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ انسان کو ہمیشہ وہ سب کچھ نہیں ملتا جو وہ چاہتا ہے۔''

میں تائید میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

اس نے مایوسی سے فضا میں ہتھیلی لہرائی اور بولی۔ ''یہ سب بہت زیادہ ہے۔''

پھر اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ میں نے اوپر کی جیب سے اپنا رومال نکالا اور ایک شریف آدمی کی طرح اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے رومال لے کر آنکھیں صاف کیں لیکن خراب ہونے کے خیال سے ناک نہیں پونچھی اور بولی۔

''سائیڈ بورڈ کی اوپر والی دراز میں ٹشو پیپر کا بکس رکھا ہوا ہے۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اگر تم.....''

میں فوراً اٹھا اور دراز میں سے ڈبا نکال کر اس کے آگے کر دیا۔

''تم بہت مہذب انسان ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اور میں ایک بے وقوف بوڑھی عورت۔'' اس نے مجھے رومال واپس کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں پہلے ہی تمہیں بہت تکلیف دے چکی ہوں۔''

''بالکل نہیں۔'' میں نے بے وقوف بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل بھی تکلیف نہیں ہوئی۔''

''اچھا تو پھر میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔'' اس نے کہا۔ ''آج نیوز ایجنٹ نے میرے گھر ہومز اینڈ گارڈن نہیں ڈالا۔ تم مجھے اگر وہ اخبار لا دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کی دکان زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم واقعی بہت شریف آدمی ہو۔ نیوز ایجنٹ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں بعد میں کسی وقت اس سے نمٹ لوں گی۔ میرا پرس کہاں ہے؟''

اس نے مجھے چند سکے دیے اور بولی۔ ''جب تم واپس آؤ گے تو میں اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے جا چکی ہوں گی، تھوڑی سی کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ دوں گی تاکہ تم اندر آ کر اخبار میز پر رکھ سکو۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''دروازہ کھلا رکھنا عقل مندی نہیں ہے۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں یہاں کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ہم بالکل الگ تھلگ ہیں ویسے بھی یہاں ایسے آلات نصب ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ البتہ سونے سے پہلے میں دروازہ بند کر کے الارم آن کر دیتی ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ایک بار پھر رونا شروع نہ کر دے۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نیوز ایجنٹ کی دکان وہاں سے چند گز کے فاصلے پر ہی تھی۔ جب میں اس کے لیے اخبار لے کر واپس آیا تو مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ میں اندر گیا اور اس کی میز پر اخبار رکھ دیا پھر میں نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن مجھے کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ میں ڈرائنگ روم کی طرف گیا جس کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا البتہ فضا میں اس کے پرفیوم کی مہک بسی ہوئی تھی۔

میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس بڑی میز کی طرف بڑھ گیا جس پر بہت سی چیزیں بے ترتیب حالت میں رکھی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے ابھی انہیں لا کر وہاں پھینکا ہو۔ اس سامان کی واحد فہرست میری جیب میں تھی اور یہ اس سے الگ تھا۔ میں نے ان میں سے صرف دو چیزیں اٹھائیں۔ ایک بلی کی شکل کا بنا ہوا خوب صورت پتھر تھا اور دوسری ناس رکھنے کی ڈبیا جو بہت ہی قیمتی تھی۔ وہ دونوں چیزیں میری جیب میں بڑی آسانی سے آ گئیں۔ گویا ایک طرح سے میں نے اپنے کام کا ایڈوانس پہلے ہی وصول کر لیا۔

وہاں سے نکلتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ اوپر کی منزل سے کوئی آواز آئی ہے۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے آ کر میرا کالر پکڑ لیتی۔ میں دس بجے کے قریب اپنے فلیٹ پہنچا۔ کھانا میں راستے میں ہی کھا چکا تھا۔

میں نے مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آئی وہ دونوں چیزیں مینٹل پیس پر رکھ دیں جہاں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

دوسری صبح بڑی روشن اور چمکیلی تھی جس کا آغاز میرے دروازے پر ہونے والی ایک خوفناک دستک سے ہوا اور دروازہ کھولنے پر ایسا لگا جیسے جہنم کا دروازہ کھل گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی دو پولیس افسر اور تین کانسٹیبل اندر چلے آئے۔ انہوں نے مجھے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر انہوں نے پورے گھر کی تلاشی لی لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا پھر سراغ رساں انسپکٹر کی نظر مینٹل پیس پر رکھی ہوئی پتھر کی بلی پر گئی اور وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔

”اچھا کھلونا ہے۔“

”یہ ایک دوست نے تحفے میں دیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا۔“ اس نے کہا۔ ”اور یہ؟“ اس نے خوب صورت قیمتی ڈبیا کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا اور جیب سے وارنٹ نکال کر دکھا دیا۔ اس نے مجھے بشپ لاج کی مالکن مسز وکٹوریہ بنٹلے کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا جو گزشتہ روز شام پانچ اور سات بجے کے درمیان ہوا تھا۔

”کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو مسٹر ہوپ کرافٹ؟“

میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن اس اچانک پڑنے والی افتاد نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا اس لیے کچھ نہ کہہ سکا۔ انہوں نے مجھے اتنا موقع ضرور دیا کہ میں اپنے پہننے کے لیے کچھ جوڑے رکھ سکوں۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر رسمی کارروائی ہوئی اور انہوں نے مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے کسی وکیل کو فون کرنے کے بجائے اپنے دوست بینی سے رابطہ کیا کیونکہ میرے خیال میں وہی مجھے اس مصیبت سے نکال سکتا تھا۔

بینی نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے کزن بیری سے بات کرے گا جو کئی اچھے وکیلوں کو جانتا ہے۔ آئندہ چند روز میرے لیے بہت کٹھن تھے۔ اس دوران مجھے کئی مرتبہ سراغ رساں چیف انسپکٹر کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ بیری نے میرے لیے جس وکیل کا انتظام کیا اس کا نام ڈینس لیمب تھا۔ شاید وہ میرے لیے اس سے بہتر وکیل تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور نہ ہی یہ سن کر اسے کوئی حیرت ہوئی کہ مجھ پر ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے کا الزام ہے اور یہ کہ میں نے اسے گلا گھونٹ کر مارا ہے بلکہ یہ جان کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا کہ اس کے پاس میرا دفاع کرنے کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے اور جب اسے ثبوتوں کے بارے میں علم ہوا تو اس کے چہرے کی سفیدی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس ویڈیو فوٹیج میں مجھے دونوں مرتبہ گھر میں داخل ہوتے اور باہر آتے دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری مرتبہ باہر آتے ہوئے میری جیب خاصی پھولی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں نے وہ دونوں چیزیں وہیں سے چرائی تھیں۔ اس کے علاوہ اس مکان میں موجود کئی چیزوں پر میری انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ ڈینس کو یہ سب کچھ پسند نہیں آیا کیونکہ یہ سارے ثبوت میرے خلاف تھے۔

ڈینس کی جھنجلاہٹ اس وقت اور بڑھ گئی جب سراغ رساں چیف انسپکٹر نے فارنسک رپورٹ کا حوالہ دیا جس کے مطابق بڑھیا کی موت سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان ہوئی تھی۔

”ہم سب جانتے ہیں کہ فارنسک رپورٹ غلط بھی ہو سکتی ہے۔“ ڈینس نے کہا۔

سراغ رساں چیف انسپکٹر یہ سن کر مسکرانے لگا۔ وہ صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بنیاد پر موت کے وقت کا تعین نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے پاس مقتولہ کی گھڑی کی صورت میں ایک اور ثبوت موجود تھا جو کہ اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کے دوران ٹوٹ گئی تھی اور اس میں سات بج کر تیس منٹ کا وقت ظاہر ہو رہا تھا جبکہ ویڈیو کے مطابق میں آخری بار سات بج کر ستائیس منٹ پر اس مکان سے باہر آیا تھا۔

ڈینس نے مجھ سے تنہائی میں ملنے کی درخواست کی اور اسے یہ موقع دے دیا گیا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ”اقرارِ جرم کر لو۔“

”کیا؟ کیا کر لوں؟“

”اقرارِ جرم۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا جیسے مجھے کھانے کی دعوت دے رہا ہو۔

”کیا تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟“

”ان کے پاس تمہارے جرم کے ثبوت موجود ہیں۔“ اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن یہ قتل میں نے نہیں کیا اور جو جرم مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا اس کا اقرار کیسے کر لوں۔“ میں نے احتجاج کرنے کے انداز میں کہا۔ ”دیکھو، اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو میری اس کیس میں ضمانت کروا دو۔“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تمہیں حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا اور کیس کا فیصلہ ہونے تک تم جیل میں ہی رہو گے۔''

ممکن ہے کہ وہ ایک اچھا وکیل نہ ہو لیکن آنے والے واقعات کی پیش گوئی ضرور کرسکتا تھا۔ اس کا کہنا درست ثابت ہوا اور مجسٹریٹ نے ابتدائی سماعت کے بعد مجھے ریمانڈ کے لیے پولیس کسٹڈی میں دے دیا۔ فرق اتنا ہوا کہ مجھے ایک کوٹھری سے نکال کر دوسری کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ ڈینس نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ وہ مجھ سے ملنے چلا آیا۔

''تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے جارج۔'' اس نے کہا۔

میں نے سر ہلا دیا اور سوچنے لگا کہ جسے وہ اچھی خبر کہہ رہا ہے وہ میرے لیے نیا عذاب ہو۔

''تم یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہو گے۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلایا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ اپنی بات پوری کرلے۔

''پراسیکیوٹر نے تمہارے مقدمے کی سماعت فوراً شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی تاریخ بھی طے ہوگئی ہے۔ آج سے ٹھیک تین ہفتے بعد یہ مقدمہ شروع ہوجائے گا۔''

یہ میرے لیے نہیں بلکہ استغاثہ کے لیے اچھی خبر تھی۔ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا اور وہ اسے ایک آسان کیس سمجھ رہے تھے جس کا فیصلہ ان کی توقع کے مطابق ہونا تھا۔

''اچھا اب مجھے وہ خبر سناؤ جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔''

''میں نے جی پارکر سے بات کرلی ہے۔ وہ اس طرح کے مقدمے لڑنے کا ماہر ہے اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ اس سے رابطہ ہوگیا۔ میں اسے اگلے ہفتے مقدمے سے متعلق تفصیلات فراہم کردوں گا۔ ابھی تو میں نے اسے مختصراً بتایا ہے اور وہ اس بارے میں بہت پُرامید ہے۔ خاص طور پر جب میں نے اسے بتایا کہ تمہارے خلاف تمام ثبوت واقعاتی نوعیت کے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ مطمئن ہوگیا۔''

''لیکن وہ تو بہت مہنگا ہوگا؟''

''اگر تم اس طرح اپنے کیس کا دفاع کرو تو واقعی یہ تمہیں مہنگا پڑسکتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ یہ رعایت کرسکتا ہوں کہ جب ہم یہ مقدمہ جیت جائیں تو تم ہمارا حصہ دے دینا۔''

اس کے بعد مقدمہ شروع ہونے سے پہلے وہ دو مرتبہ مجھ سے ملنے آیا۔ دوسری بار وہ میرے لیے کچھ کپڑے لے کر آیا جنہیں پہن کر مجھے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ یہاں بھی قسمت نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ وہی سوٹ لے کر آگیا جسے پہن کر میں بوڑھی عورت سے ملنے گیا تھا۔

''تم یہ سوٹ کیوں لے آئے۔ اگر انہوں نے اس روز کی ویڈیو دیکھ لی تو میں اس میں یہی سوٹ پہنے ہوئے نظر آؤں گا۔ یہ بات ہمارے خلاف بھی جاسکتی ہے۔''

''مسٹر۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری الماری میں یہی ایک ڈھنگ کا سوٹ تھا۔ باقی سارے سوٹوں کو ڈرائی کلیننگ کی ضرورت ہے۔ کیا تم نے اپنے کپڑے کبھی ڈرائی کلین نہیں کروائے۔ تم اتنے مفلس بھی نہیں ہو۔ ان گندے کپڑوں کی وجہ سے تمہاری الماری میں ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اس لیے مجھے کمرے کی دو کھڑکیاں کھولنا پڑیں۔''

اس نے مجھے قائل کرلیا کہ یہی سوٹ پہن کر عدالت میں جاؤں۔ اس سے میرا ایک اچھا تاثر قائم ہوگا گو کہ اس کی اوپر والی جیب سے سلک کا رومال بھی تھوڑا سا باہر نکلا ہوا تھا جسے اس نے اوچھا پن قرار دیا۔ چنانچہ اس کے کہنے پر میں نے وہ رومال سائڈ پاکٹ میں رکھ لیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

اگلی مرتبہ وہ مجھے عدالت نمبر تین میں ملا۔ جی پارکر بھی وہاں موجود تھا اور سرگوشیوں میں اپنی خوب صورت معاون سے باتیں کررہا تھا۔ ڈینس نے جو اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا مجھے دیکھا اور آنکھیں جھپکائیں پھر اس نے اپنا انگوٹھا فضا میں لہرایا جیسے میں کسی تقریب میں شرکت کرنے آیا تھا۔ عدالت میں توقع کے برخلاف کافی لوگ موجود تھے۔ حالانکہ یہ ایک عام سا قتل کا مقدمہ تھا لیکن مقتولہ ایک امیر بوڑھی عورت تھی جس کی وجہ سے لوگ اس مقدمے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ بنی اور میرے کچھ کاروباری دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے گلوریا کو دیکھ کر ہوئی۔ شاید وہ مجھے نیچا دکھانے اور آنے والی فتح کی خوشی کا پیشگی اظہار کرنے آئی تھی۔ اسے اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ وہ ایک قاتل کی سابق بیوی کی حیثیت سے پہچانی جائے گی۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ مقدمے کی کارروائی شفاف نہیں تھی جیسا کہ اکثر سزا یافتہ مجرم شکایت کرتے ہیں۔ تاہم توقع کے خلاف اس میں کچھ تیزی محسوس ہوئی اور اسے بڑی تیزی سے نمٹا دیا گیا۔ درحقیقت یہاں سارے فضول لوگ جمع ہوگئے تھے جن میں پیٹالوجسٹ مولوینی اور اس جیسے دوسرے لوگ شامل تھے۔ میرے نام نہاد وکلا کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ جی پارکر

نے مایوس کیا جو پوری کارروائی کے دوران ایک لفظ بھی نہیں بولا جبکہ میں امید کر رہا تھا کہ وہ بھی دوسرے وکیلوں کی طرح ہر پانچ منٹ بعد اچھل اچھل کر چلائے گا اور آبجیکشن می لارڈ، کا نعرہ لگائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ لہٰذا اس مقدمے میں میری دلچسپی بالکل ختم ہوگئی اور میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا۔

پھر مارگریٹ کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا تو میں بھی چوکنا ہوگیا۔ اس کی گواہی میرے لیے بہت اہم تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے گلے پر نامعقول قسم کی سفید لیس لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں اس پر جمادیں۔ اسی طرح عدالت میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئے لیکن اس کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ مسز ٹیطلے کے لیے کام کر رہی تھی اور کس طرح اس نے انسان کے روپ میں ایک شیطان کو مسز ٹیطلے سے متعارف کروایا تھا اور وہ اس غلطی پر اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اس نے اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اسی نے جیوفرے کے ساتھ اس بوڑھی عورت کی لاش دریافت کی تھی جو حال ہی میں بیرونی سفر سے واپس آیا ہے۔ وہ دونوں وقوعے کے دوسرے روز اکٹھے رچمنڈ گئے تھے۔ انہیں گھر میں داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ جیوفرے کے پاس مکان کی ایک اور چابی تھی۔

جج پارکر نے اس پر کوئی جرح نہیں کی، البتہ بے دلی سے چند سوالات ضرور کیے جن کا اس نے انتہائی سردمہری سے جواب دیا جس سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لہٰذا اس نے اسے فضول جان کر مزید کوشش ترک کردی۔ اس کے بعد ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ شاید وہاں پر موجود دوسرے لوگوں نے اس پر توجہ نہ دی ہو لیکن میری نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ مارگریٹ جب عدالت کے کمرے سے باہر جارہی تھی تو میری نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ باہر نکلتے وقت اس نے گیلری میں بیٹھی ہوئی گلوریا کی طرف دیکھا اور مجھے ایسا لگا کہ دونوں کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا ہو۔ گلوریا دھیرے سے مسکرائی اور اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلا دیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ یہ ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی لیکن اب جان گیا تھا۔ نہ جانے مارگریٹ کی اس حرکت کا مقصد کیا تھا اور نہ جانے کوئی مقصد تھا بھی یا نہیں لیکن میرے پاس یہ سوچنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ کیونکہ جیوفرے کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جارہا تھا۔ وہ ایک ایکٹر تھا اور اسے اس بوڑھی مہربان عورت نے گود لیا ہوا تھا لیکن اسے دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا اور کسی طرح بھی ایکٹر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بڑی شان سے گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ اس نے خوب صورت براؤن ویلوٹ کا سوٹ اور ارغوانی رنگ کی قمیص کے ساتھ سلک کی بولگا رکھی تھی۔ اس کا حلیہ ایسا تھا کہ وکیل استغاثہ بھی اسے پیش کرتے ہوئے کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ آپ پہلے سے تیار پڈنگ میں مزید انڈے ڈال دیں۔ وہ صرف اتنا ہی بتا سکا کہ اس نے مارگریٹ کے ساتھ کس طرح لاش دیکھی۔ وکیل نے اس کی زندگی اور قابلِ احترام منہ بولی ماں کے بارے میں کچھ غیر اہم سوالات بھی کیے جبکہ میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال سر ابھار رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا ہے، ٹیلی وژن پر؟

پھر وہ سنہری موقع آگیا جب میرا اعتماد دوبارہ بحال ہوا۔ وکیل نے اس سے اس کے گزشتہ غیر ملکی دورے کے بارے میں ایک غیر اہم اور فضول سوال کیا اور تبھی ایک معجزہ رونما ہوا۔ سورج کی روشنی کی لکیر کھڑکی کے شیشے سے اندر آئی اور سیدھی جیوفرے کے چہرے پر پڑی۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلی سے اپنی بھویں سہلانے لگا اور تبھی مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ وہ مجھے وکٹورین ہاؤس میں ویلویٹ کا سوٹ پہنے ہوئے دکھائی دیا تھا۔

میرے ذہن میں ایک زوردار جھماکا ہوا، اور میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ ان سب نے مل کر کیا کھیل کھیلا اور کس طرح یہ سب کچھ ہوا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے دو تیز رفتار ٹرینیں آپس میں ٹکرائیں، میں جان گیا تھا کہ کیا ہوا، کیسے ہوا، اور کس نے کیا۔ عین اس وقت جب میرے ذہن میں یہ فلم چل رہی تھی کھانے کا وقفہ ہوگیا اور اس طرح مجھے موقع مل گیا کہ اس بارے میں سوچوں اور فیصلہ کروں کہ مجھے کیا کرنا ہے اگر مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ کھانے کے وقفے کے دوران میں ان کے منصوبے کو سراہتا رہا جو کہ انتہائی سادہ اور بہت ہی شاندار تھا۔

دراصل وہ فضول سا اداکار جیوفرے اپنی منہ بولی ماں کے مرنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ چنانچہ وہ

مارگریٹ سے مل گیا جسے مسز ہنٹلے نے اپنی جائداد اور اثاثے فروخت کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ جیوفرے جانتا تھا کہ اگر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو اس کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ بڑھیا ان اثاثوں سے فروخت ہونے والی رقم ٹرسٹ کو منتقل کردے گی جہاں سے اس کے نرسنگ ہوم کے اخراجات پورے ہوتے رہیں گے چنانچہ اس نے مارگریٹ کے ساتھ مل کر مسز ہنٹلے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تیار کیا اور اس کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ قربانی کا بکرا بنانے کے لیے مجھ جیسا ایک بے وقوف تلاش کیا جائے۔

مارگریٹ مجھے ورغلا کر اس بوڑھی عورت سے ملوانے لے گئی اور ویڈیو کیمرے نے یہ منظر محفوظ کرلیا پھر وہ مجھے وہاں چھوڑ کر کسی ضروری کام کے بہانے روانہ ہوگئی۔ البتہ اس نے یہ انتظام کرلیا تھا کہ جیوفرے، ڈرائنگ روم کی شاندار فرانسیسی کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوتا کہ مرکزی دروازے پر لگے کیمرے کی زد سے محفوظ رہے۔ جیوفرے نے بڑی مہارت سے بڑھیا کا روپ دھارا جبکہ اصلی مسز ہنٹلے اوپر کی منزل پر تھی اور شاید اسے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ اس نے مجھے پورے گھر میں پھرنے اور جگہ جگہ اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑنے کا موقع دیا اور پھر مجھے اخبار لینے کے لیے بھیج دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے واپس جانے کا وقت وہی ہوگا جب اوپر کی منزل میں اصلی مسز ہنٹلے کا گلا گھونٹا گیا اور انہوں نے مجھ جیسے احمق شخص کا انتخاب کیا جس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ جاتے وقت کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کرلے جائے گا۔

یہ سب واقعاتی شہادتیں تھیں لیکن میری گردن پوری طرح پھنس رہی تھی۔ استغاثہ کی کہانی کے مطابق جب میں اخبار لے کر واپس آیا تو میں نے جاتے وقت دو نادر اور قیمتی اشیا اٹھالیں۔ عین اسی وقت مسز ہنٹلے وہاں آگئی اور میری یہ حرکت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور میرے جارحانہ عزائم دیکھ کر اپنے آپ کو بچانے کے لیے اوپر کی جانب بھاگی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور بستر پر گرا کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کشمکش میں اس کی گھڑی بھی ٹوٹ گئی۔

بظاہر اس منصوبے میں جیوفرے اور مارگریٹ ہی شامل تھے لیکن انہیں ایک تیسرے فرد کی معاونت بھی حاصل تھی جس کے ذریعے وہ مجھ تک پہنچے۔ انہیں ایک ایسے بے وقوف شخص کی ضرورت تھی جو ان کے منصوبے کے مطابق عمل کرسکے۔ ایک ایسا شخص جو جائداد اور نوادرات کی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھتا ہو اور نظر بچا کر نادر اشیا پر ہاتھ صاف کرسکے۔ انہیں یقین تھا کہ میں اس کام کے لیے انتہائی موزوں ہوں لیکن یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہوئی۔ اس معاملے میں گلوریا نے ان کی مدد کی اور انہیں بتایا کہ ان کا مطلوبہ شخص میں ہی ہوں۔

تھوڑی سی ذہنی مشقت کے بعد یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ مارگریٹ اور گلوریا آپس میں دوست تھیں۔ انہوں نے جس طرح عدالت میں ایک دوسرے کو دیکھا اس سے یہ بات عیاں ہوگئی تھی پھر مجھے یاد آیا کہ جب مارگریٹ پہلی بار مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اس کی کار کی ڈکی میں گلوریا کا اسپورٹس بیگ دیکھا تھا لیکن اس وقت میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس کا مطلب تھا کہ گلوریا اور مارگریٹ دونوں ایک ہی کلب کی ممبر تھیں اور گلوریا نے یہ سوچ کر اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی ہوگی کہ میرے جیل جانے کے بعد وہ میری دکان کی پوری مالک بن جائے۔ گویا سب اپنے اپنے مفادات کے تحت اس منصوبے میں شریک تھے۔

اب پورا منصوبہ مجھ پر عیاں ہوچکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا اسکرپٹ میں نے ہی لکھا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ کوئی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اور اگر میں نے کسی کے سامنے یہ کہانی بیان کی تو سب اسے سن کر قہقہے لگائیں گے کیونکہ اس کہانی کو سچ ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ آخری بات میرے ذہن میں یہ آئی کہ اگر میں نے اس کہانی پر اصرار کیا تو مقدمہ خواہ مخواہ طول پکڑے گا جس سے جج اور جیوری کے ارکان جھنجلاہٹ کا شکار ہوسکتے ہیں۔

جب میں نے جمی پارکر کو بتایا کہ میں اقرارِ جرم کر کے سزا میں کمی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں تو اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی بلکہ وہ پُرسکون نظر آنے لگا۔ اس نے کہا کہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے اور اس کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔ اس کا کہنا صحیح تھا جب لنچ کے وقفے کے بعد مقدمے کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو اس نے میری طرف سے معافی کی درخواست دائر کردی۔ اس کے بعد مقدمے کی مزید کارروائی روک دی گئی۔ جج نے اظہارِ ناراضی کے طور پر چند جملے ادا کیے کہ اگر میں پہلے ہی اقرارِ جرم کرلیتا تو عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہ ہوتا۔

مجھے چھ سال کی سزا سنائی گئی جو جمی کے خیال میں انتہائی مناسب تھی۔ اس کے بعد مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ اب مجھے سوٹ کی جگہ قیدیوں والا لباس پہننا تھا۔ مجھے بتایا گیا

کہ یہ سوٹ اور میری دوسری ذاتی اشیا جیل کے مال خانے میں محفوظ رہیں گی۔ جس کوٹھری میں مجھے رکھا گیا وہاں جان پہلے سے مقیم تھا۔ وہ خاصا کم گو واقع ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا واسطہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا جو اپنی فضول گوئی سے میرا دماغ کھاتا اور ہر وقت اپنی فضول باتیں میرے کانوں میں انڈیلتا رہتا۔ مثلاً اس نے کیسی زندگی گزاری۔ وہ کیا کرتا تھا اور اس کی فیملی میں کون کون ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرا خیال ہے کہ برطانیہ کی جیلوں میں زیادہ تر تشدد کے واقعات اسی وجہ سے ہوتے ہیں جب آپ کو تئیس گھنٹے اسی طرح کی بکواس سننے کو ملے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ کو کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے جو اپنی زبان ایک منٹ کے لیے بھی بند نہیں کرسکتا۔

لیکن جان پہلے دن سے ہی میرے ساتھ بہت اچھا رہا۔ وہ ہر وقت میرے کان نہیں کھاتا بلکہ اسی وقت بات کر کے خوش ہوتا ہے جب کوئی اور ایسا چاہے۔ دراصل باتیں کرنے کے لیے بھی کوئی موضوع چاہیے۔ عام طور پر لوگ کھیلوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں لیکن مجھے اور جان کو کرکٹ، فٹ بال یا کسی اور کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لہٰذا ہمارے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔

جان نے مجھے اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ بتایا۔ گلوریا اس کے مقابلے میں آدھی بھی نہیں تھی اور ایک وقت ایسا آیا کہ بیوی کا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا چنانچہ اس نے غصے کے عالم میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ تمام شہادتیں اس کے خلاف تھیں بلکہ اس کے گھر والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی اپنی بیوی سے نفرت کرتا تھا اور اس نے ایک منصوبہ بندی کے تحت اسے قتل کیا۔ عدالت نے اسے چودہ سال قید کی سزا سنائی تھی۔

اس نے میری کہانی بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنی۔ وہ دیوار سے لگے ہوئے تختے پر لیٹا ہوا غور سے سن رہا تھا اور اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی ان کی مہارت سے متاثر ہوا تھا۔ شاید اسے تھوڑا سا حسد بھی ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر اسے تھوڑا سا وقت مل جاتا تو وہ بھی اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایسا ہی منصوبہ بنا سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کئی سوالات پوچھے اور میں نے اسے تفصیل سے ایک ایک بات بتائی کہ کس وقت کیا ہوا؟ کس نے کیا کیا؟ کون کہاں گیا اور جب میں گرفتار ہوا تو اس کے بعد کیا ہوا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا

کترنیں

ایک شخص ڈاکٹر کے پاس آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ ''کیا مریض آم کھا سکتا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے ہاں میں جواب دیا تو وہ چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا اور پوچھا۔ ''کیا مریض سیب کھا سکتا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے پھر سے ہاں میں جواب دیا اور وہ چلا گیا۔ ایک دفعہ وہ پھر سے آیا اور پوچھا۔ ''کیا مریض کیلے کھا سکتا ہے؟'' ڈاکٹر نے طیش میں آ کر کہا۔ ''مریض ہر شے کھا سکتا ہے، پر میرا دماغ نہیں۔''

☆☆☆

ایک بادشاہ نے اپنی بیگم سے سوال کیا۔
''بیگم صاحبہ آپ کو سب سے زیادہ کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟''
بیگم نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت مجھے سب سے زیادہ ڈر تو چوہوں سے لگتا ہے۔'' بیگم پھر خاموش ہو گئیں۔
چند لمحوں بعد بیگم بولیں۔ ''بادشاہ سلامت آپ کو کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟''
بادشاہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''معاف کریں بیگم صاحبہ اگر یہ بتاؤں گا تو پھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔''

☆☆☆

ایک بچے سے ایک شخص نے سوال کیا۔ ''بیٹا آپ کو سب سے زیادہ گھر میں کون پیار کرتا ہے؟''
بچے نے سوچ کر جواب دیا۔ ''کوئی نہیں گھر والوں میں سے تو کوئی پیار نہیں کرتا البتہ ہمارے ماسٹر صاحب بڑا پیار کرتے ہیں۔''
شخص نے حیران ہو کر کہا۔ ''وہ کیسے؟''
بچے نے جواب دیا۔ ''وہ اس طرح کہ میرے والد صاحب کہتے ہیں کہ جو آپ کو سب سے زیادہ مارے وہی آپ سے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔''

جام پور سے عثمان راشد کا تعاون

دیا کہ مقدمے کی پیشی کے دوران میں نے کیا پہن رکھا تھا۔

مجھے وہ کہانی دہراتے ہوئے تیسری رات تھی جب وہ اچانک ہی بستر سے اٹھ بیٹھا اور تکیے کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ ''ان سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی جارج! واقعی بہت بڑی غلطی بلکہ یہ قصور اس کا ہے۔''

''کون، تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی، اس کا بھتیجا۔''

''تم اس کے لے پالک بیٹے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہی۔''

پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ بڑی غلطی کیا تھی اور میں کس طرح اس مصیبت سے نکل سکتا ہوں۔ اس نے مارگریٹ کو خط لکھنے میں میری مدد کی بلکہ لائبریری میں موجود انٹرنیٹ سے اس کا پتا بھی معلوم کر لیا۔ لہٰذا ہم نے اسے خط لکھا اور اب اس کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جواب ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جب مارگریٹ کو معلوم ہوگا کہ میرا سوٹ قید خانے کے اسٹور میں محفوظ ہے جہاں سب نئے آنے والے قیدیوں کے کپڑے رکھے جاتے ہیں اور سوٹ کی جیب میں ایک سلک کا رومال رکھا ہوا ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ رومال میرا ہے جس سے نقلی مسز ہٹلے (جیوفرے) نے اپنے اصلی آنسو صاف کیے تھے۔ مارگریٹ کو کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میں یہ بات ڈینس کو بتاؤں، وہ جی پارکر سے بات کرے اور پھر یہ معاملہ قانون کے رکھوالوں تک پہنچ جائے۔

پولیس، سراغ رساں، تفتیشی افسر، وکیلِ استغاثہ اور جیوری کے ارکان یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ میرے رومال پر جیوفرے کے ڈی این اے کے نشانات کیسے آگئے۔ جس سے میں پہلے کبھی نہیں ملا۔ کبھی مل بھی نہیں سکتا تھا پھر میرا رومال اس کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ جان کے کہنے کے مطابق یہ نشانات میرے لیے سونے سے زیادہ قیمتی تھے۔ اس کے بعد بلی خود ہی تھیلی سے باہر آجائے گی اور انہیں میری کہانی پر یقین آجائے گا کہ جیوفرے مجھ سے پہلے ہی کھڑکی کے راستے مسز ہٹلے کے مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کسی بہانے نشہ آور دوا پلا کر اپنی منہ بولی ماں کو بے ہوش کیا اور خود نقلی مسز ہٹلے بن کر مجھ سے ملاقات کی پھر اس نے اخبار لانے کے بہانے مجھے باہر بھیجا اور خود اوپر جا کر مسز ہٹلے کا کام تمام کر دیا۔ میں نے واپس آنے کے بعد جو کھٹکا سنا وہ اسی کی آواز تھی جبکہ میں سمجھا کہ مسز ہٹلے جاگ گئی ہے۔ اس لیے جلدی سے

وہ دو نوادرات جیب میں ڈال کر گھر سے باہر آگیا۔ اس ساری مشق کا مقصد یہی تھا کہ بیرونی دروازے پر لگے ویڈیو کیمرے کے ذریعے میری نقل و حرکت ریکارڈ ہو جس سے ثابت ہو جائے کہ اس شب مسز ہٹلے سے ملنے والا واحد شخص میں تھا لیکن جب رومال پر لگے ہوئے نشانات کا ڈی این ٹیسٹ ہوگا تو اس سے جیوفرے کی وہاں موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ جب دوبارہ مکان کے فرش اور فرنیچر کا جائزہ لیا جائے گا تو وہاں میرے علاوہ جیوفرے کی انگلیوں اور قدموں کے نشانات بھی مل جائیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارا مطالبہ کیا ہے۔ ہمیں دکان واپس چاہیے۔ اس کے علاوہ قید کے دوران مجھے جس اذیت اور ذہنی کوفت سے دوچار ہونا پڑا، اس کا مالی معاوضہ بھی میرا حق ہے۔ میں نے ہم کا صیغہ استعمال کیا ہے کیونکہ اب میں جان کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ میرا بہترین پارٹنر ہوگا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ذہین شخص ہے۔

کیا مارگریٹ کوئی راستہ تلاش کر پائے گی۔ مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔ وہ بہت تیز دماغ کی عورت ہے اور اس کے پاس بشپ لاج کا سارا لوٹا ہوا مال موجود ہے جس کی قدر و قیمت کا اسے بھی اندازہ نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں کیسی کیسی نادر و نایاب اشیا ہیں جن کی مالیت ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں پاؤنڈ ہے۔ اگر میں پولیس کو اس رومال کے بارے میں بتا دوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ میں جیل سے رہا ہو جاؤں گا اور میری جگہ جیوفرے، مارگریٹ اور گلوریا اندر ہو جائیں گے لیکن میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

اب ہم مارگریٹ کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی یا بدیر وہ میرے پاس آئے گی اور جاننا چاہے گی کہ اس رومال کی میں کیا قیمت لگاتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے سودا کرنے آئے گی تو آپ جانتے ہیں کہ میرا جواب کیا ہے۔ اگر آپ نے کہانی کو غور سے پڑھا ہو تو یہ اندازہ بھی ہو گیا ہو گا کہ میں مارگریٹ کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس لیے میں اس سے دل کی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ویسے بھی گلوریا کے جانے کے بعد خالی گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس لیے کیوں نہ لوٹ کے مال میں نصف حصہ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ مارگریٹ کو بھی اس گھر میں قید کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اسے بھی یہ سودا منظور ہوگا۔

حسد

میمونہ عزیز

کسی دانا کا قول ہے کہ ہر روز اپنے ضمیر میں جھانک کر اپنی خطاؤں کو درست کرلیا کرو... اگر تم اپنے اس فرض میں ناکام رہے تو اپنی عقل اور علم کے ساتھ دغا کرو گے... عقل کو مشعلِ راہ سمجھنے والے ایک بے وفا و بے ضمیر شخص کا اقدام... اس کی بے صبری اور کمزوریوں نے اسے بے توقیری کا تمغا عنایت کردیا تھا...

بہتر مستقبل کے لیے حال کی خوشحالی و خوش نصیبی کو ٹھکرا دینے والے بدنصیب کا انجام

وہ دفتر کسی اچھے پروفیسر کی یادگار تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک صاف ستھری میز رکھی ہوئی تھی جس پر کوئی کاغذ یا فائل نظر نہیں آرہی تھی۔ دروازے کے ایک طرف اونچا سا کتابوں کا شیلف رکھا ہوا تھا... جس میں اوپر سے نیچے تک کتابیں بھری ہوئی تھیں جن میں سے زیادہ تر پروفیسر کی تحریر کردہ تھیں۔ میز کے مخالف سمت والے کونے میں دو قیمتی کرسیاں اور شیشے کی میز رکھی ہوئی تھی۔ دو فرشی اور ایک ٹیبل لیمپ کی وجہ سے کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی

ہوئی تھی۔ سراغ رساں آئن ریلے نے اندازہ لگا لیا کہ مرنے والے پروفیسر آئزک سیلک جیسے قابل اور عالم فاضل شخص نے اس کمرے میں کیسے کیسے علمی کارنامے انجام دیے ہوں گے لیکن یہ سب ماضی کا قصہ بن چکا تھا۔ پروفیسر کی لاش میز پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے سر سے بہنے والا خون کمپیوٹر کی سطح پر جم گیا تھا۔

سراغ رساں ریلے نے ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا اور تمام تفصیل اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگا۔ پروفیسر کے دونوں ہاتھ میز پر پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ میز کے عقب میں ایک بڑا سابورڈ آویزاں تھا جس پر کئی ٹائپ شدہ کاغذ اور تصویریں ایک خاص ترتیب سے لگی ہوئی تھیں لیکن خون کے چھینٹوں نے اسے آلودہ کر دیا تھا جبکہ ایک تصویر میں سوراخ بھی ہو گیا تھا۔

ریلے کے عقب میں واقع ہال میں پولیس آفیسرز اور تفتیشی عملے کے دوسرے لوگ ریلے کے اشارے کے منتظر تھے کہ وہ اپنی کارروائی شروع کر سکیں جبکہ بیرونی دفتر میں انٹر پرسنل کمیونیکیشن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ملازمین جمع ہو گئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ریلے نے اپنی ٹیم کے لوگوں کو کام شروع کرنے کا اشارہ کیا اور پروفیسر کے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تم میں سے سب سے پہلے کس نے پروفیسر کی لاش دیکھی؟''

ایک درمیانی عمر کی بھاری بھر کم عورت نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور فوراً ہی نیچے گرا دیا۔

ریلے نے کھچا کھچ بھرے ہوئے دفتر کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم بیٹھ کر بات کر سکیں؟''

وہ عورت اسے ایک چھوٹے سے کانفرنس روم میں لے گئی۔ ریلے نے درمیان میں ٹیپ ریکارڈر رکھا اور اپنی نوٹ بک کھول لی۔ وہ عورت اس کے سامنے بیٹھ کر مضطرب انداز میں اپنے اسکارف کا کونا انگلیوں سے لپیٹنے لگی۔

''تم نے ہی پروفیسر آئزک کی لاش دیکھی تھی؟'' ریلے نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

اس عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھنے لگی۔ ریلے نے اس سے چند ابتدائی سوالات کیے اور جان گیا کہ اس کا نام باربرا ہوسٹن ہے اور وہ اس یونیورسٹی میں گزشتہ پندرہ سال سے کام کر رہی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے دفتر آئی تو اس نے پروفیسر کو مردہ حالت میں پایا۔

''کیا اس وقت کوئی اور بھی تمہارے اردگرد موجود تھا؟''

''نہیں، میں ہی ہمیشہ سب سے پہلے آتی ہوں۔ خاص طور پر پیر کی صبح کو۔ اس وقت دفتر کے تمام دروازے اور روشنیاں بند تھیں۔''

''کیا پروفیسر کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور بتیاں بجھی ہوئی تھیں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' باربرا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے کیونکہ اس کی روشنی ہال میں آرہی تھی۔ میں اسے ہائے کہنے کے لیے گئی تو وہاں اس کی لاش دیکھی۔''

''گزشتہ جمعے کو جب تم گھر گئی تھیں تو کیا اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں موجود تھا؟''

''وہ جمعے کو دفتر نہیں آیا تھا بلکہ وہ گزشتہ پورے ہفتے ہی نہیں آیا۔''

''کیا یہ غیر معمولی بات نہیں تھی؟'' ریلے نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔''

ریلے نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ گھبرا کر اس کی نظروں سے بچنے کے لیے نیچے دیکھنے لگی۔

''کیا وہ اکثر و بیشتر اختتامِ ہفتہ کام کیا کرتا تھا؟''

''مجھے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں۔ اختتامِ ہفتہ میری دوسری مصروفیات ہوتی ہیں اور میں کام کے بارے میں نہیں سوچتی۔''

ریلے نے محسوس کیا کہ وہ جواب دینے کے معاملے میں بہت محتاط ہے یا انسٹی ٹیوٹ میں اپنے کردار کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ اس نے اپنی نوٹ بک کا ایک سادہ صفحہ کھولا اور باربرا سے کہا کہ وہ اسے آئزک کے دوستوں اور ساتھیوں کے نام لکھوا دے۔

''میں تمہیں اس کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کے نام بتا سکتی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتی کہ پروفیسر آئزک کے بہت زیادہ دوست تھے۔ کم از کم اس دفتر میں تو ڈائریکٹر کولر کے علاوہ کسی سے اس کی دوستی نہیں تھی۔''

''اوہ۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ یہاں زیادہ وقت نہیں گزارتا تھا اور لوگ اس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔''

باربرا نے انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی کام کرنے والے

عملے اور دیگر اسٹاف ممبرز کے نام تو لکھوا دیے لیکن ان کے بارے میں مزید معلومات فراہم نہ کر سکی۔ ریلے نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ پروفیسر کے باس کو اندر بھیج دے۔ وہ سرخ چہرے والا بھاری بھرکم شخص تھا جو آئزک کے دفتر کے باہر اس وقت تک منڈلاتا رہا جب تک کہ پولیس نے اسے وہاں سے ہٹا نہیں دیا۔

''جارج کوئلر۔'' اس شخص نے ریلے کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کانفرنس ٹیبل پر رکھی صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم پروفیسر آئزک کے باس تھے؟'' ریلے نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ڈائریکٹر ہونے کی حیثیت سے تکنیکی طور پر میں اس کا باس ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم سب شریک کار ہونے کی وجہ سے برابر ہیں۔''

''کیا پروفیسر ایک اچھا شریک کار تھا؟''

کوئلر نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ ''وہ ہمارا بہترین اسٹار تھا اور اس نے قومی سطح پر خوب نام کمایا۔'' اس نے ایک کتاب ریلے کی طرف بڑھائی۔ یہ وہی کتاب تھی جو وہ پروفیسر کے دفتر میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''پروفیسر کی کامیابی کے بارے میں اس کے ساتھی کیا محسوس کرتے تھے؟''

''سب اسے پسند کرتے تھے۔ وہ ہمارے لیے بھائیوں جیسا تھا اور میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔''

''گویا اس دفتر میں اس کا کسی سے کوئی تنازعہ نہیں تھا؟''

''باربرا نے تمہیں کیا بتایا ہے؟ اس کی باتوں پر بالکل توجہ مت دو۔ یہ میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آئزک کو پسند کرتی تھی لیکن اس نے کبھی اسے منہ نہیں لگایا۔''

''اس کی ذاتی زندگی کیسی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ بیوی بچے ....؟''

''اس کا کوئی نہیں تھا اور وہ کام کو ہی اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ اس کی ایک شادی ضرور ہوئی لیکن برسوں پہلے ہی ان میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد آئزک نے اپنے آپ کو کام کے لیے وقف کر لیا۔ ہمارے لیے یہ بہت برا دن ہے۔''

باس کی نظروں میں پروفیسر آئزک ایک مکمل علمی

شخصیت تھی اور اس کے کوئی بیرونی مفادات نہیں تھے۔ اپنے کام کی وجہ سے وہ دنیا کے مختلف حصوں میں لیکچر دینے جاتا جس کی بدولت انسٹی ٹیوٹ کا نام روشن ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے یونیورسٹی کی ساکھ متاثر ہوتی۔ کسی ساتھی سے کبھی جھگڑا نہیں ہوا، نہ ہی طالب علموں سے نامناسب تعلقات قائم کیے۔

ریلے نے میز پر پڑی ہوئی کتاب اٹھائی اور سرورق کی پشت پر پروفیسر کی تصویر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کے کام کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ اس کا اصل کام کیا تھا؟''

کوئلر کھڑا ہو گیا اور نویں منزل پر واقع کانفرنس روم کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں یہاں کی تاریخ معلوم ہے۔'' اس نے شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس ادارے کے بانیوں نے یہ درخت لگائے تھے۔ وہ ان تصورات کی نمائندگی کرتے تھے جن کی بنیاد پر یہ یونیورسٹی قائم ہے یعنی بنی نوع انسان کی علم کے لیے تلاش۔ شروع سے ہی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ اس جھنڈ میں ایک درخت کا اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح علم کا یہ جنگل پھیلتا جا رہا ہے۔''

کوئلر واپس اپنی نشست پر آ گیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آئزک کا کام انسانوں کے درمیان رابطے کے بارے میں معلومات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ لوگوں کو کس طرح بہتر طریقے سے ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے طور پر ہمارے علم کے جنگل میں ایک درخت کا اضافہ کیا جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا تھا۔ اس لیے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آج اس کے ساتھ یہ واقعہ کیوں پیش آیا۔''

کوئلر کے جانے کے بعد ریلے نے اپنے نوٹس پر دوبارہ نظر ڈالی۔ اس نے اپنی بیس سالہ ملازمت کے دوران کیمپس میں ہونے والے کئی جرائم کی تحقیقات کی تھیں اور ہر مرتبہ کوئلر جیسی موٹی بلیوں نے اس کے کام کو مشکل بنایا۔ وہ ہمیشہ اپنی یونیورسٹی کی نیک نامی کی خاطر بے جا مداخلت کرتے، آدھا سچ بولتے اور اس کی تحقیقات کو سکیڑنے کی کوشش کرتے لیکن ریلے جانتا تھا کہ اس ظاہری خلوص کی تہ میں وہ صرف اپنا تحفظ کر رہے ہوتے تھے۔

دروازے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس کی توجہ کاغذات پر سے ہٹ گئی۔ وہاں ایک طویل قامت شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے قریب آ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''ڈاکٹر ٹیری پارکر! میرا خیال ہے کہ جارج نے تمہیں آئزک کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔''

ریلے نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''تم اور ڈاکٹر آئزک اکٹھے کام کرتے تھے؟''

پارکر نے ناگواری سے اپنے ہونٹ بھینچے اور بولا۔ ''اکٹھے تو نہیں۔ البتہ ہمارا ڈپارٹمنٹ ایک ہی تھا اور ریسرچ کا شعبہ بھی ایک ہی تھا لیکن ہم نے کبھی ایک ساتھ کام نہیں کیا۔''

ریلے حیران تھا کہ اس انسٹی ٹیوٹ میں کس طرح کام ہوتا ہوگا جہاں ساتھی مل کر کام نہیں کرتے اور باس اپنے باس ہونے کا اعتراف نہیں کرتا۔

''گویا تم ایک دوسرے کے حریف تھے؟''

یہ سن کر پارکر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصے سے بولا۔ ''میں کسی مرے ہوئے شخص کی برائی نہیں کر سکتا لیکن وہ ایک باکمال شخص تھا۔'' پھر وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تاہم میں تمہیں ایک راز کی بات بتا دوں۔ اس کی ریسرچ گمراہ کن تھی۔''

جب ریلے خاموش رہا تو پارکر تھوڑا سا آگے بڑھا اور اپنی بدبودار سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، یہ سچ ہے۔ ریسرچ ایک مکمل سائنس ہے۔ جس نے اس سوال کا سائنسی جواب تلاش کرنے میں کئی برس لگا دیے کہ لوگوں کی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ گو کہ آئزک کی نام نہاد ریسرچ محض ایک رائے تھی۔ وہ بہت ہوشیار ہے لیکن رائے کو اعداد و شمار نہیں سمجھا جا سکتا۔''

ریلے نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں سے حسد کی بو آ رہی تھی۔ اس نے پارکر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اپنے اعتراضات کا اظہار پروفیسر آئزک سے کیا تھا؟''

''ہاں، بے شک وہ کوئلر کا چہیتا تھا لیکن اسے اس کی اصلیت بتانا ضروری تھا۔''

''اور تم نے یہ کام کر دکھایا۔''

''ہاں، میرے سوا کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔''

''مسٹر پارکر.....''

''ڈاکٹر کہو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس ڈگری کے لیے بڑی محنت کی ہے۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ پروفیسر آئزک کے ساتھ تمہارے اچھے تعلقات نہیں تھے؟''

پارکر ایک بار پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔
''میں احمق نہیں ہوں۔ میں نے بہت پہلے ہی دیوار پر لکھا ہوا پڑھ لیا تھا۔ کوئلر کا خیال تھا کہ آئزک کوئی غلط کام نہیں کر سکتا اور اس سے سوال کرنے والا شخص ڈپارٹمنٹ میں اپنی حیثیت کھودے گا اور اسے جارج کی حمایت بھی حاصل نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے فنڈ حاصل کرنے کے مواقع بھی ختم ہو جائیں گے لہٰذا اس کے کام کو ناپسند کرنے کے باوجود اپنے کیریئر کو بچانے کے لیے میں نے دکھاوے کا تعلق برقرار رکھا۔''
''تمہارے کوئلر سے قریبی تعلقات تھے؟'' ریلے نے پوچھا۔
پارکر کی آنکھیں تنگ ہوگئیں اور وہ بولا۔ ''اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر اس نے چیونگم کا پیکٹ کھولا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''آئزک نے اس طرح جارج کو ہمیشہ خوش رکھا۔ آج کل ریسرچ کے کاموں سے بہت کم پیسے ملتے ہیں لیکن آئزک کی کتابیں بڑی تعداد میں فروخت ہوتی تھیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے گو کہ یہ گمراہ کن ہیں لیکن ان کی وجہ سے ہمارے کام کو شہرت ملتی ہے۔''
''اس کا مطلب ہے کہ آئزک کی کامیابی سے ادارے کو فائدہ پہنچا۔'' وہ تھوڑا سا اور آگے کی طرف جھک گیا۔
''براہ راست تو نہیں البتہ اس کی ساکھ میں ضرور اضافہ ہوا۔ لوگ جان جائیں گے کہ آئزک ایک فراڈ ہے اور وہ اپنے ساتھ جارج کو بھی لے ڈوبے گا اور اس کے بعد ادارے کے بقیہ لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے۔''
پارکر سے فارغ ہونے کے بعد سراغ رساں ریلے واشنگٹن ہال میں واپس آیا تو اس نے ایک عورت کو دیکھا جو دروازے کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے مجمع کو چیرتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔
''کیا یہ سچ ہے؟ کیا ڈاکٹر آئزک فوت ہوگیا؟''
''کیا تم اس کی کوئی شاگرد ہو؟'' ریلے نے پوچھا۔
''گزشتہ برس اس کی کلاس میں ہوا کرتی تھی۔ اب اس کے لیے کام کرتی ہوں۔''
''کس قسم کا کام؟''
''میں اس کی ریسرچ میں مدد کرتی تھی۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''انٹرویو کے درمیان نوٹس لیا کرتی اور رسالوں میں اس کے کام سے متعلق مضامین تلاش کرتی تھی۔''
مجمع میں سے ایک نوجوان شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ''ٹیسا، تم اسے جو چاہے نام دو لیکن ہم سب لوگ حقیقت جانتے ہیں۔ آئزک نے تمہیں بھی دوسری چیزوں کی طرح استعمال کیا اور اسے اتنا لحاظ نہیں تھا کہ وہ تمہیں اس کا کریڈٹ دیتا جس کی تم حق دار تھیں۔''
ٹیسا نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور ریلے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس کی بات مت سنو۔ ڈاکٹر آئزک ایک عظیم استاد تھا۔ واقعی ایک عظیم شخص۔ میٹ محض حسد میں ایسی باتیں کررہا ہے۔''
اب اس شخص کی آنکھیں گھمانے کی باری تھی لیکن وہ مہذب انداز میں بولا۔ ''ہم سب ڈاکٹر آئزک کو پسند کرتے تھے، اسے لوگوں کو خوش کرنے کا طریقہ آتا تھا لیکن جب آپ معروضی طور سے دیکھیں.....''
''ہاں بولو، رک کیوں گئے؟'' ریلے نے لقمہ دیا۔
''وہ اتنا اچھا آدمی نہیں تھا۔'' میٹ نے ٹیسا سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے آپ کو اچھا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ صرف اپنا خیال رکھتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایسا بنالیا کہ لوگ اسے پسند کرنے لگے لیکن وہ حقیقت میں لوگوں کا خیال نہیں رکھتا تھا اور اسے صرف ان کی پروا ہوتی تھی جو اس کے کام کریں یا اس کی کتابیں بیچیں۔''
''یہ ٹھیک نہیں ہے میٹ۔ میں تم سے اچھائی کی توقع کررہی تھی۔''
میٹ نے کندھے اچکا دیے لیکن معذرت نہیں کی۔ ریلے نے سوچا کہ ڈاکٹر کی ساکھ میں ایک اور نقص نکل آیا۔ اس نے نوجوان شخص پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے آخری بار ڈاکٹر آئزک کو کب دیکھا؟''
''ہم نے اسے گزشتہ شب ملنو، میں دیکھا تھا۔'' ٹیسا نے کیمپس کے قریب واقع ایک مشہور کافی شاپ کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم وہاں ہمیشہ اتوار کی شب کافی پینے کے لیے جمع ہوتے تھے۔''
''تم نے بھی اسٹڈی گروپ سے ملاقات کی؟''
''یہ ہمارے کام کا حصہ ہے۔''
میٹ نے کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہنے میں بہتری سمجھی۔ دوسرے طالب علم بھی ان کے گرد جمع ہوگئے تھے۔
''تم سب وہاں موجود تھے؟'' ریلے نے پوچھا تو سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ریلے نے کہا۔ ''مجھے گزشتہ شب کے بارے میں بتاؤ۔''
''ہم باتیں کرتے رہے کافی پی اور گھر چلے گئے۔''

میٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹر آئزک وہیں بیٹھا اپنی آنے والی کتاب پر کام کرتا رہا کیونکہ اس کی آخری تاریخ قریب آرہی تھی۔''

ٹیسا اور میٹ کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ٹیسا نے ہلکے سے سر ہلایا تو میٹ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اسے کسی کا انتظار تھا۔''

کانفرنس روم میں واپس آنے کے بعد ریلے اس کا انتظار کرنے لگا تاکہ میٹ اپنی بات کی وضاحت کرسکے۔ ٹیسا بیرونی دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ریلے نے دوسرے طالب علموں سے ان کے نام اور ٹیلی فون نمبر لینے کے بعد واپس بھیج دیا تھا۔

''میں اس کی ویب سائٹ چلاتا ہوں۔'' میٹ نے کہا۔ ''یہ بھی اس کی کتابوں جیسی ہے لیکن اس میں ذاتیات کا عنصر زیادہ ہے لوگ اپنے سوالات اور مسائل بھیجتے ہیں اور وہ انہیں مشورے دیتا ہے۔''

اتنا کہہ کر میٹ رک گیا جیسے کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔ ریلے نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو وہ بولا۔ ''حال ہی میں اسے کچھ تبصرے موصول ہوئے جو لگتا ہے کہ کسی غیر مطمئن شخص نے بھیجے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب ایک ہی شخص کی طرف سے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اس شخص کو جانتا تھا کیونکہ کل اس نے کہا تھا کہ وہ اس کا خاتمہ کرنے جارہا ہے۔''

''تمہارے خیال میں ان الفاظ سے اس کا کیا مطلب تھا؟''

''آخری تبصرہ گزشتہ روز آیا تھا اور اپنی ویب سائٹ پر ہی اسے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے چاہیے کہ گمنام پوسٹ بھیجنے کے بجائے اس سے ذاتی طور پر ملے۔''

''کیا آئزک نے اس شخص کو یہ بتایا تھا کہ کب اور کہاں ملنا ہے؟''

''اس نے صرف اتنا کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں کہاں مل سکتا ہوں؟ ہر شخص ڈاکٹر آئزک کی اتوار کی شب ہونے والی اسٹڈی گروپ کی میٹنگ کے بارے میں جانتا ہے اور جب وہ ہمارے آنے کے بعد بھی وہاں بیٹھا رہا تو میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ....''

''تم جانتے ہو کہ وہ کس سے ملا تھا؟''

''ہاں، مجھے تجسس ہوگیا تھا اس لیے سڑک کے پار ایک بار میں ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں سے کافی شاپ میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ سکوں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس عورت کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔''

''عورت؟''

''ہاں، ہمارے وہاں سے جانے کے آدھا گھنٹا بعد باربرا ہوسٹن آئی لیکن اس کا پروفیسر کی موت سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔''

''ممکن ہے کہ وہ صرف کافی پینے کے لیے آئی ہو؟''

''ہاں لیکن میں نے ان دونوں کو کھڑکی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی ناراض لگ رہی تھی اور اس کے جانے کے بعد پروفیسر بھی وہاں نہیں رکا۔''

ریلے سوچنے لگا کہ باربرا ہوسٹن نے اسے پروفیسر سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔

''کیا تم نے پہلے بھی ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا؟'' اس نے میٹ سے پوچھا۔

''وہ دونوں صرف دفتر میں ہی ساتھ ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ تر اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی اور اپنے پیغامات یا دوسری اشیا شاگردوں کے ذریعے بھیجا کرتی تھی حالانکہ ان دونوں کی میزوں کے درمیان صرف بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔''

ریلے نے اپنے نوٹس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈاکٹر آئزک کی ویب سائٹ کے بارے میں بتاؤ؟''

میٹ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''یہ اس کی ذاتی سائٹ ہے۔ اسے ایک طرح کا مشاورتی کاروبار کہا جاسکتا ہے۔ لوگ اس ویب سائٹ پر اپنے سوالات اور مسائل بھیجتے ہیں اور وہ روزانہ انہیں ای میل کے ذریعے جوابی پیغامات، مضامین اور خبرنامے بھیجتا ہے۔ خریدار ہفتے میں ایک مرتبہ اپنے مسائل اور سوالات بھیج سکتے ہیں اور وہ انہیں ذاتی طور پر جواب دیتا تھا۔ اس لیے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔''

''یہ ممبران کس طرح کے مسائل بھیجا کرتے ہیں؟''

''زیادہ تر رشتوں اور ملازمت سے متعلق ہوتے ہیں۔''

''کیا تم مجھے ان میں سے چند ایک دکھا سکتے ہو؟''

میٹ نے لمحہ بھر توقف کیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ریلے اس کے ساتھ چلتے ہوئے تہ خانے میں واقع ایک کمرے میں آیا۔ میٹ نے کمپیوٹر آن کیا اور اسکرین پر ویب سائٹ نمودار ہوگئی۔ اوپر بائیں جانب پروفیسر آئزک کی تصویر چسپاں تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

غلطی

شوہر (غصے میں بیوی سے)۔ ''بیگم آئے دن تم میری چیزوں کی تلاشی لے کر کوئی نہ کوئی چیز غائب کر دیتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ غلطی ہوگئی۔ اب کے میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ جلدی بتاؤ وہ میری سونے کی گھڑی کہاں گئی؟''

بیوی۔ ''سرتاج! واقعی مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے دراصل میں نے اسے جیولرز کو زیور بنانے کے لیے دیا ہے۔''

دوا

گاہک: ''کیا آپ کے پاس چوہے مار دوا ہے؟''

کیمسٹ: ''کیا آپ خود لے جائیں گے؟''

گاہک: ''نہیں، میں چوہوں کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

''مجھے اس شخص کے بھیجے ہوئے پیغامات کا پرنٹ آؤٹ چاہیے تاکہ ہمارا آدمی بھی انہیں ایک نظر دیکھ سکے۔''

ریلے دوسرے روز کیمپس واپس آیا تو اس کے پاس پروفیسر کی ویب سائٹ کے پرنٹ آؤٹ کے علاوہ پولیس کمپیوٹر ٹیکنیشن کی فراہم کردہ دو نئی معلومات بھی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اینن 1964 کا نام اختیار کرنے والے شخص نے پروفیسر کے دفتر میں موجود ایک کمپیوٹر کو استعمال کیا تھا اور دوسری یہ کہ اس نے پہلا پیغام اس تقریب کے چند روز بعد بھیجا جس میں یونیورسٹی نے پروفیسر کو ممتاز تحقیق کنندہ کا درجہ دیا تھا۔ ریلے نے اس تقریب کی ویڈیو بھی دیکھی جس میں اس کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کے علاوہ طالب علموں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس تقریب میں بھی اس سے سوال جواب کیے گئے۔ ریلے کو شبہ تھا کہ پروفیسر نے اپنی کتاب کو پروموٹ کرنے کے لیے بہت سے سوال خود ہی گھڑے تھے اور اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب اس نے ٹیسا سمیت پروفیسر کے اسٹڈی گروپ کے طلبہ کو سوالات کرتے دیکھا پھر اس کی نظر ٹیسا کے عقب میں کھڑی ... باربرا ہوسٹن پر گئی اور اسے تجسس ہوا کہ ڈیپارٹمنٹ کی سیکریٹری پروفیسر سے کیا پوچھنا چاہتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی، پروفیسر نے یہ کہہ کر سوالات کا سلسلہ منقطع کر دیا کہ اسے کسی اور جگہ جانا ہے۔

☆☆☆

''میں نے اسے قتل نہیں کیا۔'' باربرا نے کمپیوٹر اسکرین

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' تصویر کے نیچے دو کالم بنے ہوئے تھے۔ دائیں کالم میں آئزک کی کتابوں کی فہرست اور ان دکانوں کے پتے درج تھے جہاں سے یہ کتابیں مل سکتی تھیں جبکہ بائیں کالم میں لوگوں کے بھیجے ہوئے سوال اور ان کے جوابات درج تھے۔

میٹ نے ماؤس کے ذریعے اس کالم کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ریلے نے ایک نظر سوالات پر ڈالی۔ میٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ زیادہ تر سوالات رشتوں کے بارے میں تھے۔ ماں بیٹی، باپ بیٹے، بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ وغیرہ۔ ریلے نے اندازہ لگایا کہ آئزک نے زیادہ تر جوابات میں اصل مسئلے کو حل کرنے کے بجائے لوگوں کو اپنی کتابیں خریدنے کی ترغیب دی تھی۔

میٹ ویب سائٹ کے مختلف حصے کھولتا رہا پھر ایک جگہ رک کر بولا۔ ''یہ وہ تبصرے ہیں جنہیں ہم نے بلاک کر دیا تھا۔ ڈاکٹر آئزک ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا جو اس پر تنقید یا اس کی مہارت پر سوال اٹھائیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ سارے تبصرے پوسٹ نہیں ہوتے تھے۔''

''نہیں لیکن وہ سب سسٹم میں موجود ہیں اور انہیں ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کیا گیا۔'' اس کے بعد میٹ نے ایک پیغام کو نمایاں کیا اور خود پیچھے ہٹ گیا تاکہ ریلے اسے پڑھ سکے۔ ان پیغامات کا سلسلہ دو ہفتے پہلے شروع ہوا تھا اور ان کی عبارت کچھ اس طرح کی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا، آخر مجھے کیوں نظر انداز کر رہے ہو؟''

دو دن بعد دوسرا پیغام آیا۔ ''مجھے جواب کا انتظار ہے۔ تم ہر ایک کی مدد کرتے ہو پھر میری کیوں نہیں؟''

گزشتہ ہفتے کے پیغام میں درج تھا۔ ''تم اتنے سنگ دل کیسے ہو سکتے ہو؟''

یہ سارے پیغامات اینن 1964 کے نام سے بھیجے گئے تھے۔ ریلے نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ڈاکٹر آئزک کی سائٹ میں ناکام لوگوں کے لیے بڑی کشش ہے۔ اس لیے کوئی بھی اپنا اصل نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیا کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے اصل آدمی تک پہنچا جائے؟''

میٹ نے ایک اور ونڈو کھولی اور بولا۔ ''یہ خریدار نہیں ہے بلکہ اس نے فرضی نام سے ای میل بھیجی تھی۔''

پروڈیوڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تم اتوار کی شب اس سے کافی شاپ میں ملنے گئی تھیں؟'' ریلے نے پوچھا۔

''مجھے اس کے مشورے کی ضرورت تھی۔''

ریلے نے اینن 1964 کے بھیجے گئے پیغامات کا پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے میز پر رکھا تو وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''میں ان تمام سالوں میں اس کی کتابوں اور مضامین کی پروف ریڈنگ اور اس کی گرامر کی غلطیاں درست کرتی رہی۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے مضحکہ خیز خیالات میں بھی ترمیم کی۔ میں نے اس کی تخلیقات کو بہتر بنا کر پیش کیا اور اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہچکیوں کی وجہ سے اسے بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے سلسلۂ تکلم جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بجائے اس کے کہ وہ میرا احسان مند ہوتا' اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے میری مزید ضرورت نہیں۔ اس نے مجھے مسترد کردیا۔''

''لہٰذا تم نے اسے یہ پیغامات بھیجے اور اس سے ملنے کافی شاپ چلی گئیں؟''

''میں نے اس سے التجا کی کہ مجھے دوبارہ کام پر رکھ لیا جائے۔ کیا تم اس پر یقین کرسکتے ہو۔ اس کے بعد میں گھر چلی گئی اور پاگلوں کی طرح شراب پیتی رہی پھر میں نے بقیہ وقت بستر میں ہی گزارا۔ مجھ میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس دوران کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے فون کیا۔''

اس نے پرنٹ آؤٹ دیکھنا شروع کردیے۔ وہ ہر ایک کو پڑھ کر سر ہلاتی گئی پھر ایک صفحے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرا نہیں ہے۔''

ریلے نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ ''اگر تم سمجھتی ہو کہ اس طرح لوگوں کو استعمال کرکے بے وقوف بنا سکتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میرے پاس بھی تمہارے خفیہ راز ہیں۔''

باربرا نے ایک اور کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی میرا نام دیکھو۔ اس میں نام کے ہجوں پر غور کرو۔ تمہیں اس میں ایک اضافی I نظر آئے گا۔''

ریلے نے غور سے پرنٹ آؤٹ دیکھا۔ وہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ دونوں پیغامات ایوارڈ کی تقریب کے بعد ہی بھیجے گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی اور شخص بھی باربرا کے فرضی نام سے واقف ہوگیا ہے جسے اینن 1964 کی حقیقت معلوم ہے اور وہ چاہتا ہے کہ آئزک یہی سمجھے کہ یہ تمام پیغامات اسی کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔

جب ریلے وہاں سے روانہ ہوا تو اسے پورا یقین تھا کہ باربرا ایک بار پھر وائن کی بوتل کا سہارا لے گی اور اس کی پوری رات خود فراموشی کے عالم میں گزرے گی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ یہ بات طے تھی کہ باربرا نے آئزک کو قتل نہیں کیا بلکہ قاتل اور کوئی تھا۔ ان کے درمیان محبوب کا نہیں بلکہ ساتھی کا رشتہ تھا۔ ریلے نے آخری پیغام کی عبارت پر غور کیا۔ 'میں تمہارے فراڈ کو بے نقاب کردوں گا۔' اور اس کے ساتھ ہی ریلے کے ذہن میں پارکر کا نام آیا۔ وہی اس طرح کی عبارت لکھ سکتا تھا اس نے ریلے کے ساتھ ہونے والے انٹرویو میں بھی پروفیسر آئزک پر ایسے ہی الزامات لگائے تھے لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ پارکر اپنے حریف کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھا سکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی ساری زندگی رشتوں پر ریسرچ کرتے اور لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے گزری ہو، وہ کس طرح گولی کے ذریعے معاملات طے کرسکتا ہے۔ منطقی طور پر ایک ایسا شخص ہی مشتبہ سمجھا جاسکتا ہے جسے آئزک کی ترقی سے سب سے زیادہ فائدہ ہوا اور اس کی خود مختاری کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان بھی اسی کا ہوتا۔

ریلے درختوں کے جھنڈ کے وسط میں واقع تالاب تک آیا جہاں سے پولیس کے غوطہ خوروں نے گزشتہ روز ایک گن برآمد کی تھی۔ وہاں کوئلر پہلے سے موجود تھا اور بیالوجی کے طالب علموں کو تالاب کے وسط سے کائی کے نمونے جمع کرتے دیکھ رہا تھا۔ ریلے اس کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ کوئلر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ یہ بچے کیا کر رہے ہیں؟ اسی کو ریسرچ کہتے ہیں۔ پہلے انہوں نے ایک نظریہ تخلیق کیا اور اسے ثابت کرنے کے لیے یہ تجربہ کر رہے ہیں۔ اس سے جو معلومات حاصل ہوں گی' اس کا تجزیہ کیا جائے گا اور پھر یہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ اسی کا نام سائنس ہے۔ ہم نے اس یونیورسٹی میں ہر چیز کے لیے ایک معیار مقرر کر رکھا ہے اور یہ بچے اسے جانتے ہیں۔'' کوئلر نے گہری سانس لی اور طالب علموں کو دیکھنے لگا۔

''کیا پروفیسر آئزک کی توجہ معیار سے ہٹ گئی تھی؟'' ریلے نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

کوئلر اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آئزک

بہت ذہین تھا۔ میں نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اسے سنوارا۔ وہ بہت باصلاحیت اور ولولہ انگیز تھا۔''

وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر اس نے ریلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہنا غلط ہے کہ وہ بھٹک گیا تھا۔ اس نے ہمیشہ کامیابی کے لیے مختصر راستہ تلاش کیا۔ مجھے جن باتوں پر توجہ دینا چاہیے تھی، وہ نہیں دی اور اس طرح میں نے اپنی اقدار کو دھوکا دیا۔ مجھ پر اس ادارے کا ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے بہت دباؤ تھا۔ بہت سے لوگ اس غیر معمولی مشکل وقت میں زندگی گزارنے کے لیے مجھ پر انحصار کرتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں ناکام ہوگیا اور میں نے آسان راستے تلاش کرنا شروع کردیے۔ آئزک کی کامیابی اس یونیورسٹی کی دیرپا میراث کی مظہر تھی۔''

''میں تمہارا مسئلہ سمجھ سکتا ہوں پروفیسر۔'' ریلے نے کہا۔ ''لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم نے آئزک کو کیوں قتل کیا؟''

کوئلر نے نفی میں سر ہلایا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں لیکن اپنے بہترین دوست کو قتل نہیں کرسکتا۔''

طلبہ اپنا کام ختم کرچکے تھے۔ انہوں نے سامان سمیٹا اور قریب کھڑے ہوئے ٹرک میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد ریلے نے کوئلر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ جب آئزک نے وہ ایوارڈ جیتا تو اس کے مقابلے میں تمہاری سائنس ماند پڑگئی اور تم اس سے حسد کرنے لگے۔ تمہاری شان وشوکت کے دن ختم ہوچکے تھے اور تم کبھی بھی وہ مقام حاصل نہیں کرسکتے تھے جہاں وہ پہنچ گیا تھا۔ تم نے جس شخص کی سرپرستی کی تھی اس کا علم تمہارے غرور پر حاوی ہوگیا۔''

کوئلر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ریلے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کے بعد تم نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ اس صورتِ حال کو کس طرح اپنے مفاد میں تبدیل کیا جائے۔ تم ٹھیک کہتے ہو کہ صرف آئزک ہی کامیابی کے مختصر راستے تلاش نہیں کررہا تھا۔ بھاڑ میں گئی ریسرچ اور علمی دیانت داری۔ تم کب تک آئزک کے نام پر اپنی دکان چمکا سکتے تھے؟''

''ایک منٹ، میری بات سنو۔'' کوئلر نے مٹھیاں بھینچ کر گہری سانس لی لیکن ریلے نے اسے بولنے نہیں دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

''تم نے اسے بلیک میل کرنے کی اسکیم بنائی کہ اگر اس نے تمہارا مطالبہ پورا نہ کیا تو تم اس کی ساکھ تباہ کردو گے۔ تم نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ یونیورسٹی کی حمایت کے بغیر اس کے لیے تمام دروازے بند ہوجائیں گے۔ اسے مالی مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں اور ممکن ہے کہ پبلی شر بھی دوسرے ماہرین کی تلاش شروع کردیں۔ تمہیں یقین تھا کہ یہ اسکیم کامیاب رہے گی کیونکہ تم دونوں ہی پیسے اور شہرت کو اہمیت دیتے تھے۔ آئزک نے اس راستے پر چلنا پسند نہیں کیا اور تم اس کے تعاون سے محروم ہوگئے۔''

کوئلر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔''

''میں مفروضوں پر بات نہیں کرتا۔'' ریلے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ڈیٹا فون ریکارڈ، کمپیوٹر ریکارڈ، ویڈیو فوٹیج جمع کرنے کے ساتھ کئی لوگوں سے انٹرویو کیے ہیں اور اب میری ٹیم ان تمام تفصیلات کا تجزیہ کررہی ہے۔ تمہارے خیال میں وہ کیا حاصل کرپائیں گے۔ اس تالاب سے ملنے والی گن پر تمہاری انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عینی شاہد نے اتوار کو رات گئے تمہیں اس درختوں کے جھنڈ سے گزرتے دیکھا تھا۔''

کوئلر کا چہرہ سفید پڑگیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن ریلے پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اپنے دوست سے بچھڑنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ہمیشہ اپنے ماضی اور مستقبل پر نظر رکھی اور اب اپنے خودغرضانہ اور سفاک عمل کے انجام پر رو رہا تھا۔ ریلے کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

''جب ہماری تحقیقات کا نتیجہ سامنے آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ تمہارا جرم ثابت ہوجائے گا۔ تم نے ہی ڈاکٹر آئزک کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ اس نے تمہیں نظرانداز کرنا شروع کردیا تھا اور جب تم نے محسوس کیا کہ وہ اتنا طاقت ور ہوچکا ہے کہ تمہاری مدد کے بغیر بھی کامیاب ہوتا رہے گا تو تم سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ تم اس سے حسد کرنے لگے کیونکہ تمہاری خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ تمہارا تابع رہے اور اپنی نیک نامی و دولت میں تمہیں بھی شریک کرے۔ مجھے تمہارے اس فعل پر بالکل بھی حیرت نہیں ہے کیونکہ آج کی دنیا میں یہی سائنس چلتی ہے۔ کوئی بھی کسی دوسرے کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اور تم بھی اسی دنیا کے باسی ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ہتھکڑی نکالی اور کوئلر نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

دہری شخصیت

عکسِ فاطمہ

ناگہانی موت سے کسی خاندان پر کیا قیامت گزرتی ہے، اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے... ماہ وسال کی صعوبتیں برداشت کرنے والی دادی کی بدلتی زندگی کے رنگ ڈھنگ... خیال رکھنے اور جان چھڑکنے والی پوتی کی فرقت نے اسے پاتال میں دھکیل دیا تھا۔

گھٹے گھٹے ماحول اور نامساعد حالات میں کی جانے والی جدوجہد کا المناک انجام

وہ نرسنگ ہوم مین ہٹن سے آدھ میل کی مسافت پر تھا جہاں جین نے دو ہفتے قبل تربیت شروع کی تھی۔ گزشتہ ہفتے سوشل سروسز کی ڈائریکٹر نے اسے بلا کر کہا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک خاص کام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسے دماغی خلل کے یونٹ میں لے گئی۔ جین اس سے پہلے کبھی وہاں نہیں آئی تھی۔ رتھ گیلر نے دروازے میں پاس ورڈ پنچ کیا اور وہ دونوں اندر داخل ہوگئیں۔ وہ حصہ سکون بخش یعنی ہلکے سبز اور زرد رنگوں سے پینٹ کیا گیا تھا۔ نرسوں کے کاؤنٹر کے قریب کچھ میزیں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جہاں درجن بھر کے قریب عورتیں مختلف سرگرمیوں میں مصروف تھیں جبکہ ایک جانب وہیل چیئر پر بیٹھا آدمی پنجرے میں بند زرد رنگ کی چڑیا سے باتیں کررہا تھا۔

''موسم اچھا ہو تو کچھ مریض باہر جانا پسند کرتے ہیں۔'' مسز گیلر نے ملحقہ صحن کی طرف جاتے ہوئے جین سے کہا۔ ''جبکہ دوسرے لوگ اپنے آپ کو نرسنگ ہوم کے اندر ہی محفوظ سمجھتے ہیں۔ میں نے جس عورت کا تم سے ذکر کیا تھا، وہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اس کی پسندیدہ جگہ وہ کرسی ہے جو برگد کے درخت کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔ اس عورت کا نام مسز گلی ہے۔''

پہلی نظر میں وہ کرسی خالی نظر آئی لیکن جین نے قریب جا کر دیکھا تو وہاں ایک مختصر سی عورت کرسی کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی۔

''یہ جب سے یہاں آئی ہے یہی اس کی مخصوص جگہ ہے۔ اسے آئے ہوئے چار مہینے ہوگئے ہیں لیکن اس دوران میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔''

''کیا یہ بالکل نہیں بولتی؟'' جین نے تاسف سے پوچھا۔

''اسی بات کا تو دکھ ہے۔ ہم نے کبھی اس طرح کا

کیس نہیں دیکھا۔"

"اس کا کوئی رشتے دار ہے؟" جین نے پوچھا۔

"نہیں اور نہ ہی ہم نے اسے کسی سے گھلتے ملتے دیکھا۔ ایسا نہیں کہ یہ کسی کے خلاف ہے لیکن اسے لوگوں سے دلچسپی نہیں۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بھی ایک کوشش کرنی چاہیے لیکن اس سے زیادہ امید مت رکھنا۔"

جب وہ دونوں کرسی کے قریب پہنچیں تو جین کو اندازہ ہوا کہ وہ عورت کتنی چھوٹی سی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل بچوں جیسے تھے۔

"ہیلو مسز گلی میں تمہارے لیے ایک مہمان لے کر آئی ہوں۔" مسز گیلر نے کہا۔

آواز سن کر اس عورت نے سر اٹھایا اور ان کی جانب دیکھنے لگی۔ جین نے سوچا کہ اس عورت کو سننے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تھوڑا سا جھک گئی تا کہ اس کے چہرے سے قریب ہو سکے۔

"تم کتنی اچھی جگہ پر بیٹھی ہوئی ہو۔" اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس عورت نے جین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ جین نے اپنا جملہ دہرایا پھر بھی اس عورت نے کوئی جواب نہیں دیا تو جین نے کہا۔ "کیا تم نے اچھی طرح آرام کیا تھا؟"

اس عورت کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ جین کے چہرے پر جم گئیں پھر اس کے زرد ہونٹوں سے ایک باریک آواز ابھری۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"لورین۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر نسبتاً اونچی آواز میں بولی۔ "لورین۔"

وہ کرسی سے اٹھی اور اس کی جانب بڑھی۔ اگر جین آگے بڑھ کر اسے نہ تھام لیتی تو وہ کرسی پر گر سکتی تھی۔ اس نے جین کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پیچھے کی جانب ہٹنے کی کوشش کی تا کہ وہ جین کا چہرہ دیکھ سکے۔

"لورین۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں بہت پریشان تھی۔ تم اتنے عرصے سے کہاں غائب تھیں؟ مجھے امید تھی کہ تم ضرور واپس آؤ گی جیسے پہلے آیا کرتی تھیں۔" اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

مسز گیلر کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ابھرے لیکن جین کی توجہ مسز گلی کی جانب تھی جو کہہ رہی تھی۔ "آؤ، میرے پاس بیٹھو تا کہ میں تمہارا ہاتھ تھام سکوں۔"

جین نے اس کا نرم ہاتھ پکڑا تو وہ بولی۔ "مجھے امید تھی کہ تم ہمیشہ کی طرح واپس آؤ گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جین کے کندھے پر رکھا اور فوراً ہی گہری نیند سو گئی۔

"جب وہ جاگے گی تو کیا ہوگا؟" جین نے سوچا۔ "کیا وہ سمجھ جائے گی کہ میں لورین نہیں ہوں؟"

تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ اپنا سر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔ "تمہارے اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ اب تمہیں جانا چاہیے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ جب تم واپس آؤ گی تو میں تمہیں یہیں ملوں گی۔"

جین تھوڑا سا ہچکچائی لیکن مسز گلی نے دوبارہ کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

اگلے روز صبح وہ دوسری منزل پر واقع مسز گیلر کے کمرے میں گئی تو وہ بولی۔ "مجھے بہت حیرت ہوئی تھی اسی لیے میں نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ میرے چلے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

جین نے منظر بیان کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا تھا کہ یہ الفاظ اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گئے تھے جیسے وہ انہیں پہلے بھی کئی بار ادا کر چکی ہو۔" پھر وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "لورین کون ہے؟"

مسز گیلر کو اسی سوال کی توقع تھی۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولی۔ "مسز گلی کی پوتی۔"

"میں سمجھ رہی تھی کہ مسز گلی کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مسز گلی کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد اس کی پوتی کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"کیا تم اس سے ملی تھیں؟"

مسز گیلر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے، بس مجھے اتنا ہی کہنے کی اجازت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی مریضوں سے متعلق پرائیویسی کوڈ سے واقف ہو گی۔ ہم ان کے ذاتی معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔" پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور گھوم کر جین کی طرف آئی اور بولی۔ "تم مسز گلی کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئی تھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم وقتاً فوقتاً اس کے پاس جاتی رہو۔"

☆☆☆

دوسری صبح مسز گلی کے پاس جاتے ہوئے جین کے ذہن میں کچھ خدشات جنم لے رہے تھے۔ اسے وہ اداس آنکھیں یاد آئیں پھر ان میں خوشی کی لہر کا ابھرنا۔ گزشتہ روز ہونے والی گفتگو لفظ بہ لفظ اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

رات کھانے پر اس نے اپنی روم میٹ میری کو مسز گلی کے بارے میں بتایا۔

''انتقال ہوگیا۔'' میری نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت نے تمہیں یہی بتایا تھا۔ یہ الفاظ تو کسی عمر رسیدہ فرد کے مرنے پر کہے جاتے ہیں۔ لورین تو ہماری عمر کی ہوگی شاید ہم سے بھی چھوٹی۔''

''میرا خیال ہے کہ مسز گیلر تفصیل بتاتے ہوئے گریز کر رہی تھیں۔''

''لیکن کیوں؟''

''میں نہیں جانتی لیکن جب اس نے مریضوں کی پرائیویسی کا مسئلہ اٹھایا تو میں سوچ میں پڑگئی کہ کیا لورین کی موت کسی شرم ناک انداز میں واقع ہوئی تھی مثلاً منشیات کے زیادہ استعمال کی وجہ سے لیکن یہ صرف میرا اندازہ ہے۔'' جین سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا تم کسی اور سے یہ بات نہیں پوچھ سکتیں؟'' میری نے کہا۔

''مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لیے کسی کو اچھی طرح نہیں جانتی۔ دوسرے یہ کہ میں ابھی زیر تربیت ہوں لیکن اگر میں لورین بن جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکوں گی۔''

شام کا بقیہ وقت انہوں نے گولڈن پیکاک کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ یہ ایک نیک نام امدادی فیشن شو تھا جس میں میری ڈیزائنر کے طور پر حصہ لے رہی تھی۔ وہ فیشن کی دنیا میں ہونے والی جنونی کیفیت کے بارے میں بتا رہی تھی جس میں ڈیزائنر کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کے آئیڈیاز چوری نہ ہو جائیں۔

''کچھ ڈیزائنرز ایک دوسرے کی جاسوسی بھی کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ لیونارڈ بھی ان میں سے ایک ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مجھے اس سال گولڈن پیکاک میں حصہ لینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو اس نے مجھے ڈرنک کی دعوت دی کیونکہ میں نے کبھی اس پر بھروسا نہیں کیا اس لیے میں چوکنا ہوگئی اور محسوس کیا کہ وہ مجھے نشے میں مدہوش کرنا چاہتا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ امید کر رہا تھا کہ اس طرح وہ میرے آئیڈیاز کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے گا۔ حیرت ہے کہ بڑے بڑے فیشن ہاؤس بھی نوجوان ڈیزائنرز کی جاسوسی کرنے کے لیے ایجنٹوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے لائبریری تک چلے جاتے ہیں تاکہ جان سکیں کہ انہوں نے کون سی کتابیں ایشو کروائی ہیں۔ وہ ہماری ردی میں سے بھی کام کی چیزیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

میری کے اسٹوڈیو میں ایک فائل تھی جسے وہ ہمیشہ مقفل رکھتی تھی اور سیزن ختم ہونے تک کوئی چیز کوڑے دان میں نہیں پھینکتی تھی اور اپنے تمام مسترد شدہ ڈیزائن بھی آتش دان میں جلا دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی پریشانی عروج پر تھی جو جلد ہی ختم ہونے والی تھی کیونکہ گولڈن پیکاک کو شروع ہونے میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے اور اس میں جین، میری کے نئے ڈیزائنز کی ماڈلنگ کرنے والی تھی۔

ہفتے کے اختتام پر نرسنگ ہوم میں ایک کیئر کانفرنس ہوئی جس میں ہر یونٹ کے مریضوں کی کیفیت کا جائزہ لیا گیا۔ جس میں پورے اسٹاف نے شرکت کی۔ جین اس کانفرنس میں اپنی باری کی منتظر تھی۔ دوسرے مریضوں کی کیفیت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی گئی اس لیے انہیں جلدی نمٹا دیا گیا لیکن جب مسز گلی کی باری آئی تو گفتگو کافی طویل ہوگئی۔

''ہم نے پہلے بھی مسز گلی جیسے کیس دیکھے ہیں۔'' ہیڈ نرس نے کہا۔ ''جس میں اس طرح کے مریضوں کو ابلاغ میں

کچھ مشکل پیش آتی ہے۔ مسز گلی کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی بات بار بار دہراتی رہتی ہے۔''

جین بڑے غور سے پوری گفتگو سنتی رہی۔ اسے سوال کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ جب اسے موقع ملا تو وہ بولی۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ میں مسز گلی کے پس منظر یا لورین کے بارے میں کچھ جان سکوں۔ اس طرح شاید میں اسے اس کیفیت سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

اس بار دماغی صحت کے ڈائریکٹر نے جواب دیا۔ ''یہ سوچنے کی کوشش مت کرو کہ مسز گلی کا مسئلہ اس ٹیپ جیسا ہے جو رک رک کر چلتا ہے۔ وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ دماغ میں مسلسل خرابی کی صورت میں سامنے آ رہا ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں۔''

''گویا اسے یہ سمجھنے دیا جائے کہ میں لورین ہوں؟'' جین نے کہا۔

ڈائریکٹر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم اگر چاہو تو بھی اسے باز نہیں رکھ سکتیں۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ تم اس کی پوتی ہو۔''

اس عورت نے میز کا جائزہ لیا پھر جین کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''جب تم مسز گلی کے سامنے آئیں تو اس کا ردِعمل دیکھ کر ہم سب حیران رہ گئے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان تجربہ نہیں ہے۔ تمہیں اس بارے میں مزید مشاورت درکار ہوگی۔ اگر مجھ سے بات کرنا چاہو تو میرے پاس آ سکتی ہو۔ تمہیں ہمارے یونٹ سے تو کافی واقفیت ہو گئی ہوگی۔''

میٹنگ سے روانہ ہوتے وقت جین کو مسز گلی کی طبی حالت کے بارے میں بہتر آگاہی ہو چکی تھی لیکن لورین کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش ناکام رہی۔ اب جو اس نے کوشش کی تھی اس کے نتیجے میں یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مزید کچھ کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ دوسرے دن پارکنگ لاٹ کی طرف جاتے ہوئے اس کی ملاقات ایک ایسے پادری سے ہوئی جو مریضوں سے ملنے باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملے۔ پادری نے کہا۔

''ہیلو جین! میں سمجھتا ہوں کہ تم وہی لڑکی ہو جس سے مسز گلی نے باتیں کی تھیں؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔'' جین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا البتہ مجھے دیکھ کر اسے کسی کی یاد آ گئی۔''

''میں نے سنا ہے کہ وہ کوئی خوشگوار یاد تھی۔''

''ہاں یہ سچ ہے، وہ سمجھتی ہے کہ میں اس کی پوتی ہوں۔ شاید تم اسے نہ جانتے ہو، اس کا نام لورین تھا۔''

''نہیں لیکن میرے حلقے کی ایک عورت اسی عمارت میں رہائش پذیر ہے جہاں مسز گلی اور اس کی پوتی رہا کرتی تھیں۔ میری اونیل مجھے بتاتی ہے کہ لورین بڑی پیاری لڑکی تھی۔''

جین کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا، وہ بڑی مشکل سے اپنے اندرونی جوش پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''کیا مسز میری اونیل وہ عورت ہے جو مسز گلی سے ملنے آتی ہے؟''

''یہ ایک عمدہ خیال ہے۔ تم اس سے لورین کے بارے میں پوچھ سکتی ہو۔ میں تمہیں اس کا فون نمبر دوں گا۔ تم اسے بتا دینا کہ میں نے ہی تمہیں فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بالکل برا نہیں منائے گی۔ ویسے بھی وہ تنہا ہو گئی ہے۔ اس کے شوہر کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

جین نے فون کرنے کے لیے دوسرے دن تک انتظار کیا اور اس سے اگلے روز وہ مسز اونیل سے ملنے چلی گئی۔ وہ مسز گلی کے مقابلے میں کم عمر تھی اور اس کی طرح کمزور بھی نہیں لیکن بہت زیادہ صحت مند نہیں تھی اور چھڑی کے سہارے چلتی تھی۔

''لورین ایک باضمیر لڑکی تھی۔'' مسز اونیل نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ اس میں یہ خوبی کہاں سے آئی یقیناً وہ ماں پر نہیں گئی تھی جو ایک دن اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں اس کے باپ کو بالکل نہیں جانتی۔ لورین صرف سولہ سال کی تھی اور اسے اس عمر میں اسکول چھوڑ کر ملازمت کرنا پڑی تاکہ وہ اپنی دادی کی دیکھ بھال کر سکے۔'' یہ کہتے ہوئے مسز اونیل کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ ''لورین نے اس کا ہر طرح خیال رکھا۔ وہ اسے کھڑکی کے پاس رکھی کرسی میں بٹھاتی اور اسے مضبوطی سے کرسی کے ساتھ باندھ دیتی گو کہ اسے یہ اچھا نہیں لگتا لیکن وہ مجبور تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو دادی ادھر اُدھر ڈولتی پھرتی کیونکہ اس کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔''

مسز اونیل نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولی۔ ''وہ چھوٹی سی لڑکی ہر بات کا خیال رکھتی تھی گو کہ وہ دیکھنے میں چھوٹی نہیں لگتی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا اور تمہاری طرح خوب صورت تھی۔ اس کے بال تم سے زیادہ سیاہ تھے اور اس کی نیلی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ اگر وہ بے چاری عورت تمہیں لورین سمجھ رہی ہے تو اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں۔ تم لورین کی جڑواں بہن لگتی ہو۔''

اس نے ٹشو پیپر نکالا اور اپنی آنکھیں صاف کرتے

ہوئے بولی۔ ”اگر لورین کو نے پر واقع اسٹور تک بھی جاتی تو مجھے بتا دیتی۔ میں اس کی غیر موجودگی میں دادی کا خیال رکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ رات کو دیر سے گھر آتی تو میں اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ میں نے اس کا کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا پھر مجھے لورین میں کچھ تبدیلیاں نظر آئیں۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کیا کر رہی تھی، میں تو صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ بہت اچھے طریقے سے اپنی دادی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔“

مسز اونیل نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ”میں جانتی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے جب دو دن گزر جانے کے باوجود اس نے مجھے فون نہیں کیا ورنہ دیر ہونے کی صورت میں وہ مجھے مطلع کر دیا کرتی تھی۔ میرے شوہر خدا اس کی مغفرت کرے، نے مشورہ دیا کہ ہمیں پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔“ اس کی آواز کپکپانے لگی اور وہ بولی۔ ”میں اس بارے میں مزید بات نہیں کر سکتی۔“

وہ اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ لورین کیسے مری لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

”میری طرف سے مسز گلی کی خیریت پوچھ لینا۔“ وہ عورت مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں اس سے ملنے کے لیے آنا چاہ رہی تھی لیکن شاید یہ ہم دونوں کے لیے ہی بہتر نہ ہو۔ میں مسز گلی کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔“

”میں سمجھتی ہوں، جب مسز گلی کو تمہاری ضرورت تھی تو تم اس کے لیے جو کر سکتی تھیں، وہ کیا۔“

”تمہاری زبان سے یہ کہنا اچھا لگا۔ لورین بھی یہی کہا کرتی تھی۔“ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”لورین بہت خوش ہوگی کہ تم اس کی دادی کے پاس ہو۔“

وہ دونوں دروازے تک آئیں پھر مسز اونیل اچانک ہی رک گئی۔ اس نے جین کا بازو پکڑا اور اپنی چھڑی سے بیڈ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔ لورین کے پاس کچھ فینسی کپڑے تھے جو وہ یہاں رکھا کرتی تھی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے اس کی دادی کو پریشان کر دیا تھا جب سے لورین نے شام کے وقت یہ کپڑے پہننا شروع کیے تھے۔ ان میں سے ایک سرخ لباس تھا جسے مسز گلی بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اور جب لورین کو وہ لباس پہننا ہوتا تو وہ یہاں آجاتی۔“

یہ کہہ کر مسز اونیل نے الماری کھول کر ایک گارمنٹ بیگ اور میک اپ بکس کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”لورین نے کہا تھا کہ اگر اس کے ساتھ کچھ ہوجائے تو وہ چاہے گی یہ چیزیں میں رکھ لوں۔ یہ اس کی مہربانی تھی لیکن مجھ جیسی بوڑھی عورت شام کے لباس اور میک اپ بکس کا کیا کرے گی۔ مجھے تو کبھی ان چیزوں کو دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔“ اس نے جین کا ہاتھ دبایا اور بولی۔ ”میں بہت خوش ہوں کہ تم مجھ سے ملنے آئیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ چیزیں رکھ لو۔“

جین کچھ سوچتے ہوئے اپنی کار تک گئی اور ڈکی کھول کر اس میں گارمنٹ بیگ اور میک اپ بکس رکھ دیا پھر وہ کار چلاتی ہوئی واپس شہر کی طرف روانہ ہوئی لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی سوال بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ لورین کی موت کیسے واقع ہوئی؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا کام ہوسکتا ہے جس میں لورین کو شام کا لباس پہننے کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کوئی فنکار یا پھر کال گرل ہوسکتی تھی لیکن یہ سوال اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ کیا کام کرتی تھی البتہ یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ کیسے مری۔ رتھ ٹیلر کے کہنے کے مطابق اس کی موت چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔

جین نے گاڑی کا رخ قلب شہر کی جانب موڑ دیا۔ اسے اچانک ہی خیال سوجھا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ایک بغلی گلی میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہ دو بلاک پیدل چل کر بیالیسویں اسٹریٹ پر واقع لائبریری میں پہنچی، اندر داخل ہوکر اس نے ریفرنس روم کا رخ کیا جہاں بہت سے کمپیوٹرز رکھے ہوئے تھے۔ چند منٹوں میں ہی اخبار کی خبر کمپیوٹر کی اسکرین پر موجود تھی۔ اس نے خبر کو غور سے پڑھا۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا پھر اس کی انگلیوں نے مضبوطی سے میز کا کنارہ پکڑ لیا۔ اس خبر کے ساتھ ہی لورین کی تصویر بھی تھی جو شاید اس وقت کھینچی گئی تھی جب وہ سولہ برس کی تھی۔ خبر کے مطابق لورین کی لاش سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک لاوارث کار سے ملی تھی جو لاگوردیا ائرپورٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔

جین نے ایک گہری سانس لی اور کرسی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی کہ اسے اگلا قدم کیا اٹھانا چاہیے۔ دوپہر ہوچکی تھی اور اس بھاگ دوڑ میں اس کے ذہن سے گولڈن پیکاک کا خیال نکل گیا۔ اسے یاد آیا کہ شام سات بجے میک اپ کنسلٹنٹ کو آنا تھا۔ اس نے میری کو فون کر کے پیغام چھوڑ دیا۔ ”مجھے واپس آنے میں دیر ہوجائے گی لیکن سوزیٹ کے آنے تک پہنچ جاؤں گی۔“

لائبریری سے نکلتے وقت اس نے قریبی پولیس اسٹیشن کے بارے میں معلوم کیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی تاکہ اس کے حواس مجتمع ہوجائیں۔ استقبالیہ کلرک نے اسے تحقیقاتی یونٹ

میں پہلی منزل پر بھیج دیا جہاں دروازے پر سراغ رساں اسٹیوواک کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے سیاہ بالوں والے شخص نے اسے دیکھا اور اس کی نگاہیں جین پر جم کر رہ گئیں لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں ہی وہ شخص ہوں جس کے نام کی تختی دروازے پر لگی ہوئی ہے۔''

''میرا نام جین کورنش ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ مجھے ملاقات کا وقت دیا۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کمرے میں رکھی واحد کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''استقبالیہ کلرک نے مجھے بتادیا ہے کہ تم لورین گلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہو۔ کیا تم اس کی رشتے دار ہو؟''

''نہیں البتہ اس کی دادی کو جانتی ہوں۔ دراصل میں ہڈسن ہائٹس نرسنگ ہوم میں کام کرتی ہوں جہاں وہ داخل ہے۔ وہ بوڑھی ہے اور اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مجھے لورین سمجھتی ہے۔''

سراغ رساں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا نرسنگ ہوم نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟''

''نہیں، میں نے ان سے لورین کے بارے میں پوچھا تھا لیکن مریض کی پرائیویسی کے پیشِ نظر انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ وہ مرچکی ہے۔ میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ ابھی ابھی لائبریری سے آرہی ہوں جہاں میں نے کمپیوٹر پر پرانے اخبارات کی فائل دیکھی اور خبر کے مطابق اسے قتل کیا گیا تھا۔''

''یہ ہمارا قصور ہے کہ نرسنگ ہوم نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے ہی ان سے کہا تھا کہ اس کیس پر گفتگو نہ کی جائے۔''

''لیکن کیوں؟ یہ سب تو اخبار میں آچکا ہے۔''

''اخبار میں بہت سی خبریں چھپتی ہیں جنہیں لوگ نہیں دیکھتے یا جلدی بھول جاتے ہیں۔ یہ کیس ہمارے لیے بہت مشکل ثابت ہوا اور ہم اب بھی اس پر کام کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس کیس نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا ہے لیکن ہم اس کی زیادہ پبلسٹی نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے اخبار میں یہ خبر پڑھ لی ہے اس لیے اب تمہیں بھی وہ معلومات مل جائیں گی جو ہمارے پاس ہیں۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ اسے کیوں قتل کیا گیا؟''

''ہم نے کچھ مفروضے قائم کیے ہیں لیکن اگر مسز گلی بات کرسکتی تو شاید ہمیں کچھ اندازہ ہوجاتا لیکن وہ عورت اس قابل نہیں رہی۔'' پھر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں لورین سمجھ رہی ہے، کیا اس نے تم سے بات کی؟''

جین نے مسز گلی کا ردِعمل بتاتے ہوئے کہا۔ ''وہ حقیقت میں باتیں نہیں کررہی بلکہ جو کہا کرتی تھی، وہ دہرا رہی ہے۔ میں جب بھی اس کے پاس جاتی ہوں وہ ہر بار یہی کہتی ہے۔ میں نے اس سے دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا کہ وہ مجھے نہیں سن رہی۔''

سراغ رساں نے کرسی میں بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور بولا۔ ''شاید تمہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ تم لورین سے کتنی ملتی ہو۔''

''ہاں، اب میں جان گئی ہوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ کمپیوٹر اسکرین پر اس کی تصویر دیکھ کر میں کتنی حیران ہوئی۔''

''میں تصور کرسکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہیں دروازے پر کھڑا دیکھ کر مجھے بہت عجیب لگا۔''

''کیا تم لورین کو مرنے سے پہلے بھی جانتے تھے؟''

''نہیں لیکن اس کے بعد سے کافی وقت اس کے ساتھ گزارا۔''

وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب وہ جانے لگی تو سراغ رساں نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم رابطے میں رہو۔ میرے دو فون نمبر ہیں، دوسرا میرے گھر کا ہے۔ تم کسی وقت بھی مجھے فون کرسکتی ہو۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک ہال نما کمرے سے گزرے جہاں ایک پُرکشش سیاہ فام عورت فون پر کسی سے باتیں کررہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور حیرت سے جین کو دیکھنے لگی۔ واک نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جین سے بولا۔ ''یہ کلیو براؤن ہے۔ ہم اس کیس پر اکٹھے کام کررہے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر اس کا ردِعمل بالکل میرے جیسا تھا۔''

لفٹ میں داخل ہوکر اس نے نیچے کا بٹن دبایا اور بولا۔ ''یاد رہے کہ تم مجھے کسی وقت بھی فون کرسکتی ہو۔ ممکن ہے کہ تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات آجائے جس سے اس کیس میں مدد مل سکے۔ میں کل تمہیں فون کروں گا۔''

تقریباً پانچ بجے جین اپنے گھر پہنچی۔ جیسے ہی اس نے بیرونی دروازہ کھولا، میری دوڑتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے آئی اور بولی۔ ''شکر ہے تم آگئیں۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں دیر نہ

ہوجائے۔"

جین اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "پرسکون ہوجاؤ۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں آج کیا معلوم کر کے آئی ہوں۔"

میری نے اس کے بازو میں لٹکا بیگ اور ہاتھ میں میک اپ بکس دیکھا تو بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ لورین کی چیزیں ہیں۔"

"تمہیں یہ کہاں سے ملیں؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

میری ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ "اس کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی سنا دو۔"

جین نے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "لورین کو قتل کیا گیا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔" میری کی تقریباً چیخ نکل گئی۔ وہ خاموشی سے جین کی کہانی سنتی رہی جب وہ خاموش ہوئی تو بولی۔ "تم نے واقعی بہت مصروف دن گزارا۔ پہلے پادری پھر مسز اونیل، لائبریری اور اس کے بعد پولیس اسٹیشن۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"جب نرسنگ ہوم والوں کو معلوم ہوگا کہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں تو میری چھٹی ہوجائے گی پھر مجھے سوشل ورک میں ڈگری لینا پڑے گی۔"

میری کی آنکھوں میں بے قراری جھلکنے لگی۔ "نرسنگ ہوم کو بھول جاؤ۔ یہ قتل کا معاملہ ہے۔ تمہارے پاس اس لڑکی کے کپڑے ہیں انہیں ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیا تم نے یہ چیزیں پولیس کو دکھائی تھیں؟"

جین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ چیزیں میری کار کی ڈکی میں رکھی ہوئی تھیں۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"بہتر ہوگا کہ تم ابھی انہیں فون کردو۔"

جین نے اثبات میں سر ہلایا اور فون کی طرف بڑھی۔ اس نے اسٹیو کا نمبر ڈائل کیا اور اسے ان چیزوں کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے جواب میں کہا کہ وہ کلیو کو لے کر آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہے۔

جب وہ دونوں آئے تو جین نے ان سے میری کا تعارف کروایا اور وہ سب گیسٹ روم میں چلے آئے جہاں لورین کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ کلیو براؤن نے بیگ کھولا۔ پہلے اس میں سے ایک سرخ ساٹن کا لیس لگا ہوا گاؤن برآمد ہوا۔ اس نے احتیاط سے اسے بستر پر پھیلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سیاہ رنگ کی ٹوپی بھی تھی جس پر سرخ رنگ کی جھالر لگی ہوئی تھی۔

میری کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ جین کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ "یہ لوکا کا ڈیزائن کردہ ڈریس ہے جسے گزشتہ برس گولڈن پیکاک میں انعام ملا تھا۔"

واک مڑا اور بھویں سکیڑتے ہوئے بولا۔ "تم گولڈن پیکاک کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں ایک ڈیزائنر ہوں اور فیشن کی دنیا میں اس شو کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سال میں بھی اس میں حصہ لے رہی ہوں۔"

"یہ اس کی نقل بھی ہوسکتی ہے۔" کلیو نے کہا۔ "تم ذرا غور سے دیکھو۔"

میری نے تمام کپڑے دیکھے اور بولی۔ "یہ سب اصلی ہیں۔"

"تمہارے خیال میں ان کی کیا قیمت ہوگی؟" کلیو براؤن نے پوچھا۔

میری کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "بہت زیادہ، لوکا نے انہیں سستے داموں فروخت نہیں کیا ہوگا۔"

"کیا اس نے کسی کو یہ بلا قیمت ہی دے دیے ہوں گے؟"

میری تیز لہجے میں بولی۔ "ایسا ممکن نہیں تاوقتیکہ وہ کوئی ایسی لڑکی ہو جس میں وہ دلچسپی رکھتا ہو۔ میں لوکا کو بہت زیادہ نہیں جانتی البتہ وہ خوب صورت لڑکیوں بالخصوص سنہرے بالوں والی کو پسند کرتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ میری پسندیدہ شخصیت نہیں ہے۔"

اسٹیو واک کچھ نوٹس لیتا رہا اور اس دوران کلیو براؤن نے بیگ میں موجود بقیہ چیزیں بھی دیکھ ڈالیں۔ ان میں ایک جوڑا جوتوں کا اور ایک چھوٹا سا سلک کا بنا ہوا بیگ بھی تھا۔

"اب میک اپ بکس بھی دیکھ لو۔" اسٹیو نے کہا اور انتظار کرنے لگا کہ کلیو سارے کپڑے واپس بیگ میں رکھ دے پھر کلیو نے بیڈ پر ایک پلاسٹک شیٹ بچھائی اور بکس میں سے چیزیں نکال کر رکھنے لگی۔ ان میں لپ اسٹک، آئی شیڈ، مسکارا، فاؤنڈیشن، آئی لائنر، پاؤڈر اور برش وغیرہ تھے۔ کلیو نے اوپر کی ٹرے باہر نکالی اور بکس کو الٹ دیا۔ اس میں سے سنہری، سبز اور سرخ ریپر میں لپٹی چاکلیٹس نکلیں۔ ان کے ساتھ گم کی اسٹکس بھی تھیں۔ اسٹیو نے مٹھی بھر کر وہ چیزیں اٹھائیں اور انہیں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر الگ الگ کرنے لگا۔

اس نے ایک ایک کر کے سب چیزیں واپس شیٹ پر رکھ دیں۔ اب اس کی ہتھیلی پر دو ڈائمنڈ رنگ اور ایک ائر رنگ

چمک رہی تھیں۔ کلیو پہلے ہی بیڈ پر رکھی چیزیں چھانٹ چکی تھی۔ اس میں سے بھی ایسی اشیا برآمد ہوئیں۔

''چھ انگوٹھیاں اور پانچ بندے ملے ہیں۔'' وہ کلیو کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ ہمیں قتل کا محرک مل گیا ہے۔ وہ یہ چیزیں لے کر فرار ہو رہی تھی اور انہوں نے ان کی خاطر اس کا پیچھا کیا۔''

لیونگ روم میں اسٹیو نے انہیں پولیس کی معلومات کے بارے میں بتایا۔ ''ہم کچھ عرصہ قبل ایک گروہ کا پیچھا کررہے تھے جو جواہرات چوری کرتا ہے۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کو تربیت دیتے ہیں اور انہیں بنا سنوار کر اعلیٰ درجے کی تقریبات میں بھیجتے ہیں۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ لورین بھی ان لڑکیوں میں شامل تھی جو زیورات چراتی ہیں۔ ان لڑکیوں نے مختلف تقریبات میں زیورات چوری کیے۔ اس کے کئی ماہ بعد گھروں میں بھی ڈاکے پڑے لیکن ان دونوں وارداتوں میں کوئی تعلق قائم نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں ایک انشورنس کمپنی کے سراغ رساں نے اس کا پتا لگایا۔ اس کمپنی کے بہت سے گاہکوں نے زیورات کے غائب ہونے کی رپورٹ درج کروائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سارے زیورات ایسی ہی تقریبات سے چرائے گئے تھے۔''

واک نے جین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب لورین کی لاش ملی تو ہم نے سوچا کہ شاید یہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک ہو۔ اگر اس میں سے کوئی بھی جیولری چوری شدہ زیورات سے تعلق رکھتی ہو تو ہمیں اس بات کا یقین آجائے گا۔''

وہ اور کلیو جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے وہ سامان بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ واک نے کہا۔ ''ہمیں اس بارے میں کچھ سوچ بچار کرنا ہے۔ ہم تم سے کل بات کریں گے لیکن اس دوران تم کسی سے بھی اس بارے میں بات نہیں کرو گی۔ میں نہیں چاہتا کہ نرسنگ ہوم والے بھی یہ جان سکیں کہ تمہیں لورین کے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے۔ جب مناسب وقت آئے گا تو ہم انہیں بتادیں گے۔''

اگلے دن صبح سویرے جین کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے واک بول رہا تھا۔ ''میں تمہارے نکلنے سے پہلے بات کرنا چاہ رہا تھا اس لیے اتنی جلدی فون کیا۔ میں اور کلیو تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں ایک بجے روزینی پر مل سکتی ہو؟ یہ اٹالین ریستوران کولمبس پر واقع ہے۔''

جین نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ گزشتہ شب ہونے والا میک اپ سیشن کا وقت تبدیل ہو گیا تھا اور اب اسے صبح آٹھ بجے ہونا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ دس بجے سے پہلے نرسنگ ہوم نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڑھ بجے کا وقت بہتر رہے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

مقررہ وقت پر جین وہاں پہنچی تو واک کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''کلیو کو کوئی اور کام پڑ گیا تھا اس لیے میں اکیلا ہی آگیا۔''

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد واک نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے لیے کچھ کام کرو۔''

وہ اس کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

''ہم تمہیں گزشتہ شب یہ بات نہیں بتانا چاہ رہے تھے لیکن اب تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔ گزشتہ برس چوروں کے اس گروہ نے گولڈن پیکاک میں واردات کی اور وہاں سے دو چوریوں کی اطلاع ملی۔ اس کے بعد ان گھروں میں ڈاکے ڈالے گئے جن کے مکین اس فیشن شو میں موجود تھے۔ ہم نے آج صبح چیک کیا تو معلوم ہوا کہ لورین کے میک اپ بکس سے ملنے والی دو انگوٹھیاں ان عورتوں کی تھیں جو اس تقریب میں موجود تھیں۔ زیورات چوری کرنے والوں کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہم ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ تھوڑا سا غیر محتاط ہو گئے۔ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات ہیں کہ وہ اس سال دوبارہ گولڈن پیکاک میں واردات کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ لورین نے وہ انگوٹھیاں چرائی ہوں گی؟''

''لگتا تو یہی ہے کیونکہ یہ اس کے سامان سے برآمد ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ وہ غلط لوگوں کے لیے کام کررہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی دادی سے مخلص نہیں تھی۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنے لیے کسی صحیح راستے کا انتخاب نہ کرسکی۔''

''لیکن اس نے یہ کام کس طرح کیا؟''

''وہ زیورات بہت چھوٹے تھے۔ انہیں چھپانا اور نگلنا آسان تھا۔''

''نگلنا؟'' جین نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، انہیں اس کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔''

جین نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب باتیں میرے سر سے گزر رہی ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''ہم اس مفروضے پر کام کر رہے ہیں کہ جس شخص نے لورین کا اتنا خیال رکھا، وہ اس سال بھی گولڈن پیکاک میں آئے گا۔ اگر اس نے لورین کے لیے وہ لباس خریدے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے بہت زیادہ چاہتا تھا یا کسی خاص تقریب میں شرکت کرنے اسے بھیجا گیا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی چیزیں لے کر بھاگ رہی ہے تو اس کا رویّہ تبدیل ہو گیا۔''

''لہٰذا اس نے لورین کو قتل کر دیا۔''

واک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا خیال ہے کہ اس نے خود ہی اپنے آپ کو گولی ماری۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟'' جین نے پوچھا۔

''اسے بہت قریب سے گولی ماری گئی۔ وہ کوئی ایسا شخص ہے جسے وہ جانتی تھی۔'' واک لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور مرنے سے کچھ دیر پہلے وہ اس شخص کے ساتھ بے تکلف ہو رہی تھی۔''

جین نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ''تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس شخص نے قتل کرنے سے پہلے اس سے پیار بھری باتیں کیں؟'' پھر وہ خوف کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی؟''

''ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے لیکن ہمیں کشمکش کی کوئی علامت نہیں ملی۔''

''لورین کتنے عرصے سے اس گروپ کے لیے کام کر رہی تھی؟''

''ہم اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔''

''تمہارے خیال میں دادی کو اس کا پتا تھا؟''

''وہ عورت بیمار تھی اور اسے لورین کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں تھا۔''

جین نے پوچھا۔ ''تم نے مسٹر اور مسز اونیل سے بات کی تھی؟''

''ہاں، وہ صرف دادی کی مدد کر کے ہی خوش تھے اور انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لورین کیا کر رہی تھی۔''

جین مزید کچھ سوالات کرنا چاہ رہی تھی لیکن ان کے جوابات صرف لورین کے پاس تھے۔ واک نے بولنا شروع کیا۔ ''فیشن شو سے پہلے ایک استقبالیہ ہو گا۔ یہ ایسا موقع ہوتا ہے جہاں سب موجود ہوتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو کہ تمہاری شکل لورین سے بہت ملتی ہے۔ اگر تم لورین کا سرخ گاؤن پہن کر اس استقبالیہ میں جاؤ اور وہ شخص بھی وہاں موجود ہوا تو اسے شدید جھٹکا لگے گا اور ہمیں ڈر ہے کہ وہ خوف کے عالم میں سب کچھ اگل دے گا۔''

جین ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس اسکیم میں اگر مگر بہت ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کیا معلوم ہونا چاہیے؟''

''اس گروہ کے بارے میں ہم بہت سی باتیں نہیں جانتے لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہوں نے کبھی کوئی قتل نہیں کیا۔ ہم نے کئی خفیہ ایجنٹوں کی ڈیوٹی لگائی ہے۔ اس کے علاوہ میں بھی تمہارے ساتھ گوند کی طرح چپکا رہوں گا۔''

ریستوران سے نکلتے وقت جین نے کہا کہ وہ میری سے بات کر کے جواب دے گی لیکن وہ خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے جب اس نے میری سے بات کی تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہہ دیا۔ ''تمہیں اس کے لیے راضی نہیں ہونا چاہیے۔''

جین نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔ ''وہ بہت بڑے گینگسٹرز ہیں، کوئی مرغی چور نہیں۔ کیا تم اپنے آپ کو مار سکتی ہو؟ کیوں...... مجھے بتاؤ کہ تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو مجھے کوئی وجہ بتاؤ؟''

''شاید اس لیے کہ جو کچھ لورین کے ساتھ ہوا وہ مجھے پسند نہیں آیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ صرف تنہا ہی نہیں ہوئی بلکہ اس پر دادی کی ذمے داری بھی آ گئی۔ وہ بھی بھاگ کر کہیں جا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ ایسے کام میں پھنس گئی جس کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔''

میری نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولی۔ ''تم واقعی بہت نرم دل ہو لیکن تم لوگوں کی بھلائی میں نہ پڑو۔ یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ میری بات غور سے سنو اس طرح تم اپنے آپ کو خود ہی مار لو گی۔''

''میں سڑک پار کرتے ہوئے بھی مر سکتی ہوں۔''

''ہاں بشرطیکہ تم احتیاط سے سڑک پار نہ کرو اور اب تم کیا کر رہی ہو، تم آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھ رہی ہو۔'' میری کھڑی ہو گئی اور جین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اس کام سے دور رکھنے کی خاطر شو سے دستبردار ہو جاؤں گی۔''

جین نے اسے گھورا اور بولی۔ ''یہ پاگل پن ہے، تم ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''تم مجھے پاگل مت کہو، ابھی اس سراغ رساں کو فون کر کے منع کر دو اور اگر وہ تمہیں اکسانے کی کوشش کرے......''

''وہ ایسا نہیں کرے گا اور نہ ہی اس نے پہلے ایسی کوئی کوشش کی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ پہلے تم سے بات کروں گی۔''

''اور اب تم میری بات نہیں سن رہی ہو۔ جس لڑکی کی جگہ وہ تمہیں پیش کر رہے ہیں، اسے دل کے قریب تین گولیاں لگی تھیں اور وہ مرگئی۔ تم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتیں۔ تم پر اس کا کوئی قرض نہیں اور نہ ہی تم نے اس کی دادی پر کوئی احسان کیا ہے۔ وہ بے چاری بھی عنقریب مرنے والی ہے لیکن تمہارے سامنے تو ابھی پوری زندگی ہے۔''

جین سوچ رہی تھی کہ وہ واک کو کیا جواب دے۔ میری نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور بولی۔ ''ہم صبح بات کریں گے۔''

رات کے کسی پہر جین کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ لیونگ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور میری ایک بلب کے نیچے اپنے ہاتھ میں چھوٹا سا ایمبرائڈری کا چھلا لیے بیٹھی تھی۔ وہ رات کے اس پہر اسے دیکھ کر حیران ہوئی اور بولی۔ ''تین بج رہے ہیں، تم اس وقت کیا کر رہی ہو؟''

حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی تتلی کاڑھ رہی تھی۔ یہ اس کا ٹریڈ مارک اور لکی چارم تھا۔ اس کی ماں نے میری کی پیدائش سے ایک رات قبل خواب میں زرد تتلیوں کا بادل دیکھا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام میری پوسا رکھا گیا۔ یہ ہسپانوی لفظ ہے جس کے معنی تتلی کے ہیں۔

میری نے وہ چھلا ایک طرف رکھ دیا اور بولی۔ ''میں نے تمہارے سراغ رساں سے بات کی تھی۔''

''کیا؟'' جین حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں، میں جانتی تھی کہ تم اسے کیا جواب دو گی اس لیے اس سے چند باتیں کرنا ضروری تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔''

جین کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔ ''تم دونوں کے درمیان اور کیا باتیں ہوئیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں، البتہ وہ کہہ رہا تھا کہ گولڈن پیکاک میں تمہاری حفاظت کے لیے جائے گا۔''

جین قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''وہاں رومانس کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ اس کی ذمے داری ہے کہ وہ میری حفاظت کرے۔''

''وہ اپنی ذمے داری بہتر طور پر نبھائے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں پوری میکسیکن فوج کو اس کے پیچھے لگا دوں گی۔''

جین خود بھی خوف محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میری، پیکاک ایونٹ تمہارے لیے ایک بڑی تقریب ہے اور اب مجھے بھی اس میں دھکیل دیا گیا ہے۔''

میری نے قینچی اٹھا کر سفید سلک کا ایک مثلث نما ٹکڑا کاٹا جس پر سنہری تتلی بنی ہوئی تھی اور اسے جین کو دیتے ہوئے بولی۔ ''ہفتے کی شب تم یہ لباس پر لگاؤ گی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ توہم پرستی ہے لیکن یہ مجھے اچھا لگے گا۔ میں نے تمہارے سراغ رساں سے کہہ دیا ہے کہ کل صبح لورین کا سرخ گاؤن اور ٹوپی یہاں پہنچا دے۔''

دوسری صبح جب وہ شاور لے کر باہر آئی تو اسے واک کی کال موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میری نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں گولڈن پیکاک میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سے پہلے ایک دفعہ مل لیں تاکہ ہمارے درمیان ہم آہنگی بڑھ جائے اور ہم ایک کپل دکھائی دیں۔ اگر تم فارغ ہو تو میں شام سات بجے تمہیں لے لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم رینبو روم چلیں۔''

ٹھیک سات بجے وہ اسے لینے آگیا۔ اس نے عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصا پرکشش نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر جین کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے افسانوی انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور جین اس کا بازو تھام کر چلنے لگی۔ رینبو روم کی افسانوی دنیا میں پہنچ کر اسے گرد و پیش کا ہوش نہ رہا اور واک کی مسحور کن باتوں میں کھو گئی۔ یہ اس کی زندگی کی یادگار شام تھی۔

بالآخر ہفتے کی شب بھی آن پہنچی۔ والڈروف آسٹوریا کے بال روم کو گولڈن پیکاک کے لیے شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا۔ میری صبح سے ہی وہاں پہنچی ہوئی تھی تاکہ انتظامات کا جائزہ لے سکے۔ جب وہ دونوں ہال میں پہنچے تو کئی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ جین اس مخصوص لباس میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ مجمع کی طرف بڑھتے ہوئے واک نے سرگوشی کے انداز میں جین سے کہا۔ ''مجھ سے قریب رہو۔'' وہ کلیو براؤن کے پاس سے گزرے لیکن منصوبے کے مطابق انہوں نے بیگانگی کا انداز اختیار کیا۔ اس

نے انتہائی دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا اور اس میں خاصی پُرکشش نظر آرہی تھی۔

میری پردے کے پیچھے سے نمودار ہوئی جہاں تمام ڈیزائنر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے لمبا سیاہ گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ یہ ان کے منصوبے کا حصہ نہیں تھا اس لیے جین اور اسٹیو پوری طرح چوکنا ہوگئے۔

''لوکا بھی یہاں ہے۔'' میری نے آہستہ سے کہا۔ ''تم اسے لباس سے پہچان سکتے ہو۔ اس نے گہرے میرون رنگ کی جیکٹ پہن رکھی ہے جس پر سنہری شولڈر لگے ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

واک اور جین نے نظریں گھما کر ہال کا جائزہ لیا اور بالآخر وہ انہیں نظر آگیا۔ اس کے سنہری شولڈر تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ بظاہر تنہا نظر آرہا تھا اور دوسرے کئی مہمانوں کی طرح اس کی نظریں ہال میں بھٹک رہی تھیں۔ شاید وہ کسی شناسا کی تلاش میں تھا۔ ایک ویٹر اس کے پاس سے گزرا تو اس نے ٹرے سے مشروب کا ایک گلاس اٹھایا اور دوبارہ ہال کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس کا ہاتھ فضا میں معلق ہوگیا اور اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت نظر آنے لگی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو لیکن وہ بھوت نہیں بلکہ جین تھی۔ اس نے شیمپین کا گلاس میز پر رکھا اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

واک اور جین دونوں اس کی حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ واک نے اپنے کوٹ کے گریبان میں لگا ہوا بٹن دبایا جس سے دیگر محافظ چوکنا ہوگئے۔ جب لوکا ان کے قریب پہنچ گیا تو واک فوراً ہی جین کے سامنے آگیا۔

''لورین۔'' لوکا بے یقینی کے انداز میں زور سے بولا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس کا ہاتھ فوراً ہی اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا۔ واک اس حرکت کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا اس نے ہلکا سا پنچ لگایا اور لوکا زمین پر گر گیا۔

اسی وقت آرکسٹرا کی آواز گونجی اور سب لوگ اس جانب متوجہ ہوگئے۔ فیشن شو کا آغاز ہوچکا تھا۔ اس وقت تک واک کی نفری وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے لوکا کو ہال سے باہر لے گئے۔ کلیو نے جین کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اس جانب چل دی جہاں میری انتظار کررہی تھی۔

دونوں سہیلیاں بغل گیر ہوگئیں۔ میری نے لباس تبدیل کرنے میں جین کی مدد کی اور چند ہی منٹوں میں وہ میری کا ڈیزائن کردہ لباس پہن چکی تھی۔ سوزیٹ نے اسی مناسبت سے اس کا میک اپ بھی تبدیل کردیا اور اب وہ اپنی باری کا انتظار کررہی تھی پھر وہ لمحہ آگیا اور وہ ریمپ کی جانب چل دی۔ اس کا ہلکے سبز رنگ کا شیفون والا ڈریس اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس برس گولڈن پیکاک کو زبردست کامیابی ملی۔ میری کو بیسٹ ڈیزائنر کا ایوارڈ ملا۔ اس کے تیار کردہ ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس سب پر سبقت لے گئے۔ اس خوشی میں جین اور میری نے اگلے روز واک اور کلیو کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ دونوں واک سے واقعے کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین تھیں۔ وہ بھی ان کی بے تابی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ چنانچہ اس نے اصل موضوع کی طرف آنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کردیں اور میری کو چھیڑنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے ڈیزائن بے شک اچھے ہوں گے لیکن سارا کمال جین کے قیامت خیز حسن کا ہے اور اسی وجہ سے میری کے ڈیزائن پسند کیے گئے کیونکہ وہ جین کے خوب صورت جسم پر خوب جچ رہے تھے۔ جین اپنی تعریفیں سن کر جھینپ رہی تھی۔ اس نے ایک ادا سے واک کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

''ہم سب لوکا کے بارے میں سننا چاہتے ہیں۔''

واک نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''اوہ میرے خدا، وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ ہر خوش قسمت لڑکی کی زبان پر اسی کا نام رہتا ہے۔'' پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''لورین کے سامان سے ملنے والے کپڑوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ لوکا اور لورین کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ وہ لوکا کے لیے کام کرہی تھی اور وہ اسے پسند بھی کرتا تھا پھر لورین کے دل میں بے ایمانی آگئی اور اس نے لوکا کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے وہ قتل کردی گئی۔ ہمیں اس پر پہلے سے شبہ تھا لیکن ہم چاہ رہے تھے کہ کسی طرح لورین کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہوجائے۔ جین سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں یہ منصوبہ آیا کیونکہ وہ لورین سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتی ہے۔ لوکا بھی پہلی نظر میں دھوکا کھا گیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ لیبارٹری رپورٹ سے ثابت ہوگیا کہ لوکا کے پاس سے جو ہتھیار برآمد ہوا اسی سے لورین کو قتل کیا گیا تھا۔ وہ صرف ڈیزائنر ہی نہیں بلکہ چور بھی ہے اور اس نے تمام چوریوں کا اعتراف کرلیا ہے۔''

واک نے یہ سب بتاتے ہوئے جین کی طرف پیار بھرے انداز میں دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

فاصلے

غلام قادر

زندگی کی کئی مسافتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو روح طے کرلیتی ہے... لیکن ہم ان کو وقت کے پیمانے سے نہیں ناپ سکتے... ایسی مسافتیں انسان کی فطرت و مزاج پر دور رس اثرات ثبت کردیتی ہیں۔ ان کی کردار سازی کی تشکیل میں نمایاں حصہ انہی مسافتوں کی دین ہوتا ہے۔ ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی کہانی کا آغاز و انجام... جنہیں گردشِ حالات نے... ٹھنڈے مزاج کے صلح پسند انسان میں ڈھال دیا تھا... بات کتنی ہی اشتعال انگیز ہو... حالات کتنے ہی ناساز گار ہوں... وہ نہ برہم نہ مایوس... شکوہ نہ گلہ... دل کی گہرائیوں میں لاکھ ہیجان برپا ہوں... چہرے پر برہمی یا پریشانی کی کوئی لکیر نہیں... سمندر کے مانند گہرائیوں میں شوریدہ سری مگر سطحِ آب پر پُرسکوت و پُرسکون...

بچھڑے ہوئے دو مہکتے پھولوں کا ملاپ...... جن کی خوشبوئیں آپس میں ملتی تھیں......

میں بالکل بھی بستر سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن کوئی تھا جو بیل پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا تھا اور واضح طور پر بتا رہا تھا کہ جب تک دروازہ نہیں کھلے گا، وہ جائے گا نہیں۔ میں نے گھڑی کی جانب نگاہ کی جو سات بج کر دس منٹ ہونے کا اعلان کررہی تھی۔

”کون آگیا اس وقت کُتّے کی...“ میں نے وہی کچھ کہا جو عام دنوں میں دیر سے اٹھنے کے عادی فرد کو کہنا چاہیے تھا جبکہ وہ چھٹی کا دن تھا اور رات میں گھر بھی دیر سے واپس آیا تھا۔

گھنٹی نے ایک مختصر وقفے کے بعد دوبارہ بجنا شروع کیا تو مجھے بستر چھوڑنا ہی پڑا۔

”آرہا ہوں بھئی۔“ میں نے کہا اور ساتھ ہی آہستہ لہجے میں چند غیر پارلیمانی لفظ ادا بھی کیے اور تب ہی مجھے یاد آیا کہ دروازے کی گھنٹی بجنے سے پہلے میرا موبائل بھی بجتا رہا تھا جسے آف کرکے میں نے اپنی نیند جاری رکھی تھی۔

”زیتون تو نہیں ہوسکتی۔“ میں نے گھر کے کام کرنے والی ملازمہ کے بارے میں سوچا۔ وہ نو بجے سے پہلے نہیں آتی تھی اور اسے بیل بجانے کی ضرورت بھی نہیں تھی اس کے پاس دروازے کی اضافی چابی موجود تھی۔

میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے تک پہنچا لیکن دروازہ کھلتے ہی جو چہرے نظر آئے، وہ ہوش اُڑانے، پیروں کے نیچے سے زمین سرکانے، ہاتھوں کے طوطے اُڑانے اور چودہ طبق روشن کرنے کے لیے کافی تھے۔

”میاں گھر کے اندر نہیں بلواؤ گے؟“ ان میں سے وہ بولا جو سب سے آگے کھڑا تھا۔ یہ وہ تھا جو ان چاروں میں سب سے بڑا تھا یعنی عملاً وہی اس بدمعاش ٹولے کا سربراہ تھا۔ اپنے حلیے سے وہ کسی کالج کا پروفیسر لگتا تھا۔ تراشیدہ اور سلجھے ہوئے بالوں کے ساتھ چہرے پر بڑی سی عینک لگائے تمام معاملات میں اس کا فیصلہ آخری فیصلہ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اس کی پروفیسری کا تاثر تب تک ہی رہتا جب تک وہ اپنی

زبان کو حرکت نہ دے۔ پہلا لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلتا اور اس کی جہالت واضح ہونے لگتی۔

''جی... جی... بھائی تشریف لائیے۔'' لیکن کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ ''کسی کے باپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ کو کہیں داخل ہونے سے روکے۔''

وہ چار بھائی تھے۔ اختیار الدین، احسان الدین، انتظار الدین اور عبادت الدین چاروں کے نام ساتھ' الدین کا لاحقہ ضرور لگا تھا لیکن دین سے ان کا صرف نام کی حد تک ہی تعلق تھا ورنہ کون سا ایسا غیر قانونی کام تھا جس میں انہوں نے نام پیدا نہیں کیا تھا۔

''میاں کھڑے کیوں ہو، تم بھی بیٹھ جاؤ۔'' سب سے بڑے بھائی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا اور مجھے ہوش آیا کہ میں کھڑا کیوں ہوں۔

''میں آپ کے لیے کچھ لاتا ہوں۔'' میں نے اپنے کھڑے رہنے کا جواز پیدا کرنا چاہا تو وہ چاروں ہنس دیے۔

ان چاروں کو دیکھ کر کوئی بھی شخص پریشان ہو سکتا تھا لیکن میری ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ ان چاروں کے بارے میں جو کہانیاں عام تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ چاروں کہیں بھی ایک ساتھ نہیں جاتے تھے۔ اگر کسی تقریب میں چاروں کا جانا انتہائی ضروری ہوتا تب بھی دو جاتے تھے اور پہلے دو کی واپسی کے بعد دوسرے دو جاتے تھے۔

''بھائی صاحب یہ بیڈ ٹی والا لونڈا ہے۔ چائے پیے بغیر اس کی آنکھ نہ کھلے گی۔'' احسان الدین نے ہنستے ہوئے بڑے بھائی کو مخاطب کیا... وہ چاروں اس طرح ہنسنے لگے جیسے احسان الدین نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''بھئی بات تو صحیح کر رہا ہے۔ پر چائے بنائے گا کون، اس کی نوکرانی تو دو ڈھائی گھنٹے بعد آئے گی۔'' اس بار انتظار الدین نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی .. مگر اس دفعہ وہ ہنسے نہیں تھے صرف مسکرا دیے تھے۔

''چل بھئی عبادت الدین اپنا کام شروع کر۔'' سب

سے بڑے بھائی نے سب سے چھوٹے بھائی کو حکم دیا اور چھوٹے بھائی نے بغیر کسی حجت کے اپنی جگہ چھوڑ دی جیسے سپاہی کو جنرل نے حکم دیا ہو۔

''آپ تکلیف نہ کریں میں...'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن اختیار الدین نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے ذیشان میاں کہ تم لوگ جس طرح کی چائے پیتے ہو، وہ ہمارے لیے جوشاندہ ہے۔'' اختیار الدین نے کہا اور باقی دونوں نے ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا۔ عبادت الدین تو کمرے سے جا چکا تھا۔

''اور دوسری بات یہ ہے شانی میاں کہ ہم نے پہلے ہی تمہیں صبح صبح اٹھا کر کافی تکلیف دے دی ہے۔'' اختیار الدین نے کہا اور تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''بھائی صاحب لونڈا پریشان ہو رہا ہے۔ اسے بتا دو کہ ہم غلط نیت سے نہیں آئے۔'' انتظار الدین نے اپنے انداز میں بڑے بھائی سے کہا۔

''کیا بتائیں، وہ خود سمجھدار ہے۔'' اختیار الدین نے ناراض انداز میں کہا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہو مگر ہماری بدنامی ہم سے پہلے ہر جگہ پہنچ جاوے ہے۔'' انتظار الدین نے پُراصرار انداز میں کہا۔

''کیوں بھائی ذیشان یہ صحیح کہہ رہا ہے؟'' اختیار الدین نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے صرف کچھ حیران ضرور ہوں۔'' میں نے مصلحت کی الف سے ی تک کو ذہن میں رکھ کر جواب دیا۔

''میاں حیراتی کا ہے کی؟'' اختیار الدین نے عجیب سے انداز میں سوال کیا۔

''آپ خود تکلیف اٹھانے کے بجائے مجھے طلب کر لیتے۔'' میں نے کہا اور اختیار الدین عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ابے تیرا کیا خیال ہے کہ ہم اُلّو کے پٹھے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہ آئی۔'' اختیار الدین نے کہا اور مجھے احساس ہو گیا کہ مجھ سے کوئی بڑی غلطی ہو گئی ہے جس پر یہ غنڈوں کا سردار ناراض بھی ہو سکتا ہے۔

''میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا بھائی۔'' میں نے لجائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن اس کے تاثرات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''سوچ نہیں سکتا لیکن کہہ یہی رہا ہے تُو۔'' اختیار الدین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''میری بات سے آپ کو تکلیف ہوئی تو میں معذرت چاہتا ہوں۔'' میں نے جان کی امان پانے کے لیے ہتھیار پھینک دیے۔

''تو نے تو بتایا تھا کہ بڑا سمجھدار اور پڑھا لکھا لمڈا ہے پر یہاں تو تیری بات الٹی ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔'' اختیار الدین کا مخاطب اس بار اس کا اپنا بھائی احسان الدین تھا۔

''یہ سب بیڈ ٹی نہ ملنے کی وجہ سے ہے بھائی صاحب۔'' احسان الدین نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ تینوں پھر سے ہنسنے لگے۔

''ابے عقل کے کوڑھی کوئی ایسی ہی بات ہوگی کہ ہم چاروں بھائی اس طرح تیرے پاس آئے ہیں۔'' اختیار الدین نے کہا اور میرے پاس سر ہلانے اور خود کو عقل کا کوڑھی سمجھنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''سولہ جماعتیں پاس کرنے کے بعد اتنی عقل تو تجھ میں آجانی چاہیے تھی کہ کوئی ایسی ہی رازداری کی بات ہوگی کہ ہمیں اتنے سویرے تیرے پاس آنا پڑا۔'' اختیار الدین نے کہا اور میری گردن ایک بار پھر تائید میں ہلنے لگی۔

''ابھی عبادت کو چائے لے آنے دو بھائی صاحب پھر دیکھنا کیسی سمجھداری کی باتیں کرتا ہے یہ۔'' احسان الدین نے ایک بار پھر بیڈ ٹی کو نشانہ بنایا تھا۔

''بات ایسی ہی تھی کہ نہ تجھے اپنے اڈے پر بلا سکتے تھے اور نہ تیری نوکرانی کے سامنے بات کر سکتے تھے۔'' اختیار الدین نے کہا اور میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''میاں گھر تو کافی اچھا سجایا ہوا ہے۔'' اختیار الدین نے خاموشی کا وقفہ ختم کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی ڈیکوریشن کی تعریف کی۔

''جی پسند کرنے کا شکریہ۔'' میں نے کہا اور اختیار الدین نے ایک بار پھر تعریفی نظر ڈالنی شروع کر دی۔

''کتنے کمرے ہیں؟'' اختیار الدین نے سوال کیا۔

''تین بیڈروم ہیں اور ڈرائنگ و ڈائننگ روم۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''پانچ کمرے ہوئے پھر تو۔'' اختیار الدین نے شاید اپنے حساب داں ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش کی جس کی تصدیق کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ عبادت الدین ہاتھ میں ٹرے اور ٹرے میں سلیقے سے چائے کے مگ لیے آتا ہوا نظر آیا۔ میرا دل چاہا کہ کہہ دوں کہ جتنا سلیقہ تم میں ہے، وہ ثابت کرتا ہے کہ پرائے گھر جاکر خوش رہو گے۔ لیکن چونکہ مجھے اپنی جان عزیز تھی اس لیے میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

سب سے پہلے عبادت الدین نے چائے میرے سامنے ہی رکھی تھی اور بہت آہستگی سے کہا۔ ''چینی ایک چمچ ڈالی ہے۔'' اور میں نے یوں سر ہلایا جیسے اس نے بہت بڑا کام کیا ہو۔

تینوں بھائیوں کو چائے دینے کے بعد عبادت الدین نے اپنا مگ اٹھایا اور وہیں جاکر بیٹھ گیا جہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔

''وہ تمہاری نوکرانی تو نو بجے تک آئے گی؟'' اختیار الدین نے سوال کیا۔

''کبھی نو بجے کبھی ساڑھے نو...'' میں نے وہی جواب دیا جو حقیقت تھی۔ اختیار الدین نے ایک بار پھر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے۔

''ایک گھنٹا تو ہے ہمارے پاس۔'' اختیار الدین کا سوال عمومی تھا لیکن میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ میں نے کوشش کی کہ یہ ظاہر نہ کروں کہ میں پریشان ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ اختیار الدین کے اس فقرے کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بلیک وارنٹ پڑھ کر سنایا جانے والا ہے۔

''سب سے پہلی بات تو اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھالو کہ ہم تمہارے بارے میں ایک ایک چیز جانتے ہیں۔'' اختیار الدین نے بظاہر عام سی بات کہی تھی لیکن اس کے لہجے میں مجھے ایک دھمکی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا یہ فقرہ مجھے اس لیے بھی غیر ضروری محسوس ہوا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی یہ بات ثابت کر چکا تھا۔

''بھائی میں کوئی اہم آدمی نہیں ہوں کہ...'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی اختیار الدین نے ہاتھ اٹھایا، میں خاموش ہوگیا۔

''اہم ہے یا نہیں اب ہمارے لیے اہم ہوگیا ہے۔'' اختیار الدین نے کہا۔ تینوں بھائیوں نے یوں سر ہلایا جیسے وہ پوری طرح متفق ہوں۔

''جیسا حکم بھائی۔'' میں نے جواب میں کہا۔ اب کیوں اہم ہوگیا ہوں، اس سوال کے کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میری کیفیت اس وقت وہی تھی جو جنگل میں نہتے آدمی کی شیر کے سامنے ہوسکتی ہے کہ اب جو بھی کرنا تھا، وہ شیر نے کرنا تھا۔ فرق تھا صرف اتنا کہ وہاں ایک شیر کی جگہ چار بھیڑیے تھے۔

''ہاں بھئی احسان الدین اپنے شانی بھائی کو اس کی کہانی سنادے۔'' اختیار الدین نے بھائی نمبر دو سے کہا۔

''بھائی کہاں سے شروع کروں؟'' احسان الدین نے اپنے بھائی سے سوال کیا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ سوال مجھ سے کیا گیا ہے۔

''کہیں سے بھی شروع کردے صرف اسے یہ سمجھانا ہے کہ ہم سے... وہ تین پانچ نہ کرے جو عورتوں سے کرتا ہے۔'' اختیار الدین نے جواب دیا۔

میں نے کہنا چاہا کہ اس تین پانچ کے کیا معنی ہیں لیکن مجھے خاموش رہنے میں ہی عافیت نظر آئی تھی اس لیے خاموش رہا۔

''بھائی مجھے اجازت ہے؟'' احسان الدین کے کچھ کہنے سے پہلے عبادت الدین نے بڑے بھائی سے اجازت طلب کی۔ اختیار الدین پہلے تو کچھ دیر صرف عبادت الدین کو دیکھتا رہا پھر گردن ہلا کر اجازت دے دی۔

''بات یہ ہے... ذیشان بھائی کہ ہماری اور آپ کی کہانی کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔'' عبادت الدین نے انتہائی نرم لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میرا ان چار بھیڑیوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟'' میں نے سوچا لیکن جو کچھ سوچ رہا تھا، اسے الفاظ کی شکل دینے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

''آپ کے والد نجم منیر صاحب ایف آئی اے کے ڈائریکٹر تھے جنہیں دفتر سے واپسی پر قتل کیا گیا، انہوں نے ایک عالم دین کی صاحبزادی سے شادی کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی۔'' عبادت الدین کا لہجہ اگرچہ نرم تھا لیکن مجھے اس کی گفتگو کا انداز پسند نہیں آیا اور میں بول پڑا۔

''بات اس طرح نہیں ہے جیسا آپ کہہ رہے ہیں۔'' میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر کہنا شروع کردیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بات میری ذات سے آگے بڑھ کر میرے والدین تک آگئی تھی۔ ''میرے دادا منیر احمد صاحب بھی ایک مشہور عالم دین تھے۔ ان کی تحریر شدہ بہت سی کتابیں آج بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔'' میں نے بے خوف انداز میں کہا تو ان چاروں کے چہرے پر ایک رنگ

آ کر گزر گیا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ ان چاروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں لیکن میں نے اس پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔

''میرے دادا منیر احمد اور نانا حاجی بشیر صاحب کی دوستی تھی اور یہی شادی کی بنیاد بنی تھی۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی تو کچھ دیر تک وہاں خاموشی کا راج رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ انہیں میری جانب سے توقع نہیں تھی کہ میں یوں اختلاف کروں گا اور پھر میرے اختلاف کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ دوبارہ سے کس طرح جوڑا جائے لیکن پھر اختیار الدین کے اشارہ کرنے پر عبادت الدین نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے بات کی تھی ویسے آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہے۔'' عبادت الدین نے کہا، اس کا لہجہ معذرت خواہانہ سا تھا۔

''میں نے صرف تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا اور عبادت الدین نے گردن ہلا دی۔

''آپ کے والد اور والدہ میں وجۂ اختلاف ہماری اطلاع کے مطابق اوپر کی آمدنی تھی جسے آپ کی والدہ نے صحیح نہیں سمجھا تھا۔'' عبادت الدین اس بار پہلے سے زیادہ محتاط تھا۔

''والدہ شادی سے قبل کالج میں لیکچرار تھیں۔'' میں نے جواب میں کہا اور عبادت الدین نے گردن ہلا کر تصدیق کر دی۔ ''جو بات والدہ نے مجھے بتائی، وہ یہ تھی کہ انہوں نے شادی سے پہلے ہی والد صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں حرام کی کمائی کسی صورت میں برداشت نہیں کریں گی۔'' میں نے عبادت الدین کی وہ تصحیح بھی کر دی جہاں اس نے میرے والدین کی شادی کو ناکام کہا تھا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں، ان دونوں میں اس بات پر اختلاف ہوا تھا جب آپ کے دادا کے انتقال کے بعد آپ کے والد نے زمانے کے مروجہ طریقے پر عمل شروع کیا تھا۔'' عبادت الدین کا لہجہ تقریباً مؤدبانہ تھا۔ اس نے الفاظ کے استعمال میں بھی نہایت احتیاط برتی تھی۔ وہ چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ والد نے رشوت لینے کا آغاز کر دیا تھا یا والد صاحب راشی ہو گئے تھے لیکن اس نے ایسا کہنے سے گریز کیا۔

''بھائی بات لمبی ہوتی جارہی ہے اس طرح تو...'' احسان الدین نے اچانک دخل دیا تھا لیکن اس کا مخاطب اختیار الدین تھا۔

''تو چپ بیٹھ، بے چارہ جاہل انسان۔'' اختیار الدین نے بھائی کو ڈانٹ دیا لیکن میرا جی چاہا کہ میں ایک زوردار قہقہہ لگاؤں کیونکہ جس انداز میں اختیار الدین نے احسان الدین کو جاہل کہا تھا، وہ ایسے ہی تھا جیسے وہ خود پی ایچ ڈی ہو۔

''آپ اپنے والدین کی واحد اولاد رہے لیکن آپ اپنی والدہ کے ساتھ ہی رہے۔'' عبادت الدین نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کہا لیکن شاید میرے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے تھے کہ وہ اس کے فوراً بعد چپ ہو گیا تھا۔

''دادا کا انتقال ہوا تو میں چھ برس کا تھا۔'' میں نے عبادت الدین کی تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد تین برس تک ہم ساتھ ہی رہے تھے لیکن پھر والدہ نے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنا فلیٹ لیا اور میں والدہ کے ساتھ رہا...'' میں نے کہا اور عبادت الدین نے ایک بار پھر اس طرح گردن ہلائی جیسے وہ میری بات سے متفق ہو۔

''آپ کے والدین کی علیحدگی کے باوجود آپ کے والد جب چاہتے آپ سے ملنے آسکتے تھے صرف اس پابندی کے ساتھ کہ وہ آپ کے لیے کسی بھی طرح کا کوئی تحفہ نہیں لاسکتے تھے۔'' عبادت الدین نے بات آگے بڑھائی اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں میں نے پھر بھی وضاحت ضروری سمجھی۔

''اماں اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک قطرۂ گندگی دودھ جیسی پاک چیز کو بھی گندہ کر دیتا ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔ اس بار کسی کے کچھ کہنے سے قبل اختیار الدین بول پڑا۔

''کیا خوب صورت بات کی تھی، انہوں نے۔'' اختیار الدین کا فقرہ ابھی ادا ہی ہوا تھا کہ باقی... تینوں بھائیوں نے بھی تائید میں گردن ہلا دی۔

''ہماری اطلاع یہ بھی ہے کہ آپ کے والد اکثر چھٹی والے دن آپ کے ساتھ گزارنے کے لیے سویرے ہی آپ کے فلیٹ پر پہنچ جاتے تھے اور رات تک وہیں رہتے تھے۔ آپ تینوں کھانا بھی ساتھ کھاتے تھے لیکن وہ پابندی ہمیشہ رہی کہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لاسکتے تھے۔'' عبادت الدین نے کہا اور میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ ''آپ لوگوں نے کافی محنت کی ہے معلومات جمع کرنے میں لیکن کیوں کی ہے، اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی؟''

''اماں اور بابا میں صرف ایک بار اختلاف ہوا تھا جب بابا انٹر کے بعد مجھے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور اماں نے

اس کی بھرپور مخالفت کی تھی۔'' میں نے وہ کچھ نہیں کہا، جو کہنا چاہ رہا تھا۔

اپنے پہلے بہادرانہ فقرے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ ماحول میں موجود تناؤ میں بہت حد تک کمی آئی تھی پھر جب اختیار الدین نے احسان الدین کو ڈانٹ پلائی تھی، اس کے بعد اس میں مزید کمی آئی تھی لیکن میں نے اس کے باوجود کوئی ایسی بات کرنے سے گریز کیا تھا جس سے کوئی بھی شخص بھڑک جائے۔

''آپ نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا تھا؟'' عبادت الدین نے سوالیہ انداز میں کہا لیکن میں نے اس کی بھی وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''میں نے بابا سے بات کی اور انہیں سمجھایا کہ اماں کی طبیعت صحیح نہیں ہے اور میں انہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔'' میں نے وضاحت کی تو سب سے پہلے اختیار الدین کی گردن ہلی اور ساتھ ہی اس نے واہ کا نعرہ لگا کر داد بھی دی۔

''آخر کے ایک سال آپ نے ان کی خدمت کا حق ادا کردیا۔'' عبادت الدین نے کہا لیکن میں صرف نفی میں گردن ہلا سکا۔

''ہماری بدنصیبی دیکھو کہ ہم اپنی ماں کو کندھا بھی نہ دے سکے۔'' اختیار الدین نے کہا اور میں حیرت سے ان کے چہرے دیکھنے لگا۔

''آپ ایم۔اے کے پہلے سال میں تھے جب آپ کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔'' عبادت الدین نے کہا اور میں نے تائید کردی۔

''بابا کے اصرار کے باوجود میں نانا کی وجہ سے بابا کے گھر منتقل نہیں ہوا۔'' میں نے کہا لیکن عبادت الدین نے نفی میں گردن ہلا کر میری تردید کرنی چاہی لیکن میں نے اس کی جانب توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''نانا نے ضعیفی میں اکلوتی اولاد کا صدمہ دیکھا تھا اور وہ والدہ کی علیحدگی کی وجہ سے بھی پوری طرح آگاہ تھے اس لیے میں انہیں مزید صدمہ نہیں دینا چاہتا تھا۔'' میں نے کہہ تو دیا لیکن عبادت الدین کی نفی میں ہلتی ہوئی گردن نے مجھے چونکا بھی دیا۔ میرے ذہن میں اختیار الدین کا وہ فقرہ گونجنے لگا۔

''وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔'' اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ ایک وجہ یہ بھی ہو لیکن اس کی ایک اور

وجہ آپ کی ایک میڈم طلعت قریشی بھی تھیں۔'' عبادت الدین نے اپنے الفاظ کے بم میرے کان پر پھینک دیے۔

''میڈم قریشی طلاق یافتہ تھیں اور ان کی طلاق کی وجہ بھی ان کا یہی مزاج بتایا جاتا ہے۔'' عبادت الدین نے میرے پیروں سے زمین سرکا دی تھی۔

''ان کی طلاق کو کئی سال بیت چکے تھے۔'' میں نے تردید کرنے کے بجائے محض اپنا دفاع کرنا چاہا لیکن عبادت الدین کی گردن پھر سے نفی میں ہل گئی۔

''وہ یہ نہیں کے رہا (کہہ رہا) کہ تم نے طلاق کروائی بلکہ وہ کچھ اور کے رہا ہے۔'' اختیار الدین نے دخل دینے والے انداز میں کہا۔

''آپ کی زندگی کے اس چیپٹر کا آغاز تو آپ کی کالج لائف سے ہی ہو چکا تھا لیکن میں صرف آپ کے فلیٹ سے منتقل نہ ہونے کی وجہ بتا رہا ہوں۔'' عبادت الدین نے کہا اور میں خاموش رہنے پر مجبور رہا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں واش روم سے ہو آؤں؟'' میں نے اختیار الدین سے اجازت مانگی اور وہ ہنس دیا۔

''اگر تیرے کو اپنا صوفہ اور... قالین گیلا نہیں کرنا تو چلا جا۔'' اختیار الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب اجازت دے دو۔ بدبو میں تو میں نہیں بیٹھنے کا۔'' انتظار الدین نے کہا اور چاروں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''چلا جا بھئی، بدبو میں تو میں بھی نہیں بیٹھنے کا۔'' اختیار نے مجھے وہیں موجود پا کر کہا اور وہ پھر سے ہنسنے لگے۔

میں وہاں سے اٹھا تو وہ چاروں ہنس ہی رہے تھے۔

یہ ضرور تھا کہ مجھے حاجت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ گفتگو اچانک ایسے موڑ پر آ گئی تھی کہ مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اپنی گفتگو کا لائحہ عمل مرتب کر لوں کیونکہ کوئی بھی غلط فقرہ میرے جسم اور روح کا رابطہ منقطع کر سکتا تھا۔ اپنی گفتگو کو ترتیب دینے کے لیے ضروری تھا کہ مجھے اس کا اندازہ ہو جائے کہ ان چاروں کو اس رازداری کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ تنہائی ملنے کے بعد میں نے اس پر سوچنا شروع کیا لیکن کوئی سرا کسی طرح ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گفتگو کے آخری حصے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پر بھی غور کیا کہ تعلقات میں سے کوئی ایسا تعلق تو نہیں آ گیا جس نے ان چاروں بھائیوں کو میرے فلیٹ تک آنے پر مجبور کر دیا ہو لیکن ذہن نے اس کی بھی تردید کر دی تھی۔ نئے تعلق کے نام پر صرف ایک نام ذہن میں آتا تھا لیکن اس سے بھی خاص تعلق نہیں ہو سکا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح تھا کہ ایک طویل عرصے بعد کسی لڑکی نے اس انداز میں متاثر کیا تھا کہ میں سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

لائبہ ایک چینل میں رپورٹر تھی اور رپورٹنگ کے سلسلے میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے نہ صرف اسے معلومات دی تھیں بلکہ اس کی یہ درخواست بھی مان لی تھی کہ میں وہ معلومات کسی اور کو نہ دوں۔ ہماری دوسری ملاقات اس کے شکریے کے فون کے بعد ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن اس نے گفتگو کو بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا، یہ اس کا رویہ ہی تھا کہ میں بھی محتاط ہونے پر مجبور تھا۔ ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ ان بھیڑیوں کا لائبہ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ لیکن پھر فوراً ہی یہ سوال مسترد بھی کر دیا گیا۔

''کہاں وہ خوب صورت، نازک اندام، باتمیز لڑکی اور کہاں یہ بے ڈھنگے اور جاہل جنہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ ذہن نے اپنے ہی خیال کو مسترد کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی عبادت الدین کا تصور بھی ذہن میں ابھرا جو کسی حد تک اپنے بھائیوں سے مختلف تھا۔

''جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' میں نے واش روم سے نکلتے ہوئے سوچا۔ میں واپس کمرے میں آیا تو چاروں خاموش تھے بالکل ایسے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو پھر اس سے قبل کہ میں کوئی سوال کرتا، اختیار الدین بول پڑا۔

''تمہاری نوکرانی آ گئی ہے۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پولیس کی آمد کی اطلاع دے رہا ہو۔

''کوئی بات نہیں، ہم بیڈروم میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ان چاروں کے چہروں پر اس طرح اطمینان آ گیا جیسے میں نے انہیں کارروائی کیے بغیر پولیس کے جانے کی اطلاع دی ہو۔

''اچھا ہوا وہ آ گئی۔'' میں نے کہا اور وہ چاروں اس طرح متوجہ ہوئے جیسے میں نے کوئی غیر متوقع بات کی ہو۔

''میں اسے ناشتے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔'' میں نے کچن کی جانب بڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اختیار الدین بول پڑا۔

''رہنے دے اس بے چاری کو۔'' اس نے مجھ سے کہا اور پھر فوراً ہی بھائی کی طرف پلٹا۔ ''میری دینو سے بات کروا۔'' اس نے احسان الدین سے کہا۔

''جی بھائی۔'' احسان الدین نے ایک سعادت مند ملازم کے انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ وہ ایک مہنگا موبائل تھا اور مجھے یقین تھا کہ احسان الدین اس موبائل میں موجود تمام چیزوں سے آگاہ بھی نہیں ہوگا۔

''بھائی بات کریں گے۔'' رابطہ ہوتے ہی احسان الدین نے موبائل اختیار الدین کی جانب بڑھا دیا۔

''ہاں بھئی دین محمد ایسا کرو کہ بھائی شہابو کے یہاں سے حلوہ پوری پکڑلو۔'' اختیار الدین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور پھر دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا، وہ سنتا رہا۔

''تم اس سب کو دفع کرو اور جلدی سے پوریاں پکڑلو۔'' اختیار الدین نے کہا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا کہ میں ان لغویات سے دور ہوں لیکن ایک بار پھر صبر کے گھونٹ پینے پڑے۔

''دیکھیو پوریاں ڈبل کرواکر خوب کڑک کروا لیجیو۔'' اختیار الدین نے مزید ہدایات دیں۔ اختیار الدین کا ہدایت نامہ جاری تھا، میں زیتون کی جانب گیا تاکہ وہ بیڈروم میں ایک دو کرسیاں بڑھا دے لیکن جاتے ہوئے میرے کانوں میں یہ ہدایت بھی آئی۔ ''آندھی کی طرح جائیو اور طوفان کی طرح آئیو۔''

زیتون حیران ضرور تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے ان چاروں کے بارے میں معلوم کرنا چاہا لیکن میں اسے کیا بتاتا، خود میں نہیں جانتا تھا کہ درندوں نے فلیٹ پر قدم رنجہ کیوں فرمائے ہیں۔

زیتون نے اشارہ کیا تو میں نے ان سے بیڈروم کی جانب چلنے کے لیے کہا اور وہ چاروں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے اختیار الدین آگے بڑھا لیکن پھر اچانک اس نے رک کر زیتون کو مخاطب کیا۔

''بہن اگر ایک اچھی سی دودھ پتی پلوادو تو احسان ہوگا۔'' اس نے زیتون کو انتہائی مہذب لہجے میں مخاطب کیا تھا اور زیتون نے سر ہلا دیا۔

''بھائی کا مطلب ہے کہ ہم سب کے لیے ایک ایک۔'' انتظار الدین نے کہا لیکن ابھی جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اختیار الدین بول پڑا۔

''پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ رہتی ہے سب سمجھ لیتی ہے۔ تیری طرح جاہل نہیں ہے۔'' اختیار الدین نے ایک اور بھائی کو جہالت کے سرٹیفکیٹ سے نوازا لیکن میری ہمت پھر بھی نہ ہو سکی کہ میں اختیار الدین سے اس کی اس قابلیت کی سند کے بارے میں سوال کرسکوں۔

میں وہ آخری آدمی تھا جو کمرے میں داخل ہوا....

پہلا احساس جو مجھے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہوا تھا، وہ یہ تھا کہ میں نے کمرے میں بلاوجہ ہی کرسیاں لگوائیں کیونکہ احسان الدین اور انتظار الدین نے تو بیڈ پر ڈیرے ڈال دیے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ جوتے اتار کر بیڈ پر چڑھے تھے۔ عبادت الدین نے دائیں ہاتھ کے صوفے پر قبضہ کیا تھا جبکہ میرے لیے اختیار الدین کے سامنے والے صوفے پر جگہ چھوڑی گئی تھی۔

میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اختیار الدین نے اٹھ کر دروازہ بند کردیا اور ماحول ایک بار پھر گفتگو کے لیے تیار ہوگیا اور عبادت الدین نے بھائی کا اشارہ پاتے ہی اپنی گفتگو کا آغاز کردیا۔

''ہمارا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں بلکہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے بارے میں اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور جانتے ہیں۔'' عبادت الدین نے اپنی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے عبادت الدین کو مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے کہا اور چاروں بھائی میرے اس ردِعمل سے چونکنا ہوگئے۔

''ہر شخص کی زندگی کے کچھ گوشے ایسے ہوتے ہیں جنہیں وہ پبلک میں ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا۔ اب تک کی ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مجھے فوری طور پر نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔

''بھائی صاحب ہم پبلک ہوگئے؟'' احسان الدین نے بڑے بھائی کو مخاطب کیا لیکن اختیار الدین کا ردِعمل مختلف تھا۔

''تو چپکا نہیں بیٹھ سکتا۔'' اختیار الدین نے بھائی کو بری طرح جھڑک دیا۔

''آپ نے بڑی محنت سے میرے بارے میں معلومات جمع کی ہیں لیکن کیوں جمع کیں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں؟'' میں نے وہ کہہ ہی دیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں ایک کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔

''تیرا کیا خیال ہے کہ ایسا کیوں کیا ہم نے؟'' اختیار الدین نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

''میں نے کہا کہ میں یہ سمجھ نہیں سکا ہوں کہ ایسا کیوں کیا ہے۔'' میں نے اختیار الدین کے جواب میں کہا۔

''پھر میرے چاند یہ تو سمجھ لے کہ کوئی وجہ تو ضرور

ہے۔'' اختیار الدین کا لہجہ نرم ہوتا جا رہا تھا۔
''ہوسکتا ہے کہ آپ کا کوئی ایسا کام ہو جو میرے ذریعے سے ہوسکتا ہے اور جس کے لیے آپ لوگ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہوں۔'' میں نے ہمت کر ڈالی اور اختیار الدین کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔
''بلیک میل...'' اختیار الدین کا انداز مکمل طور پر طنزیہ تھا۔
''بھائی مجھے اجازت ہے؟'' عبادت الدین نے بھائی سے اجازت طلب کی لیکن اختیار الدین نے اسے جواب دینے کے بجائے مجھے مخاطب کیا۔
''بالکل غلط اندازہ لگایا ہے چندا تم نے ہمارے بارے میں۔'' اختیار الدین کا لہجہ ایک بار پھر تلخ تر ہوگیا۔
''یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن...'' میں نے ماحول کو نرم کرنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن اختیار الدین نے مجھے روک دیا۔
''تمہارے محکمے میں ہمیں کام ہوتا تو ہم تمہارے بڑوں سے بات کریں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کون سا افسر کتنے میں بکتا ہے۔'' اختیار الدین نے کہا۔
''بھائی آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں لیکن ذیشان صاحب کا یوں اندازے لگانا بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔'' عبادت الدین نے کہا اور اختیار الدین نے اسے گھورنا شروع کردیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر نرمی آتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ اختیار الدین کچھ بولتا، انتظار الدین بول پڑا۔
''کون سی غلط بات کردی ہم نے؟'' انتظار الدین نے تلخ لہجے میں کہا۔
''عبادت الدین صحیح ہے۔'' اختیار الدین نے انتظار الدین کو ڈانٹ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بیڈروم کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ عبادت الدین نے اٹھ کر دروازہ کھولا جہاں زیتون چائے کی ٹرے کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے دروازے سے ہی چائے کی ٹرے لے لی اور زیتون کا شکریہ ادا کیا۔
''ایک اہم ترین بات کرنے ہم آئے تھے جس پر تمہیں پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔'' اختیار الدین نے اس وقت کہا تھا جب عبادت الدین چائے دینے میں مصروف تھا۔
''میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ہماری کہانی آپ سے بہت ملتی ہے۔'' عبادت الدین نے اپنی جگہ بیٹھنے کے ساتھ ہی کہا۔
''جی مجھے یاد ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔
عبادت الدین کے جواب میں کہہ تو دیا لیکن اختیار الدین کے نرم لہجے نے میری پریشانی مزید بڑھا دی۔
''ہمارے والد ایک نہایت ہی شریف شخص تھے اور پولیس کی ملازمت کے باوجود انہوں نے صرف تنخواہ پر گزارا کیا تھا۔'' عبادت الدین نے اچانک ہی اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔
میں کہنا چاہ رہا تھا کہ میری اطلاعات تو کچھ اور ہیں لیکن میں نے عبادت الدین کو خاموشی سے سننے پر اکتفا کیا۔
''ابا کو ان کے افسران نے ایک جھوٹے کیس میں اس طرح ملوث کیا کہ انہیں پانچ سال کی سزا ہوگئی۔'' عبادت الدین نے بات آگے بڑھائی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، مجھے اس پر ایک فی صد بھی یقین نہیں تھا کیونکہ مجھے ان کے باپ کے بارے میں تفصیل سے بہت کچھ معلوم تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں خاموش رہا۔
''جیل میں ابا کی ملاقات شہر کیا ملک کے کچھ بڑے جرائم پیشہ سے رہی۔ ابا جو پہلے ہی بدلے کی آگ میں جتلا تھے، ان لوگوں کے ساتھ ہوگئے۔'' عبادت الدین نے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ عبادت الدین اپنے باپ کے جرائم پیشہ ہونے کا جواز پیش کررہا ہے لیکن اس کے باوجود میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔
''ابا کو جیل ہونے سے ہمارے گھر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اماں کو پولیس کا کوارٹر چھوڑنا پڑا۔ تینوں بھائیوں کو اسکول چھوڑنا پڑا اور نہ جانے کیا کیا۔'' عبادت الدین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اختیار الدین بول پڑا۔
''میں ایک گیراج میں کام کرنے لگا اور دونوں چھوٹے ایک چپل کے کارخانے میں کام کرتے تھے۔'' اختیار الدین نے کہا۔ جس انداز میں اختیار الدین نے کہا تھا، اس میں مجھے حقیقت محسوس ہوئی تھی۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اختیار الدین بول پڑا۔
''میں گیارہ سال کا تھا، یہ دونوں آٹھ اور نو سال کے تھے۔'' اختیار الدین نے دونوں چھوٹے بھائیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''عبادت الدین تو دو برس کا بھی نہیں تھا جب ابا جیل گئے تھے۔'' اختیار الدین نے اپنی بات مکمل کرلی تھی۔
اختیار الدین خاموش ہوا تو کمرے میں کچھ اس طرح کا سکوت چھا گیا جیسے ہم سب ابھی ابھی کسی جنازے کو دفنا کر

لوٹے ہیں پھر یہ خاموشی کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مجھے ہی اس خاموشی کو توڑنے کی ابتدا کرنی پڑی تھی۔

''آپ نے بتایا تھا، جیل میں آپ کے والد کے تعلقات ہو گئے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جیل میں ابا کے نئے دوستوں نے جیل کے باہر کے ساتھیوں کی مدد سے اماں کو امداد بھجوائی تھی لیکن اماں نے انکار کر دیا تھا۔'' عبادت الدین نے میرے جواب میں کہا۔

''میں سمجھ نہیں سکا؟'' میں نے کہا جس کے جواب میں عبادت الدین بھی کچھ دیر خاموش ہی رہا۔

''اماں کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کی جانب سے آزمائش ہے اور اس میں ہمیں پورا اترنا ہے۔'' عبادت الدین نے جواب میں کہا۔

''وہ آپ کے والد کے نئے دوستوں کے ذرائع آمدنی پر شاید بھروسا نہیں کرتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا اور سب سے پہلے اختیار الدین کی گردن اثبات میں ہلی۔

''اماں نے پوری کوشش کی کہ ہمیں بچائے رکھے مگر ابا کے آتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا۔'' اختیار الدین نے پہل کی۔

میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن میں سوال نہ کر سکا جبکہ عبادت الدین نے وضاحت شروع کر دی تھی۔

''ابا کو اماں کے بارے میں اچھی طرح علم تھا اسی لیے جیل سے واپس آنے کے تین سال تک ابا نے اماں سے بہت کچھ چھپایا تھا لیکن پھر اماں کے علم میں بات آ گئی۔'' عبادت الدین نے باپ کے بارے میں تفصیل بتانے سے گریز کیا۔

''اماں سب کچھ چھوڑ کر ایک دن چپکے سے ہماری بہن کو لے کر غائب ہو گئیں۔'' عبادت الدین خاموش ہوا ہی تھا کہ اختیار الدین نے بات آگے بڑھائی۔

''آپ کی بہن...؟'' میں نے سوال کیا اور چاروں بھائی ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

''ابا کی جیل سے واپسی کے بعد ہمارے گھر ایک ننھی پری آئی تھی جسے ہم پیار سے منی کہتے تھے۔'' عبادت الدین نے جواب میں کہا۔

''ان دونوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کہاں گئیں؟'' میں نے سوال کیا اور وہ چاروں ایک بار پھر ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں باتیں کرنے لگے۔

''اماں کی ایک خالہ واہ کینٹ میں رہتی تھیں، اماں اور منی وہیں گئی تھیں۔'' عبادت الدین کا جواب تھا۔

''تو آپ کے والد...'' میں نے سوال کیا۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ اماں نہیں مانیں گی ابا جب تک زندہ رہے، اپنی کوشش کرتے رہے۔'' عبادت الدین کا جواب تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا اور اختیار الدین مسکرا دیا۔

''تم سے زیادہ پہلوان کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔'' اختیار الدین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی پہلوان کہلوائے جانے پر میری نظریں آئینے کی جانب اٹھ گئیں اور میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی لیکن خود کو موٹا، چوڑا، بے ہنگم توند میں نہ پا کر مطمئن ہو گیا۔

وہ چاروں بھائی شاید توقع کر رہے تھے کہ میں کچھ کہوں گا اور شاید اسی لیے ان میں سے کوئی بھی فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا جب انہوں نے دیکھ لیا کہ میں کچھ نہیں بول رہا تو عبادت الدین نے دوبارہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

''امی کی خالہ کی ایک بیٹی تھی جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور شوہر کی نوکری بیوی کو دی گئی تھی۔'' عبادت الدین نے اپنی بات کا آغاز کیا لیکن میرے ذہن میں ایک نام تھا جو مسلسل گونج رہا تھا۔ لائبہ نے بھی کہا تھا کہ اس کا تعلق واہ کینٹ سے ہے۔

ذہن اور دل میں ایک عجیب سا ہیجان تھا جو بپا تھا لیکن میں اسے کوئی عنوان نہیں دے پا رہا تھا۔ دل کہتا تھا کہ ان بھیڑیوں کا لائبہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا اور دماغ تھا کہ دلیل دیے جا رہا تھا کہ یوں اچانک صبح سویرے ان چاروں کی آمد بے سبب نہیں ہو سکتی۔

''امی کی خالہ زاد بہن کا ایک بیٹا بھی تھا۔'' عبادت الدین نے کہا اور ذہن پر ایک اور دھماکا ہوا۔

''لائبہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تھا لیکن پھر وہیں کا ہو رہا۔'' میرے ذہن نے خطرے سے آگاہ کرنا چاہا لیکن دل تھا کہ اب بھی اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا کہ ''تمام اندیشے بے بنیاد ہیں۔''

''کیا آپ کا اب بھی اپنی والدہ اور بہن سے رابطہ ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا جس کے جواب میں وہ چاروں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔

''اماں کا انتقال تو ابا کے ایک برس کے اندر ہی ہو گیا تھا۔'' اختیار الدین نے جواب میں کہا لیکن صرف اتنا کہہ کر

وہ خاموش ہو گیا۔
''جب ہم ابا کے ساتھ پہلی بار اماں کے پاس گئے تھے تب ہی اماں نے ہم سے ہر تعلق توڑ لیا تھا۔'' عبادت الدین نے کہا اور مجھے خطرے کی بو اور تیز آنے لگی۔ اس سے قبل کے عبادت الدین اپنی بات آگے بڑھاتا، باہر دروازے پر بیل کی آواز سنائی دی اور وہ رک گیا۔
میں نے اٹھ کر... دیکھنا چاہا لیکن اختیار الدین نے عبادت الدین کو جانے کے لیے اشارہ کیا مگر زیتون شاید اس سے بھی پہلے دروازے تک پہنچ گئی تھی اسی لیے وہ بیڈروم کے دروازے کے باہر رک گیا پھر اس نے وہیں کھڑے دروازے پر موجود فرد سے کہا۔ ''انتظار کرو نیچے۔'' دروازہ بند کرنے کی آواز آئی تو عبادت الدین پلٹ آیا۔
''بھائی دینو تھے۔'' اس نے اختیار الدین سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اختیار الدین نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔
''پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔'' اس کا مخاطب میں تھا، انداز ایسا تھا کہ جیسے رائے طلب کر رہا ہو اور میں یہ کہتے کہتے رک گیا۔
''کہ میری کیا مجال کہ میں آپ کو کسی کام سے روکنے کی جرأت کرسکوں۔''
وہ چاروں ایک ساتھ کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ تب جبکہ زیتون ابھی لائے ہوئے سامان کو برتنوں میں منتقل بھی نہیں کرسکی تھی۔ اختیار الدین نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن عبادت الدین اور انتظار الدین کچن کی جانب بڑھ گئے۔ زیتون کے انکار کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے زیتون کی مدد کرنی شروع کردی۔
''جلدی لے آؤ بھائی بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔'' اختیار الدین نے نعرہ لگانے والے انداز میں کہا۔ اس کے باوجود اس نے پہلا لقمہ اسی وقت لیا جب اس کے دونوں بھائی بھی میز تک آگئے۔
جو کچھ میز پر لگایا جارہا تھا، وہ میرے حساب سے پندرہ سے زیادہ لوگوں کے لیے بہت کافی تھا لیکن جس انداز میں وہ اس پر ٹوٹے تھے اس سے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جو کچھ میز پر سجا ہے، اسے ختم کرنے کے لیے وہ برسوں کی ریاضت کرتے رہے ہیں۔
اس وقت جب وہ چاروں میز پر جتے ہوئے تھے میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ ''اگر واقعی لائبہ ان کی بہن ہے اور انہوں نے مجھے اپنی بہن سے دور رہنے کا حکم نما مشورہ دیا تو میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے؟''
میں نے خاموشی کے ساتھ ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیا اور اس کے ساتھ ہی ذہن اور دل کی ایک نئی جنگ کا آغاز ہو گیا۔
''لائبہ ایسی لڑکی نہیں ہے جسے ان غنڈوں کا حکم مان کر چھوڑ دیا جائے۔'' دل کا فیصلہ تھا۔
''زندگی رہے گی تو لائبہ یا کوئی بھی لڑکی زندگی میں آسکتی ہے۔'' ذہن کا تجزیہ تھا۔
اس وقت جب وہ چاروں پیٹ کا دوزخ بھرنے میں مصروف تھے، میں ایک دوسری ہی آگ میں جل رہا تھا۔ ذہن و دل کی اس لڑائی میں میری نظریں بار بار ان چاروں کی جانب اٹھ رہی تھیں اور پھر ذہن نے آہستہ آہستہ یہ گتھی سلجھانی شروع کردی۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لائبہ کے حوالے سے گفتگو کرنے آئے ہیں ورنہ ان بھائیوں کے بارے میں تو مشہور تھا کہ یہ لوگ اپنے اڈے سے بمشکل ہی باہر نکلتے ہیں۔
''میں واضح طور پر ان سے کہہ دوں گا کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے لائبہ سے دور نہیں کرسکتی۔'' میں نے پُرعزم انداز میں سوچنے کی کوشش کی لیکن پھر فوراً ہی مجھے لگا کہ میں یہ سب دعوے کرنے کی پوزیشن میں کہاں ہوں۔
یہ سچ تھا کہ میری لائبہ سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں، بہت سے موضوعات پر ہمارے درمیان تبادلۂ خیال بھی ہوا تھا لیکن ہمارے درمیان اس انداز کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی جس سے کسی بھی قسم کی کوئی چاہت یا پسندیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہو۔ یہ ضرور تھا کہ میں کسی حد تک اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن اپنے بارے میں اس کے خیالات سے یکسر ناواقف تھا۔
اس وقت جب میں اپنی ہی الجھن میں الجھا ہوا تھا، وہ چاروں بھائی میز پر موجود چیزوں سے برسرِپیکار تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی پوری طرح سے جنگ میں شمولیت کی دعوت دیتے رہے لیکن زیادہ تر توجہ ان کی اپنے مشکیزے کو بھرنے میں تھی۔ میری سوچ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوسکی تھی جب انہوں نے میز پر سے اپنے ہر دشمن کا صفایا کردیا تھا۔
''چائے ہمیں کمرے میں پہنچا دینا۔'' اختیار الدین نے زیتون سے فرمائشی انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ چاروں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ان کے میز سے اٹھنے اور کمرے میں اپنی اپنی نشستیں سنبھالنے تک میں بھی ایک

نتیجے پر پہنچ گیا لیکن اس کے اظہار سے پہلے مجھے ایک اور جھوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ عام طور پر جب خالی پیٹ میں کچھ پہنچ جائے تو بندے میں سستی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں لیکن ان چاروں بھائیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے کھانے کے بعد ان کے جسموں میں ایک نئی بیٹری چارج ہو گئی ہو۔

''جب تک چائے آئے تب تک عبادت الدین اپنی بات مکمل کرلو۔'' اختیار الدین نے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا لیکن اس سے قبل کہ عبادت الدین کچھ کہے، میں نے اپنے اس فیصلے پر عمل کرنا شروع کردیا۔ میرا مخاطب براہِ راست اختیار الدین تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں آپ کی یہاں آمد کے بارے میں سمجھ چکا ہوں۔'' میں نے کہا اور ان چاروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اختیار الدین نے سوال کیا جس کا جواب میں نے فوری طور پر دیا۔

''آپ لائبہ کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں۔'' میں نے اپنا فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ ان چاروں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

''آپ کی ذہانت میں کوئی شک نہیں لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ آپ اس نتیجے پر کیونکر پہنچے؟'' عبادت الدین نے سوال کیا۔

''یہ بعد کی بات ہے، پہلے یہ تو بتائیں کہ میں صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں؟'' میں نے عبادت الدین کے سوال کو نظر انداز کیا۔

''جسے لوگ لائبہ کے نام سے جانتے ہیں وہی ہماری مُنّی ہے۔'' اختیار الدین نے ایک مختصری خاموشی کے بعد جواب میں کہا۔

''اب مجھے یہ بھی بتا دیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا لیکن تلخ انداز کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اگر آپ مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنی بات مکمل کرلوں تو بات آسانی سے سمجھ آجائے۔'' عبادت الدین نے کہا۔

''آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی۔'' میں نے جواب میں کہا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ اب وہ چاروں نفسیاتی طور پر دباؤ میں آچکے ہیں اس دباؤ میں آنے کی وجہ کیا ہے، میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میرے چندا، میرے لعل ہم بُرے لوگ ہیں مگر یقین کرو کہ ہم تمہارے بارے میں برا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' اختیار الدین نے اس بار پہل کی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ اماں نے ہم سے ہر ناتا توڑ لیا۔'' عبادت الدین نے اپنا سلسلہ کلام جوڑنے والے انداز میں کہا۔

''جی آپ کی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی۔'' میں نے جواب میں کہا لیکن عبادت الدین چند لمحے خاموش رہا۔

''اماں کا خیال تھا کہ ابا نے ہم چاروں کو اپنے راستے پر لگا لیا ہے اور اب ہم سدھر نہیں سکتے اس لیے بہتر ہے کہ ہم سے ناتا توڑ لیا جائے۔'' عبادت الدین نے بات آگے بڑھائی۔

''ابا چاہتے تھے کہ سال میں ایک بار ہی سہی ہم مُنّی سے اور مُنّی ہم سے مل لے لیکن اماں کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا۔'' اختیار الدین نے عبادت الدین کی بات آگے بڑھائی۔

''لیکن آپ نے اپنی بہن پر نظر رکھی؟'' میں سوال کیے بِنا نہیں رہ سکا۔

''جب تک ابا حیات رہے، وہ یہ کام کرتے رہے لیکن جب ابا کو مار دیا گیا تو یہ ذمّے داری میں نے لے لی۔'' اختیار الدین جواب دے کر چپ ہو رہا۔

''شاید اس طرح کہ اسے معلوم نہ ہو سکے کہ...'' میں نے کہنا چاہا لیکن اختیار الدین نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''اماں اور مُنّی کبھی بھی ہماری نظروں سے اوجھل نہیں تھیں نہ ابا کی زندگی میں نہ ان کے بعد لیکن ہم ان سے مل نہیں سکتے تھے۔'' اختیار الدین نے مجھے روکا لیکن کچھ کہہ نہیں سکا تو عبادت الدین نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ کے والد کے انتقال پر...؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں سوال کر بیٹھا۔

سوال کچھ ایسا نہیں تھا کہ وہ چاروں اچانک خاموش ہو کر خالی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے رہتے لیکن ایسا ہوا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی اور ان میں سے کوئی ایک بھی کچھ کہنے کے لیے تیار نظر نہیں آرہا تھا۔

''اماں کو میں نے فون پر بتایا تھا۔'' ایک وقفے کے بعد اختیار الدین نے کہنا شروع کیا لیکن اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

''انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ اللہ ان کے گناہ معاف کرے اور فون رکھ دیا تھا۔'' اختیار الدین اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''اماں نے بھائی سے تو اتنا ہی کہا تھا لیکن اماں نے عدت کے دن اسی طرح گزارے تھے۔'' عبادت الدین نے بات آگے بڑھائی اگرچہ اس کا لہجہ غم زدہ تھا۔

''میں ان کی کیفیت کا اندازہ کرسکتا ہوں۔'' اس وقت خاموشی تھی جب میں نے ان چاروں کو مخاطب کیا اور وہ چاروں اس انداز میں میری جانب دیکھنے لگے جیسے وہ مجھ سے کچھ اور بھی سننا چاہ رہے ہوں۔ ''والد نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ والدہ کی آخری رسومات پر بھی ان کی رقم خرچ نہ ہو۔'' میں نے کہا اور ان کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''بھائی نے کوشش کی تھی کہ ابا کے بعد ہی اماں ہمیں قبول کرلیں لیکن اماں اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئیں۔'' عبادت الدین نے کہا۔

''شاید وہ غلط بھی نہیں تھیں کیونکہ ہم گناہ کے راستے میں اتنے آگے جاچکے تھے کہ واپسی ممکن نہیں تھی۔'' اختیار الدین نے کہا۔

اختیار الدین تو خاموش ہو گیا لیکن میرا جی چاہا کہ میں کہہ دوں کہ ''واپسی کا راستہ تو ہر وقت کھلا ہوتا ہے آپ نے خود بھی سوچنے سے گریز کیا تھا۔'' لیکن میں ایسا کوئی جملہ نہیں کہنا چاہ رہا تھا جس سے وہ بھڑک جائیں۔

بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی تو سب کے ذہن میں یہی تھا کہ وہاں زیتون چائے کی ٹرے کے ساتھ ہوگی۔ حسبِ سابق عبادت الدین نے چائے کی ٹرے زیتون سے ..... لے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہر بار کی طرح اس نے سب سے پہلے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی تھی۔

اس وقت جب عبادت الدین چائے دے رہا تھا اور کمرے میں خاموشی تھی۔ میرا ذہن ایک بار پھر اس جانب بھٹک گیا کہ آخر وہ چاروں مجھ سے چاہتے کیا ہیں۔ یہ صحیح تھا کہ وہ شہر کے نامی غنڈے تھے بلکہ دو تین سال سے تو انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کرلیا تھا اب انہیں سیاسی حمایت بھی حاصل تھی اور اسی سیاسی حمایت کے بل پر انہوں نے زمینوں پر قبضے بھی شروع کر رکھے تھے لیکن میرے فلیٹ میں آنے کے بعد سے وہ کسی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہوئے تھے جسے غنڈہ گردی کہا جاسکتا۔

''منّی ہماری اکلوتی بہن ہے اور ہم سب کو جان سے بھی زیادہ پیاری ہے لیکن ایک شہر میں ہونے کے باوجود ہم سے ملنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' اختیار الدین نے چائے کا پہلا گھونٹ لینے سے پہلے کہا اس کے لہجے سے افسردگی واضح طور پر ظاہر تھی۔

''اس سے میری چند ملاقاتیں ہیں...'' میں نے اپنی مجبوری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''وہ اماں کی بیٹی ہے لیکن ہم کچھ اور کہہ رہے ہیں۔'' عبادت الدین نے میری وہ غلط فہمی دور کردی جو اختیار الدین کے فقرے کے ساتھ میرے ذہن میں آئی تھی۔ ''ہم اماں کے جنازے پر گئے تھے لیکن منّی نے اماں کی وصیت بتائی کہ ہم چاروں جنازے کو کندھا نہ دیں۔'' اختیار الدین نے کہا۔

''بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ اماں کی وصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہم سے کوئی رابطہ نہ رکھے۔'' عبادت الدین نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''لیکن نوکری کی مجبوری اسے اسی شہر میں لے آئی جہاں آپ چاروں ہیں۔'' میں نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی اختیار الدین کی گردن نفی میں ہل گئی۔

''کراچی آنے کے لیے ہم نے اسے کہلوایا تھا۔'' اختیار الدین نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔

''منّی نے جب نوکری کی تلاش شروع کی تو اسلام آباد کے ایک بڑے آدمی نے اس پر بری نظر ڈالی۔'' عبادت الدین نے کچھ وقفے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''کوئی سیاست داں...؟'' میں نے سوال کیا لیکن عبادت الدین نے فوراً ہی انکار کردیا۔

''وہ ایک بڑا بیوروکریٹ تھا۔'' عبادت الدین نے کہا جس انداز میں عبادت الدین نے صیغہ ماضی استعمال کیا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے پورے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ ایک سرد سی لہر تھی جو مجھے اپنے پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ چاروں بھیڑیے اس لیے یہاں آئے ہیں۔'' میں نے ان چاروں کی جانب ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ''اگر یہ اس وقت مجھے قتل بھی کردیں تو ان کے خلاف کون گواہی دے گا؟'' میں نے زیتون کو ذہن میں لاتے ہوئے سوچا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اماں اپنی جس خالہ کے

پاس پہنچی تھیں وہاں اماں کی خالہ کی بیٹی اور نواسہ بھی تھا۔''
عبادت الدین نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔

''جی ہاں جنہیں ان کے شوہر کی جگہ نوکری ملی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ وہ اسی گھر میں میرا قتل بھی کر سکتے ہیں، میں مزید محتاط ہو گیا۔

''اس نے ہم سے رابطہ کیا اور بتایا کہ منّی کو اس کُتّے نے کس طرح کی دھمکی دی تھی۔'' عبادت الدین نے کہا۔

میرا دل چاہا کہ میں سوال کروں کہ ''کیا دھمکی دی تھی؟'' لیکن نئے پیدا ہونے والے خوف نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''لائبہ یہ بات جانتی ہے؟'' میں نے سوال کر ہی دیا لیکن ایک مختلف انداز میں۔

''ہمارا اندازہ ہے کہ وہ جانتی ہے۔'' عبادت الدین کا جواب تھا۔

''یہ ایسا اس لیے کہہ رہا ہے کہ میں ظفراللہ سے ملا تھا اور واہیں (اس) کو میں نے سمجھایا تھا کہ منّی ہم سے نہ ملے مگر کراچی آجائے۔'' اختیار الدین نے وہ بات کردی جسے عبادت الدین شاید بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔

بات کسی حد تک نہیں بلکہ بہت حد تک واضح ہو چکی تھی۔ میرا لائبہ کی جانب جھکاؤ یا لائبہ کا میری جانب التفات نے اس کے رکھوالوں کو خبردار کر دیا تھا اور وہ میرے پاس پہنچ گئے تھے۔ براہِ راست انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن دبے لفظوں میں جو کچھ وہ کہہ چکے تھے، وہی بہت کافی تھا۔

اس وقت جب میں خاموشی سے ان کی گفتگو کا تجزیہ کر رہا تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لائبہ جو کل رات تک میرے ذہن پر قبضہ کر رہی تھی، اچانک اسی میں مجھے اپنی موت کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اپنے طور پر میں یہ طے کر چکا تھا کہ جونہی وہ مجھے لائبہ سے دور ہونے کا مشورہ دیں گے، میں فوری طور پر ان کا حکم مان جاؤں گا۔

''ظفراللہ سے جب میری بات ہوئی تب ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ منّی کو ہماری وجہ سے کیا کچھ سامنا تھا۔'' اختیار الدین نے خاموشی کا وقفہ ختم کیا تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میں جب لائبہ سے ملا تھا ایسی کوئی بھی چیز سامنے نہیں آئی تھی۔

''ہم نہیں چاہتے کہ طلعت قریشی جیسی خواتین سے آپ کے رشتے کے بارے میں بات کریں۔'' عبادت الدین نے بھائی کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔

''وہ بات جان (جانے) دے عبادت الدین۔'' اختیار الدین نے بھائی سے کہا اور عبادت الدین نے گردن جھکا دی۔

''اب یہ اپنے مقصد پر آرہے ہیں۔'' میں نے سوچا لیکن زبان سے اس کا اظہار کرنے سے گریز کیا تھا۔

''بچپنے میں ایسی حرکتیں ہوجاتی ہیں کسی سے کچھ کسی سے کچھ۔'' اختیار الدین نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ لائبہ سے چند ملاقاتیں ہیں۔'' میں نے وضاحت کرنی چاہی لیکن اختیار الدین پھر سے بول پڑا۔

''بھائی میاں ہم ہر بات جانتے ہیں، یہ بھی کہ کس کھانے کا بل کس نے دیا تھا۔'' اختیار الدین نے کہا اور میرے پاس اس سے آگے .. کہنے کے لیے کچھ نہیں رکھا تھا۔

''اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں آئندہ لائبہ سے نہ ملوں تو...'' میرا فقرہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ اختیار الدین اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''ابے یہ کیا کے ریا ہے؟'' (کہہ رہا ہے) اس کے انداز میں عجیب سی بوکھلاہٹ تھی۔

''میاں ہم کیوں یہ چاہنے لگے بلکہ ہم تو کچھ ہور کے (اور کہہ) رہے ہیں۔'' اختیار الدین بولتا چلا گیا۔

صورتِ حال بالکل اچانک غیر متوقع طور پر اس طرح تبدیل ہو گئی تھی کہ جس کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں تھا لیکن جو صورتِ حال اچانک پیدا ہوئی تھی، اسے کنٹرول بھی صرف میں ہی کر سکتا تھا ورنہ یہ دھبا زندگی بھر کے لیے میرے دامن پر رہتا۔

''آپ نے میرا پورا فقرہ سنے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی۔'' میں نے اختیار الدین کو مخاطب کیا۔ وہ کچھ دیر صرف مجھے دیکھتا رہا اور پھر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں سے اٹھا تھا لیکن اس کی نظریں مجھ پر ہی رہی تھیں۔

''اجازت ہو تو میں کچھ تفصیل سے اپنی بات کرلوں؟'' میں نے اپنی گفتگو کو ایک مختلف رخ دینے کا آغاز کرنا چاہا اور وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''یہ صحیح ہے کہ میں کچھ بہت اچھا شخص نہیں رہا ہوں لیکن یہ سب کچھ ایک حد تک رہا تھا۔'' میں نے ان کی جانب سے کچھ نہ کہے جانے کے باوجود اپنی بات شروع کردی تھی۔ میری کیفیت اس وقت تقریباً وہی ہو چکی تھی جیسے کسی

جاں بہ لب شخص کو اچانک زندگی کی ضمانت مل جائے۔

''تم اپنی بات بعد میں کرتے رہنا، پہلے ہماری بات سن لو۔'' اختیار الدین نے کہا اور مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

''دو دن پہلے ظفر بھائی کا فون آیا تھا بھائی صاحب کے پاس۔'' اختیار الدین کے خاموش ہوتے ہی عبادت الدین نے کہا اور اختیار الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ تو اسلام آباد میں ہے شاید...'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''جی بالکل ایسا ہی ہے۔'' عبادت الدین نے میری بات کی تائید کی۔ ''بات ایسی ہی تھی کہ میں اگلا جہاز پکڑ کر اسلام آباد چلا گیا تھا۔'' اختیار الدین نے کہا لیکن مجھے اس کے انداز میں عجلت محسوس ہوئی۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ اس میں کچھ بے چینی سی آ گئی تھی۔

''ظفر بھائی نے آپ کے متعلق بات کی تھی۔'' عبادت الدین نے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرا دل ایک بار پھر کچھ ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔

''میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔'' میں نے کہا اور اختیار الدین نے عجیب انداز میں مجھے گھورا۔

''تم نہیں جانتے، منّی تو جانتی ہے۔'' اختیار الدین نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''وہ چاہتی تھی کہ ظفر بھائی آپ سے ملیں۔'' عبادت الدین نے وضاحت کی اور مجھے اپنا سانس واپس آتا ہوا محسوس ہوا۔

''اب صاف بات یہ ہے کہ ہماری بہن ہماری وجہ سے بہت سے نقصان اٹھا چکی ہے۔'' اختیار الدین نے کہا۔

''اب بھی بات یہی ہوئی ہے کہ وہ آپ کو ہمارے بارے میں آگاہ کرے گی اور اگر آپ اس کے بعد بھی...'' عبادت الدین نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سچ پوچھیں تو میرے اور لائبہ کے درمیان اس مسئلے پر کوئی بات نہیں ہوئی ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ میں اس بار پوری طرح سنجیدہ ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا اور وہ چاروں ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے کوئی انہونی ہوئی ہو۔

''ویسے تو سنا ہے تمہاری زبان عورتوں اور لمڈیوں میں خوب چلتی ہے۔'' اختیار الدین نے عجیب انداز میں کہا۔

''صحیح بات یہ ہے بھائی صاحب کہ عورتوں میں زیادہ اور لمڈیوں میں کم۔'' احسان الدین نے بہت دیر بعد زبان

ٹیچر: ''قاتل کسے کہتے ہیں؟''
سردار: ''مجھے نہیں پتا۔''
ٹیچر: ''مثال کے طور پر تم نے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ اب تم کون ہوئے؟''
سردار: ''یتیم۔''

تعریف

پہلی ملاقات میں شوہر نے بیوی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ہزار لڑکیوں میں ایک ہو۔''
بیوی نے یہ سنتے ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا۔
''ارے ارے روتی کیوں ہو؟''
بیوی نے زور دار ہچکی لی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے ملتے رہے ہیں۔''

رضوانہ سمیع......کوٹری

کھولی۔ میں چاہتا تو اسے بہت کرارا جواب دے سکتا تھا لیکن میں نے اسے کوئی سخت جواب دینے سے گریز کیا۔

''کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ آپ کو ہمارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' عبادت الدین نے سوال کیا اور میں کچھ دیر محض اسے دیکھتا رہا۔

''ہو سکتا ہے کہ کسی اور حالات میں آپ کا ذکر ہوتا تو میرا ردِعمل کچھ اور ہوتا لیکن جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے، اس کے بعد یقیناً مختلف ہے۔'' میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فقرہ کہا۔

میں نے جو کچھ کہا تھا، اس میں نہ کوئی منافقت تھی نہ کوئی بناوٹ تھی لیکن ابھی میرا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اختیار الدین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ عجیب منظر تھا کہ شہر کا سب سے بڑا بدمعاش جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے، میرے سامنے بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا، اسے خاموش کروانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

''ہم بہت برے لوگ ہیں لیکن خدا کے لیے ہمارے گناہوں کی سزا ہماری بہن کو نہیں دینا۔'' روتے ہوئے اختیار الدین نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپ خود کہہ چکے ہیں کہ وہ اپنی ماں کی بیٹی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

سب سے پہلے اختیار الدین نے اپنی جگہ چھوڑی اور

اس کے ساتھ ہی باقی بھائی بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے، مجھے بھی اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں گے لیکن اختیارالدین کے لیے جیسے وہاں بیٹھنا محال ہورہا تھا۔

''عبادت الدین رابطہ رکھے گا۔'' اختیارالدین نے روانگی سے قبل کہا۔

عبادت الدین سب سے آخری فرد تھا جو فلیٹ سے رخصت ہوا لیکن جاتے جاتے وہ ایسا فقرہ کہہ گیا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میں احتیاط کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہیں دیر نہ کردوں۔

عبادت الدین نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ ''آپ اس ایک معاملے میں بہت تیز مشہور ہیں لیکن یہاں آپ کی رفتار سست ہے۔'' وہ کہہ گیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

ان بھائیوں کے جانے کے بعد میں نے زیتون کے چہرے پر بہت سے سوال بکھرے دیکھے تھے لیکن میرے پاس اس کے سوالوں کے جواب دینے سے زیادہ ضروری سوال موجود تھے اسی لیے میں نے بیڈروم میں چند منٹ سوچنے کے ساتھ ہی لائبہ کا نمبر ملالیا۔

''خیریت تو ہے کیا طبیعت زیادہ ہی خراب ہے؟'' موبائل پر اس کی آواز سنائی دی اور میں وہ سب کچھ بھول گیا جو مجھے کہنا تھا۔

''یہ سوال کرنے کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''ذیشان صاحب آپ خود کہہ چکے ہیں کہ چھٹی کے دن جلد اٹھنا کفرانِ نعمت ہوتا ہے۔'' اس کی آواز کانوں میں آئی تھی۔

''اٹھتا تو وہ ہے جو سوتا ہے۔'' میں نے احتیاط کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا لیکن اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

''کوئی خاص بات؟'' لائبہ کی آواز میں سنجیدگی تھی، اس کا لہجہ بھی مدھم تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا ایک بار پھر میں وہ کچھ نہیں کہہ سکا جو میں کہنا چاہ رہا تھا۔

''شاید آپ کو یاد ہو کل رات کا ڈنر ہم نے ساتھ ہی کیا تھا۔'' اس نے کہا۔ واضح طور پر وہ مجھ سے وہ کہلوانا چاہ رہی تھی جو میں کہنا چاہ رہا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور دوسری جانب وقفہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ آپ مجھ سے ملاقات کرکے کہنا چاہتے ہیں، وہ فون پر کہہ دیں؟'' اس نے بہت کھل کر دعوت دی تھی۔ اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ تھا۔

''بالکل ممکن ہے لیکن میری خواہش ہے کہ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر وہ سب کچھ کہوں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔'' میرا جواب تھا اور وہ پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔'' لائبہ نے کہا۔

''اندازے لگانے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم مل لیں؟'' میں ایک بار پھر جھجک گیا۔

''میں اس وقت ایک اسائنمنٹ پر ہوں۔'' ایک وقفے کے بعد اس نے کہا۔

''کیا ہم...'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن لائبہ نے مجھے روک دیا۔

''ہم رات کے کھانے پر ساتھ ہوں گے۔ میں فون کردوں گی۔'' اس نے کہا اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا، اس نے لائن کاٹ دی۔

دوبارہ فون کرنا مجھے مناسب نہیں لگا لیکن اس کے فون کاٹتے ہی مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ اس نے کئی بار مجھے اس کا موقع دیا تھا کہ میں اپنے دل کی بات کہہ دیتا لیکن ہر بار میں نروس ہوگیا تھا۔

''شاید یہ اسی طرح ہوتا ہو۔'' میں نے خود سے کہا۔ میں نے اپنے غصے کے بارے میں سوچا۔ مجھے غصہ اس بات پر تھا کہ میں دوستوں میں اس لحاظ سے مشہور تھا کہ جس سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ دیتا تھا۔ لاتعداد بار یہ ہوچکا تھا کہ میں نے اپنے جھوٹ کو ایسے الفاظ پہنائے تھے کہ وہ سچ بن گیا تھا لیکن اس ایک موقع پر جب ذہن اور دماغ ایک کرکے سچ کہنا چاہ رہا تھا تو لفظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

میں اس وقت بھی بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا جب زیتون کمرے میں داخل ہوئی۔ ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھتا تھا کہ اگر لائبہ نے انکار کردیا تو میں کیا کروں گا پھر یہ خیال بھی ذہن میں آتا کہ اگر وہ ظفراللہ سے اسلام آباد فون کرکے بات کرسکتی ہے تو یقیناً وہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہی ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی جب مجھے اپنی بداعمالیاں ذہن میں آتیں تو ذہن میں یہ بھی آجاتا کہ ان میں سے ایک بھی

اس کے علم میں آئی تو... اور اس کے بعد سوچ ختم ہو جاتی۔
''صاحب جی...!'' میرے کانوں میں زیتون کی آواز آئی اور میں چونک گیا۔ ''ایک لڑکی آئی ہے، آپ کا پوچھ رہی ہے۔'' زیتون نے کہا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔
''لڑکی آئی ہے؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا لیکن ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ زیتون کے پیچھے لائبہ کا چہرہ نمودار ہوا۔
''میں نے ڈرائنگ روم میں...'' زیتون نے کہنا چاہا لیکن پھر اس نے میری نظروں کا تعاقب کیا تو اسے لائبہ دکھائی دی۔
''میں نے سوچا کہ بلاوجہ تمہیں رات تک پریشان کروں۔'' لائبہ نے زیتون کے برابر سے ہوتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
میرا جی چاہا کہ میں کہہ دوں کہ ''تم تمام بہن بھائی حیرت زدہ کرنے کے مریض ہو۔'' لیکن میں نے خاموشی اختیار کی۔
''میں گرین ٹی لوں گی۔'' اس نے عین اس جگہ پر جہاں کچھ دیر پہلے اس کا بھائی بیٹھا تھا، بیٹھتے ہوئے زیتون کو مخاطب کیا۔ لائبہ خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ نروس تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم دونوں ہی نروس تھے۔
''جی فرمائیے، میں حاضر ہوں۔'' زیتون کے کمرے سے جاتے ہی لائبہ نے مجھے مخاطب کیا۔
''بہت ہو چکا ذیشان صاحب اب کہہ بھی دو۔'' میں نے خود کو حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا نام تبدیل کر لو۔'' میں نے اس کے سامنے کی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا اور وہ ہنس دی۔
''میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آپ کو ایک لڑکی کو پرپوز کرنا بھی نہیں آتا۔'' اس نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔ اس نے خاموش ہو کر میری جانب دیکھا لیکن میں کچھ کہے بغیر صرف اسے دیکھتا رہا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔
''تمہاری ان جھکی نظروں کو کیا میں اقرار سمجھوں؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا صرف ایک بار نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر سے نظریں جھکا لیں۔
''میرے ماضی کے بارے میں جان لینے کے بعد بھی اگر آپ اپنی بات پر قائم رہے تو...'' اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''میرے بارے میں اتنا تو جانتی ہو کہ میرا تعلق ایف آئی اے سے ہے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا اور اس کی نظریں اٹھ گئیں۔ ''یہ بھی جانتی ہو کہ ایف آئی اے ایک تحقیقاتی ادارہ ہے؟'' اس کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے ایک اور سوال کر دیا۔
''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' اب کی بار اس نے سوال کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔
''یہی کہ میں تمہارے بارے میں سب کچھ نہیں تو بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے ایک بار پھر بغیر کچھ کہے صرف دیکھنا شروع کر دیا۔ نہ جانے کتنے ہی لمحے اسی طرح کٹ گئے۔ ہم دونوں ہی خاموشی سے ایک دوسرے کو صرف دیکھتے رہے تھے... نہ اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا ہوا نہ ہی میں نے کچھ کہا۔
''آپ جانتے ہیں کہ میں کس کی بہن ہوں؟'' کتنی ہی دیر بعد اس نے سوال کیا اور میں نے صرف اثبات میں گردن ہلا دی۔
''ذیشان... آپ...'' لائبہ کی کپکپاتی ہوئی آواز مجھ تک آئی۔ میں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لوں لیکن عین اس وقت زیتون نمودار ہوئی۔
''آپ اور کیا جانتے ہیں؟'' زیتون کے جاتے ہی لائبہ نے سوال کیا۔ زیتون کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ برتن سمیٹنے آئی تھی اور بہت اچھا ہوا کہ وہ عین اس وقت آ گئی ورنہ ہم دونوں ایک ٹرانس میں جا رہے تھے۔
''جو کچھ میں جانتا ہوں، اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔
لائبہ اس کے بعد خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن جس جذباتی کیفیت سے وہ گزر رہی تھی، اس میں وہ اپنے لفظ مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔ تب ہی اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔
''آپ نے جو کچھ کہا میں اس کی قدر کرتی ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ چاہوں گی کہ آپ سب کچھ جان لیں۔'' لائبہ نے کچھ دیر بعد کہا اور میں ہنس دیا۔ جس انداز میں ہنسا... اس نے لائبہ کے چہرے پر بہت سے سوال بکھیر دیے تھے۔ میں خاموش ہو... گیا تب بھی وہ آنکھوں

میں سوال لیے مجھے دیکھتی رہی۔

''پہلے تم اپنا مکمل تعارف کراؤ پھر میں اپنی کہانی سناؤں اس میں تو بہت وقت گزر جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں کہا۔

''آپ کو یہ زحمت نہیں دوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس مہربانی کے لیے پیشگی شکریہ۔'' میں نے شعوری کوشش کی کہ ماحول کی سنجیدگی کچھ کم ہو جائے۔

''شکریہ اس وقت ادا کروں گی جب میری گفتگو ختم ہوگی اور آپ وہ مان لیں گے جو میں کہوں گی۔'' اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا اور اس کے ساتھ ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔

''کوئی شرط؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

''بہتر ہوتا کہ آپ مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دیتے۔'' لائبہ نے ایک وقفے کے بعد کہا اور میرے ذہن میں تشویش کی لہروں نے سر اٹھایا۔

''بہتر ہے۔'' میں نے بظاہر پُرسکون لہجے میں کہا لیکن میرے ذہن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔

''مجھے آپ کی والدہ کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میری والدہ سے کہاں غلطی ہوئی تھی۔'' لائبہ نے کہا اور میں بری طرح چونک گیا۔

''میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''آپ کی والدہ اپنے اصولوں پر پوری طرح قائم رہیں اور اس پر انہوں نے کوئی سمجھوتا نہیں کیا لیکن ساتھ ہی انہوں نے آپ کی زندگی میں محرومی کا خلا پیدا نہیں ہونے دیا۔'' لائبہ نے اپنے فقرے کی وضاحت کی اور میں نے سوچا کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔

''ایک طرح سے تم صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

''آپ کا اپنے والد سے ملنا، ان کے ساتھ وقت گزارنے نے آپ کی زندگی میں وہ خلا نہیں پیدا ہونے دیا جو میری زندگی میں پیدا ہو گیا۔'' لائبہ کا انداز بالکل ہی سنجیدہ تھا لیکن ساتھ ہی اس کے لہجے میں غم کی ایک لہر بھی موجود تھی۔

''بابا نے عید اور بقرعید ہمیشہ ہمارے ساتھ گزاری تھی بلکہ تقریباً ہر چھٹی ان کی ہمارے ساتھ ہی گزرتی تھی۔ رات کا کھانا بھی وہ ہمارے ساتھ کھا لیتے تھے۔'' میں نے لائبہ کی بات کو آگے بڑھایا۔

''آپ کی والدہ نے آپ کے لیے وہ راستہ کھلا رکھا تھا لیکن میری ماں نے وہ راستہ مکمل بند کر دیا تھا۔'' لائبہ نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''شاید تمہارے والد اور بھائیوں کی شہرت سے وہ خوف زدہ ہوں۔'' میں نے جواز دینا چاہا اور وہ ایک طنزیہ ہنسی کے ساتھ خاموش رہی۔

''غنڈے کی بیٹی اور بدمعاشوں کی بہن کی شہرت نے تو پھر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔'' لائبہ نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

''ایک لحاظ سے میرے لیے تو یہ اچھا ہی ہوا۔'' میں نے ماحول کی افسردگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ میرے فقرے کے ساتھ ہی پہلے تو اس کی آنکھوں میں سوالیہ حیرت ابھری لیکن جب فقرہ سمجھ میں آیا تو وہ مسکرانے لگی۔

''یہ حقیقت شاید میری والدہ کی نظروں سے اوجھل رہی کہ بچے کی زندگی میں ماں اور باپ دونوں کی حیثیت ہوتی ہے۔'' لائبہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

''لڑکیوں کے لیے تو باپ کچھ زیادہ ہی اہم ہوتا ہے۔'' میں نے اس کی بات کی تائید کی لیکن وہ خاموش رہی۔

''اماں نے اپنے اصولوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی یہاں تک کہ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جب وہ نہیں ہوں گی تو...'' اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تم یہ تو نہیں کہہ رہی ہو کہ تم اپنی والدہ کے اصولوں کو نہیں مانتی ہو؟'' میں نے سوال کیا اور اس کی گردن فوراً ہی نفی میں ہل گئی۔

''میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ درمیانی راستہ بھی ہوتا ہے جس پر آپ کی والدہ نے عمل کیا۔'' اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''جو ہو چکا، اسے دوبارہ سے موضوع بنانا کتنا اہم ہے؟'' میں نے کہا اور وہ کچھ دیر تک صرف مجھے دیکھتی رہی۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے شہر میں اس لیے منتقل ہوئی تھی کہ یہاں میرے بھائی بھی تھے؟'' لائبہ نے سوال کیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ذہن کا مشورہ مان لیا۔ میں اگر یہ

کہتا کہ میں جانتا ہوں تو اس کے ساتھ ہی مجھے بہت سے سوالات کے جوابات دینے پڑتے لیکن انکار کی صورت میں مجھے تفصیل کے ساتھ وہ کچھ سننا پڑا جس کا تذکرہ اس کے بھائیوں نے سرسری انداز میں کیا تھا۔

''مجھے ورکنگ ویمن ہاسٹل کے باہر اغوا کرنے کی کوشش اس لیے کی گئی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ظفر اللہ بھائی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' اس نے اس واقعے کا اختتام کرتے ہوئے کہا میں کسی اور ہی سوچ میں تھا۔

''تم نے کہا کہ تمہارے بڑے بھائی نے اس شخص کو اس کے گھر میں گھس کر اپنے ہاتھوں سے اس کے تین دوستوں کے سامنے چھریوں کے وار سے قتل کیا لیکن کسی نے ان کا نام نہیں لیا؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے میری بات کی تائید میں گردن ہلا دی۔

''اختیار الدین بھائی جب وہاں پہنچے تو وہ چاروں دوست شراب کے شغل میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور مارنے کی وجہ بیان کرنے کے بعد اسے قتل کیا تھا۔'' لائبہ نے عام سے تاثر کے ساتھ کہا۔

لائبہ جب اس قتل کا نقشہ کھینچ رہی تھی تو اس کا لہجہ اتنا مطمئن تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہاکی یا فٹ بال میچ کی کمنٹری کر رہی ہو۔

''ذیشان صاحب کہیں آپ غلطی تو نہیں کر رہے ہیں؟'' لائبہ کے مطمئن انداز دیکھ کر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا تھا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ میرے بھائیوں نے میرے ناکام اغوا یا اس کی بیہودگی کی سزا دی ہے۔'' مجھے خاموش دیکھ کر لائبہ نے کہا۔

''تم یہ تو نہیں کہہ رہیں کہ وہ شخص ویت نام میں امریکی مظالم میں بھی شریک تھا؟'' میں نے کچھ اس لہجے میں سوال کیا تھا کہ لائبہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور خاصی دیر تک ہنستی رہی۔

''آپ کی انہی باتوں نے شاید آپ کو خواتین میں مقبول بنا رکھا ہے۔'' لائبہ نے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ فقرہ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے یونہی سرسری طور پر جانے دیتا باوجود اس کے کہ لائبہ نے وہ فقرہ ہنستے ہوئے کہا تھا لیکن اس کی کاٹ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

''ٹرین کا سفر میں نے زیادہ نہیں کیا لیکن جو لوگ اکثر ٹرین کا سفر کرتے ہیں، وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہر ٹرین کا ایک آخری اسٹیشن ہوتا ہے۔'' اس کی ہنسی میں وقفہ آتے ہی میں نے کہا اور اس نے کچھ اس انداز میں مجھے دیکھنا شروع کیا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔

''آپ سے ہونے والی دوسری ملاقات میں میرا یہ تجزیہ تھا کہ آپ سے باتوں میں جیتنا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور میں نے آج جس فیصلے کا اظہار کیا ہے، وہ فیصلہ میں پہلی ملاقات میں کر چکا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس کے ساتھ ہی لائبہ سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اس شخص کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ قدرت کا انتقام تھا جو وہ مظلوم اور مجبور لڑکیاں اس بیہودہ شخص سے نہ لے سکی تھیں۔'' لائبہ نے ایک طرح سے میرے فقرے کو نظر انداز کیا تھا اور دوبارہ اپنے موضوع پر آ گئی تھی۔

''شاید میں تم سے اختلاف کر لیتا لیکن اس وقت نہیں اس لیے یہ بحث پھر کبھی سہی۔'' میں نے کہا اور لائبہ نے بھی اس موضوع پر خاموشی اختیار کر لی۔

''میرا خیال ہے درمیان سے بات کرنے کے بجائے میں ابتدا سے بات کروں تو بہتر ہے۔'' لائبہ نے کہا اور میں نے خاموش رہ کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

لائبہ اس کے بعد بولتی رہی اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے تقریباً وہی باتیں کی تھیں جو کچھ دیر پہلے میں اس کے بھائیوں سے سن چکا تھا جب تک وہ بولتی رہی، میں یہ سوچتا رہا کہ وہ سب ایک ہی پیڑ کی شاخوں کی طرح تھے لیکن ان میں بہت زیادہ فرق تھا اور بہت کم باتیں مشترک تھیں۔ ان کے والدین کی مختلف سوچ نے انہیں مختلف بنا دیا تھا۔ ایک اور بات کا احساس مجھے لائبہ کی گفتگو کے دوران میں ہوا کہ بھائیوں سے مختلف ہونے کے باوجود وہ بھائیوں سے نفرت نہیں کرتی تھی۔

''اماں کی وصیت تھی کہ ان کا کوئی بیٹا ان کے جنازے کو کندھا نہ دے لیکن ظفر اللہ بھائی سمیت کسی میں ہمت نہیں تھی کہ یہ بات ان سے کہتا۔ جب میں نے بھائی اختیار سے یہ بات کی تو انہوں نے سر جھکا کر اماں کا حکم تسلیم کر لیا۔'' لائبہ کہتے کہتے رکی۔

''چھوٹے تینوں بھائی اسی طرح پروفیسر صاحب کا حکم مانتے ہیں جیسے وہ بھائی نہیں، ملازم ہوں۔'' میں نے کہا اور لائبہ مجھے گھورنے لگی۔

''آپ بھائی اختیار کو پروفیسر کہہ رہے ہیں؟'' اس

نے سوال کیا۔

"میں ان کے حلیے کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے جواب میں کہا۔

لائبہ نے میری وضاحت سنی لیکن خاموش رہی۔اس کا چہرہ بھی اس طرح سے بے تاثر رہا کہ میں اس کے بعد کچھ کہہ نہیں سکا۔

"بھائی عبادت ایک لڑکی کو پسند کرتے تھے اور یہ پسند یک طرفہ نہیں تھی، وہ لڑکی بھی بھائی عبادت کو پسند کرتی تھی۔" لائبہ نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔

"وہ خاصے سلجھے ہوئے ہیں۔" میں نے کہہ دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا لیکن لائبہ اس وقت کسی اور دھیان میں تھی اس لیے اس کی توجہ میری غلطی کی طرف نہیں گئی۔

"بھائی عبادت نے اس کا ذکر بھائی اختیار سے کیا اور وہ رشتہ لے کر خود گئے لیکن ان کے گھر والوں نے انکار کر دیا۔" لائبہ نے بات آگے بڑھائی۔

"کون سے ماں باپ ہوں گے جو اپنی لڑکی کو بھیڑیوں کے غول میں جانے کی اجازت دیں گے۔" میرے ذہن میں فقرہ ابھرا لیکن میں نے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی اسے دبا لیا۔

"بھائی عبادت نے دوسرا طریقہ اپنانا چاہا لیکن بھائی اختیار نے سختی سے منع کر دیا۔" لائبہ نے کہا اور مجھے دلچسپی ہوئی۔

"تمہارا مطلب ہے کورٹ میرج؟" میں نے سوال کیا۔

"کورٹ میرج تو تب ہوتی جب وہ لڑکی گھر سے باہر نکلتی لیکن اس کے گھر والوں نے تو اسے گھر میں بند کر دیا تھا۔" لائبہ نے وضاحت کی اور میں الجھ کر رہ گیا۔

"تو کیا وہ لڑکی کو اغوا کرنا چاہتے تھے؟" میں نے سوال کیا اور لائبہ کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

"بھائی اختیار کے روکنے کے باوجود بھائی عبادت نے عین لڑکی کے نکاح والے دن لڑکی کے گھر پر اپنے دو دوستوں کے ساتھ اٹیک کیا جس میں بھائی عبادت زخمی بھی ہوئے لیکن وہ لڑکی کو فائرنگ کرتے ہوئے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔" لائبہ کہتے کہتے ایک بار پھر رک گئی۔

"بالکل فلمی سین ہوگا۔" میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا اور وہ مسکرا دی۔

"فلمی سین تب مکمل ہوا جب بھائی اختیار اسپتال پہنچے.... اور انہوں نے لڑکی کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور بھائی عبادت نے انکار کیا تو بھائی اختیار نے ان پر پستول تان لیا۔" لائبہ کے فقرے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

"لڑکی کی مرضی کیا تھی؟" میں نے سوال کر دیا۔

"جو کچھ ہوا، اس میں اس کی بھی رضامندی شامل تھی تب ہی تو وہ اسپتال میں تھی۔" لائبہ نے کہا اور مجھے اس کا موقف تسلیم کرنا پڑا۔

"تب تو یہ زیادتی تھی۔" میں نے کہا اور لائبہ نے میرے فقرے پر توجہ نہیں دی۔

"بھائی اختیار لڑکی کو لے کر اس کے والدین کے پاس گئے اور نہ صرف ان کی بیٹی واپس کی بلکہ یہ پیشکش بھی کہ وہ نکاح ہونے تک وہیں رہیں گے بلکہ نکاح کے بعد بھی ان کی ذمے داری ہوگی کہ دوبارہ اس طرح کا واقعہ نہ ہو۔" لائبہ نے کہا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کے بعد کیا کہوں۔

"اس لڑکے کی جگہ میں ہوتا تو اس پیشکش کے باوجود تیار نہ ہوتا۔" میں نے کہہ دیا۔

"اس لڑکے نے بھی یہی کیا تھا۔" لائبہ کا جواب تھا اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں ہنس پڑے۔

"اور تمہارے عبادت بھائی کی تو لاٹری نکل آئی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لاٹری یہ نکلی کہ لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کو عاق کر دیا اور بھائی اختیار نے عبادت بھائی سے ہر تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔" لائبہ نے کہا اور میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ "صبح تو وہ ساتھ ہی تھا بلکہ ترجمان بنا ہوا تھا۔"

"بھائی اختیار کا فیصلہ یہ تھا کہ دونوں اب پاکستان میں نہیں رہ سکتے اور اس فیصلے کے مطابق وہ دونوں انگلینڈ چلے گئے تھے۔" لائبہ نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت الدین میں جو بات کرنے کا سلیقہ آیا ہے، وہ برطانیہ میں رہنے کی وجہ سے آیا ہے؟" میں نے سوچا لیکن یہ بات بھی میں کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ اگر لائبہ سوال کر لیتی کہ میری ملاقات کب ہوئی تو میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

"چند سال پہلے آپ نے اخبارات میں خبر پڑھی ہوگی کہ ایک پاکستانی نژاد جوڑے پر آئرلینڈ میں حملہ ہوا تھا۔" لائبہ نے کہا اور میں چونک گیا۔

"جس میں بیوی اور بچہ ہلاک ہوئے تھے اور شوہر

شدید زخمی۔۔۔'' میرا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ لائبہ کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''بھائی اختیار نے انہیں اپنی زندگی سے نکال دیا تھا لیکن ان کے دشمنوں نے بھائی اختیار سے پہنچنے والے نقصان کا بدلہ بھائی عبادت کے خاندان سے لیا تھا۔'' لائبہ کا لہجہ افسردہ تھا۔

''حملہ آوروں سے شاید تمہارے بھائی کا مقابلہ بھی ہوا تھا؟'' میں نے اپنی یادداشت کو تازہ کیا لیکن اس کے جواب میں وہ خاموش رہی۔

''بھائی اختیار خود برطانیہ میں اس وقت تک رہے تھے جب تک بھائی عبادت ٹھیک نہیں ہو گئے اور واپس آنے کے لیے تیار نہیں ہو گئے۔'' لائبہ نے اپنی بات مکمل کی۔

یہ سوال کرنا عبث تھا کہ ان بھائیوں نے اس کا بدلہ لیا یا نہیں۔ جو لوگ بہن کے ساتھ بدتمیزی کرنے یا اس پر غلط نگاہ ڈالنے والوں کے گھر میں دن دہاڑے گھس کر قتل کر سکتے تھے، انہوں نے قتل کر دینے والوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔

''کیا اب ہم کچھ اپنے بارے میں بات کر سکتے ہیں؟'' لائبہ کی خاموشی طویل تر ہونے لگی تو میں نے سوال کیا لیکن لائبہ نے اس کا فوری جواب نہیں دیا بلکہ نگاہیں جھکائے خاموش رہی۔

''آپ کی اور میری والدہ کی طرح میری بھی پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ آپ مجھے حرام نہ کھلائیں۔'' اس نے انتہائی آہستگی سے کہا۔

''میں اپنے ایک دوست کی کنسٹرکشن کمپنی میں سرمایہ کاری کرتا ہوں۔'' میں نے کہنا شروع کیا اور لائبہ نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''ارادہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ میں اپنی کمپنی بنا کر نوکری چھوڑ ہی دوں یا پھر اسی طرح صرف سرمایہ لگا کر نفع میں سے اپنا شیئر وصول کرتا رہوں۔'' میں نے کہا لیکن یہ بات نہیں بتائی کہ جس سرمایہ کاری کی میں بات کر رہا ہوں، اس کا بیشتر حصہ وہ ہے جو مجھے والد سے ورثے میں ملا ہے۔

''آپ جو بہتر سمجھیں لیکن میں نے اپنی بات واضح کر دی ہے۔'' لائبہ نے آہستگی سے کہا۔

''اپنے بھائیوں کے حوالے سے۔۔۔'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

لائبہ کے پاس میرے سوال کا فوری کوئی جواب نہیں تھا بلکہ مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کچھ کہہ نہ پا رہی ہو۔ کئی بار اس کے لب ہلے لیکن صرف ہل کر رہ گئے۔

''اگر تم برا نہ مانو تو میں مشورہ دوں؟'' میں نے کہا لیکن اس کی آنکھیں کہتی رہیں کہ وہ منتظر ہے، میں پوری طرح اس کی نظروں کی زبان سمجھنے کے باوجود خاموش رہا۔

''میں منتظر ہوں ذیشان۔'' آخرکار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''وہ اچھے ہیں یا برے بلکہ بہت برے بھی ہیں پھر بھی تمہارے بھائی ہیں۔'' میں نے کہنا شروع کیا لیکن اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں ان سے ملوں۔۔۔ مگر؟'' وہ کہتے کہتے رک گئی اور میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں اس کی ماں کی وصیت گونج رہی ہوگی۔

''تم اس انداز میں بھی تو مل سکتی ہو جس طرح میری والدہ نے مجھے والد سے ملنے کی اجازت دی تھی۔'' میں نے کہا اور لائبہ کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

اس روز دوپہر کا کھانا میں نے اور لائبہ نے ساتھ کھایا تھا لیکن رات کے کھانے پر ہم آٹھ بندے ساتھ کھا رہے تھے۔ اسلام آباد سے لائبہ کے کزن ظفر اللہ کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے لائبہ کے بھائیوں سے بات کی تھی۔ انہیں پوری بات سمجھانے میں دیر لگی نہ انہوں نے پہنچنے میں دیر لگائی۔ رات کے کھانے سے پہلے بہن بھائیوں کے ملاپ کا ایک سین بھی ہوا جس میں ہر جانب سے خوب آنسو بہائے گئے۔

ظفر اللہ کے مشورے پر اگلے ہی روز سادگی سے ہمارا نکاح ہوا لیکن اسی روز ہم واہ کینٹ کے لیے روانہ ہوئے جہاں ظفر اللہ کی والدہ سے ہم نے شادی کی اجازت لی اور بہانہ یہ بنایا کہ میرے اور لائبہ کے تمام ملنے والے کراچی میں ہیں اس لیے ہم شادی کراچی میں کریں گے۔

آج ہم ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ شروع میں چوری چھپے رشوت لیتا تھا لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد سے بالکل ہی ختم کر دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو زندگی مجھے اور لائبہ کو گزارنی پڑی تھی وہ میری بیٹی کو گزارنی پڑے۔ ہم تینوں لائبہ کے بھائیوں سے بھی ملتے ہیں۔۔۔ اب مجھے وہ بھیڑیے جیسے بھی نظر نہیں آتے۔۔۔

ادھوری خبر

سلیم فاروقی

زندگی کے حالات و واقعات کا قریب سے اور گہری نظر کے ساتھ مشاہدہ کرنے کا مسلسل موقع ہر شخص کو ملتا رہتا ہے... جو آنے والے وقت... منزل کا تعین اور شعوری سفر کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے... ان تجربات و مشاہدات سے کوئی منزل کو پالیتا ہے... اور کسی کے حصے میں اٹھتی جوانی کے ان چند سالوں میں شعور و آگہی کے بجائے تلخیاں اور ناکامیاں بسیرا کر لیتی ہیں... ان تلخ تجربات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت نہ کرنے والے کم حوصلہ... افراد ایک ایسے گرداب میں الجھ کر رہ جاتے ہیں... جس سے نکلنے کی کوئی سرحد... کوئی راہ باقی نہیں رہتی...

چند دوستوں کی مشترکہ للکار... جو اپنی زندگی کو ایک نیا رچاؤ اور نیا نکھار دینا چاہتے تھے... نامعلوم راستوں کا انتخاب کرنے والے بدنصیبوں کی داستانِ حیات

کمال نے ایک مرتبہ پھر موبائل نکال کر ٹائم دیکھا اور بیزاری سے اردگرد دیکھنے لگا۔ وہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے امجد کا انتظار کر رہا تھا اور دو دفعہ چائے پی چکا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پیکٹ میں اب صرف دو ہی سگریٹ رہ گئے تھے۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے لگایا اور ویٹر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا تاکہ اس سے ماچس لے سکے۔

اسی وقت ایک جلتا ہوا لائٹر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر لائٹر والے کو دیکھا اور کہا۔ ''شکریہ۔''

''میں آپ کو بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا آپ

کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟'' لاٹر والے نے کہا اور اس سے پوچھے بغیر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے یہ کوئی اعلیٰ ریسٹورنٹ تو تھا نہیں کہ کوئی بیٹھنے سے پہلے اس سے اجازت لیتا۔ وہ تو عام سا ایک ہوٹل تھا جس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی بینچیں بنا دی گئی تھیں۔ ان بینچوں کے سامنے ماربل کی بھاری میزیں تھیں۔ وہاں عموماً مزدور، کم آمدنی والے لوگ اور طالبِ علم چائے پیتے تھے۔

کمال کو اس وقت اجنبی کی موجودگی بہت کھل رہی تھی۔ وہ دراز قد اور کسرتی بدن کا نوجوان تھا۔ جسم پر لباس بھی معقول تھا اور حلیے سے یونیورسٹی کا طالب علم یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا ملازم لگ رہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ وہ خاصی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔

''چائے پئیں گے آپ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کمال سے پوچھا۔

''اگر آپ مجھے بہت دیر سے دیکھ رہے ہیں تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ......''

''آپ دو کپ چائے پی چکے ہیں۔'' نوجوان نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ''اس شہر میں ایک چائے ہی تو ہے جو کسی بھی وقت پی جا سکتی ہے۔'' اس نے بیرے کو اشارے سے بُلایا اور بولا۔ ''دو دودھ پتی چائے لے آؤ لیکن ذرا کڑک۔ ہاں، باقر خانی، بسکٹ وغیرہ بھی لے آنا۔'' پھر وہ کمال کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میرا نام عظیم ہے اور میں ایک بینک میں جاب کرتا تھا۔''

''کرتا تھا کیا مطلب؟ کیا اب آپ جاب نہیں کرتے؟''

''جی ہاں، میں نے آج ہی جاب چھوڑی ہے۔''

''مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں ہے لیکن اگر آپ......''

''آپ پوچھیں، ضرور پوچھیں۔'' نوجوان مسکرا کر بولا۔ ''میں غریب ضرور ہوں لیکن اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتا۔''

''عظیم صاحب! جب پیٹ بھرا ہو تو انسان کو اصول بھی یاد رہتے ہیں اور وہ ان پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ خالی پیٹ انسان کا صرف اور صرف ایک اصول ہوتا ہے، پیٹ بھر روٹی اور بس۔''

''یہ اصول نہیں، انسان کا بنیادی حق ہے کمال صاحب۔'' عظیم نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ بڑے باپ کے بیٹے ہیں جو اتنی آسانی سے ملازمت پر لات مار دی۔ ملک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں نوجوان بے روزگاری کا عذاب جھیل رہے ہیں اور آپ......''

''میں کسی صنعت کار یا بیوروکریٹس کا بیٹا نہیں ہوں۔'' عظیم مسکرایا۔ ''میرا باپ معمولی سا پرائمری اسکول ٹیچر تھا۔ اب وہ بھی ریٹائر ہو چکا ہے۔ میرے گھر میں دو جوان بہنیں اور دو بھائی ہیں اور......''

''اس کے باوجود آپ نے ملازمت چھوڑ دی؟'' کمال نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں، اس کے باوجود میں نے چند ہزار کی اس نوکری پر لات مار دی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔''

اس وقت کمال کو امجد کی شکل نظر آئی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے ہوٹل میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ رشید بھی تھا۔ کمال نے ہاتھ ہلا کر امجد کو اشارہ کیا تو وہ سیدھا کمال کی طرف آ گیا اور ایک کرسی سنبھال کر بولا۔ ''سوری یار! میں کچھ لیٹ ہو گیا۔''

''کچھ لیٹ نہیں، تم پورے ایک گھنٹا اور چالیس منٹ لیٹ ہو۔''

''وہ دراصل......'' بولتے بولتے اس کی نظر عظیم پر پڑی تو وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ''یار عظیم! تو یہاں کیسے؟'' پھر وہ کمال سے مخاطب ہوا۔ ''کمال! تم عظیم کو پہلے سے جانتے ہو؟''

''نہیں یار! ان سے تو ابھی کچھ دیر پہلے ملاقات ہوئی ہے۔''

''یہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہم دونوں پہلی کلاس سے میٹرک تک ایک ساتھ ہی پڑھے ہیں پھر عظیم لاہور چلا گیا۔ اس کے بعد سے ہم دونوں آج ملے ہیں۔''

''تو آج کل کیا کر رہا ہے؟'' عظیم نے امجد سے پوچھا۔

''آج کل میں وہ کام کر رہا ہوں جو اس ملک کے لاکھوں نوجوان کر رہے ہیں۔'' امجد نے کہا۔ ''دھکے کھا رہا ہوں، ذلیل ہو رہا ہوں جاب کے لیے۔''

عظیم مسکرایا اور بولا۔ ''لگتا ہے اس وقت تو بہت غصے میں ہے۔''

''اس وقت کیا عظیم صاحب!'' کمال نے کہا۔ ''یہ غصہ تو مستقل ہے۔ ہم بھی اس صورتِ حال کا شکار ہیں۔ مجھے تو آپ پر حیرت ہے کہ آپ نے لگی لگائی ملازمت چھوڑ دی۔''

''میں نے ملازمت چھوڑی نہیں ہے بلکہ مجھے نکال دیا گیا ہے۔'' عظیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں آپ لوگوں کی طرح دھکے نہیں کھاؤں گا بلکہ اپنا حق چھین لوں گا۔''

''یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں۔'' امجد نے کہا۔

''صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' عظیم نے کہا۔ ''اس کے لیے عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔'' پھر وہ رازداری کے انداز میں بولا۔ ''میرے پاس ایک پلان ہے، میں اکیلا وہ کام نہیں کرسکتا۔ اگر آپ لوگ میرا ساتھ دیں تو......''

''ہم ساتھ دیں گے۔'' امجد نے جلدی سے کہا۔ ''تو پلان بتاؤ۔''

''میں بینک میں ڈکیتی کرنا چاہتا ہوں۔'' عظیم نے اطمینان سے کہا۔

چند لمحے کے لیے وہ دونوں خاموش ہوگئے اور عظیم کی شکل دیکھنے لگے۔

''بس ہوگئے پریشان؟'' عظیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ پانے کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔''

''ہم تو خود اس بات پر غور کررہے تھے۔'' کمال نے کہا۔ ''تم پلان بتاؤ، ہم تیار ہیں۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' عظیم خوش ہوکر بولا۔ ''میں اپنے ہی بینک میں ڈکیتی کرنا چاہتا ہوں۔'' عظیم نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ بینک کا اسٹاف کتنا ہے۔ اضافی کیش کہاں ہوتا ہے۔ بینک کے سیف کی چابیاں کہاں ہوتی ہیں اور کہاں سیکیورٹی کا انتظام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''تم پلان بتاؤ۔''

''میری ایک شرط ہے۔'' عظیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صرف پلاننگ کروں گا، سارا خرچہ برداشت کروں گا لیکن تمہارے ساتھ ڈکیتی میں حصہ نہیں لوں گا۔ مجھے بینک کا ہر شخص جانتا ہے۔ وہ لوگ مجھے پہچان لیں گے اور میرے ساتھ تم لوگ بھی پکڑے جاؤ گے۔''

''ہمیں یہ بھی منظور ہے۔'' کمال نے کہا اور دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہمیں منظور ہے۔'' امجد اور رشید نے کہا۔

''میں سائٹ ایریا کی برانچ میں تھا۔'' عظیم نے کہا۔ ''وہاں ہر مہینے کی دس تاریخ کو تین بڑی فیکٹریوں کے ملازمین کی تنخواہیں ہوتی ہیں جو شام تک فیکٹریوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ اس دن بینک میں تقریباً دو کروڑ روپے کیش ہوتا ہے، بارہ، پندرہ لاکھ اور لگا لو۔ واردات کا بہترین وقت دوپہر ایک بجے سے تین بجے کے درمیان ہوگا کیونکہ اس وقت کسٹمر برائے نام ہوتے ہیں اور پولیس کا سپاہی کھانا کھانے چلا جاتا ہے۔ دو آدمی بینک میں داخل ہوں گے اور بینک کے عملے اور وہاں موجود کسٹمر کو گن پوائنٹ پر لے لیں گے پھر ایک آدمی کیشیئر سے کیش سمیٹے گا، بینک منیجر سے سیف کھلوا کر اضافی کیش لے گا پھر دونوں آدمی کیش کے تھیلے لے کر باہر نکل جائیں گے۔ تیسرا آدمی گاڑی کے ساتھ باہر موجود ہوگا۔ دونوں آدمی فوراً گاڑی میں بیٹھ جائیں گے اور وہاں سے فرار ہوجائیں گے۔''

''بینک کے عملے میں کتنے آدمی ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔ ''سیف کی چابیاں منیجر کے علاوہ دوسرے آدمی کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ جب تک دونوں چابیاں استعمال نہ ہوں تو سیف نہیں کھلے گا۔''

''یہ سب باتیں میں کل بتاؤں گا۔'' عظیم نے کہا۔ ''کل تم لوگ میرے گھر آجاؤ۔ وہاں میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ لوٹ کی رقم لے کر بھی تم لوگوں کو وہیں آنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''ہم آجائیں گے۔''

''تو پھر اب کل ملاقات ہوگی۔'' عظیم نے کہا اور جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی پشت پر اپنا پتا لکھ کر کمال کے حوالے کردیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں بھی کھڑے ہوگئے اور عظیم کے جانے کے بعد وہ بھی ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

ان تینوں میں کمال سب سے زیادہ پڑھا لکھا، ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے یونیورسٹی سے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا۔ ملک کے لاکھوں نوجوانوں کی طرح اسے بھی خوش فہمی تھی کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اسے کوئی معقول ملازمت مل جائے گی۔ وہ گزشتہ ایک سال سے ملازمت کے لیے دھکے کھارہا تھا۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے سے کلرک کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے اور اب گھر میں اکثر فاقے ہوتے تھے۔ دو مہینے تو محلے کی ایک دکان سے ادھار پر کام چلتا رہا۔ دکان والے عنایت اللہ کو بھی امید تھی کہ کمال کو ملازمت مل جائے گی تو اس کا پورا حساب بے باق ہو جائے گا۔ اب تو اس نے بھی ادھار دینا بند کردیا تھا اور اپنے پیسوں کا تقاضا کرنے لگا تھا۔

کمال کو حیرت ہوتی تھی کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ کے باوجود اسے جاب کیوں نہیں مل رہی؟ اسے دو چار جگہ ملازمت ملی بھی تو ایسی کہ کمال نے خود انکار کردیا۔ ایک کسی

فیکٹری میں ٹائم کیپر کی ملازمت تھی، دوسری ایک کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ کی ملازمت تھی، تیسری ایک پرائیویٹ اسکول کی جاب تھی جہاں انتظامیہ دس ہزار کے واؤچر پر سائن لینے کے بعد صرف تین ہزار ہی ٹیچرز کے ہاتھ پر رکھتی تھی۔

بہت دھکے کھانے اور ذلیل ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنا حق چھیننا پڑے گا۔

امجد کے حالات بھی کم و بیش کمال ہی کی طرح تھے لیکن اس میں کمال جیسی جرأت تھی نہ قوت فیصلہ۔ رشید میں جرأت بھی تھی اور اعتماد بھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گزشتہ دو سال سے چوری چکاری اور لوٹ مار کی وارداتیں کر رہا تھا۔

وہ تینوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اس لیے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان تینوں کے گھریلو حالات بھی ایک جیسے تھے۔

☆☆☆

امجد گھر میں داخل ہوا تو ابا نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔ امجد نے صحن میں ایک طرف رکھی ہوئی پانی کی ٹنکی سے ہاتھ منہ دھویا اور برآمدے میں پڑے تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔

''شاہانہ!'' اماں نے آواز لگائی۔ ''کھانا دے بھائی کو۔''

''کھانا؟'' امجد نے حیرت سے کہا۔ ''کھانا کہاں سے آیا اماں؟''

''ٹھیکے دار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔'' اماں نے کہا۔ ''انہوں نے ختم کرایا تھا۔''

امجد نے تلخی سے سوچا۔ 'اب ہماری یہی زندگی رہ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی خیرات پر پلیں' پہلے تو اس نے سوچا کہ کھانے سے انکار کر دے لیکن کھانے میں بریانی، قورمہ اور تافتان دیکھ کر اس کے پیٹ میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ وہ کھانے پر گویا پل پڑا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے زوردار ڈکار لی اور گڑ کی چائے پیتے ہوئے بولا۔ ''بس اماں، ایک آدھ ہفتے کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیوں بیٹا، تجھے کہیں ملازمت مل گئی ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''ملازمت چھوڑ اماں، مجھے ایک ایسا کام مل گیا ہے جس میں پیسا ہی پیسا ہوگا۔ تم بس ایک ہفتے انتظار کرلو۔''

''ایسا کون سا کام ہے بیٹا؟'' ابا نے پوچھا۔

''ابا، آپ دیکھتے جائیں، میرا ایک دوست کویت سے آیا ہے۔ وہ میرے ساتھ مل کر کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ محنت میری، پیسا اس کا۔'' امجد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''پھر میں بہت دھوم دھام سے اپنی بہنوں کی شادی کروں گا۔''

''بیٹا! جو کچھ بھی کرنا، سوچ سمجھ کے کرنا۔'' ابا نے کہا۔

اس دن گھر کا ہر فرد یوں خوش نظر آ رہا تھا جیسے امجد نے واقعی کاروبار شروع کر دیا ہو۔

☆☆☆

گلشن اقبال کا چھوٹا سادہ بنگلا بہت خوب صورت تھا۔ انہیں وہ بنگلا ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ کال بیل کے جواب میں عظیم ہی نے دروازہ کھولا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

بیٹھنے کے بعد عظیم نے کہا۔ ''تم لوگوں کو مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔'' کمال نے کہا۔ ''بہت آسان ایڈریس ہے۔''

عظیم نے ایک تھرماس سے ان لوگوں کے لیے چائے نکالی اور بولا۔ ''میں یہاں اکیلا رہتا ہوں اس لیے باہر ہی کھاتا پیتا ہوں۔ یہ چائے بھی میں باہر سے ہی لایا ہوں۔''

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

جب وہ چائے پی چکے تو عظیم نے کہا۔ ''اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولا۔ ''بینک میں دو کیشیئرز ہیں، ان میں سے ایک لڑکی ہے۔ دو کلرک ہیں۔ دو سینئر آفیسرز ہیں اور ایک منیجر ہے۔ بوڑھا سا ایک چپراسی ہے، ایک سیکیورٹی گارڈ بینک کے اندر ہوتا ہے۔ وہ خاصا چاق و چوبند ہے اور آرمی کا ریٹائرڈ حوالدار ہے۔ یہ ہوئے نو آدمی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ باہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک پولیس کا سپاہی بھی ہوتا ہے جو اس وقت وہاں موجود نہیں ہوگا۔ لیکن اسے بھی ذہن میں رکھو۔ ممکن ہے اس دن وہ موجود ہو۔ ان کے علاوہ بینک میں چند کسٹمرز بھی ہوں گے۔ یہ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ ہاں، بینک کے سیف کی چابیاں منیجر کے علاوہ ایک سینئر افسر کے پاس ہوتی ہیں۔ اس کا نام منیر ہے۔ اب تم لوگوں کو خود انتظام کرنا ہے کہ وہاں سے فرار کے لیے گاڑی کہاں سے آئے گی اور تم لوگ اسلحہ کہاں سے حاصل کرو گے؟''

''اسلحے کی کیا ضرورت ہے؟'' کمال نے کہا۔

اس کی بات پر عظیم خوب ہنسا جیسے اس نے کوئی بہت احمقانہ بات کہہ دی ہو، پھر وہ بولا۔ ''اسلحے کی موجودگی ضروری ہے۔ چاہے اسے استعمال نہ کیا جائے لیکن اسلحہ دیکھ کر ہی لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ حالات سنگین ہو جائیں تو ہوائی فائرنگ کر کے لوگوں کو دہشت زدہ کیا جاسکتا ہے۔''

پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور امجد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔ میرے خیال میں ابتدائی اخراجات کے لیے یہ کافی ہیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ایک بات اور... لوٹی ہوئی رقم کا چالیس فیصد میرا ہوگا، بقیہ ساٹھ فیصد تم تینوں آپس میں بانٹ لینا۔ اس طرح تقریباً ساٹھ لاکھ روپے میرے حصے میں آئیں گے اور تم لوگوں کو تقریباً پینتالیس پینتالیس لاکھ روپے ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کمال نے کہا۔ اتنی رقم بھی اس کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔

''ایک بات اور۔'' عظیم نے کہا۔ ''اگر تم مزید کسی ساتھی کا اضافہ کرو گے تو اسے اپنے حصے میں سے دو گے۔''

''تم نے اخراجات کے لیے جو رقم دی ہے، وہ کم ہے۔'' رشید نے کہا۔ ''ہمیں اسلحہ خریدنے کے لیے کہیں زیادہ رقم کی ضرورت پڑے گی، پھر گاڑی کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔''

عظیم نے چند لمحے سوچا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور گڈی نکالی اور امجد کو دے دی۔

''یہ رقم ہمارے حصے میں سے نہیں کٹے گی۔'' رشید نے کہا۔

''نہیں کٹے گی۔'' عظیم مسکرایا۔ ''ویسے تم مجھے پرانے پاپی لگتے ہو۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''آج دو تاریخ ہے، اب ہم نو تاریخ کی رات کو یہیں ملیں گے۔''

وہ تینوں باہر آگئے۔

باہر آکر کمال نے امجد سے کہا۔ ''یار یہ عظیم تو بہت چالاک آدمی ہے۔ یہ کچھ کرے گا بھی نہیں اور بیٹھے بٹھائے ساٹھ لاکھ لے لے گا۔''

''یہ سوچو کہ ہمیں کیا ملے گا۔'' امجد ہنس کر بولا۔ ''اتنی رقم میں تو میں کوئی بھی کاروبار کرسکتا ہوں۔''

''ہاں یار یہ تو ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''میں بھی کاروبار ہی کروں گا۔''

''میں تو سیدھا دبئی چلا جاؤں گا۔'' رشید نے کہا۔

پھر وہ تینوں ایک بس میں سوار ہو گئے۔ اور مزید بات چیت کے لیے اسی ہوٹل میں جا بیٹھے۔

امجد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب گاڑی کا مسئلہ بھی ہے۔''

''گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رشید نے کہا۔ ''وہ تو میں کہیں سے بھی اٹھا لوں گا۔'' رشید نے کہا۔ وہ اس وقت ہوٹل کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔

''یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے۔'' امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آج کل تقریباً ہر گاڑی میں ٹریکر لگا ہوتا ہے۔''

اس کی بات پر رشید یوں مسکرایا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے ایک سال تک گاڑیاں چوری کرنے کا دھندا بھی کیا ہے۔ میں ہر قسم کے ٹریکر کو ناکارہ کرنا جانتا ہوں۔ اس کی تم لوگ فکر مت کرو۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں ہمیں مزید ایک آدمی کی ضرورت پڑے گی۔''

''کیوں؟'' کمال نے اسے گھورا۔

''یار، بینک میں تم دونوں جاؤ گے۔ ان میں سے ایک آدمی تو کیش سمیٹنے میں مصروف ہوگا، ایک آدمی بینک کے عملے، گارڈز اور پولیس والے کو قابو کرے گا، پھر کسٹمرز میں سے بھی کچھ لوگوں کو ہیرو بننے کا شوق ہوتا ہے۔ ان سب کو سنبھالنے کے لیے ایک آدمی تو کافی نہیں ہے۔ تم لوگ ایک بات بھول رہے ہو۔ ایک سیکیورٹی گارڈ بینک کے اندر بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات منیجر یا کیشیئر میں سے کوئی مسلح بھی ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی وجہ سے ہمارا پلان ناکام ہو۔ پلان ناکام ہوا تو ہم سب سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔''

کمال سوچ میں پڑ گیا۔ امجد نے کہا۔ ''ویسے رشید کی بات میں وزن ہے لیکن مزید ایک آدمی کہاں سے لائیں؟''

''ایک آدمی بڑھانے کا مطلب ہے کہ خطرات میں اضافہ اور لوٹ کی رقم میں حصے داری۔'' کمال نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''مزید خطرہ کیسے؟''

''بھئی جتنے زیادہ آدمی ہوں گے، اتنے ہی خطرات بھی زیادہ ہوں گے۔'' کمال نے کہا۔ ''میں نے اس پلان کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ ہمیں مزید کوئی ضرورت پڑے گی۔''

''ضرورت تو پڑے گی۔'' امجد نے کہا۔ ''سوال صرف یہ ہے کہ ایسا آدمی کہاں سے ملے گا جو با اعتبار بھی

ہو۔"

"ایسا ایک آدمی میری نظر میں ہے۔" رشید جلدی سے بولا۔ "وہ بہت زبردست ڈرائیور اور شارپ شوٹر ہے۔ پہلے وہ جس گینگ کے ساتھ کام کرتا تھا، ان لوگوں سے کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔ آج کل وہ بہت پریشان ہے۔ ہمارے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ اسے ہم لوٹ کے مال میں سے حصہ نہیں دیں گے۔ میں اس سے صرف پانچ لاکھ روپے کی بات کروں گا۔ لوٹی ہوئی رقم چاہے جتنی بھی ہو اسے صرف پانچ لاکھ دیے جائیں گے۔"

"اور وہ راضی ہو جائے گا؟" کمال نے پوچھا۔

"وہ اس وقت بہت پریشان ہے، ایک لاکھ میں بھی راضی ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، تم شام کو اسے لے آؤ۔" کمال نے کہا۔ "ہاں، اور جا کر اس علاقے کا جائزہ لو کہ وہاں گاڑی کہاں پارک کرو گے، وہاں سے کون کون سے راستے نکلتے ہیں۔ اگر ہمیں مین روڈ چھوڑ کر سروس روڈ یا گلیوں میں بھی گھسنا پڑے تو وہ راستے کہاں نکلتے ہیں؟"

"یہ تو خیر میں آج ہی معلوم کرلوں گا۔"

"یہ بھی دیکھنا کہ بینک کے باہر جو گارڈ ہوتا ہے، وہ اپنی گن کہاں رکھتا ہے اور پولیس والا کس طرف ہوتا ہے؟" پھر وہ امجد سے مخاطب ہوا۔ "تم بینک کے اندر جا کر جائزہ لے لو۔ اسٹاف میں کتنے آدمی ہیں، منیجر کا کمرا کس طرف ہے اور دوپہر کے وقت بینک میں عموماً کتنے کسٹمر ہوتے ہیں۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب شام کو اسی ہوٹل میں ملاقات ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" رشید نے کہا۔ "میں شام کو اکبر کو بھی اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔"

"اکبر؟" کمال نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"اکبر اس بندے کا نام ہے جسے ہم......"

"اچھا اچھا۔" کمال نے کہا۔ "تم اس شارپ شوٹر کی بات کر رہے ہو۔"

"اس کا نام اکبر ہے لیکن لوگ اسے اکو کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، اب کل شام کو ملاقات ہوگی۔" کمال نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"تمہیں گھر کی بھی کچھ فکر ہے؟" ابا نے تلخ لہجے میں کمال سے کہا۔ "کئی دن سے تم گھر میں پڑے ہوئے ہو یا باہر آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو۔"

"میں بہت دھکے کھا چکا ہوں، بہت ذلیل ہو چکا ہوں ابا۔" کمال نے بھی تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "اب اور ذلیل نہیں ہو سکتا۔ دفتروں میں بااختیار سیٹ پر بیٹھا ہوا دو ٹکے کا آدمی بھی خود کو پرائم منسٹر سے کم نہیں سمجھتا۔ ملازمت مانگنے والے تو ان کے نزدیک بھک منگے ہیں یا کیڑے مکوڑے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟ اتنا پڑھ لکھ کر یونہی آوارہ گردی کرتے پھرو گے؟ تم سے بہتر تو وہ پلمبر اور الیکٹریشن ہے جو شام کو ہزار پندرہ سو روپے کما کے گھر میں گھستا ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی پلمبر یا مکینک بنا دیا ہوتا، کیا ضرورت تھی مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کی؟"

"آپ بھی اس کی شکل دیکھتے ہی شروع ہو گئے۔" اماں نے کمال کی طرف داری کی۔

"تو کیا اسے سر پر بٹھاؤں؟" ابا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھو آخر یہ کرنا کیا چاہتا ہے؟"

"میں بزنس کرنا چاہتا ہوں ابا۔"

"واہ...!" ابا کا لہجہ پھر طنزیہ بلکہ تحقیر آمیز ہو گیا۔ "بزنس کرنا چاہتا ہوں۔" ابا نے اس کی نقل اتاری۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھا لو۔ نوکری کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور چلے ہیں بزنس کرنے، اونہہ۔ بزنس کوئی دس پانچ روپے سے شروع نہیں ہوتا۔"

"ابا! نیویارک میں میرا ایک دوست ہے۔ وہ وہاں ریڈی میڈ گارمنٹس اور کارپیٹس کا بزنس کرتا ہے۔ کپڑے اور قالین وہ پاکستان سے امپورٹ کرتا ہے۔ اب وہ کراچی میں بھی اپنے دفتر کی ایک برانچ کھولنا چاہتا ہے۔ یہاں کے تمام معاملات میں سنبھال لوں گا۔ پاکستان سے بھیجے گئے گارمنٹس اور کارپیٹس میں جو منافع ہوگا، اس میں چالیس فیصد میرا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے ہر مہینے معقول تنخواہ بھی دے گا۔"

"یعنی تمہارا دوست...... وہ وہاں ہے......" ابا کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹا! سرمایہ اس کا اور محنت تمہاری۔ یہی بات ہے نا؟" خوشی سے ابا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اماں اور اس کی بہن بھی بہت خوش تھی۔

"جاؤ، منہ ہاتھ دھو لو۔" ابا نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "کھانا میرے ساتھ ہی کھانا، ابھی میں نے بھی کھانا

نہیں کھایا ہے۔''

وہ منہ دھو کر آیا تو روبی نے کہا۔ ''بھیا! یہاں آفس کہاں ہوگا آپ کا؟''

''جنید اگلے ہفتے پاکستان آرہا ہے، وہ خود ہی آفس لے کر اسے ڈیکوریٹ کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کلفٹن یا ڈیفنس کے علاقے میں آفس بنائے گا۔''

''واؤ، پھر آپ ہی اس آفس کے انچارج ہوں گے۔'' روبی نے کہا۔ ''جنید بھائی آپ کو گاڑی تو دیں گے نا؟''

''پہلے اسے آنے تو دو۔'' کمال ہنس کر بولا۔

☆☆☆

کمال اور امجد ہوٹل کے اسی مخصوص گوشے میں بیٹھے رشید کا انتظار کررہے تھے۔ کمال نے امجد سے کہا۔ ''یار! اب تو یہ کام بہت ضروری ہوگیا ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں سے بھی کہہ دیا ہے کہ میں ایک دوست کے ساتھ مل کر بہت جلد ایک بزنس شروع کرنے والا ہوں۔ ان کے چہروں کی چمک دیکھ کر مجھے اپنے جھوٹ پر افسوس بھی ہوا۔ اب اگر کسی وجہ سے ہمارا یہ مشن ناکام ہوگیا تو مجھ سے اماں، ابا اور بہن بھائیوں کے حسرت زدہ اور مرجھائے ہوئے چہرے نہیں دیکھے جائیں گے۔''

''یار! یہی حال میرا بھی ہے۔'' امجد نے کہا۔ ''میں نے بھی اپنے گھر والوں کو جھوٹی آس دلائی ہے۔ ناکامی کی صورت میں گھر واپسی کی ہمت مجھ میں بھی نہیں ہے۔''

''یار! ہم لوگ منفی انداز میں کیوں سوچ رہے ہیں؟'' کمال نے سر جھٹک کر کہا۔ ''ہمیں ہر قیمت پر یہ کام کرنا ہی ہوگا۔''

اسی وقت رشید وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ لمبے قد اور چھریرے جسم کا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نے کمال سے کہا۔ ''یہ ہے میرا دوست اکبر، سب اسے اکو کہتے ہیں۔'' پھر وہ اکبر سے مخاطب ہوا۔ ''اکو! یہ کمال ہے اور یہ امجد۔''

کمال اور امجد نے اکبر سے ہاتھ ملایا اور رشید سے کہا۔ ''یار! ہم کب سے تمہارا انتظار کررہے ہیں، ہم نے تو ابھی تک چائے بھی نہیں پی ہے۔''

''ارے یار، آج چائے میری طرف سے۔'' رشید نے ہنس کر کہا اور بیرے کو آواز دے کر بلالیا۔ اسے چائے اور سموسوں کا آرڈر دینے کے بعد رشید نے کہا۔ ''میں نے اکبر کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ ہر طرح سے راضی ہے۔''

کمال نے غور سے اکبر کا جائزہ لیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ معصوم چہرے والا سیدھا سادہ سا یہ نوجوان گینگسٹر بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا۔ ''اکو! ہمیں رشید نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ ہمارے مشن کی بنیادی شرط رازداری ہے۔''

''کمال بھائی۔'' اکبر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ ''اپنی گردن کٹوا دوں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔'' پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا لیکن وہ خالی تھا۔ اس نے پیکٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''کمال بھائی! میں ذرا سگریٹ لے آؤں، سگریٹ کے بغیر میرا دماغ بالکل کام نہیں کرتا ہے۔''

وہ اٹھ کر تیزی سے پان سگریٹ کے کیبن کی طرف بڑھا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی وہ ایک سائیکل والے سے ٹکرا گیا۔ سائیکل کے کیریئر پر دو تین پیکٹ رکھے تھے۔ اکو کے ٹکرانے سے سائیکل والا سڑک پر گر پڑا۔ سامان کے پیکٹ بھی سڑک پر گرے۔ ان میں شاید شیشے کے گلاس یا پیالے تھے۔ کچھ برتن چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گئے۔

وہ شخص غضب ناک انداز میں اکبر کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کردیا اور بھنا کر بولا۔ ''ابے اندھا ہے کیا؟ دیکھ کر نہیں چلتا۔''

''مجھے معاف کردیں۔'' اکو نے تھپڑ کھا کر کہا۔ ''اصل میں غلطی آپ کی بھی ہے۔''

''غلطی کے بچے۔'' اس آدمی نے پھر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ ''بکواس کررہا ہے کہ میری غلطی ہے۔''

کمال، رشید اور امجد نے یہ واقعہ دیکھا تو لپک کر وہاں پہنچے۔ کمال کو اندیشہ تھا کہ اکو کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کردے۔ اس وقت تک وہ شخص اکو کو مزید دو تین تھپڑ مار چکا تھا اور اکو خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔

امجد کو یہ دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ شخص ڈیل ڈول میں اکو سے دگنا تھا اور چہرے سے بھی لڑاکا نظر آرہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اکو جیسا آدمی اس شخص سے یوں ڈر جائے گا۔

''بس کرو بھائی۔'' کمال نے کہا۔ ''تم نے اس بے چارے کو بہت مار لیا، اب جانے بھی دو۔''

''جانے دوں؟'' وہ آدمی قہر آلود لہجے میں بولا۔ ''تم اس کے اتنے ہی ہمدرد ہو تو میرا نقصان پورا کردو۔''

''یار! اصل میں غلطی تمہاری بھی تھی۔'' رشید نے ناگواری سے کہا۔ ''تم منہ اٹھائے سائیکل دوڑاتے چلے

آ رہے تھے۔ اپنی غلطی اس کے سر تھوپ رہے ہو۔"
"تم سب اس کمینے کی حمایت کر رہے ہو، میرا نقصان کیا اس کا باپ پورا کرے گا؟"
اچانک اکو کے تیور بدل گئے۔ وہ چیخ کر بولا۔ "مجھے جتنا چاہو مار لو لیکن میرے باپ کو کچھ مت کہنا ورنہ......"
"ورنہ کیا کرے گا تو؟" وہ آدمی بپھر کر بولا۔ "تیرا باپ کہیں کا گورنر ہے یا......"
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اکو نے اچانک اس کے چہرے پر زوردار گھونسا مارا تھا۔ "بکواس کیے جا رہا ہے۔" اکو نے اسے زوردار لات مارتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کروں گا، میں تجھے بولنے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔"
وہ لاتوں اور گھونسوں سے اس شخص پر پل پڑا۔ "مجھ سے معافی مانگ ورنہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اکو نے دوسری لات اس کے پیٹ میں ماری تو وہ شخص اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔
"چھوڑو اکو۔" رشید نے کہا۔ "بس بہت ہو گیا۔"
"نہیں رشید بھائی۔" اکو نے رشید کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ "یہ پہلے معافی مانگے گا، پھر میں اسے چھوڑوں گا۔ اس نے میرے باپ کا نام کیسے لیا؟"
اکو اس شخص کے سینے پر سوار ہو گیا۔ کمال اور امجد نے مداخلت کرنا چاہی تو رشید نے کہا۔ "اسے چھوڑ دیں، ورنہ یہ ابھی گن نکال لے گا۔"
اکو نے اس شخص کا گلا دبوچ لیا اور چیخ کر بولا۔ "معافی مانگ ورنہ میں تیری گردن توڑ دوں گا۔"
سائیکل والا اس کے جنون سے بوکھلا گیا تھا۔ اکو نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔
وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا تھا لیکن لوگ انہیں چھڑانے کے بجائے تماشا دیکھ رہے تھے۔
سائیکل والا گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "مجھے...... معاف...... کر دو۔"
اکو نے اس کی گردن چھوڑ دی اور اس کے سینے سے اٹھ گیا۔ سائیکل والا زمین پر پڑا اپنی گردن مسل رہا تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ کمال نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور اس کا سامان اٹھانے میں مدد کرنے لگا۔ وہ شخص جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ رہا تھا اور اکو کو یوں سہمے ہوئے انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے پھر اس کی گردن دبوچ لے گا۔
اکبر کو رشید اور امجد وہاں سے ہٹا لے گئے تھے۔ رشید ہی نے اس کے لیے سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا۔
وہ شخص سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔
کمال اور دوسرے لوگ دوبارہ اس میز پر جا بیٹھے۔
"یہ کیا حرکت تھی؟" کمال نے سرد لہجے میں پوچھا۔
"اس نے میرے باپ کو بُرا بھلا کہا تھا کمال بھائی۔" اکو نے کہا۔ "اس نے مجھے مارا، میں اس کی مار کھاتا رہا کہ غلطی میری بھی تھی لیکن جب اس نے میرے باپ کا نام لیا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ کوئی میرے باپ کو بُرا کہے۔"
"بہت محبت کرتے ہو اپنے باپ سے؟" امجد نے ہنس کر کہا۔
"میرے باپ نے مجھے ماں بن کر پالا ہے، امجد بھائی۔" اکو نے کہا۔ "بابا بتاتا ہے کہ میں صرف ایک سال کا تھا جب میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔"
"اپنے غصے پر قابو پانے کی عادت ڈالو اکو۔" کمال نے کہا۔
"میں تو بہت کوشش کرتا ہوں کمال بھائی۔" اکو نے کہا۔ "لیکن اس وقت میرا ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔"
'یار اپنے باپ سے سب کو محبت ہوتی ہے۔" امجد نے کہا۔ "ہونا بھی چاہیے لیکن......"
رشید نے امجد کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور موضوع بدلنے کو بولا۔ "یار! یہ ویٹر اب تک چائے لے کر نہیں آیا۔"
اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔
ویٹر نے کہا۔ "میں تو چائے لے کر آیا تھا لیکن آپ لوگ تو ادھر تھے ہی نہیں۔"
"اچھا، اب جلدی سے چار دودھ پتی اور کیک پیس لے آؤ۔"
"رشید!" کمال نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ اس علاقے کا ایک چکر لگا لو جہاں وہ بینک ہے۔"
"میں نے اس علاقے کا چکر لگا لیا ہے کمال۔" رشید نے کہا۔ "وہاں سے تین راستے تین مختلف سمتوں میں نکلتے ہیں۔ سب سے محفوظ راستہ مین روڈ ہی پر ہے۔ اگر مین روڈ پر نہ جا سکے تو بینک کی عقبی سمت میں سائٹ ایریا ہے۔ وہاں اندر کی طرف مختلف سڑکیں ہیں اور کئی راستے ہیں۔"
"میں نے اس علاقے کا چپا چپا دیکھا ہوا ہے کمال بھائی۔" اکو نے کہا۔
"ہاں، اب تو ڈرائیونگ تم ہی کرو گے۔" کمال نے

کہا۔ ”رشید تمہارے لیے گاڑی کا بندوبست کردے گا۔“

”گاڑی کا بندوبست بھی میں خود ہی کرلوں گا۔“ اکو نے کہا۔ ”میں کل ایک مرتبہ پھر جا کر بینک کی لوکیشن دیکھ لوں گا۔“

”میں نے آج اندر سے بھی بینک کا جائزہ لے لیا ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”میں نے اندر جا کر ایک ایسے بینک کے بارے میں معلوم کیا جس کی سائٹ کے علاقے میں کوئی برانچ نہیں ہے۔ بینک کی کلرک لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس بینک کی برانچ ناظم آباد میں ہے۔ میں نے اس بہانے وہاں موجود اسٹاف کا جائزہ لے لیا۔ بینک میں دو کیشیئر، دو سینئر افسر، دو کلرک، ایک پیون، ایک سیکیورٹی گارڈ اور بینک منیجر ہوتا ہے۔ دوسرا سیکیورٹی گارڈ اور پولیس والا بینک کے باہر ہوتا ہے۔ دوپہر ایک سے تین بجے کے درمیان بینک میں کسٹمرز بھی برائے نام ہوتے ہیں۔ عظیم بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

”بس تو پھر دس تاریخ کا مشن ڈن ہو گیا۔ ہم لوگ اپنے طور پر بھی بینک کے عملے کے معمولات کا جائزہ لیں گے اور اب نو تاریخ کی شام کو عظیم سے ملیں گے۔“

”ایک بات اور۔“ امجد نے کہا۔ ”ہم مسلح ضرور ہوں گے لیکن فائرنگ صرف شدید خطرے کی صورت میں کریں گے۔“ پھر وہ کمال سے بولا۔ ”ہمیں اپنے حلیوں میں بھی تو تبدیلی کرنا ہوگی۔“

”وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ کمال نے کہا۔ ”آج کل داڑھی مونچھیں، وگ ہر چیز ریڈی میڈ ملتی ہے۔ وہ کل یا پرسوں لے آؤں گا۔“

وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو سب کے ذہن میں واردات کا ایک خاکہ تیار تھا۔ کمال کو بس یہی اندیشہ تھا کہ کارروائی کے دوران میں ان کے ہاتھ سے کسی کی جان نہ چلی جائے۔

☆☆☆

کمال گھر میں داخل ہوا تو ابا نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ گھر کی حالت میں فوری طور پر تو کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اچھے مستقبل کے خیال سے سب کے چہروں پر ایک بے نام سی خوشی تھی۔ ابا جو گزشتہ کئی ماہ سے کمال سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہے تھے، اب وہ بھی اس سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ بہن بھائیوں کا رویہ بھی حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ وہ بھی کمال کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ ابھی سے مستقبل کے خواب سجا رہے تھے۔ وہ ابا اور بہن بھائیوں کی یہ خوشی دیکھ کر ڈر گیا کہ اگر کل کو کسی بھی وجہ سے انہیں مایوسی ہوئی تو ان کا سامنا کرنا کمال کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

کھانا کھا کر کمال پھر گھر سے نکل گیا۔ اسے سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ اس نے ابھی تک امجد سے ایک پیسا نہیں لیا تھا۔ پان والے غفور چاچا سے اس کا ادھار چلتا تھا۔ گزشتہ چار مہینے سے اس نے غفور چاچا کو بھی کچھ نہیں دیا تھا۔

ان کی دکان پر اس وقت کئی آدمی موجود تھے۔ کمال انتظار کرتا رہا کہ رش کم ہو تو وہ غفور چاچا سے سگریٹ مانگے۔ اسے غفور چاچا کی طرف سے بھی اندیشہ تھا کہ وہ اب اُدھار دینے سے انکار کر دیں گے۔

اسے دیکھ کر غفور چاچا نے خوش دلی سے کہا۔ ”ارے کمال بیٹا! آپ تو دو دن سے نظر ہی نہیں آئے۔ مجھے آپ سے ضروری کام تھا۔“

”ہاں چاچا بولیں۔“ کمال نے جلدی سے کہا۔

”یار! وہ رضوانہ کا امتحان سر پر ہے۔ اسے انگریزی کی ٹیوشن پڑھانے کے لیے کسی پڑھانے والے کا بندوبست تو کر دیں۔“ رضوانہ ان کی بیٹی تھی جو بی اے کا امتحان دے رہی تھی۔

”کسی کا بندوبست کیا چاچا۔“ کمال نے ہنس کر کہا۔ ”آج کل تو میں خود بھی فارغ ہوں۔ میں پڑھا دوں گا۔“

”واہ، آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔“ غفور چاچا خوش ہو کر بولے۔ ”تو پھر کب سے پڑھانا شروع کریں گے؟“

”کل اور پرسوں مجھے کچھ کام ہے۔ اس کے بعد میں رضوانہ کو پڑھا دوں گا۔“

”جیتے رہو بیٹا۔“ چاچا نے کہا اور گولڈ لیف کا پورا پیکٹ کمال کو دے دیا۔

پھر غفور چاچا دوسرے گاہکوں میں مصروف ہو گئے اور کمال وہاں سے کھسک لیا۔

دوسرے دن اس کی آنکھ شہباز کے جھنجوڑنے پر کھلی۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”بھائی وہ...... رشید بھائی......“

”کیا ہوا رشید کو؟“ کمال گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ کمال نے درشت لہجے میں

کہا۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''بھائی...... وہ...... رشید بھائی کے گھر میں رونا پیٹنا مچا ہوا ہے۔ سب محلے والے کہہ رہے ہیں کہ رشید بھائی...... پولیس مقابلے میں......''

کمال اسی حالت میں اٹھ کر باہر بھاگا۔ محلے کے لوگ مختلف ٹکڑیوں میں بٹے رشید ہی کے بارے میں بات کررہے تھے۔

کمال، رشید کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا گھر پچھلی گلی میں تھا۔ گھر کے باہر اور اندر محلے کے لوگ جمع تھے۔ گھر سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کمال نے شکور بھائی سے پوچھا۔ ''شکور بھائی! یہ سب کیسے ہوا؟''

شکور بھائی نے کمال کو دیکھا اور افسردگی سے بولے۔ ''یار! بُرے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ رشید کو سمجھایا تھا کہ وہ شرافت سے رہے لیکن وہ باز نہیں آیا۔ کل رات وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ نکلا تھا۔ ان دونوں نے گن پوائنٹ پر ایک جوڑے کو لوٹا تھا۔ وہ لوگ شادی کی تقریب سے لوٹ رہے تھے۔ اب یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ کچھ فاصلے پر پولیس کی ایک موبائل موجود تھی۔ مزید بدقسمتی یہ کہ موبائل کا انچارج افسر دیانت دار آدمی تھا ورنہ پولیس وین اگر موجود بھی ہو تو پولیس والے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس پولیس افسر نے فوری طور پر ان دونوں کا تعاقب کیا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ رشید نے گھبرا کر پولیس وین پر فائرنگ کردی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی سے ایک پولیس والا زخمی ہوگیا۔ پولیس کی جوابی فائرنگ سے رشید بری طرح زخمی ہوا۔ اس کے ساتھی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے اسے بھی گرفتار کرلیا۔ رشید نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

شکور بھائی نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس پر وہاں کھڑے ہوئے ایک صاحب بولے۔ ''بھائی! یہ تو پولیس کا بیان ہے۔ پولیس والے تو اپنی کارکردگی دکھانے کو بھی بندہ مار دیتے ہیں اور اسے ''پولیس مقابلے'' کا نام دیتے ہیں۔ مرنے والے کے پاس سے ہتھیار بھی برآمد ہو جاتے ہیں۔''

''اس کیس میں ایسا نہیں ہوگا۔'' شکور بھائی نے کہا۔ ''رشید کا ساتھی ابھی زندہ ہے، وہ اس واقعے کا گواہ بھی ہے۔ اگر پولیس جعلی پولیس مقابلہ کرتی تو دوسرے آدمی کو بھی ہلاک کردیتی۔''

کمال بھی کبھار رشید کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن اس وقت اس میں اندر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ یوں بھی ابھی تک رشید کی لاش پولیس نے ورثا کے حوالے نہیں کی تھی۔

کمال کچھ دیر وہاں ٹھہر کر واپس آگیا۔ رشید کی موت سے زیادہ اسے اپنے منصوبے کی فکر تھی۔ اسے اپنا پلان ناکام ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ ممکن ہے رشید کے ساتھ اکبر ہو۔

وہ دل گرفتہ سا گھر واپس آگیا۔ اس نے ناشتا بھی نہیں کیا، کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ گلی سے نکلا ہی تھا کہ اسے امجد آتا دکھائی دیا۔ وہ اسی کی طرف آرہا تھا۔

امجد اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے کہا۔ ''یار امجد! یہ سب کیا ہوگیا؟''

''لگتا ہے، ابھی ہماری قسمت میں مزید دھکے لکھے ہیں؟'' امجد نے کہا۔ اسے بھی رشید کی موت سے زیادہ اپنے پلان کی ناکامی پر صدمہ تھا۔

''یار! کسی طرح یہ تو معلوم کرو کہ رشید کے ساتھ دوسرا آدمی کون تھا؟''

''یہ معلوم ہوگیا ہے۔'' امجد نے کہا۔ ''تم نے شاید ٹی وی نہیں دیکھا۔ رشید کے ساتھی کا نام جمال ہے۔ وہ کورنگی کے علاقے میں رہتا ہے اور اس سے پہلے بھی ڈکیتی اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں کرچکا ہے۔''

''لیکن اب ہمارے پروگرام کا کیا ہوگا؟'' کمال کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' امجد نے کہا۔ ''اصل میں یہ کام ہمارے بس کا ہے بھی نہیں۔'' پھر وہ ہنس کر پھیکے سے لہجے میں بولا۔ ''چلو کل سے پھر ملازمت تلاش کرتے ہیں۔''

کمال نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''یار! یہ تو بہت مشکل ہے۔ محض اس خبر سے کہ میں بزنس شروع کرنے والا ہوں، گھر کے ہر فرد کے چہرے پر خوشی کی چمک ہے۔ ابا بھی مطمئن ہیں۔ میں ان لوگوں کو پھر سے مایوسیوں کے اندھیروں میں دھکیل دوں؟''

''میرا حال تو زیادہ خراب ہے یار۔'' امجد نے کہا۔ ''میں نے تو اپنی بہن ثمینہ کی سسرال والوں کو شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔ میں تو کہیں غائب ہو جاؤں گا۔''

''تمہارے غائب ہونے سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟'' کمال نے کہا۔ ''تمہارے والدین کو ذلت اٹھانا

پڑے گی۔ ثمینہ کی منگنی ٹوٹی تو وہ خود ٹوٹ کر رہ جائے گی۔"

"تو پھر کیا کریں یار؟" امجد جھنجلا کر بولا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" کمال نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"یار! شام کو وہیں ہوٹل میں ملتے ہیں۔" امجد نے کہا۔ "اس وقت تو میں گھر کا سودا لینے نکلا تھا۔"

امجد سے رخصت ہو کر کمال گھر پہنچا تو غفار چاچا کو دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا۔ غفار چاچا، ابا کے دور پرے کے رشتے دار تھے۔ ان کے والد کئی بڑے سرکاری محکموں میں مختلف چیزیں سپلائی کرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر انہوں نے جنگ کے زمانے میں بہت مال کمایا تھا۔ غفار چاچا نے پہلے معمولی ٹھیکوں سے کام شروع کیا، پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے بلڈر بن گئے۔

کمال نے انہیں سلام کیا تو وہ بولے۔ "ہاں بھئی کمال! تم نے کہیں ملازمت کی یا ابھی تک فارغ گھوم رہے ہو؟"

"کمال تو ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس شروع کرنے والا ہے بھائی جان؟" ابا نے فخریہ انداز میں کہا۔

"ایکسپورٹ امپورٹ؟" غفار چاچا کے لہجے میں طنز تھا پھر وہ بولے۔ "جلال میاں! آج کل میرا ہاتھ کچھ تنگ ہے، تم اگر...."

"جی ہاں بھائی جان۔" ابا نے جلدی سے کہا۔ "بس کمال کا بزنس شروع ہو جائے۔ میں آپ کی ایک ایک پائی لوٹا دوں گا۔"

کمال بُری طرح چونک اٹھا۔ تو کیا ابا نے اس چھچھورے آدمی سے پیسے قرض لیے ہیں۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ابا! آپ کو قرض لینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ آپ تو قرض کے بہت خلاف ہیں۔"

"تمہارے ابا نے تمہاری تعلیم کے لیے قرض لیا تھا میاں۔" غفار چاچا نے پھر طنز کیا۔ "انہیں کیا معلوم تھا کہ تم پڑھنے لکھنے کے باوجود نکمے رہو گے۔"

"کتنا قرض ہے آپ کا؟" کمال نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے میرا قرض ابھی چکا دو گے۔" غفار چاچا نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"تم بیچ میں مت بولو کمال۔" ابا نے کمال کو ڈانٹا۔ "یہ میرا اور بھائی جان کا معاملہ ہے۔"

"کیسے نہ بولوں ابا؟" کمال نے کہا۔ "مجھے معلوم تو ہو کہ ان کا کتنا قرض ہے۔ چکانا تو مجھے ہی ہے نا۔"

"واہ بھئی واہ۔" غفار چاچا نے پھر طنز کیا۔ "بیٹا ہو تو ایسا۔ کمال میاں! تمہارے ابا مجھ سے اب تک دو لاکھ روپے لے چکے ہیں۔ اس رقم پر اگر سالانہ انٹرسٹ لگایا جائے تو قرض کی رقم پانچ لاکھ سے بھی زیادہ بنتی ہے۔"

کمال نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو کیا آپ ہم سے سود لیں گے؟"

"توبہ توبہ، سود کون کم بخت لے رہا ہے۔" غفار چاچا نے کہا۔ "یہ تو منافع ہے۔ یہ رقم اگر میں اتنے عرصے بینک میں رکھتا تو وہاں سے مجھے اس سے کہیں زیادہ منافع ملتا۔"

"سود کو منافع، انٹرسٹ یا مارک اپ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سود تو سود ہی رہتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں سود خور ہوں۔ چلو یوں ہی سہی۔ اب ایک ہفتے کے اندر اندر میری رقم ادا کر دو سود سمیت۔"

"ورنہ؟" کمال نے بپھر کر پوچھا۔

"ورنہ تمہارے ابا جانتے ہیں کہ کیا ہوگا؟ ایک ہفتہ...... سات دن۔" غفار چاچا نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھائی جان! آپ بیٹھیں تو سہی۔" ابا نے کہا۔

"میں اگلے ہفتے پھر آؤں گا۔" غفار چاچا نے تلخ لہجے میں کہا اور باہر نکل گئے۔

ابا ان کے پیچھے لپکے لیکن وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

ابا بوجھل قدموں سے واپس آ گئے اور بولے۔ "کمال! تمہیں اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"ابا! آخر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔ قرض کی رقم تو میں ہی چکاؤں گا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "اور وہ سود خور دھمکی کیا دے رہا تھا، کیا ہوگا ابا؟"

"بیٹا! غفار اتنا سخی نہیں ہے کہ مجھے یونہی لاکھوں روپے دے دے گا۔ اس نے مجھ سے مکان کے کاغذات رکھوا لیے تھے۔"

"کیا؟" کمال نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے صرف دو لاکھ روپے کی خاطر مکان کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے؟"

"میرے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا بیٹا۔" ابا کے لہجے میں بے بسی تھی۔ "میں اگر اس سے قرض نہ لیتا تو کیا

کرتا؟ میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہاری ملازمت کے بعد اسے قرض واپس کردوں گا۔''

ابا کے لہجے کی بے چارگی دیکھ کر کمال کو ترس آگیا۔ اس نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں ابا! میں غفار کی ایک ایک پائی چکادوں گا۔ وہ اتنی آسانی سے ہمارا مکان ہضم نہیں کرسکے گا۔''

''بیٹا اب تم ہی اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتے ہو۔'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس دن آٹھ تاریخ تھی۔ گویا انہیں ٹھیک دو دن بعد اپنے پلان پر عمل کرنا تھا۔

وہ شام کو پروگرام کے مطابق ہوٹل پہنچ گیا۔ امجد اور اکو وہاں پہلے سے موجود تھے۔

''آؤ یار! تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔'' امجد نے کہا۔

''سب کچھ فائنل ہوچکا ہے۔ ہم نے اس علاقے کی ریکی کرلی ہے۔ بینک کو اندر سے دیکھ لیا ہے۔''

''اب صرف گاڑی باقی ہے۔'' اکو نے کہا۔ ''وہ میں دس تاریخ کی صبح اٹھاؤں گا۔''

''یار! اس میں بھی رسک ہے۔'' کمال نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اگر مالک نے فوراً ہی گاڑی کی رپورٹ درج کرادی تو......''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' اکو مسکرایا۔ ''میں کئی دن سے مختلف پارکنگ لاٹ کا جائزہ لے رہا ہوں۔ وہاں زیادہ تر آفس ہیں۔ لوگ صبح گاڑی پارک کرتے ہیں تو پھر شام کو جاتے وقت ہی اسے وہاں سے نکالتے ہیں۔''

''میرا خیال تھا کہ ہم کوئی گاڑی رینٹ پر حاصل کرلیں۔'' کمال نے کہا، پھر وہ خود ہی بولا۔ ''نہیں یار! رینٹ اے کار والے تو ضمانت اور شناختی کارڈ کے بغیر گاڑی دیتے ہی نہیں ہیں۔''

''یار! یہ رسک تو ہمیں لینا ہی پڑے گا۔'' امجد نے کہا پھر وہ بولا۔ ''ہتھیار تو ہمارے پاس موجود ہیں۔ گاڑی میں بھی کوئی اخراجات نہیں ہوں گے۔ عظیم کے دیے ہوئے پورے دو لاکھ ہمیں بچیں گے۔''

''ان دو لاکھ کو تین حصوں میں تقسیم کرو۔'' کمال نے کہا۔

''وہ میں پہلے ہی کرچکا ہوں۔'' امجد مسکرایا۔ ''ہم میں سے ہر آدمی کے حصے میں پینسٹھ ہزار روپے آئیں گے۔ پانچ ہزار وگز، چشموں اور ٹوپیوں کے لیے کافی ہوں گے۔''

پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار! آج کسی بہترین جگہ پر مغز نہاری نہ کھائی جائے۔''

''خیال تو اچھا ہے۔'' کمال نے کہا۔

وہ تینوں وہاں سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

سب انسپکٹر ناصر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''یس! ناصر اسپیکنگ۔''

''انسپکٹر صاحب۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تمہارے محلے میں دو پارٹیوں میں تصادم ہوگیا ہے۔ دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ جھگڑا مزید بڑھے گا کیونکہ دونوں پارٹیوں کے لوگوں نے اپنی مدد کے لیے مزید لوگوں کو بلایا ہے۔''

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں، اپنا ایڈریس اور نام لکھوایئے۔'' اس نے رائٹنگ پیڈ اپنی طرف گھسیٹا اور ایڈریس نوٹ کرنے لگا پھر وہ بولا۔ ''جمیل صاحب! آپ فکر مت کریں۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

اس نے ریسیور رکھا اور اپنی ٹوپی اٹھا کر باہر نکل آیا۔

سب انسپکٹر ناصر ان افسروں میں سے تھا جو واقعی عوام کی خدمت کرنے کے لیے پولیس کے محکمے میں آتے ہیں۔ وہ دوسرے افراد کی طرح ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا تھا کہ اس وقت تھانے میں کوئی موبائل وین نہیں ہے یا نفری کم ہے۔

اس نے فوری طور پر پولیس پارٹی تشکیل دی اور ہنگامی طور پر جائے واردات کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب سے ناصر اس پولیس اسٹیشن میں آیا تھا، علاقے میں جرائم کم ہوگئے تھے۔ وہ ''ٹک مکا'' کا سرے سے قائل ہی نہیں تھا۔ اس کی اس روش سے جرائم پیشہ افراد تو پریشان تھے ہی، پولیس اسٹیشن کے دوسرے افسران بھی عاجز تھے۔ علاقے کا ایس ایچ او دلاور تو اسے وہاں سے ٹرانسفر کرنے کے لیے ہر جتن کررہا تھا۔

☆☆☆

کمال نے بہت دن بعد نیا جوڑا پہنا تھا۔ وہ اپنے بھائی بہنوں کے لیے بھی نئے کپڑے لے کر آیا تھا۔ ابا کو نیا چشمہ بنوا کردیا تھا، اماں کے لیے بہترین اونی شال لایا تھا۔ اس دن گھر میں بھی اچھا کھانا پکا تھا۔ اس نے ابا کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا تھا کہ اگلے ماہ سے میں کام شروع کردوں گا۔ میرے دوست نے اسی سلسلے میں کچھ پیسے بھیجے ہیں۔

"بیٹا! اس نے جس کام کے لیے پیسے بھیجے ہیں، پہلے وہ کرو، فضول خرچی مت کرو۔" ابا نے کہا۔

"فضول خرچی کہاں ابا۔" کمال نے کہا۔ "کچھ رقم تو اس نے میرے ذاتی اخراجات کے لیے بھیجی ہے۔ باقی پیسے تو میں نے بینک میں جمع کرادیے ہیں۔" اس نے نیا جوتا پہنتے ہوئے کہا۔

اس قسم کے قیمتی جوتے کی خواہش نہ جانے کب سے اس کے دل میں تھی۔ رے بین کا چشمہ لگا کر تو اس کی شخصیت مزید نکھر گئی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو ایک لمحے کو وہ خود کو بھی نہ پہچان سکا۔

وہ گھر سے نکلنے لگا تو اماں نے کہا۔ "بیٹا! رات کو جلدی آجانا، ہم کھانے پر تمہارا انتظار کریں گے۔"

"اماں! میں نہ جانے کب آؤں۔" کمال نے کہا۔ "آپ لوگ کھانا کھا لیجیے گا۔ میرے انتظار میں بھوکے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ گھر سے نکل کر چاچا غفور کی دکان پر پہنچا۔ چاچا بھی اسے اس حلیے میں دیکھ کر حیران ہو گئے اور بولے۔ "کمال! لگتا ہے تمہیں ملازمت مل گئی ہے؟"

"ملازمت نہیں چاچا۔" کمال نے ہنس کر کہا۔ "میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر ایکسپورٹ، امپورٹ کا بزنس شروع کر رہا ہوں۔ آپ بتائیں، آپ کا کتنا حساب ہے؟"

"حساب تو ہوتا رہے گا بیٹا۔" چاچا غفور خوش ہو کر بولے۔ "ابھی تو میں مصروف ہوں، رات کو آکر حساب کرلینا۔" انہوں نے گولڈ لیف کا ایک پیکٹ کمال کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، تم رضوانہ کو کب سے پڑھاؤ گے؟"

"رضوانہ کو؟ ہاں۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ دو دن میں مصروف رہوں گا۔ پرسوں سے میں اسے پڑھانا شروع کردوں گا۔" وہ سگریٹ لے کر آگے بڑھ گیا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ ٹہلتا ہوا بس اسٹاپ پر پہنچا۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی نئی اور قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی امجد کے آنے میں دس منٹ باقی تھے۔ وہ مزے سے سگریٹ پیتا رہا۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ امجد اور اکو وہاں پہنچ گئے۔ امجد کی بھی سج دھج نرالی تھی۔ اس نے بھی قیمتی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اکو البتہ اسی حلیے میں تھا، میلی سی جینز، ٹی شرٹ اور کیپ۔ پیروں میں وہی پرانے جوگرز تھے۔

"یار! بس کا انتظار کون کرے۔" امجد نے کہا۔ "میں ٹیکسی پکڑ لیتا ہوں۔"

وہ ٹیکسی پکڑ کر گلشن اقبال کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

عظیم نے حسبِ معمول انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور تھرماس سے چائے انڈیلنے لگا۔ آج وہ کچھ بسکٹ اور سموسے بھی لے کر آیا تھا۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد عظیم نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "تم لوگوں کی تیاریاں مکمل ہیں؟"

"ہاں، ہم نے تیاری کرلی ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

"ہتھیاروں کا کیا ہوا؟"

کمال نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس سے پہلے اکو بول اٹھا۔ "ہم وہاں زیادہ ہتھیار لے کر نہیں جائیں گے۔ صرف ایک ٹی ٹی کافی ہے۔"

"ایک ٹی ٹی سے کام چل جائے گا؟" عظیم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" اکو نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "ہم وہاں ایک ٹی ٹی لے کر جائیں یا پورا توپ خانہ لے کر جائیں۔"

"تمہیں میں نے پہلے تو ان لوگوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟" عظیم نے درشت لہجے میں کہا۔

"تو اب دیکھ لو۔" اکو کا لہجہ بھی تلخ تھا۔ "یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے کہ واردات میں کتنے آدمی شامل ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے گروپ کا ایک آدمی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ تم نے وہ خبر تو ٹی وی پر بھی دیکھی ہوگی اور اخبارات میں بھی پڑھی ہوگی۔"

"ہاں، میں نے وہ خبر دیکھی تھی۔" عظیم نے کہا، پھر امجد سے بولا۔ "یہ تم کسے لے آئے ہو؟ اسے تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

"اے مسٹر!" اکو نے کہا۔ "ہم یہاں تہذیب یا اخلاق کی تربیت کے لیے نہیں آئے ہیں، تم جس انداز میں بات کرو گے، اسی انداز میں جواب بھی ملے گا۔"

"اکو! تم خاموش ہو جاؤ۔" کمال نے کہا پھر وہ عظیم سے بولا۔ "یار! تم ہی کچھ خیال کرلو۔ تمہیں اکو سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"گاڑی کا بندوبست ہو گیا؟" عظیم نے کمال کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"گاڑی کا بندوبست صبح ہو جائے گا۔" اکو نے کہا۔

"اس کی فکر مت کرو۔"

"کیوں، کیا تمہارے باپ کا شوروم ہے؟"

"باپ تک جاتا ہے۔" اکو نے بپھر کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"اکو!" کمال گھبرا گیا۔ "میری بات سنو، دیکھو......"

امجد بھی جلدی سے کھڑا ہو گیا اور اکو کو پکڑنے لگا۔

اکو نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا اور بولا۔ "میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے میرے باپ کا نام کیوں لیا؟"

"غلطی ہو گئی اس سے۔" امجد نے کہا۔ "اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

"اسے معاف کر دو اکو۔" کمال نے بھی خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"اس سے کہو کہ معافی مانگے۔" اکو نے تند لہجے میں کہا۔ "ورنہ سارا پروگرام رکھا رہ جائے گا۔"

"یار! میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟" عظیم بھی اکو کے جنونی رویے سے کچھ ڈر گیا۔ "معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سے انسان چھوٹا نہیں ہو جاتا۔ میں معافی چاہتا ہوں یار۔" عظیم نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "غصے میں میرے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی۔ تمہارا باپ بھی میرے لیے اتنا ہی قابلِ احترام ہے جتنا تمہارے لیے ہے۔"

عظیم کے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

"تم جا کر منہ دھو لو۔" کمال نے اکو سے کہا۔ "اس سے تمہارا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوگا۔"

اکو اٹھا تو عظیم نے کہا۔ "باتھ روم کوریڈور کے آخری سرے پر ہے۔" اس کے جانے کے بعد عظیم نے امجد سے کہا۔ "یہ کس جنگلی کو لے آئے۔ یہ تم لوگوں کو بھی مروائے گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" کمال نے کہا۔ "بس اس کا باپ اس کی کمزوری ہے، کوئی اس کے باپ کو برا کہے یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"خیر، تم جانو۔"

اکو منہ دھو کر واپس آیا تو وہ خاصا نارمل تھا۔ اس نے عظیم سے کہا۔ "میں نے غصے میں تمہیں کچھ زیادہ ہی کہہ دیا۔"

"اب اس بات کو بھول جاؤ۔" عظیم نے ہنس کر کہا۔ "ہاں، تم لوگ کس وقت بینک میں داخل ہو گے؟"

"ہم ٹھیک ڈیڑھ بجے بینک کے اندر ہوں گے۔" کمال نے کہا۔

"ہاں، وہی وقت بہترین ہے۔" عظیم مسکرایا۔ "ہاں، تم لوگ واردات کے بعد یہاں نہیں آؤ گے۔"

"یہاں نہیں آئیں گے؟" کمال نے حیرت سے کہا۔ "تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"میں نے اس کے لیے ایک اور محفوظ جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ صفورا چورنگی سے آگے نورین کمپلیکس کے نام سے ایک بارہ منزلہ عمارت زیرِ تعمیر ہے۔"

"ہاں، میں نے وہ عمارت دیکھی ہے۔" امجد نے کہا۔

"آج کل وہاں کام رکا ہوا ہے بلکہ گزشتہ ایک مہینے سے وہاں کام نہیں ہو رہا ہے۔ تم لوگ رقم لے کر وہیں پہنچ جانا۔ وہ بہت بڑا کمپلیکس ہے اور وہاں صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے۔ اسے میں پہلے ہی کسی بہانے وہاں سے ہٹا دوں گا۔ اس بلڈنگ میں داخلے کے تین راستے ہیں۔ ان میں ابھی تک گیٹ نہیں لگے ہیں، لکڑی کے عارضی گیٹ لگا دیے گئے ہیں۔ انہیں کھول کر ہم آسانی سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔"

"کس دروازے سے اندر جاؤ گے؟" اکو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کسی بھی دروازے سے اندر آ جاؤ۔" عظیم نے کہا۔ "اصل مقصد تو زینے تک پہنچنا ہے۔"

"اس بلڈنگ میں زینہ بھی ایک نہیں ہوگا۔" اکو نے سرد لہجے میں کہا۔ "آخر ہم کہاں بھٹکتے رہیں گے؟"

"میں تم لوگوں سے پہلے وہاں پہنچوں گا اور موبائل فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

آخر اس ویرانے میں جانے کی ضرورت کیا ہے؟" امجد نے کہا۔

"اس قسم کے کام ویرانوں ہی میں ہوتے ہیں۔" عظیم مسکرا کر بولا۔

"فرض کرو، ہم رقم لے کر کہیں غائب ہو جائیں؟" امجد نے ہنس کر کہا۔

عظیم نے اس کی طرف دیکھا، اور سنجیدگی سے بولا۔ "یہ تو کبھی سوچنا بھی مت۔"

"ہم صرف فرض کر رہے ہیں۔" امجد نے کہا۔ "تم

اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟''
''میں کبھی پریشان نہیں ہوتا۔'' عظیم نے کہا۔ ''میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں کہ ایسا سوچنا بھی مت۔''
''یار! اب تو سوچ لیا ہے۔'' اکو نے کہا۔ ''ہم ساری رقم لے کر غائب ہو گئے تو تم کیا کرو گے؟''
عظیم سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں پہلے ٹی وی پر خبریں دیکھوں گا۔ آج کل تو معمولی سی خبر کو بھی بریکنگ نیوز بنا دیا جاتا ہے۔ یہ تو بہت بڑی خبر ہو گی اور واقعی بریکنگ نیوز ہو گی۔ تم لوگ اگر اس واردات میں کامیاب رہے تو میں دو گھنٹے تک تمہارا انتظار کروں گا۔ راستے میں کہیں ٹریفک جام بھی ہو سکتا ہے، تمہاری گاڑی کا ٹائر پنکچر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دو گھنٹے میں نے اسی لیے دیے ہیں، اس کے بعد میں علاقے کے پولیس اسٹیشن کو گمنام ٹیلی فون کروں گا اور تم لوگوں کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دوں گا۔''
''ہمارے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے، کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔'' اکو نے کہا۔
''اس صورت میں بات دوسری ہے۔ تم لوگ مجھے موبائل فون پر اطلاع تو دے سکتے ہو نا؟''
اس کی بات پر کمال نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''یار! ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ کام کر رہے ہو تو پھر ہم پر اعتبار بھی کر لو۔''
''بے اعتباری کی بات تو امجد نے کی تھی۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار! ہم بھی کس بحث میں پڑ گئے۔ ہمیں واقعی ایک دوسرے پر اعتبار کرنا چاہیے۔''
کمال اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اب تم سے کل ملاقات ہو گی۔''
''اس ادھوری بلڈنگ میں۔'' عظیم نے گویا ان لوگوں کو ایک مرتبہ پھر یاد دلایا۔
وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو اکو بہت فکر مند تھا۔ اس نے کہا۔ ''یار! مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگا۔''
''ہم جو کام کرنے جا رہے ہیں۔ اس میں اچھے لوگ کہاں سے آئیں گے۔'' کمال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''نہیں یار!'' اکو نے کہا۔ ''ہر کام کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا رویہ حاکمانہ ہے۔ یوں جیسے بینک اس کی میراث ہو اور وہ ہمیں لوٹنے کا حکم دے رہا ہو، پھر یہ کہ وہ کچھ کرے بغیر ساتھ فیصد لے گا، آخر کیوں؟''
''یہ سب تو پہلے سوچنے والی باتیں تھیں۔'' امجد نے کہا۔ ''اس وقت ہم لوگ اتنے پریشان تھے کہ اس کی ہر شرط مانتے گئے۔ ویسے اب بھی ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔''
''یار! مجھے بہت بھوک لگی ہے، کہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔'' اکو نے کہا۔
''آج کھانے پر گھر والے میرا انتظار کریں گے۔'' کمال نے کہا۔ ''تم لوگ کھانا کھا لو، میں تو گھر جا کر کھاؤں گا۔ آج میں نے اماں سے خاص طور پر کریلے قیمہ بنوایا ہے۔''
''ٹھیک ہے، میں اور اکو آج پھر نہاری کھا لیں گے۔'' امجد نے کہا۔
ان لوگوں کے قریب سے ایک رکشا گزرا تو امجد نے اسے روک لیا۔

☆☆☆

کمال گھر میں داخل ہوا تو گھر کا ہر فرد اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اماں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں اور بولیں۔ ''مجھے یقین تھا بیٹا! تو رات کے کھانے کے وقت ضرور آئے گا۔'' پھر وہ بولیں۔ ''نورین! جلدی سے بھائی کے لیے گرم گرم روٹی ڈال دے اور کھانا نکال۔''
ایک عرصے بعد کمال نے اپنے گھر والوں کے ساتھ اتنے اچھے ماحول میں کھانا کھایا تھا۔ انہیں خوش دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے ضمیر پر جو بوجھ تھا، وہ بھی گھر والوں کے دمکتے چہرے دیکھ کر کم ہو گیا تھا۔
کھانے کے بعد اس کی بہن نے کہا۔ ''بھیا! آپ نے ایک دفعہ وعدہ کیا تھا کہ مجھے آئسکریم کھلائیں گے۔''
''اب بھائی کا پیچھا چھوڑ دے، بہت رات ہو گئی ہے اور کمال تھکا ہوا بھی ہو گا۔''
''کہاں اماں۔'' نورین نے کہا۔ ''ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ ابھی تو بازار میں خوب رونق ہو گی۔''
''چل، تو بھی کیا یاد کرے گی۔'' کمال نے کہا۔ ''میں تجھے آئسکریم کھلا ہی دوں پھر موقع ملے نہ ملے۔''
اس نے اپنے چھوٹے بھائی اعجاز کو بھی ساتھ لے لیا۔ ان کے محلے میں تو ڈھنگ کی کوئی دکان تھی نہیں۔ اس نے رکشا پکڑا اور گلستان جوہر چلا گیا۔
آئسکریم کھاتے ہوئے اس نے بتایا کہ چاچا غفور بھی اپنی بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے کا کہہ رہے تھے۔
''رضوانہ کو؟'' نورین نے چونک کر کہا۔ ''بھیا! وہ پڑھے وڑھے گی نہیں۔ آپ فضول میں بدنام ہوں گے۔''
''کیا مطلب؟'' کمال نے پوچھا۔

''رضوانہ کو پڑھنے سے زیادہ فلمی رسالوں اور گانے سننے میں دلچسپی ہے۔ وہ ہر وقت اسی چکر میں رہتی ہے کہ کون سا کپڑا بناؤں، کس ڈیزائن کا ہو، چپل اور سینڈل کہاں سے خریدوں۔ وہ ہر دو چار مہینے بعد تو اپنا موبائل بدل دیتی ہے۔ وہ کیا خاک پڑھے گی۔''

''میں اب چاچا غفور سے وعدہ کر چکا ہوں۔'' کمال نے کہا۔ ''اسے پڑھانا تو پڑے گا۔''

''ذرا محتاط رہیے گا۔ کہیں وہی آپ کو نہ پڑھا دے۔''

''تم کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگی ہو؟'' کمال نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں تو آپ کو احتیاط کا مشورہ دے رہی ہوں۔'' پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ''ایک بات بتاؤں، رضوانہ آپ کو پسند کرتی ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' کمال نے کہا۔

''اچھا آپ ناراض نہ ہوں۔'' نورین جلدی سے بولی۔ ''میں تو آپ کے بھلے ہی کے لیے کہہ رہی تھی۔''

''ہاں بھائی!'' اعجاز نے کہا۔ ''رضوانہ باجی مجھ سے بھی بہانے بہانے سے آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں۔''

''میرے خیال میں اب گھر چلیں۔'' کمال نے کہا۔ ''اور ہاں، اماں اور ابا کے لیے بھی آئسکریم لے لیتے ہیں۔''

وہ لوگ واپس پہنچے تو اماں پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی تھیں۔ کمال انہیں دروازے پر دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ ''خیریت تو ہے اماں، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

''بیٹا! تمہارے ابا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں اس خیال سے باہر آ گئی تھی کہ جاوید سے تمہیں ٹیلی فون کراؤں گی۔''

کمال ان کی بات سنے بغیر اندر بھاگا۔ ابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی، ان کا چہرہ پسینے میں تر تھا اور اس پر شدید اذیت کے آثار تھے۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہے تھے۔

''کیا ہوا ابا؟'' کمال نے گھبرا کر پوچھا۔

''بیٹا! میرے سینے اور ہاتھ میں...... بہت...... شدید درد ہو رہا ہے۔'' ابا نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم پریشان نہ ہو، میں نے بام لگا لیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

اماں، نورین اور اعجاز بھی پیچھے آ گئے۔ کمال نے اماں سے کہا۔ ''آپ ابا کے کپڑے بدلوائیں، میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں، ابا کو اسپتال لے جاؤں گا۔'' وہ بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسپتال جاتے ہوئے ابا کی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہنے لگے اور انہوں نے سر اماں کی گود میں رکھ دیا۔

کمال نے مضطرب ہو کر ابا کو دیکھا پھر ٹیکسی والے سے کہا۔ ''یار! تم ذرا تیز نہیں چل سکتے۔ ابا کی حالت بہت خراب ہے۔''

''میں تو پہلے ہی نوے اور سو کی اسپیڈ سے چل رہا ہوں۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ ''اس ٹریفک میں اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا۔ بس ہم اسپتال پہنچنے ہی والے ہیں۔''

اسپتال میں وارڈ بوائز ابا کو اسٹریچر پر ڈال کر عجلت میں ایمرجنسی روم کی طرف لے گئے۔ کمال اور اماں کوریڈور میں انتظار کرنے لگے۔

ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹروں نے کمال کو بتایا کہ ہم نے مریض کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا ہے۔ آپ انہیں بروقت یہاں لے آئے لیکن ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ آئندہ چوبیس گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ آپ لوگ ان کے لیے دعا کریں۔''

''ڈاکٹر صاحب!'' اماں نے کہا۔ ''میں ان سے مل سکتی ہوں؟'' ان کے لہجے میں خوشامد تھی۔

''ابھی تو آپ ان سے نہیں مل سکتیں۔ وہ اس وقت آئی سی یو میں ہیں۔'' پھر کمال سے بولا۔ ''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔''

وہ کمال کو اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ''آپ مریض کے بیٹے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' کمال نے کہا۔

''میں نے آپ کی اماں کے سامنے بتایا نہیں۔ مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر وہ آئندہ چوبیس گھنٹے تک سروائیو کر گئے تو پھر کچھ امید کی جا سکتی ہے۔'' اس نے ایک پرچے پر کمال کو دوائیں لکھ کر دیں اور بولا۔ ''فوری طور پر یہ دوائیں لے آئیں۔ یہ دوائیں اس وقت ہمارے اسٹاک میں نہیں ہیں۔''

کمال نے خاموشی سے پرچہ لے لیا اور باہر کی طرف

بڑھ گیا۔

اماں اور کمال نے وہ رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ ڈاکٹر وقفے وقفے سے مختلف دوائیں منگواتے رہے۔ کہنے کو وہ سرکاری اسپتال تھا اور پاکستان کا سب سے بڑا امراضِ قلب کا مرکز تھا لیکن غریب آدمی کے لیے اس کے اخراجات برداشت کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

کمال نے اندازہ لگایا، رات سے اب تک اس کے تیس ہزار روپے کے قریب خرچ ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ کہیں اس حرام کی کمائی کی وجہ سے تو ابا کی طبیعت نہیں بگڑی؟ اس کمائی پر اسے یاد آیا کہ آج دس تاریخ ہے اور انہیں کارروائی کرنا ہے لیکن وہ ابا کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

اسی وقت ڈاکٹر باہر نکلا اور بولا۔ ''مسٹر کمال! آپ کے والد کی حالت مزید بگڑ گئی ہے۔ ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی۔'' پھر ڈاکٹر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''انہیں سانس کی تکلیف بھی ہے۔''

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب، سانس کی تکلیف تو ابا کو کئی سال سے ہے۔''

''بس آپ لوگ دعا کریں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔

کمال کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ اماں کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ اس وقت باتھ روم گئی ہوئی تھیں۔ کمال ابھی اماں کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سوچا کہ پہلے میں امجد کو بتا دوں کہ آج میں ان کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور کوریڈور کے نسبتاً پُرسکون گوشے میں جا کر امجد کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف بیل بجتی رہی لیکن امجد کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے گھڑی دیکھی ابھی صرف آٹھ بجے تھے۔ ممکن ہے امجد اب تک سو رہا ہو۔ کمال نے اکو کا نمبر ملایا۔ اس نے دوسری ہی بیل پر فون اٹھا لیا اور بولا۔

''جی کمال بھائی!'' وہ شاید اس وقت گھر سے کہیں باہر تھا۔ پس منظر میں گاڑیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

''یار اکو!'' کمال نے کہا۔ ''میں آج تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔''

''کیا مطلب کمال بھائی'' اکو نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

''میرے ابا کو رات ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''اس وقت بھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔''

''ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' اکو نے کہا۔ ''آپ ہو کہاں کمال بھائی؟''

''میں اس وقت ابا کے پاس کارڈیو میں ہوں۔ وہ آئی سی یو میں ہیں۔''

''امجد بھائی کو بتایا؟'' اکو نے پوچھا۔

''امجد فون ریسیو نہیں کر رہا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''میں یہاں سے نزدیک ہی ہوں، دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' اکو نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ چہرے سے بہت پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''ابھی تک آئی سی یو میں ہیں۔'' کمال نے کہا۔

''تم نے تو رات سے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔'' اکو نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لایا ہوں۔''

کمال اور اکو اس وقت اسپتال کے لان میں تھے۔ کمال نے کہا۔ ''میرے ساتھ اماں بھی ہیں۔''

''کمال بھائی! اماں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اکو نے کہا۔ ''ان سے کہو کہ گھر جا کر آرام کریں۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''پہلے آپ لوگ ناشتا کر لو۔''

اماں کوریڈور میں ایک طرف بیٹھی تھیں۔ کمال انہیں وہاں سے لان میں لے آیا اور ان کے ساتھ ناشتا کیا۔ اکو اس وقت کچھ فاصلے پر بیٹھا رہا۔

''یہ کھانا کون لایا ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں! میرا ایک دوست اکبر یہ سب کچھ لے کر آیا ہے۔'' پھر اس نے اشارے سے اکو کو بلا لیا۔ ''اماں! یہ اکبر ہے۔'' اس نے اکو کا تعارف کرایا۔

اکو نے اماں کو سلام کیا اور بولا۔ ''اماں جی! آپ گھر جا کر آرام کریں۔ انکل کی دیکھ بھال کے لیے ہم لوگ یہاں موجود ہیں۔''

پھر کمال اور اکو نے زبردستی اماں کو وہاں سے بھیج دیا۔

اماں کے جانے کے بعد اکو نے کہا۔ ''ذرا ڈاکٹر سے ایک دفعہ پھر بات کر لیں۔''

وہ وہاں سے اٹھا اور سیدھا ڈاکٹر کے روم میں گھس

گیا۔

ڈاکٹر اس وقت بہت تھکا تھکا نظر آ رہا تھا اور روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی آف ہو چکی تھی۔

اکو نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! مجھے جلال صاحب کے بارے میں بات کرنا ہے۔''

''بھائی! میری ڈیوٹی آف ہو چکی ہے۔ اب ڈاکٹر سجاد ہی آپ کو کچھ بتا سکیں گے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اکو درشت لہجے میں بولا۔ ''ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ آپ کا دماغ بھی آف ہو گیا ہے کیا؟ آپ رات بھر یہاں تھے۔ آپ کو مریض کے بارے میں معلوم ہوگا یا دوسرے ڈاکٹر کو؟''

''میں نے کہا نا کہ میری ڈیوٹی آف ہو چکی ہے۔ ویسے ان کے مریض کی کنڈیشن بہت مخدوش ہے۔''

''مخدوش ہے تو...... اس کا کوئی علاج بھی ہو گا؟'' اکو نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہم تو اپنی کوشش کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہر مریض کی جان بچانا ہمارا فرض ہے۔''

''اچھی طرح علاج کریں ڈاکٹر صاحب۔'' اکو نے کہا۔ ''پیسے کی فکر نہیں کرنا، آپ جو دوائی بھی بولو گے، میں لا کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا اور کمال سے بولا۔ ''یار! دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے، ماں باپ نہیں ملتے۔''

باہر انہیں امجد دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے انہی کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے انکل کی؟''

''حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''دعا کرو کہ ابا ٹھیک ہو جائیں۔'' کمال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''انکل انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے کمال بھائی۔'' اکو نے اسے تسلی دی۔

''یار! وہ ہمارے پروگرام کا کیا بنے گا؟'' امجد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ان کے والد موت سے لڑ رہے ہیں اور تمہیں پروگرام کی فکر ہے؟'' اکو نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یار! ایسا کرو، تم لوگ میرے بجائے کسی اور کو شامل کر لو۔ میں تو ابو کو چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔''

''نہیں کمال بھائی۔'' اکو نے جواب دیا۔ ''اگر آپ نہیں ہو تو پروگرام کینسل۔''

''پھر کوئی دوسرا آدمی ہمیں اتنی جلدی ملے گا کہاں سے؟'' امجد نے کہا۔ ''اگر اکو کسی کا بندوبست......''

''میں نے کہا نا۔'' اکو نے کہا۔ ''پروگرام کینسل۔ کوئی ایسا آدمی ملنا بھی مشکل ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اگر مل بھی جائے تو کمال بھائی کے بغیر ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ میں اس وقت گاڑی اٹھانے ہی والا تھا جب مجھے کمال بھائی کا فون ملا۔ میں نے اسی وقت ارادہ بدل دیا۔''

''یار! عظیم سے بات کرنا پڑے گی۔'' امجد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''عظیم کوئی ہمارا باس نہیں ہے۔'' اکو نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کو بولو، ہم آج واردات نہیں کر سکتے۔''

''پھر تو ہمیں ایک مہینے بعد ہی موقع ملے گا۔'' امجد نے کہا۔ ''اس وقت تک عظیم انتظار کرتا بھی ہے یا نہیں؟''

''اگر انتظار کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم پھر کچھ اور سوچیں گے۔''

''میں عظیم سے بات کرتا ہوں۔'' امجد نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر عظیم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن عظیم نے فون نہیں اٹھایا۔

''یار! وہ تو فون اٹھا ہی نہیں رہا ہے۔'' امجد نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم دس پندرہ منٹ بعد پھر اسے کال کرو۔ اگر وہ فون اٹھا لیتا ہے تو ٹھیک ہے، نہیں اٹھاتا تو ہم بھی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ جب اسے واردات کی کوئی اطلاع نہیں ملے گی تو پھر وہ خود ہمیں کال کرے گا۔''

اکو نے کہا۔ ''مجھے اس آدمی سے اب نفرت ہو گئی ہے۔ وہ کوئی بہت بڑا ماسٹر مائنڈ ہے جو لوٹ کی رقم میں سے ساٹھ فیصد خود لے گا، وہ بھی بغیر کسی محنت کے۔''

اسی وقت کمال کو نورین اور اعجاز نظر آئے۔ اماں نے گھر پہنچ کر ان دونوں کو بھیج دیا ہوگا۔

کمال اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ نورین اسے دیکھ کر رونے لگی اور بولی۔ ''بھیا! ابا کیسے ہیں؟''

''ابا ٹھیک ہیں، تم پریشان مت ہو۔''

''میں ابا کے پاس جاؤں گا۔'' اعجاز نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''ابا اس وقت آئی سی یو میں ہیں۔'' کمال نے کہا۔

''ابھی تو ان سے کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ کل تک ڈاکٹر انہیں کمرے میں شفٹ کر دیں گے پھر ہم سب ان سے ملیں

گے۔''

''ہمارے گھر کے حالات بدلے بھی تو کب۔'' نورین نے روتے ہوئے کہا۔ ''ابا سے یہ خوشی برداشت نہ ہوئی۔''

کمال نے چور نظروں سے نورین کو دیکھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ گھر کے حالات کیسے بدلے ہیں؟

''بھیا! آپ گھر جا کر آرام کریں۔'' نورین نے کہا۔ ''ابا کے پاس میں اور اعجاز ہیں۔''

''تم بھلا کیا کرو گی؟'' کمال نے کہا۔ ''اعجاز بھی ابھی بچہ ہے۔ ابا کو کسی بھی وقت کسی ایسی دوا کی ضرورت پڑ سکتی ہے جو یہاں نہیں ملے گی، پھر تم کیا کرو گی، ویسے بھی کسی لڑکی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں یہاں ہوں، میرے دوست ہیں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے گھر جاؤ اور ابا کی صحت کے لیے دعا کرو۔ کل صبح اماں کے ساتھ آجانا۔ ہاں، اماں کو بھی اب یہاں مت آنے دینا۔ یہاں وہ بے چاری ساری رات بے آرام رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ابا کو سنبھالتے سنبھالتے، اماں بیمار پڑ جائیں۔'' کمال نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے کچھ نوٹ نکالے اور نورین کو دے کر بولا۔ ''فی الحال یہ رکھ لو۔ میں اماں کو پیسے دینا بھول گیا تھا۔ گھر میں راشن بھی تو نہیں ہے۔''

نورین نے خاموشی سے پیسے رکھ لیے، اور اعجاز کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

ان کے جانے کے بعد کمال پھر اکو اور امجد کے ان آبیٹھا۔ اس نے امجد سے پوچھا۔ ''عظیم سے بات ہوئی؟''

امجد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے پھر فون کیا تھا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔''

''بس تو پھر اس پر لعنت بھیجو۔'' کمال نے کہا۔ ''اب جو کچھ کریں گے ہم لوگ اپنے طور پر کریں گے۔''

اچانک امجد کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر کہا۔ ''عظیم کی کال ہے۔''

''بات کرو۔'' کمال نے کہا۔ ''اسپیکر کھول دینا تاکہ ہم بھی اس کی بات سن سکیں۔''

امجد نے کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگالیا۔

''تم مجھے کال کیوں کر رہے تھے؟'' عظیم نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ تم مجھے واردات کی کامیابی کے بعد کال کرو گے۔''

''میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم آج یہ کام نہیں کر سکتے۔''

''کیا؟'' عظیم نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''جب یہ کام تمہارے بس کا نہیں تھا تو تم لوگوں نے ہامی کیوں بھری؟''

''یہ بات نہیں ہے عظیم۔'' امجد نے کہا۔ ''اصل میں کمال کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ اس وقت آئی سی یو میں ہیں۔''

''یار! تو کمال وہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ کچھ پیسے کما کر اپنے والد کا علاج اچھی طرح کرا سکتا تھا۔''

''اس صورت میں کمال بھائی کام کریں گے؟'' اکو نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ان کے والد کی حالت خراب ہے۔ کسی محلے والے کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا ہے۔''

''یہ تم لوگوں کا پرابلم تھا۔'' عظیم نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر کمال اس آپریشن میں شرکت نہیں کر سکتا تھا تو تمہیں کسی دوسرے آدمی کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔''

''یار! تم انسان ہو یا......'' اکو کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ ''ایک بات سن لو، ہم کمال بھائی کے بغیر یہ کام نہیں کریں گے، میں جانتا ہوں کہ آج کے بعد ہمیں یہ موقع اگلے مہینے ہی مل سکے گا۔ تم اس وقت تک انتظار کر سکتے ہو تو کرو ورنہ اس ڈیل کو کینسل سمجھو۔''

''اور میں نے تم لوگوں کو ایڈوانس میں دو لاکھ روپے دیے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟''

''وہ پیسے تو ہم نے خرچ بھی کر دیے بلکہ پچاس ہزار کے مقروض بھی ہو گئے ہیں۔'' اکو نے کہا۔

''تم لوگ آج شام کو مجھ سے ملو۔'' عظیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' امجد نے جواب دیا۔ ''ہم سات بجے تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔''

اکو کوئی سخت جواب دینے والا تھا کہ امجد نے اشارے سے اسے روک دیا۔

''دیکھو، تم لوگ میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب مت کرو۔'' کمال نے کہا۔

''کمال بھائی!'' اکو نے کہا۔ ''اس کام میں ٹیم ورک ہوتا ہے۔ ٹیم کا ایک ممبر بھی کم ہو جائے تو بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس ٹیم میں رشید پہلے ہی کم ہو چکا ہے۔ اب ہم دو آدمی کیا کر سکتے ہیں؟ ویسے بھی آج کا وقت تو گزر ہی گیا۔ عظیم اگر آئندہ ماہ کے لیے راضی ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اپنے طور پر کوئی پلان بنائیں گے۔ ایک دفعہ یہ کام کرنے کا فیصلہ کر لیا

ہے تو اسے کریں گے ضرور۔''

''اس کے بغیر اب گزارہ بھی نہیں ہوگا۔'' امجد نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد کمال پھر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''کمال صاحب! مبارک ہو۔ آپ کے والد کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ آج رات تک ہم انہیں آئی سی یو سے روم میں شفٹ کر دیں گے۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ احسان ہے۔'' کمال نے کہا۔

''ہاں، یہ کچھ ڈرپس اور میڈیسنز بھی آئیں گی۔'' ڈاکٹر نے کمال کو ایک پرچہ تھما دیا۔

اکو نے زبردستی وہ پرچہ کمال سے لے لیا اور جا کر دوائیں لے آیا۔ وہ لوگ مزید ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھے۔ پھر امجد جا کر کھانا لے آیا۔ کھانے کے بعد کمال نے کہا۔ ''اب تم لوگ بھی جاؤ، صبح سے میرے ساتھ خوار ہو رہے ہو۔''

''انکل کی طبیعت کے بارے میں بتاتے رہنا۔'' امجد نے کہا۔ ''ابھی تو ہم عظیم سے ملنے جا رہے ہیں۔''

☆☆☆

عظیم بہت جھلایا ہوا تھا۔ اس نے امجد سے کہا۔ ''تم لوگوں نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ میرا تو کئی لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا۔''

''تو ہم کیا کرتے؟'' اکو نے کہا۔ ''کیا ہم دو آدمی کارروائی کر لیتے؟''

''اب کیا کرنا ہے؟'' امجد نے کہا۔ ''ہم ڈیل کینسل سمجھیں یا......''

''میں حالات میں ایسا جکڑا ہوا ہوں کہ چاہتے ہوئے بھی یہ ڈیل کینسل نہیں کر سکتا۔'' پھر وہ اکو سے بولا۔ ''بزنس میں دوستیاں اور رشتے داریاں نہیں نبھائی جاتیں۔ یہ بھی ہمارا بزنس ہی تو ہے۔''

''لیکن جب معاملہ باپ جیسے رشتے کا ہو تو بزنس بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔'' اکو نے سرد لہجے میں کہا۔

''اب یہ مشن آئندہ ماہ کی دس تاریخ کو ہوگا۔'' عظیم نے کہا۔ ''لیکن اب میں اس میں کچھ تبدیلیاں کر رہا ہوں۔ اس مشن میں میرے دو آدمی بھی شریک ہوں گے۔''

''ان کی کیا ضرورت ہے؟'' امجد نے کہا۔ ''زیادہ افراد سے بھی مشن میں ناکامی کے امکانات ہوتے ہیں۔''

''نہیں، یہ ضروری ہے۔'' عظیم نے کہا۔ ''دو آدمی بینک کے عملے، گارڈز، پولیس والے اور کسٹمرز کو قابو میں نہیں کر سکتے۔''

''چلو یوں ہی سہی۔'' امجد نے کہا۔

''ایک بات کی وضاحت کر دوں۔'' اکو نے کہا۔ ''لوٹ کے مال میں سے ساٹھ فیصد ہمارا ہوگا جیسا کہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ اب تم دو آدمی بڑھا رہے ہو تو انہیں تم اپنے حصے میں سے ادائیگی کرو گے۔''

عظیم چند لمحے تک اکو کو گھورتا رہا۔ پھر درشت لہجے میں بولا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی اسمارٹ بننے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟''

''بزنس میں تو نفع نقصان سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔'' اکو کا لہجہ بھی درشت تھا۔

عظیم، امجد سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے اس شخص کے ساتھ کام نہیں کرنا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ڈیل کینسل کر رہے ہو؟'' امجد نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' عظیم جھلا کر بولا۔ ''اس آدمی کی خاطر تم میری برسوں کی دوستی بھول جاؤ گے؟''

''بزنس میں دوستیاں اور رشتے داریاں نہیں نبھائی جاتیں۔'' امجد نے اسی کا جملہ اسے لوٹا دیا۔ ''اکو ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ تم سے سکسٹی، فورٹی کی ڈیل ہوئی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ اگر ہم مزید کسی آدمی کا اضافہ کریں گے تو اسے اپنے حصے میں سے دیں گے۔ ہم تو وہی بات کر رہے ہیں جو تم کر رہے تھے۔''

''ٹھیک ہے، پھر ڈیل کو کینسل سمجھو۔'' عظیم نے بھپر کر کہا۔

''او کے۔'' امجد نے بے نیازی سے کہا۔ ''ہم یہ کام تمہارے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔''

''تم یہ کام ضرور کرو لیکن کسی اور جگہ۔ اس بینک کی طرف رخ بھی مت کرنا۔''

''کیوں؟'' اکو نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ بینک تمہاری میراث ہے کیا؟''

''یہی سمجھ لو۔'' عظیم نے کہا۔ ''وہاں اب کارروائی میرے آدمی کریں گے۔''

''تمہیں ناکامی ہوگی ماسٹر مائنڈ صاحب۔'' اکو کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ایسا ہونے دوں گا؟'' عظیم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا بھی ایک حل ہے۔ تم ابھی اس بینک کو بھول

جاؤ، ہم بھی بھول جاتے ہیں۔'' اکو اٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو امجد بھائی، اب اس شخص سے مزید کوئی بات نہیں ہو سکتی۔''

امجد بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں باہر کی طرف بڑھے۔

اچانک عظیم نے کہا۔ ''ٹھہرو۔''

اکو اور امجد جاتے جاتے رک گئے۔

''سوری، میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اصل میں آج کام نہ ہونے سے میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے، کچھ الجھ کر رہ گیا ہوں۔ ڈیل تو ڈیل ہے۔ کام پہلے کی طرح ہوگا۔ بس فرق یہ ہے کہ اس مہینے کے بجائے اگلے مہینے ہوگا۔ کوئی نیا آدمی اس مشن میں شامل نہیں ہوگا۔''

''یار! تم بھی بعض اوقات بہت جذباتی ہو جاتے ہو۔'' امجد نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔''

''اچھا، اب اس موضوع کو چھوڑو۔'' عظیم نے کہا۔ ''چلو، چل کر کہیں کھاتے پیتے ہیں۔ آج میں تم لوگوں کو سی فوڈ کھلاتا ہوں۔ کلفٹن میں ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے جہاں سی فوڈ ملتا ہے۔''

''گڈ۔'' امجد نے کہا۔

وہ لوگ باہر آئے تو اکو نے پوچھا۔ ''تمہاری گاڑی کہاں گئی؟''

''بیچ دی یار۔'' عظیم نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے امید تھی کہ آج کام ہو جائے گا۔ میں نے تو نیویارک کا ٹکٹ بھی بک کرا لیا تھا۔''

''نیویارک؟'' امجد نے پوچھا۔

''ہاں یار، رقم ملتے ہی میں ملک چھوڑ دوں گا۔ میرے پاسپورٹ پر ملٹی پل ویزا لگا ہوا ہے۔ میں کسی بھی وقت نیویارک یا لندن کا ویزا لے سکتا ہوں۔''

وہ گھر سے نکل کر سڑک پر آئے تو فوراً ہی انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔

امجد نے سی فوڈ اور ساحلِ سمندر کے ریسٹورنٹ کے بارے میں صرف سنا ہی تھا۔ وہاں کا خواب ناک ماحول اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اکو اس ماحول سے زیادہ متاثر نہیں تھا۔

کھانے کے بعد وہ لوگ کچھ دیر وہاں چہل قدمی کرتے رہے۔

اچانک اکو کو کمال کے والد کا خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ''امجد بھائی! اب چلیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''ہاں چلو۔'' امجد نے کہا۔

وہ لوگ وہاں سے سیدھے اسپتال پہنچے۔ کمال انہیں لان ہی میں مل گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ''یار امجد، ابو کی طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ انہیں آئی سی یو سے روم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''چلو، میں بھی انکل سے مل لوں۔'' امجد نے کہا۔

''اس وقت اماں اور نورین ان کے پاس ہیں۔ میں نے ابا کے لیے پرائیویٹ روم کا بندوبست کیا ہے۔ وہاں وہ بہت آرام سے ہیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ سب عظیم کے پیسوں کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''عظیم کے کون سے پیسے؟'' اکو چڑ کر بولا۔ ''یہ ہماری محنت کا معاوضہ ہے۔ ویسے بھی وہ مردود چالیس فیصد ہتھیا لے گا۔''

''ہاں تم لوگ عظیم سے ملنے گئے تھے، ذرا مجھے اس ملاقات کی تفصیل تو بتاؤ۔''

اکو نے شروع سے آخر تک اسے ہر بات کی تفصیل بتا دی۔

''یار! یہ عظیم تو کچھ زیادہ ہی کمینہ اور گھٹیا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''اکو نے کہا کہ وہ اگر دوسرے لوگوں کو شامل کرے گا تو اسے اپنے حصے میں سے انہیں ادائیگی کرنا پڑے گی۔ اس پر تو ہتھے سے اکھڑ گیا۔'' امجد نے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' کمال ہنس کر بولا۔ ''یہ بات اس سے صرف اکو ہی کہہ سکتا تھا۔'' کمال نے ہنس کر کہا۔ ''ہم لوگ تو مروت میں خاموش رہتے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''چلو اچھا ہے۔ ہمیں ایک مہینا اور مل گیا۔ اس دوران میں ہمیں مزید معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ چلو ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں، اماں اور نورین کا کیا پروگرام ہے؟'' کمال نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''یار! میں ذرا پانی پی لوں، وہاں مچھلی اور جھینگے کھا کر پیاس کچھ زیادہ ہی لگ رہی ہے۔''

وہ لان سے نکل کر اسپتال کی اس سڑک پر آئے جہاں گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

اچانک پشت سے انہیں کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ مخالف سمت سے بھی ایک گاڑی آ رہی تھی اس لیے وہ لوگ وہاں رک گئے۔ گاڑی والے نے مسلسل ہارن دینا شروع کر دیا۔

مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کے گزرنے کے بعد وہ راستے سے ہٹے تو گاڑی والے نے انہیں غلیظ سی ایک گالی دی اور چیخ کر بولا۔ ''ابے، تو تو یوں چہل قدمی کر رہا

ہے جیسے سڑک تیرے باپ کی ہے۔“
اکو نے پھر کر اس کی طرف دیکھا اور چیخ کر بولا۔
”کیا کہا؟“
”میں کہہ رہا ہوں کہ سڑک تیرے باپ کی ہے جو یوں ٹہل رہا ہے۔“ اکو کے تیور دیکھ کر امجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”اکو، چلو۔“
اکو نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی والے کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے گاڑی والے کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا اور بولا۔
”سالے، باپ کا نام لیتا ہے۔“
گاڑی والے نے بلبلا کر اترنے کی کوشش کی لیکن اکو نے اسے اترنے ہی نہیں دیا اور پھر ایک زبردست گھونسا اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ ”باپ تک جاتا ہے۔“ اکو پھر کر بولا۔ ”اکو، چھوڑ دو۔“ امجد نے کہا۔ ”اسے تم نے اچھی خاصی سزا دے دی ہے۔“
اکو نے ایک مرتبہ پھر امجد کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس دوران میں گاڑی والا موقع پا کر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا اور اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔
اکو نے جھپٹ کر گاڑی کا دروازہ پوری قوت سے اسے مار دیا۔ اس کے پیروں اور شانے پر زبردست چوٹ لگی اور وہ اچھل کر پھر اندر جا گرا۔
اس وقت تک وہاں آنے والی گاڑیوں کی وجہ سے اچھا خاصا ٹریفک جام ہو گیا تھا۔
اسپتال کے سیکیورٹی گارڈز دوڑ پڑے اور بولے۔
”یار! یہ گاڑی تو بیچ میں سے ہٹاؤ، پھر ایک دوسرے کو مارتے رہنا۔“
اکو پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی والا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس کے منہ اور ٹھوڑی سے خون بہہ رہا تھا۔
اسی وقت امجد نے آہستہ سے کہا۔ ”اکو پولیس کے دو سپاہی اس طرف آ رہے ہیں۔ اب یہاں سے کھسک لو۔“
”میں ابھی تو جا رہا ہوں لیکن اسے چھوڑوں گا نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔
گاڑی والے سے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نے اسے ہٹا کر خود اسٹیئرنگ سنبھالی اور اس کی گاڑی پارکنگ میں پہنچا دی۔ پولیس کے دونوں سپاہی جھگڑے کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن سوائے امجد کے یا اس گاڑی والے کے کسی کو جھگڑے کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔

امجد پریشانی کے عالم میں اکو کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی وقت امجد کے سیل فون پر اکو کی کال آئی کہ میں تھرڈ فلور پر کمال کے ساتھ موجود ہوں روم نمبر تین سو بارہ۔
امجد بھاگا بھاگا اوپر پہنچا۔ وہ دونوں کوریڈور ہی میں موجود تھے۔
امجد شدید جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے اکو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”آخر کیا ضرورت تھی اس آدمی کو لہولہان کرنے کی؟“
”آپ کو معلوم ہے کہ کیا ضرورت تھی۔“ اکو نے بے نیازی سے جواب دیا۔
”اگر یہی حال رہا اکو تو تم پاگل ہو جاؤ گے۔“ امجد درشت لہجے میں بولا۔
”ہاں، اس معاملے میں پاگل ہوں میں۔“ اکو بھاری لہجے میں بولا۔
”یار، یہ اسپتال ہے۔“ کمال نے جلدی سے کہا۔
”یار اکو۔“ امجد نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکتے؟“
”میں نے بہت کوشش کی ہے امجد بھائی۔“ اکو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔“
”یار! باپ سب کے ہوتے ہیں اور سب اپنے بچوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔“ امجد نے کہا۔ ”پھر تم......“
”سارے باپ ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ اکو نے کہا۔ ”میرے باپ نے آج تک میری کسی بات کو رد نہیں کیا ہے جب میں چھوٹا تھا تو وہ مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتا تھا۔ ایک دفعہ ان سے میں نے آئسکریم کی ضد کی۔ اس وقت نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ ابا نے میری خاطر خوشامدیں کر کے آئسکریم کی ایک دکان کھلوائی اور دگنی قیمت پر آئسکریم خرید کر مجھے دی۔ میرا باپ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ وہ مزدوری کرتا تھا۔ ہم کچی آبادی میں رہتے تھے۔ کچھ فاصلے پر بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ عید کا موقع تھا۔ سامنے والے بنگلے کا بچہ عید کی شاپنگ کر کے آیا تھا۔ میں نے اپنے بابا سے ضد کی کہ میں بھی ویسے ہی جوتے اور کپڑے خریدوں گا۔ بابا کچھ دیر سوچتا رہا پھر اپنی جیب سے پیسے نکال کر گنے۔ تکیے میں چھپے ہوئے پیسے نکالے اور گننے کے بعد فکرمند ہو گیا۔
”بابا۔“ میں نے پھر کہا۔ ”میں ویسے ہی کپڑے لوں گا۔“

''اچھا تو بیٹھ، میں تیرے لیے ویسے ہی کپڑے لے کر آتا ہوں۔ بابا رات گئے واپس آیا، تو اس کے ہاتھ میں ویسے ہی کپڑے اور جوتے تھے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بابا نے نہ صرف اپنی جمع پونجی ان کپڑوں پر لگا دی تھی بلکہ کمی پوری کرنے کے لیے اس نے اپنا خون بھی بیچا تھا۔'' اکو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''کوئی باپ اپنی اولاد سے اتنا پیار کرتا ہے؟'' اکو آنکھیں صاف کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ''اس قسم کے واقعات تو بے شمار ہیں کمال بھائی! بابا کا بس چلے تو وہ مجھے اپنی زندگی بھی دے دے۔'' اب کوئی میرے فرشتہ صفت باپ کو برا کہے گا تو مجھے غصہ آئے گا کہ نہیں۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ اکو۔'' کمال نے کہا۔ ''تمہارے باپ کو کوئی بھی بُرا کہے گا، تم اس کے ساتھ یہی سلوک کرو گے؟''

''میرا چاچا بھی مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، مجھے اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا تھا، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا لیکن ایک دفعہ آپس کے جھگڑے میں اس نے بابا کو گالی دے دی تھی۔ میں نے جنون میں وہاں رکھا ہوا بیلچہ اٹھایا اور چاچا کی ٹانگوں پر دے مارا۔ اس کی ہڈی اس بری طرح ٹوٹی کہ وہ عمر بھر کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ اب وہ بے ساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ اس دن بابا نے پہلی دفعہ مجھے مارا تھا اور بہت بری طرح مارا تھا لیکن میں اپنے غصے کی عادت نہ چھوڑ سکا۔''

☆☆☆

''یار! مجھے ایک اور بات معلوم ہوئی ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''عظیم سرے سے بینک میں جاب ہی نہیں کرتا تھا۔''

وہ لوگ حسب معمول بولان ہوٹل میں بیٹھے تھے، اس دن پانچ تاریخ تھی۔ ٹھیک پانچ دن بعد یعنی دس تاریخ کو انہیں اپنے مشن پر عمل کرنا تھا۔ اس دوران میں عظیم سے بھی دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کمال کے ابا اب بالکل ٹھیک تھے۔

''بینک میں جاب نہیں کرتا تھا؟'' اکو نے حیرت سے کہا۔ ''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کمال بھائی؟''

''بینک کے ہیڈ آفس میں تو ہر ملازم کا پورا ریکارڈ ہوتا ہے۔ آج کل تو یوں بھی ہر چیز کمپیوٹرائزڈ ہے۔ ہیڈ آفس میں میرے دوست کے بھائی کام کرتے ہیں۔ میں نے ان سے معلوم کیا ہے۔''

''ان سے کیسے معلوم کر لیا؟'' امجد نے پوچھا۔

''یار، بہت آسانی سے۔'' کمال ہنس کر بولا۔ ''میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بینک میں ایک صاحب کام

مصرف

شہر کے اندر کپڑے کی ایک بڑی مل کو آگ لگ گئی۔ شہر بھر کی تمام فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آگ بجھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں مگر آگ بے حد شدید تھی۔ ہر گاڑی دور سے آگ بجھا رہی تھی کہ اتنے میں فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی مل کے اندر چلی گئی اور آگ پر قابو کر لیا۔ مل کا مالک بہت خوش ہوا۔ اس نے فائر بریگیڈ والوں کو 20 ہزار روپے انعام میں دیے اور پوچھا کہ آپ اس 20 ہزار کا کیا کریں گے؟''

فائر انجن کا ڈرائیور بولا۔ ''گاڑی کا بریک درست کرائیں گے۔''

(علی رضا خان، نارتھ کراچی)

کرتے تھے عظیم اخلاق۔ انہوں نے میرے ایک عزیز کے یہاں رشتہ بھیجا ہے۔ مجھے معلوم یہ کرنا ہے کہ انہوں نے بینک کی جاب خود چھوڑی تھی یا بینک نے انہیں نکالا تھا؟''

''پھر؟'' اکو نے پوچھا۔

''انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے جاب کب چھوڑی ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ گزشتہ ماہ۔ انہوں نے فوراً ریکارڈ چیک کر کے بتا دیا کہ اس نام کے کسی آدمی نے جاب نہیں چھوڑی ہے، نہ اسے نکالا گیا ہے۔ پھر انہوں نے مزید چیک کرنے کے بعد بتایا کہ عظیم اخلاق ولد اخلاق احمد نام کا کوئی آدمی سرے سے ہمارے بینک میں ملازم ہی نہیں تھا۔''

''یہ بہت جھوٹا اور گھٹیا آدمی ہے کمال بھائی۔'' اکو نے کہا۔ ''اس سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

''اس لیے میں تم لوگوں کو خبردار کر رہا ہوں۔'' کمال نے کہا۔

''ہماری باقی تمام تیاریاں تو مکمل ہیں۔'' امجد نے پوچھا۔

''وہ تو پچھلے ہی مہینے مکمل تھیں۔'' اکو نے کہا۔ ''بس ایک آخری کام ہے گاڑی اٹھانے کا۔ وہ تو میں دس تاریخ کی صبح ہی کو اٹھاؤں گا۔''

''یار! ویسے بھی اب عظیم کے دیے ہوئے پیسے ختم ہو گئے ہیں۔'' امجد نے کہا۔

''کوئی بات نہیں امجد بھائی۔'' اکو ہنس کر بولا۔ ''پانچ دن بعد پیسا ہی پیسا ہوگا۔''

☆☆☆

اس دن مہینے کی نو تاریخ تھی اور وہ سب عظیم کے گھر بیٹھے تھے۔ پہلے کی طرح آج انہیں پھر ہر چیز فائنل کرنا تھی۔

''دیکھو، اس دفعہ ہمیں ہر قیمت پر اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ اب کسی کا بھائی یا باپ......''

اکو نے گھور کر عظیم کو دیکھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''کسی کا باپ بھی ہمیں نہیں روک سکتا۔'' پھر وہ اکو سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے گاڑی کا بندوبست کرلیا؟''

''گاڑی کا بندوبست تو سمجھو ہوگیا۔'' اکو نے بیزاری سے کہا۔ ''اب یہ مت کہنا کہ یار تم ہنڈا سٹی لے کر کیوں آئے، لینڈ کروزر یا ڈبل کیبن پک اپ کیوں نہیں لائے؟''

اکو کے لہجے میں طنز تھا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' عظیم چڑ کر بولا۔ ''تم چاہے پراڈو لاؤ، سوزوکی کیری لاؤ یا پھر رکشا ہی لے آؤ۔ یہ تمہارا پرابلم ہے۔''

''گڈ!'' اکو ہنس کر بولا۔ ''یہ ہوئی نا بات۔''

''میرا خیال ہے کہ تم لوگ وہ ادھوری تعمیر شدہ عمارت بھی دیکھ آئے ہو گے؟''

''ظاہر ہے، ہمیں ایک مہینے کا ٹائم ملا تھا تو ہم نے معمولی معمولی باتوں پر بھی غور کیا ہے۔ وہ عمارت تو مشن کا بنیادی حصہ ہے۔''

''اوکے۔'' عظیم نے کہا۔ ''اب تم لوگوں سے کل دوپہر کے بعد طے شدہ جگہ پر ملاقات ہوگی۔''

وہ سب وہاں سے رخصت ہوگئے۔ پھر سے امجد، کمال اور اکو ہوٹل پر جا بیٹھے۔

اکو نے کہا۔ ''میں کل گیارہ بجے تک آپ کو پک کرلوں گا۔''

''ہاں، میں نے فائبر کے بڑے بڑے چار پانچ تھیلے لے لیے ہیں۔'' امجد نے کہا۔

''تھیلوں سے کیا ہوگا؟'' کمال نے کہا۔

''یار، وہ ڈاک کے مضبوط تھیلے ہیں اور ایک تھیلا اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں ایک کروڑ کی رقم آسانی سے سما سکتی ہے۔ میں نے پانچ تھیلوں کا انتظام اس لیے کیا ہے کہ زیادہ وزنی نہ ہوں اور انہیں لے کر نکلنے میں آسانی ہو۔ ہم دونوں دو دو تھیلے اطمینان سے اٹھا سکتے ہیں۔ پانچواں تھیلا تو میں نے احتیاطاً رکھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ بیگ بھی لیتا آؤں گا۔''

''وگز، تاریک شیشوں کے چشمے اور نقلی داڑھی مونچھیں میرے پاس ہیں۔'' کمال نے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر کل گیارہ بجے ملاقات ہوگی۔'' امجد نے کہا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

کمال صبح ہی سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے ناشتا کرنے کے بعد کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ اکو کی ہدایت کے مطابق وہ اس وقت جینز، جیکٹ اور جوگرز میں تھا اور بہت اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ابا نے اس کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کرلیا اور بولے۔ ''کمال بیٹا! کوئی پریشانی ہے؟''

''نہیں ابا۔'' کمال نے جواب دیا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ حیدرآباد جانا ہے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا۔''

''حیدرآباد جانا ہے؟'' ابا نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن کل تو تم نے کچھ نہیں بتایا تھا؟''

''اس دوست نے صبح اچانک ہی ٹیلی فون کر کے حیدرآباد چلنے کو کہا ہے۔ میں اس کی گاڑی میں جاؤں گا اور شام تک واپس آجاؤں گا۔''

اچانک باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ کمال نے کھڑکی سے باہر جھانکا، پھر بولا۔ ''اکبر آگیا ابا! میں چلتا ہوں، خدا حافظ۔'' اس نے کمرے میں جا کر بہت عجلت میں سوٹ کیس اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ حیدرآباد جانے کا بہانہ اس نے اسی لیے بنایا تھا تاکہ سوٹ کیس لے جانے کا کوئی جواز پیدا ہوسکے۔ چھوٹے سے اس سوٹ کیس میں چشمے، وگز اور نقاب بھی تھے۔

اکو جدید ماڈل کی ٹویوٹا کرولا لایا تھا۔ کمال نے عقبی دروازہ کھول کر سوٹ کیس اندر اچھالا اور جلدی سے آگے بیٹھ گیا۔ اکو نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''گاڑی بالکل نئی ہے۔'' اکو نے کہا۔ ''ٹویوٹا کرولا کا انجن ویسے بھی بہت پاورفل ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ڈبل کیبن پک اپ اٹھاؤں لیکن ڈبل کیبن پک اپ بینک کے نزدیک کھڑی ہوئی خوامخواہ لوگوں کی نظروں میں آتی۔ اس شاندار گاڑی پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔'' پھر اس نے رے بن کا قیمتی چشمہ نکال کر لگا لیا اور بولا۔ ''اب دیکھو کمال بھائی! کوئی شک کرسکتا ہے؟''

کمال نے اس کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''کمال بھائی! آپ کچھ پریشان ہو؟'' اکو نے کہا۔ ''ایسے کیسے کام چلے گا؟''

''نہیں، میں پریشان تو نہیں ہوں۔'' کمال نے کہا۔

اکو نے یونہی ایک لمبا سا چکر لگایا تھا تا کہ کمال کی پریشانی اور گھبراہٹ دور ہو جائے ورنہ امجد کا گھر تو دوسری ہی گلی میں تھا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی روکی اور کولڈ ڈرنکس کے تین ٹن اور سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آیا۔

''لو کمال بھائی، انجوائے کرو۔'' اس نے ایک ٹن خود کھولا اور دوسرا کمال کو دے دیا۔ تیسرا اس نے امجد کے لیے رکھ دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کا ڈی وی ڈی پلیئر آن کر دیا اور گانا شروع ہو گیا۔ 'رنگ دے، مجھ رنگ دے، مجھے رنگ دے'۔

''یار! کوئی معقول گانے لگاؤ۔'' کمال نے ہنس کر کہا۔ اس کی گھبراہٹ کسی حد تک دور ہو چکی تھی۔

اکو نے دوسرا گانا لگا دیا۔ ''ہوش والوں کو خبر کیا، بے خودی کیا چیز ہے؟''

اس غزل پر تو کمال جھوم اٹھا اور خالی ٹن گاڑی سے باہر پھینک کر سگریٹ سلگا لیا۔ موسم خنک تھا اس لیے ان لوگوں نے جینز پر جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔

دس پندرہ منٹ یونہی بے مقصد گھومنے کے بعد اکو، امجد کے گھر پہنچ گیا۔ کمال کی طرح امجد بھی فوراً گھر سے نکلا آیا۔ اس کا بیگ خاصا وزنی تھا۔ ظاہر ہے اس میں ہتھیار اور ان کے فاضل میگزینز تھے۔ امجد عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہتھیاروں والا بیگ کھول کر اس میں سے ایک ماؤزر نکال کر کمال کو دیا اور خود مشین پسٹل رکھ کر اس کے دو تین میگزینز بھی رکھ لیے۔ ماؤزر کے فاضل میگزینز اس نے کمال کو دے دیے اور اکو سے بولا۔ ''یہ دوسرا ماؤزر تمہارے لیے ہے۔''

''اسے وہیں رکھ دیں۔'' اکو نے کہا۔ ''میں اپنا سامان خود لے کر آیا ہوں۔ اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نائن ایم ایم کا پسٹل ان لوگوں کو دکھایا، پھر اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا وہاں SIG کی دور مار رائفل رکھی تھی۔

کمال حیرت سے بولا۔ ''یار! میری نظر اب تک تمہاری رائفل پر نہیں پڑی۔''

اکو نے اس سے سائیلنسر نکال کر کمال کو دیا اور بولا۔ ''آپ ذرا رائفل پر یہ سائیلنسر فٹ کر دو۔''

کمال نے رائفل اٹھائی۔ وہ بہت ہلکی پھلکی لیکن مہلک رائفل تھی۔ سائیلنسر لگانے کے بعد اس نے دوبارہ رائفل اکو کی طرف بڑھا دی۔ اس نے وہ دوبارہ اپنے پہلو میں رکھ لی۔

کمال نے عقبی نشست سے سوٹ کیس اٹھایا اور اس میں سے براؤن بالوں والی ایک وگ نکال کر پہن لی، چہرے پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگا لیا اور وگ کی ہم رنگ براؤن مونچھیں نکال کر ہونٹوں پر چپکا لیں۔ مونچھوں میں ٹیپ کی طرح کی کوئی چپکنے والی چیز لگی تھی جیسے عموماً اسٹیکر چپک جاتے ہیں۔ اسی طرح مونچھیں بھی اس کے ہونٹوں پر چپک گئیں۔ اس نے سوٹ کیس سے چھوٹا سا ایک آئینہ نکال کر اپنا جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر آئینہ امجد کی طرف بڑھا دیا جو چہرے پر نقلی داڑھی مونچھیں چپکانے میں مصروف تھا۔ داڑھی اتنی فنکاری سے بنائی گئی تھی کہ بالکل اصلی لگتی تھی۔ اس پر گھنی مونچھیں، پھر امجد نے سر پر ایک کیپ بھی لگا لیا۔ اس کا حلیہ بالکل بدل گیا۔

اکو نے تنقیدی نظروں سے دونوں کا جائزہ لیا پھر ہنس کر بولا۔ ''بالکل پرفیکٹ۔''

تیار ہو کر کمال نے گھڑی دیکھی، اس میں سوا ایک بجا تھا۔

☆☆☆

سب انسپکٹر ناصر نے وین میں بیٹھتے ہوئے موبائل وین کے ڈرائیور سے کہا۔ ''پہلے بینک کی طرف لے لو، صبح منیجر کا ٹیلی فون آیا تھا کہ آج دس تاریخ ہے۔ اس نے مجھے یاد دہانی کے لیے کال کی تھی۔ اس موبائل وین میں سب انسپکٹر ناصر اور ڈرائیور سمیت چھ آدمی تھے۔ چار کانسٹیبل پیچھے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ ہر فرد مسلح تھا۔ سپاہیوں کے پاس رائفلیں تھیں اور ایس آئی ناصر کے پاس سروس ریوالور۔ اس کا نشانہ بہت غضب کا تھا اور وہ چھ سیکنڈ میں چھ فائر کرتا تھا اور ہر فائر نشانے پر بیٹھتا تھا۔ اس نے پولیس شوٹنگ کے مقابلوں میں کئی انعامات جیتے تھے۔ چھ سیکنڈ میں چھ فائر کا ریکارڈ تو آج بھی کوئی نہیں توڑ سکا تھا۔

اس نے بینک کا ایک چکر لگایا، بینک کا سیکیورٹی گارڈ اپنی جگہ پر موجود تھا اور پولیس والا بھی باہر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس وین دیکھ کر وہ نہ صرف کھڑا ہو گیا بلکہ اس نے اپنی رائفل بھی ہاتھوں میں تھام لی۔

ایس آئی ناصر مسکرا کر بولا۔ ''مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ نہ جانے تم لوگ اپنی ڈیوٹی ٹھیک طرح کیوں نہیں کرتے۔''

ڈرائیور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

ہر مہینے کی دس تاریخ کو وہ وقفے وقفے سے بینک کے کئی چکر لگایا کرتا تھا۔

☆☆☆

ایک بج کر پچیس منٹ پر اکو نے گاڑی بینک کی بغلی سڑک پر ایک طرف پارک کر دی۔ اس کا رخ ایسا تھا کہ اسے بینک کے سامنے سے گزرنے والا ہر شخص اور ہر گاڑی نظر آ رہی تھی۔

کمال اور امجد ایک بریف کیس لے کر بینک کی طرف بڑھ گئے۔ اس بریف کیس میں فائبر کے تھیلے تھے۔ ان دونوں کے ہتھیار ان کی جیبوں میں تھے۔ اب سب سے بڑا مرحلہ سیکیورٹی گارڈ سے نمٹنے کا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میٹل ڈیٹیکٹر تھا۔ اسے فوراً علم ہو جاتا کہ وہ دونوں مسلح ہیں، وہ اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل اتار سکتا تھا یا چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔

کمال بہت عجلت میں وہاں پہنچا اور گارڈ کے پاس جاتے ہی بلند آواز میں بولا۔ ”تم کیسی ڈیوٹی دے رہے ہو؟ ابھی ابھی ایک مسلح آدمی اندر گھسا ہے۔“

”مسلح آدمی؟“ گارڈ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”اب یہیں کھڑے حیرت ہی کرتے رہو گے یا اسے پکڑو گے بھی؟“ کمال نے درشت لہجے میں کہا۔

گارڈ بوکھلا کر بینک کے دروازے کی طرف مڑا۔ اس نے شیشے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ کمال نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔ خاموشی سے اندر چلو۔“ گارڈ خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ حسب معمول پولیس والا کھانے کے لیے جا چکا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے امجد بھی اندر داخل ہوا اور اس نے بینک کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

کمال گرج کر بولا۔ ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ماؤزر نکال لیا۔ ”سب لوگ اوندھے منہ لیٹ جائیں۔“ اس نے وہاں موجود لوگوں کو حکم دیا۔

وہاں دو تین خواتین کسٹمرز بھی موجود تھیں۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے علاوہ چار مرد تھے۔ وہ سب لرزتے ہوئے اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔

اس دوران میں امجد بینک کے عملے کے سر پر جا پہنچا تھا اور سب کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔

پھر تو سب کچھ بہت آسان ہو گیا۔ لگتا تھا کہ بینک کا عملہ پہلے سے لٹنے کو تیار بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ شہر میں ڈکیتی کی وارداتوں میں ڈاکو مزاحمت کرنے پر لوگوں کو گولی مار دیتے تھے۔ بینک کے عملے کو بھی یہی خوف تھا، ویسے بھی چند ہزار کی نوکری کے لیے کون اپنی جان پر کھیلتا ہے؟

امجد نے نہ صرف کیشیئرز کے کیش کا صفایا کر دیا بلکہ منیجر سے سیف کھلوا کر اس میں سے بھی رقم نکال کر تھیلوں میں بھر لی۔ پھر اس نے پہلے دو تھیلے دروازے کے پاس پہنچائے۔ پھر بقیہ دو تھیلے لے کر آگے بڑھا اور دروازے کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ نہ جانے کس کونے سے بینک کا پیون اس پر جھپٹا۔ کمال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے پہلے تو پیون کو دھمکانے کی کوشش کی لیکن جب وہ امجد سے لپٹ گیا تو کمال نے بوکھلا کر پیون کی پشت پر فائر کر دیا۔

☆☆☆

ایس آئی ناصر نے دوبارہ بینک کا چکر لگایا تو وہاں گارڈ اور پولیس والے کو غائب پا کر چونکا اور ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔

پولیس کی موبائل وین دیکھ کر اکو پہلے سے چوکنا ہو گیا تھا اور اس نے رائفل اٹھا کر اپنے پیروں پر رکھ لی تھی۔ موبائل وین اس انداز میں رکی تھی کہ اس کی پشت اکو کی طرف تھی اور اسے پیچھے بیٹھے ہوئے چاروں کانسٹیبلز صاف نظر آ رہے تھے۔

اسی وقت بینک کے اندر سے فائر کا دھماکا سنائی دیا۔ ناصر نے پلک جھپکتے میں اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور بینک کی طرف لپکا۔

خطرہ دیکھ کر اکو نے ناصر کے پاؤں کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی اس کی پنڈلی کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی۔ سپاہیوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کیں اور اترنے ہی والے تھے کہ اکو نے دو ہوائی فائر کر دیے تاکہ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جائیں۔

وین کا ڈرائیور شاید بہت جی دار تھا یا پھر سکتے میں آ گیا تھا۔

ایک سپاہی پیچھے سے چیخ کر ڈرائیور سے بولا۔ ”او گاڑی چلا اوئے، پتا نہیں کون کتے کا بچہ فائرنگ کر رہا ہے۔“

اس سپاہی کی گالی بھی اکو کو گولی کی طرح لگی۔ اس نے لگاتار چار فائر کیے اور چاروں سپاہیوں کی کھوپڑیاں اڑا دیں۔ پانچواں فائر اس نے پولیس موبائل کے ٹائر پر کیا۔

اسی وقت کمال اور امجد تھیلوں سمیت وہاں سے نکلے اور بھاگتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی پہلے ہی اسٹارٹ تھی۔ اکو نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی اور اسے

جیٹ فائٹر کی رفتار سے دوڑانے لگا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی کمال اور امجد نے اپنی وگوں اور داڑھی مونچھوں سے نجات حاصل کی۔ چشمے اتارے اور سارا سامان دوبارہ بریف کیس میں بھر دیا۔

کمال کو ایک جگہ گندا نالا نظر آیا۔ اس نے اکو سے گاڑی کی رفتار کم کرنے کو کہا اور وہ بریف کیس اس گندے نالے میں پھینک دیا۔

اکو پھر تیز رفتاری سے روانہ ہوگیا۔

مین روڈ پر پہنچ کر اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی کہ مبادا کوئی ٹریفک سارجنٹ اسے پکڑ لے۔ پھر اس نے گاڑی کا ریڈیو کھول دیا۔ اس وقت کوئی گانا چل رہا تھا۔ وہ گانا ختم ہوا تو اناؤنسر نے کہا۔ ''اب آپ کے لیے ایک بریکنگ نیوز۔ سائٹ کے علاقے سے ڈاکو تقریباً پونے تین کروڑ روپے کیش لے کر فرار ہوگئے۔ بینک کے ایک پیون نے مداخلت کی کوشش کی تو ایک ڈاکو نے اسے گولی مار دی۔ باہر نکلتے ہی پولیس کی موبائل وین نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے نہ صرف سب انسپکٹر کو بری طرح زخمی کر دیا بلکہ گاڑی میں سوار چاروں سپاہیوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔''

''آپ دونوں بالکل پُرسکون ہو جاؤ۔'' اکو نے کہا۔ ''میں کسی ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکوں گا۔ وہاں سے کچھ کھا پی کر آگے بڑھیں گے۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' کمال نے کہا۔ ''تمہیں اس وقت بھی کھانے کی لگی ہوئی ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بالکل پُرسکون ہو جائیں۔ ابھی ہمیں عظیم سے بھی نمٹنا ہے۔''

اس نے ایک جگہ گاڑی روکی تو کمال نے کہا۔ ''تم یہیں ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس اور پیٹیز وغیرہ لے آؤ اور رکو مت بلکہ چلتے رہو۔''

اکو ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل میں بھی ٹی وی چل رہا تھا اور اس پر وہی بریکنگ نیوز دکھائی جا رہی تھی۔

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''بینک کے پیون کی عمر اٹھاون سال تھی اور وہ بہت محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ اصغر علی کا صرف ایک بیٹا تھا۔''

اصغر علی کا نام سن کر اکو بری طرح چونکا اور اس نے گھوم کر ٹی وی کی طرف دیکھا۔ ٹی وی اسکرین پر گارڈ کی تصویر تھی۔

اکو کا سر بری طرح گھوما، اس نے نزدیکی دیوار کا سہارا لیا ورنہ وہ منہ کے بل فرش پر گرتا۔ پھر اس نے میز پر رکھا ہوا جگ اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔

چند لمحے بعد اس کی حالت سنبھل گئی لیکن وہ غصے سے کھولنے لگا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گاڑی تک پہنچا اور بولا۔ ''یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ پولیس کے زخمی انسپکٹر نے گاڑی کا نمبر دیکھ لیا ہے۔''

''تو پھر نکل یہاں سے۔'' کمال چیخ کر بولا۔

اکو نے گاڑی پھر دوڑا دی اور دس منٹ کے اندر وہ اس ادھوری عمارت تک جا پہنچے۔

اکو نے گاڑی ایسی جگہ پارک کی کہ وہ مین روڈ سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ گاڑی دیکھ کر چوکیدار اپنے کمرے سے نکل آیا اور اکو کو سلام کیا۔

اکو نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''بابا! دوسرا آدمی کہاں ہے؟'' اس نے اندھیرے میں تیر پھینکا تھا۔ جو نشانے پر لگا۔

''سائیں دوسرا آدمی تو گوٹھ گیا ہے، خیر تو ہے سائیں؟''

''ہاں، خیر ہے تم اپنے کمرے میں چلو۔''

چوکیدار جونہی مڑا اکو نے پیچھے سے اس کے سر پر پسٹل کا بٹ مارا۔ وہ تیورا کر فرش پر گر پڑا۔ اکو نے اسے گھسیٹ کر عمارت کے اندر ڈالا اور اس کی اجرک پھاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے پھر اسے ایک کمرے میں ڈال دیا۔

کمال اور امجد بھی نیچے اتر آئے۔ انہوں نے رقم کے تھیلے اتارے اور عمارت کی طرف بڑھے۔

''سب سے اوپر کی منزل پر پہنچنا ہے۔'' امجد نے کہا۔

ایک تھیلا اکو نے پکڑ لیا۔ بقیہ تین تھیلے وہ دونوں پکڑے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے ان سب کا برا حال ہوگیا۔ وہ تینوں اوپر ٹیرس میں نکل آئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

جب ان لوگوں کی حالت ذرا سنبھلی تو کمال نے کہا۔ ''یہ عظیم کہاں رہ گیا؟''

''آجائے گا۔'' امجد نے کہا۔ ''کہیں بیٹھا ہوا خبریں سن رہا ہوگا۔''

اکو نے اچانک سرد لہجے میں پوچھا۔ ''بینک کے پیون کو کس نے مارا تھا؟''

''وہ اچانک ہمارے سامنے آ گیا تھا ورنہ......''

''میں پوچھ رہا ہوں اسے کس نے مارا تھا؟'' اکو دہاڑ کر بولا۔

''مجھ سے گولی چل گئی تھی۔'' کمال نے کہا۔

اکو اچانک بری طرح رونے لگا۔ ''تم نے میرے بابا کو مار دیا۔ میرا بابا مر گیا۔ مر گیا میرا بابا...... وہ میرا باپ تھا۔ تم نے اسے مار دیا۔''

''دیکھو اکو! یہ ایک حادثہ تھا، پھر ممکن ہے وہ تمہارا بابا نہ ہو۔''

''وہ میرا بابا تھا۔'' اکو نے روتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''میں نے ہوٹل کے ٹی وی پر اس کی تصویر دیکھی تھی۔ میرا بابا مر گیا۔ تم نے میرے بابا کو مار دیا۔ اب کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' اکو کے لہجے میں جنون تھا۔ اس نے اچانک اپنا پسٹل نکال لیا اور بولا۔ ''اب کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''اکو ہوش میں آؤ۔'' کمال چیخ کر بولا۔ ''تمہارا بابا......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اکو نے کمال کی پیشانی پر گولی ماری تھی۔ وہ الٹ کر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ختم ہو گیا۔

اس دوران میں امجد کو موقع مل گیا، اس نے اپنا ریوالور نکالا اور اکو پر فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ اکو نے برق سرعت سے گھوم کر اس پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے حلق سے پار ہو گئی۔

اچانک کمرے کی طرف سے عظیم کی آواز آئی۔ ''ویری گڈ! تم نے تو خود ہی میرا کام آسان کر دیا۔ اب اپنا پسٹل پھینک دو ورنہ کھوپڑی اڑانا تو میں بھی جانتا ہوں۔''

اکو نے پسٹل پھینک دیا۔

''اب تم اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔'' عظیم نے اسے حکم دیا۔

اکو اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔

اسی وقت عظیم کے ساتھ دو آدمی کمرے سے باہر آئے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پسٹل تھے۔

اکو نے کہا۔ ''دیکھو، مجھ سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے میرے بابا کو ہلاک کر دیا ہے۔ بینک میں مرنے والا پیون میرا باپ تھا۔''

''وہ تمہارا باپ تھا؟'' عظیم نے کہا۔ ''وہ کتے کا پلا، کتے ہی کی موت مرا۔'' عظیم نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے بہت غصہ آتا تھا باپ کو گالی دینے پر، وہ حرام زادہ بیچ میں کود ہی کیوں، سؤر کا بچہ ہیرو بننے چلا تھا۔''

اکو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''بکواس بند کرو۔'' پھر لیٹے لیٹے اس نے برقی سرعت سے پیر سمیٹے اور اپنی پنڈلی سے بندھے ہوئے دو پستول نکال لیے۔ لیٹے ہی لیٹے پہلا فائر اس نے عظیم کی پیشانی پر کیا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی اس نے لگاتار دو فائر مزید کیے اور عظیم کے ساتھیوں کی پیشانیوں کے عین وسط میں سوراخ ہو گئے۔

پھر وہ جنونی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا۔ ''میرا بابا مر گیا، میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔''

اس نے جنونی حالت میں نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کھولے اور نوٹ فرش پر ڈھیر کر دیے۔ پھر وہ نوٹوں کا ڈھیر دیکھ کر قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ان ہی نوٹوں کی وجہ سے میرا بابا میرا ہے...... ان ہی نوٹوں کی وجہ سے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر نوٹ نیچے پھینکنا شروع کر دیے۔

فائرنگ کی آواز سن کر نیچے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جو اکو کو کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

وہاں موجود لوگوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہرے، لال، نیلے نوٹ پتنگوں کی طرح لہراتے ہوئے زمین کی طرف جا رہے تھے۔

اکو نے آخری بچے ہوئے نوٹ بھی دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر نیچے پھینکے اور چیخ کر بولا۔ ''بابا! تو اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی آ رہا ہوں بابا... میرا انتظار کرنا بابا، میں آ رہا ہوں۔'' پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بارہویں منزل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ چند لمحوں بعد بکھرے ہوئے نوٹوں پر اس کا ٹوٹا پھوٹا وجود بکھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

اصغر علی نے اردگرد دیکھا اور اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے فضلو سے پوچھا۔ ''ابھی تک اکو نہیں آیا۔''

اسے آج کئی دن بعد ہوش آیا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔

''اسے شاید اطلاع ہی نہیں ہو گی۔'' اصغر علی بڑبڑایا۔ میڈیا والوں نے تو پہلے ہی اس کی موت کی خبر چلا دی تھی حالانکہ اس وقت وہ زندہ تھا۔

فضلو نے دل میں کہا۔ ''اکو اب کبھی نہیں آئے گا۔''

اس نے سوچا کہ اصغر علی کو بتا دے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش ہو گیا۔